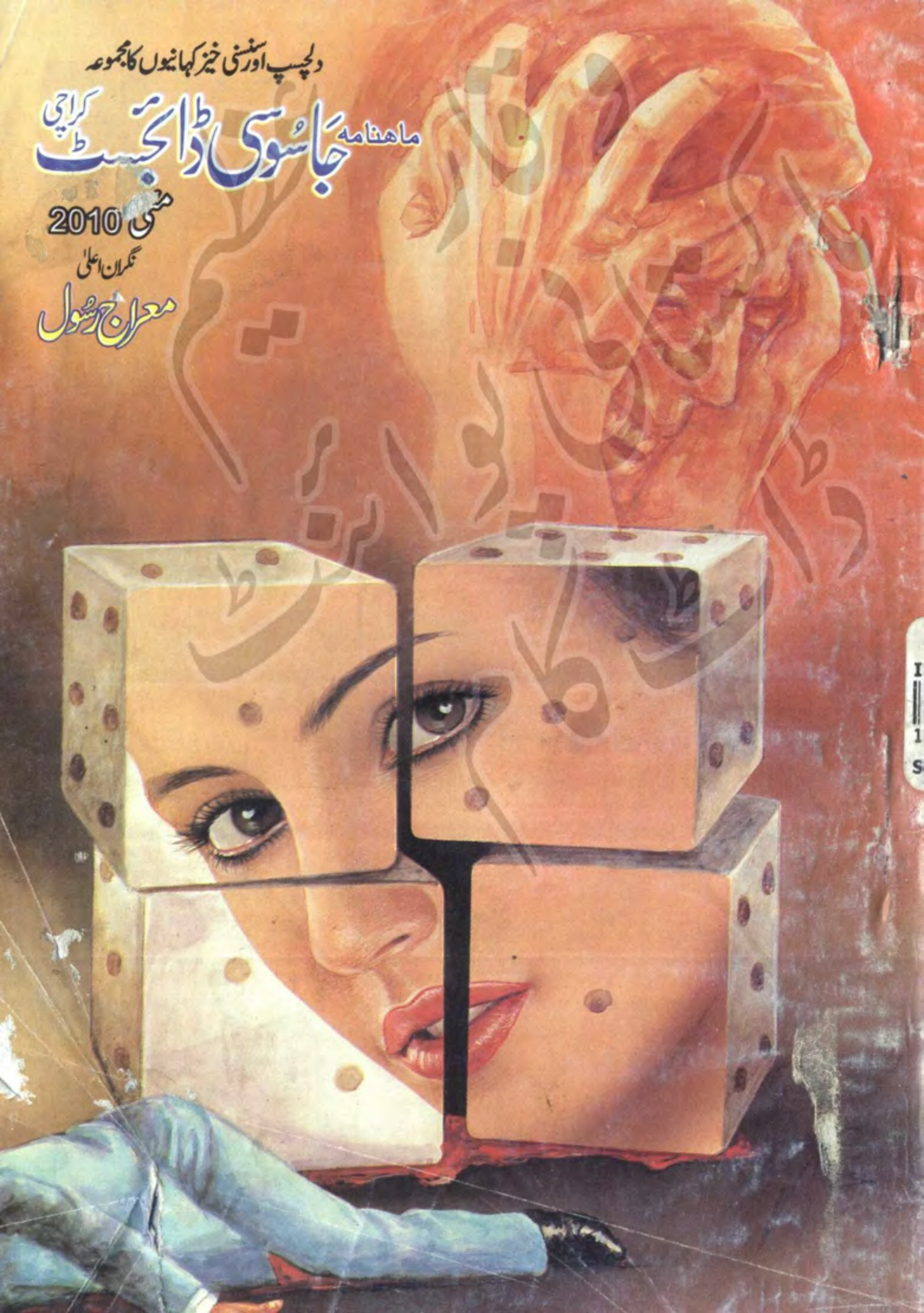
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
مئی 2010
نگران اعلیٰ
معراج رسول

جاسوسی

مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

چینی نکتہ چینی
11

تنویر ریاض
خودغرض، احسان فراموش معاشرہ اور انسانی
احساسات کے اسرار و رموز میں ڈوبی داستانِ تحیر

دلِ سنگ
18

شاکر منعم
وہ خواب جس کی تعبیر نے
سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا تھا

تعبیر
63

کاشف زبیر
زندگی، محبت اور شکم کی آگ
کے درمیان بقا کا کھیل

بھوک
71

ثمر عباس
مجرمانہ ذہنیت اور مغربی معاشرے کے
سیاہ چہرے کی عبرت ناک تصویر کشی

تنہا سفر
83

اسما قادری
تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چھپا بازی کا مقدر
کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گرداب
92

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

آصف ملک
جنگ کے پس منظر میں جنم لینے
والی کہانی کا ایک المناک پہلو

پیشگی دفاع
133

مریم کے خان
قسمت کی ستم گری کا انوکھا وار جس نے
آخری لمحات میں بازی پلٹ دی

خیالِ سراب
147

طاہر جاوید مغل
محبت کے محاذ پر پچھڑے ہوئے شخص کی جدوجہد...
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

للکار
156

رضوانہ منظر
وہ صیاد جو اپنے ہی جال میں پھنس
چکا تھا... سراغرسانی پر مبنی مختصر تحریر

چوٹ
201

اسما راشد
محبت کی پُرفریب دنیا کے متضاد عکس جہاں
محبت کی رنگینی، رفتہ رفتہ سنگینی میں ڈھل رہی تھی

جوشِ وحشت
210

سلیم فاروقی
نیکی اور بدی کی راہ میں حائل رکاوٹیں جو شخص
کے ہر قدم اُکھاڑ دیتی ہیں کہ ورق کا تیز رفتار رنگ

رزقِ حلال
250

جلد 39 • شمارہ 05 • مئی 2010 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 5895313 فیکس (021) 5802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی، نکتہ چینی

مدیرِ اعلیٰ

عزیزانِ من... السلام علیکم!

مئی 2010ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ مہینا تپتے دنوں اور حبس زدہ راتوں کا حوالہ ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ملک میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے عذاب نے جہاں پہلے ہی شہریوں کے دن دوبھر اور راتیں اجیرن کی ہوئی تھیں، وہیں اب لگتا ہے کہ اس 'غمِ ایام' نے پورے ملک کے شہریوں کو اعصابی تناؤ کا مریض بنادیا ہے۔ وہ حکومت جسے ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کے سدِ باب، بے روزگاری کے خاتمے اور ملکی ترقی کے لیے صنعتی پھیلاؤ کے لیے کام کرنا تھا، لوڈ شیڈنگ کے ہاتھوں سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے۔ بجلی کی قلت کیسے دور ہو؟ چلو جی، اس کے لیے ہفتے میں دو دن چھٹی کر لیتے ہیں، گیس کی بھی لوڈ شیڈنگ کیے دیتے ہیں، بازار سرِ شام بند کروادیتے ہیں... سب کچھ کر لیا لیکن مسئلہ اپنی جگہ بدستور موجود ہے۔ مہنگائی میں اضافہ معیشت کا ایک لازمی جزو اور تقاضا ہے۔ ماہرینِ معیشت اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ معمول کے حالات میں دس فیصد تک سالانہ مہنگائی کا تناسب عام بات ہے لیکن جناب وطنِ عزیز میں تو مہنگائی میں اضافے کا کوئی پیمانہ ہی نہیں ہے۔ حالت تو اب یہ ہو چکی ہے... کہ آدمی ایک روپیا کما کے... دو روپے خرچ کرنے پر مجبور ہو چکا ہے۔ یہ فضول خرچی نہیں بلکہ مہنگائی کا تحفہ ہے۔ مہنگائی کی بات چلی تو شکاگو کے مزدور اور 'یوم مزدور' کی بات بھی نکل آئی۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے خوب کہا تھا 'ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات... مہنگائی کے اس دور میں بندۂ مزدور کے اوقات ہی نہیں... شب و روز بھی تلخ ہو چکے ہیں۔

مہنگائی کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ پیٹرول، گیس اور بجلی مہنگی ہوتی ہے تو ہر چیز کے دام خود بخود بڑھنے لگتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ کاغذ، سیاہی، طباعت اور ترسیل پر آنے والے مصارف میں گزشتہ کئی مہینوں سے متواتر اضافہ ہو رہا ہے لیکن ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ان اثرات کو کم از کم اپنے قارئین تک منتقل نہ کیا جائے لیکن کب تک... اب آپ کے پسندیدہ رسالے 'جاسوسی ڈائجسٹ' کی قیمت میں دس روپے کا اضافہ ناگزیر ہو چلا ہے۔ قیمت میں یہ اضافہ بادلِ ناخواستہ کرنا پڑ رہا ہے۔ جون سے ماہنامہ 'جاسوسی ڈائجسٹ' کی فی شمارہ قیمت 50 روپے ہوگی اس سے آگے نہیں کہیں گے...

چلتے ہیں آپ کی محفلِ مکتوبات میں اور پڑھتے ہیں جو آپ کے دل میں ہے۔

علی عمران، ڈی آئی خان سے زبردست طریقے سے لکھتے ہیں ''جاسوسی 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر ڈالی تو خوب صورت حسینہ کچھ عجیب ہی سوچوں میں گم تھی اور ایک گنجا تصویر لے رہا ہے۔ اوپر ایک مولوی صاحب غصہ فرما رہے ہیں۔ خیر، زبردست محفل میں پہنچے تو دیکھا جعفر حسین کرسیٔ صدارت پر بیٹھے ہیں، زبردست تبصرے کے ساتھ۔ سب سے پہلے للکار پڑھی۔ طاہر مغل صاحب تابش کو شاہ خاور کی طرح مگر جدید دور کا لڑا کا بنانا چاہتے ہیں۔ اس دفعہ کی قسط زبردست تھی اور کافی ٹیڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ پھر گرداب پڑھی، واقعی زبردست ہوتی جا رہی ہے۔ چودھری صاحب تو بڑے الٹے نکلے۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اے سی شہریار نے اپنے آپ کو بچالیا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب کشور بی بی کی شادی کا بھانڈا پھوٹنے والا ہے۔ بدخصلت کی آخری قسط کافی بہترین تھی جس میں کامران صاحب نے کافی ہاتھ گرم کیے اور دشمن اول ہندوستان والوں کا کافی برا حال کیا۔ دونوں رنگ کافی زبردست تھے۔ پہلے رنگ نے رونے پر مجبور کر دیا۔ مُردہ فروش کافی زبردست تحریر تھی اور سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ مذاق، بدمعاش، نمبر پلیٹ اچھی تھیں۔ غرض اس دفعہ کا شمارہ ہر لحاظ سے زبردست تھا۔''

محمد اقبال بھٹی، گاؤں ستو کی قصور سے لکھتے ہیں ''جاسوسی 5 تاریخ کو بک اسٹال سے خریدا۔ ذاکر صاحب سرورق بنانے میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ ایک خوب صورت سی لڑکی ہونٹوں پر سرخی، کانوں میں بالیاں اور گلے میں موتیوں کا ہار پہن کر ایک گنجے فوٹو گرافر سے اپنی تصویریں کھنچوا رہی تھی اور پیچھے سے ایک مولوی ٹائپ آدمی غصے سے گنجے فوٹو گرافر کو تصویریں کھینچنے سے روک رہا تھا۔ محفل میں جھانکا تو جعفر حسین کرسیٔ صدارت پر براجمان تھے۔ میری طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ آمنہ پٹھانی صاحبہ! اگر آپ کو پرچہ فیصل آباد سے منگوانا پڑتا ہے تو کوئی بات نہیں، شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ غلام مصطفیٰ صاحب! اگر آپ کے پرچے 13 اپریل سے ہو رہے ہیں تو میری اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو فرسٹ ڈویژن میں پاس کرے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے، بہت زبردست تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے سلیم فاروقی کی بدخصلت پڑھی، بہت ہی زبردست اور ایکشن سے بھرپور کہانی تھی جس نے ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اس کے بعد اپنے فیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل کی للکار پڑھی۔ کہانی ایکشن سے بھرپور ہے لیکن میرے خیال میں تابش کی جگہ عمران کو ہیرو ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ بلا خوف، خطرے میں کود پڑتا ہے اور تابش ڈرتا رہتا ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب! تابش کو سلطان راہی بنائیے تاکہ وہ ڈنڈے اور کلہاڑیوں سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار سکے۔ اسما قادری کی گرداب بھی سلسلے وار اچھی کہانی ہے۔ اس دفعہ کہانی میں ایکشن بہت ہی کم تھا۔ چودھری افتخار امریکا چلا گیا ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں مُردہ فروش بے حد پسند آئی۔ سرورق کے دونوں رنگوں میں پہلا رنگ منظر امام کا بہت اچھا تھا۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

جواد اداس کی سہ بار خوشیاں چارسدہ سے ''اپریل کا مہینا میرے لیے ہمیشہ خوشیاں ہی لایا ہے۔ مابدولت اسی مہینے میں بہار کی طرح اس دنیا میں تشریف لائے۔ اسی مہینے میں محفلِ دوستاں میں میرا خط شائع ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ماہ، شمارہ پہلے ہی چکر میں ملا۔ (واہ جی وا! آپ کی تو عید ہوگئی) جو پہلے بقول سلیم شبلی صاحب کے دس نہیں تو کم سے کم سات آٹھ چکروں کے بعد ہی ملتا تھا۔ اپریل کے شمارے کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ سب سے پہلے سرورق پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ حسینۂ جاسوسی، شکل سے بیمار نظر آرہی تھی۔ کوئی بات نہیں موسم تبدیل ہو رہا ہے نا... ایک گنجا اس کی تصویر بہت انہماک سے اتار رہا ہے اور ایک باریش آدمی اس پر سراپا احتجاج نظر آرہا ہے۔ مجموعی طور پر سرورق خوب صورت اور پُرامن تھا جس میں گن کا نام و نشان تک نہیں۔ اس کے بعد پوری

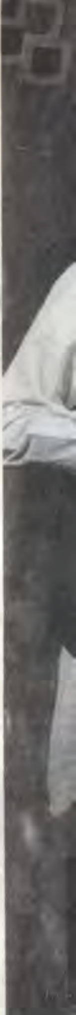

شان وشوکت سے جاسوسی کی جان، محفلِ دوستاں میں مہمان خصوصی بن کر شامل ہونا چاہا لیکن وہاں پہلے سے محترم جعفر حسین صاحب مہمان خصوصی بنے بیٹھے تھے۔ ان کا تبصرہ شان دار تھا۔ آمنہ پٹھانی، عابد جان، ہمایوں سعید اور دلنشین بلوچ بھی پیش پیش رہے۔ ارسلان رضا صاحب! آپ کا الزام غلط ہے۔ شبلی صاحب اگر جاسوسی کے لیے دس چکر لگاتے ہیں تو اس میں دروغ گوئی کی کیا بات ہے؟ یہ تو جاسوسی سے ان کی محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ عصمت بھائی! اتنے کش مت لگایا کریں، خدانخواستہ اگر بیمار پڑ گئے تو ہم آپ کے کش لگے تبصرے سے محروم ہو جائیں گے، کش لگا کے۔ محفل برخاست ہونے کے بعد سیدھا گرداب میں پہنچے۔ اس قسط نے بھی اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ چودھری کو شاید امریکا میں ماہ بانو کا سراغ مل جائے، اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ تابش کے ہاتھ پاؤں کھل رہے ہیں۔ عمران ہیرو کی شخصیت پردوں میں پوشیدہ ہے۔ یقیناً وہ بھی عشق کے سفر میں لٹ چکا ہے۔ اس لیے تو دل والوں کے درد کا احساس ہے اسے۔ بدخصلت میں سلیم فاروقی نے اپنے ہیرو کو فتح دلا ہی دی۔ کہانی حقیقت سے بہت دور گئی۔ سرورق کے دونوں رنگ انتہائی زبردست تھے۔ کاشف زبیر میرے پسندیدہ رائٹر ہیں اس لیے پہلے دوسرا رنگ پڑھا۔ انتہائی سبق آموز کہانی تھی جو ہمارے ہی معاشرے کی عکاسی کرتی ہے جہاں باپ اولاد کو اور خاص کر بیٹی کو بوجھ سمجھتا ہے۔ باپ کی بے توجہی سے اولاد اگر کوئی غلط قدم اٹھاتی ہے تو پھر باپ کی غیرت جوش مارتی ہے لیکن پھر کچھ نہیں رہتا اور تباہی خاندان کا مقدر بن جاتی ہے۔ پہلا رنگ بھی زبردست رہا۔ ''دلدار وادی'' کے غیر متوقع انجام نے رلا دیا۔ انتہائی خوب صورت کہانی تھی۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں بدمعاش، ٹاپ پر رہی۔ ہوگارڈ کا کردار بہت پسند آیا۔ کالج کا نام اگر اس کے نام سے ہوتا تو اچھا ہوتا۔ باقی بھی زبردست تھیں۔''

اوکاڑہ سٹی سے **تصویر العین** کی رائے ''صبر آزما انتظار کے بعد جاسوسی 12 تاریخ کو ملا۔ جاسوسی ہاتھ میں آتے ہی تپتی گرمیوں کی دوپہر میں بادل چھا گئے۔ بس اب دعا ہے کہ بارش نہ ہو ورنہ گندم کی کھڑی فصلیں خراب ہو جائیں گی۔ ٹائٹل میں سب سے خوب صورت چیز جیولری تھی۔ ایک آدمی کیمرا پکڑے شاید دوشیزہ کا سائڈ پوز لینے کی کوشش کر رہا تھا اوپر ایک شخص چہرے پر ڈاڑھی سجائے اور ہزاروں جھریاں لیے ہونٹ سکیڑے پتا نہیں کیا بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اداریے میں انکل نے بجلی کا مسئلہ اٹھایا۔ واقعی میں بجلی کی لوڈ شیڈنگ نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ پیپرز نزدیک ہیں، رات میں تو بندہ پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اس دفعہ جعفر حسین چنیوٹ سے صدارت کی کرسی پر براجمان نظر آئے، مبارک ہو۔ خاصا طویل تبصرہ تھا۔ کوکبوار دوان ایم اے عاصی کی آمد اچھی لگی۔ خوش آمدید عاصی صاحب۔ آمنہ پٹھانی اپنے خط میں آسیہ خان کی جھوٹی تعریف اور اپنے خطوط کے بارے میں آپ ہی میاں مٹھو بنتی نظر آئیں۔ اعجاز احمد اپنے تبصرے میں ہر ایک کی ٹانگ کھینچتے نظر آ رہے تھے۔ ہمایوں سعید رومیو ''چچ چچ'' بڑا افسوس ہوا۔ آسیہ خان نے آپ کی اتنی تعریفیں کی ہیں، وہ سب کی سب آپ کو طنز لگیں۔ بدخصلت پڑھ کر ایسا لگا جیسے سلیم فاروقی نے سرکش سے متاثر ہو کر لکھی ہو۔ تقریباً سارا ایکشن ہی چودھری افضل والا تھا۔ خصوصاً کامران کا ورما کے کان کو سگریٹ سے داغنا اور ہیروئن کی موت۔ اس کہانی نے متاثر نہیں کیا۔ مردہ فروش، مریم کے خان کی کہانی پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔ میرا خیال ہے کہ کہانی کو تھوڑا اڈرانا ہونا چاہیے تھا۔ للکار میں اب تک سمجھ نہیں آئی کہ ہیرو تابش ہے یا عمران؟ کہانی تابش کی ہے، ایکشن عمران کا دکھایا جا رہا ہے۔ بس اب تو یہ انتظار ہے کہ طاہر انکل کب اسے اپنے اصل رنگ میں لاتے ہیں۔ گرداب اب نیا موڑ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ہر اگلی قسط پچھلی قسط سے بہتر ہوتی ہے۔ کشور کی لگتا ہے کہ بس اب شامت آنے والی ہے۔ خدا خیر کرے۔ پھر اگلی قسط کا لمبا انتظار کرو۔ مذاق میں سونیا کس قدر تیز نکلی، بے چارے جمال کو پھنسوا دیا۔ لڑکی بھی ہاتھ نہ آئی اور نوکری بھی گئی۔ معما، فوزیہ ظہیر نے بہت خوب صورت لکھی۔ کہانی بہت زبردست تھی، سنا ہے کہ جو قتل ہو جائے جب تک اس کے قاتل کو سزا نہ ملے، وہ روح بے چین رہتی ہے۔ دلدار وادی محبت اور دوستی پر لکھی گئی کہانی تھی۔ آخر میں دانیال اور فرزین کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ دشمن دوست ہمارے معاشرے کے رویّے کی عکاسی کرتی یہ کہانی، اے کاش کوئی ان سے سبق بھی حاصل کرے۔ بیٹیاں تو والدین کا فخر ہوتی ہیں لیکن والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنا رویہ اعتدال پر رکھیں۔ بہت زیادہ سختی اور نرمی دونوں ہی اولاد کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر سلیم رضا اور کاشف رضا کی ملتان سے مشترکہ کاوش ''جاسوسی کے ہم نئے نئے قاری ہیں۔ جنوری 2010ء کو جاسوسی کا پہلا شمارہ ہمارے ہاتھ لگا تو پھر اسی دن سے ہم اس کے دیوانے ہو گئے۔ ماہ اپریل کا شمارہ 7 تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائٹل پر موجود حسینہ فوٹو گرافر سے بے نیاز ایسی لگ رہی تھی کہ جیسے اسے کسی کے آنے کا انتظار ہو۔ محفل میں جعفر حسین کو کرسیِ صدارت مبارک۔ سویرا خان اور ندیم کو ویلکم۔ دلنشین بلوچ کی ادائیں اچھی نہیں ہیں۔ بلوچ صاحب! پلیز مدیر کی ہدایت پر عمل کریں۔ ایس ایس ناز اپنا اصل نام تو بتا دو جبکہ ہمایوں سعید اور سلیم شبلی اور تصویر العین کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں بدخصلت کہانی پسند آئی۔ کافی ایکشن زدہ کہانی تھی۔ کامران جیسے بہادر لوگ پاکستانی ایجنسی میں ہونا چاہئیں۔ گرداب بھی زبردست جا رہی ہے۔ ماسٹر آفتاب اور کشور کو اب یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ شہر یار کو اب چودھری افتخار کے خلاف میدان میں آ جانا چاہیے جبکہ شہر یار کو اب ماہ بانو کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ للکار میں عمران اور اقبال، تابش کو ہیرو بنا رہے ہیں۔ امید کی جا سکتی ہے کہ جلد ہی تابش صاحب اپنے ایکشن میں نظر آئیں گے اور تلاشِ جاناں میں بھی کامیاب رہیں گے۔ دلدار وادی اور دشمن دوست دونوں رنگ کافی پھیکے تھے جبکہ کہانی بدمعاش بہت پسند آئی۔ ہوگارڈ بدمعاش نہیں مسیحا تھا۔ مذاق میں جمال بے چارہ سونیا سے دھوکا کھا بیٹھا۔''

کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار کا ملکہ کوہسار سے پربہار تبصرہ ''ٹائٹل پر موجود دیہاتی حسینہ دل و جان سے پسند آ گئی۔ گنجا فوٹو گرافر بھی سرورق کے رنگوں کے مصنفین کو اچھی چوئیشن فراہم کر رہا تھا تاہم اوپر موجود اور رنج رنگ میں رنگے بھوت نما مرد کی عدم موجودگی ہی بہتر ہوتی۔ فہرست خوب صورت تھی۔ اداریہ بھی متاثر کر گیا۔ جعفر حسین کا تبصرہ واقعی اول نمبر کا حق دار تھا۔ دلنشین بلوچ کی حماقتوں پر انہیں انعامی شیلڈ بھجوانے کا سوچا مگر پتا چلا موصوفہ کی الماری پہلے ہی فل ہو چکی ہے۔ چودھری سسٹرز، ہمارے تبصرے پسند کرنے کا شکریہ مگر اب ہمارے شکریے کے جواب میں پھر شکریہ کہہ کر ہمیں پھر سے شکریہ کہنے پر مجبور مت کیجیے گا۔ تصویر العین، بھئی بڑا نازک دل ہے آپ کا؟ یزدانی جی کی اس تجویز سے ہم متفق ہیں کہ ترجمہ کہانیوں کے اینڈ میں اصل رائٹر کا نام بھی ہونا چاہیے تا کہ ہمیں بھی تو غیر ملکی رائٹرز سے واقفیت ہو۔ ارسلان رضا، اپنے ہمایوں سعید دل پھینک نہ ہوتے تو نام کے ساتھ رومیو لگایا ہوتا؟ گرداب میں سسپنس اپنے عروج پر ہے۔ ایک طرف شہر یار کے اغوا کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے تو دوسری طرف سجاد رانا کی جان کو بھی خطرہ ہے۔ ماہ بانو کو امریکی سے خطرہ درپیش ہے تو کشور کا راز بھی شاید کھلنے والا

ہے۔ غرض ہر کردار حالات کے گرداب میں گرفتار ہے اور ہم گرداب کے گرداب میں گرفتار۔ مداری اور آتش فشاں کے بعد پہلی تحریر ہے جس کا ہمیں اتنی شدت سے انتظار رہتا ہے۔ للکار میں عمران کی کہانی سامنے آنے کے بعد ہی اس کے رویے کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ وگرنہ یوں کون ہر پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاتا ہے۔ بہرحال، موجودہ قسط میں رومانس کی کمی محسوس ہوئی اور ہمیں طاہر صاحب کا لکھا گیا رومانس ہی پسند آتا ہے۔ رنگوں میں خلافِ توقع کاشف زبیر کی دشمن دوست بالکل پسند نہیں آئی۔ وجہ ایک تو مصنف افغانیوں پر پہلے ہی بہت زیادہ لکھ چکے ہیں۔ دوسری وجہ کہانی کا پلاٹ کمزور تھا۔ کچھ کردار خوانخواہ کہانی میں شامل کیے گئے۔ منظر امام کی تحریریں ہم پڑھتے ہی نہیں۔ مختصر تحریروں میں اصل سرمایہ اور بدمعاش میں نہ صرف واقعات دلچسپ تھے بلکہ دونوں ایک اہم پیغام سے بھی مزین تھیں۔ ثمر عباس کی بلا معاوضہ میں بُرے شخص نے بُرے شخص کی مدد سے ایک بُرے شخص کو ختم کرنا چاہا۔ دو بُرے آدمی تو ختم ہو گئے مگر تیسرا رہ گیا، یہ چیز ہمیں پسند نہیں آئی۔ تاہم کہانی میں غیر معمولی کردار، طریقہ کار اور بڑی بڑی رقمیں شامل کر کے رائٹر نے ہمیں متاثر کرنے کی، کوشش کی وہ کافی کامیاب رہی۔ رضوانہ منظر کی موجد بس ٹھیک ہی تھی۔ مُردہ فروش مختلف قسم کی تحریر ثابت ہوئی۔ فکشن ہونے کے باوجود اچھی لگی۔ فوزیہ ظہیر کی معما بھی ایک ہلکی پھلکی دلچسپ تحریر تھی۔ بہرحال، مجموعی طور پر شمارے کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مختصر تحریریں، طویل تحریریں اور سلسلہ وار تحریریں۔ موجودہ شمارہ سلسلہ وار تحریروں اور مختصر تحریروں کے شعبے میں تو کامیاب رہا مگر طویل تحریریں متاثر کرنے میں یکسر ناکام رہیں۔ ہاں، کترنیں اس دفعہ کافی زیادہ اور دلچسپ تھیں۔ شاہد صاحب کے اسکیچز بھی اچھے لگے۔ خاص طور پر گرداب کے ساتھ موجود اسکیچ تو کبھی نہ بھولنے والا تھا۔''

ڈی جی خان سے **روشانے صنم** کی باتیں ''خوب صورت رنگوں سے سجا جاسوسی خلافِ توقع 4 اپریل کو ہی مل گیا۔ مٹھائی ہو جائے انکل! اور تو اور اس دن موسم بھی بہت خوش گوار رہا اور لائٹ بھی نہیں گئی۔ واہ، سبحان اللہ... ایسے خوب صورت دن تو بہت کم میری زندگی میں آتے ہیں...! ٹائٹل اس بار جاسوسی سے ہٹ کر تھا۔ ماڈل، فوٹو جینک چہرے کے ساتھ کافی کیوٹ لگی مگر اداسی بھری آنکھوں میں پانی کسی کے غم کی نشانی بتا رہا تھا اور فوٹو گرافر اس کے دل کی حالت سے بے خبر کسی نئے چہرے کی تلاش میں تھا۔ ہماری محفل میں گولڈن تبصرے کے ساتھ جعفر حسین ٹاپ پر رہے، اچھی بات ہے۔ دلنشین کے تبصرے انہی کی طرح ''طرح دار'' ہوتے ہیں۔ رومیو جی! آپ کے پاس دماغ ''بھی'' ہے؟ پہلے کیوں نہیں بتایا بے ایمان آدمی...! ارسلان رضا! مجھے آپ کو بلیک لسٹ میں دیکھنے کی شدید خواہش ہے۔ آمنہ پٹھانی! آپ کو میرا تبصرہ لاجواب لگا۔ زندہ باد... باقی سب نئے اور پرانے دوستوں کے لیے میری نیک تمنائیں...! کہانیوں میں فرسٹ آف آل بات ہو جائے للکار کی۔ اس شاہکار کو پڑھتے ہوئے مجال ہے میرا دھیان اِدھر اُدھر بھٹکے۔ یہ قسط تیز رفتار اور ہنگامہ خیز رہی۔ تابش سے درخواست ہے کہ وہ میٹھو سراج کو نہ چھوڑے پلیز! بدخصلت میں ہمارے ہمسایہ ملک کی زور زبردستی، ڈھٹائی، کمینہ پن اور شیطانیت بیان کی گئی ہے۔ ایک مثال ہے کہ ''اگر انڈیا میں کوئی کیلے کے چھلکے سے بھی پھسل جائے تو الزام پاکستان پر آتا ہے۔'' کامران کے عزم اور ہمت کو داد دینا پڑے گی۔ انڈیا میں ہوتے ہوئے ان کی بدخصلتوں کا مقابلہ کر کے خیریت سے واپس لوٹنا میرے لیے کسی نئی زندگی سے کم نہیں۔ ویل ڈن کامی جی! سرورق رنگوں میں کاشف زبیر جو کہ نام ہی گارنٹی ہے، دشمن دوست کے پرانے موضوع کے ساتھ حاضر ہوئے۔ کہانی اچھی تھی۔ میرے خیال میں اکبر خان جیسا دشمن دوست باپ کسی کا نہ ہو۔ ویسے کاشف صاحب ہر بار پشاور سے تعلق رکھنے والوں پر کہانیاں کیوں لکھتے ہیں؟ کوئی خاص وجہ ہے کیا؟ چھوٹی کہانیوں میں معما میری پسندیدہ کہانی رہی۔ چارلس ایک بھوت ہونے کے باوجود مجھے بہت پسند آیا اور اینا کے ساتھ مل کر ایمرے اور لوئس کو بے نقاب کر کے ہمارا دل جیت لیا۔ مگر اسٹوری آف دی منتھ بدمعاش رہی۔ بے شک ہوگارڈ جیسے لوگوں کی وجہ سے تو یہ دنیا قائم ہے۔ چاہے وہ دوسروں کی نظر میں اچھے ہوں یا بُرے...! میری طرف سے سام ہوگارڈ کو ایک گرینڈ سیلیوٹ! بلا معاوضہ میں پیٹس شولڈر نے پاپا جیسے آدمی کو ڈبل کراس کرنے کی کوشش کی مگر افسوس، قسمت نے ساتھ نہ دیا اور اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ نمبر پلیٹ میں، میں ''میری'' کو معصوم سمجھتی رہی مگر وہی ظالم قاتلہ نکلی۔ یہی تو ہمارے جاسوسی کی خاصیت اور انفرادیت ہے کہ جو ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے اسے ہم اینڈ تک نہیں سمجھ پاتے، تھینکس جاسوسی! موجد یوں تو انگریزی ترجمہ شدہ تھی مگر اس میں جھلک احمد اقبال کی کہانیوں جیسی تھی۔ سو سویٹ نا! اور مُردہ فروش رات کا ایک بج رہا تھا جب میں نے ختم کی۔ خوفناک موضوع پر لکھی گئی کہانی تھوڑا بہت اپنا امیج قائم کر سکی۔ ویسے پتا ہے آپ کو جاسوسی ڈائجسٹ کی جان اور دل یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور للکار ہے۔''

سرگودھا سے **زینب سمیع** کی پسندیدگی ''اپریل کا شمارہ خلافِ توقع 2 تاریخ کو ملا۔ اس ماہ کا ٹائٹل بہتر تھا۔ چینی، نکتہ چینی کی محفل میں بھی تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ قسط بھی بہت اچھی تھی۔ اسما آپی نہایت مہارت سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں جو کہ ان کا خاصہ ہے۔ اس کے بعد للکار پڑھی جو کہ بہت اچھی لگی۔ مغل انکل بالکل اپنے اسٹائل پر جا رہے ہیں اور بہت ہی اچھا لکھ رہے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر مشتمل بدخصلت کا دوسرا اور آخری حصہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ رنگوں میں پہلا رنگ دلدار وادی پڑھا جو کہ اپنے اچھوتے موضوع کی بدولت زبردست تھا لیکن اختتام خاصا افسردہ کر گیا۔ دوسرا رنگ دشمن دوست بھی بازی لے گیا۔ مریم کے خان نے مُردہ فروش جیسی کہانی لکھ کر رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اس کے علاوہ نمبر پلیٹ نہایت شان دار کہانی تھی۔ باقی مختصر کہانیاں بلا معاوضہ، اصل سرمایہ، معما، موجد اور بدمعاش بے حد دلچسپ اور متاثر کن تحاریر تھیں۔''

محمد فیاض ملک کی مختصر شمولیت میانوالی سے ''کافی عرصے سے جاسوسی ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں لیکن لکھنے کی جسارت پہلی دفعہ کر رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے (یقیناً)۔ میری جاب ایسی ہے کہ ملکی حالات کے پیشِ نظر مصروفیت کچھ زیادہ ہے۔ اس لیے جلدی جلدی لکھ رہا ہوں۔ اگر آپ نے موقع دیا تو آئندہ بھی حاضر ہوتا رہوں گا۔ تمام ساتھیوں کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں اور انہی تبصروں نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ اگلی دفعہ انشاء اللہ تمام ساتھیوں کی میٹھی میٹھی تنقید میں بھی شامل ہونے کی کوشش کروں گا۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر... گرداب جس کا آغاز بور قسم کا تھا لیکن اسما صاحبہ کو داد دینی پڑے گی کہ اس کہانی میں آغاز کے مقابلے میں بہت زیادہ تیزی آئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغل انکل کی للکار ایک اچھی اور تیز رفتار کہانی ہے۔ امید ہے تابش بہت جلد اصل ہیرو کے روپ میں نظر آئے گا۔ بدخصلت ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور کہانی تھی جس میں آخری لمحات میں جینی کی قربانی نے بہت متاثر کیا۔''

ملتان سے **غزالہ وقار** کا تبصرہ ''اپریل کا جاسوسی حسبِ معمول چار پانچ تاریخ کو ملا۔ رنگوں سے سجا چمک دار اور ملائم سرورق بہت اچھا لگا۔ سرورق کی

دوشیزہ بہت حسین مگر بعد میں آخری رنگوں کی ہیروئنز کے مقابلے میں عمر کی کچھ زیادہ لگی مگر حسنِ پُرسوز نے زیادہ تردد نہیں کرنے دیا۔ اشتہاروں کو سرسری سا دیکھتے ہوئے فہرست کو پڑھتے ہوئے، نکتہ بینوں کی محفل میں پہنچے۔ آپ کا مختصر پُرورداداریہ پڑھا۔ جعفر حسین کی تعریف و توصیف آپ کو اتنی بھائی کہ سب سے پہلے انہی کے نام کے درشن ہوئے۔ ٹھیک ہے بھئی، آپ بہتر سمجھتے ہیں۔ ایم اے عاصی اور اس سے پہلے بھی کچھ کولمبو وغیرہ تھا، کا تبصرہ تو ٹھیک تھا مگر نام کی طوالت سمجھ سے باہر تھی۔ آمنہ پٹھانی کا نام پڑھ کر تبصرہ پڑھا مگر نام کی ہیبت کے برعکس تبصرہ بہت نرم اور پیارا تھا۔ دلنشیں صاحبہ کا احتجاج کافی چٹخارے دار یعنی وہی بھلے چاٹ اور گول گپے والا تھا۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے اور اچھے نہ ہوتے تو اتنے قیمتی صفحات پر جگہ کیسے پاتے؟ اب چلتے ہیں اس محفل کی وجۂ رونق یعنی کہانیوں کی طرف۔ سلیم فاروقی کی بدخصلت دوسرے حصے کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ کامران صاحب کے سفرنامے نے ایک بار پھر ان حقائق کی طرف ہماری توجہ دلائی جن سے ہم نظریں چراتے ہوئے امن کی آشا کی باتیں کرتے ہیں۔ مکمل امن اور بہتر تعلقات تب ہی بن سکتے ہیں جب فریقِ ثانی بھی اپنی خصلتوں کو بدل کر من سے منافقت نکال کر ہاتھ ملائے۔ اس کے بعد اپنے پسندیدہ مصنف طاہر جاوید مغل کی للکار پر رکے۔ ہم شاید اپنے گرد و پیش کے ماحول سے اتنے دل برداشتہ ہیں کہ اپنے ہیروز کو ٹھاہ ٹھاہ کر کے سب کچھ ٹھیک کرتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ خیر سے لگے رہو طاہر بھائی۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ جاسوسی جب سے میرے زیرِ مطالعہ ہے میں نے کسی خاتون کی سلسلے وار کہانی شاید پہلی بار پڑھی ہے۔ اسما قادری کی گرداب مضبوط گرفت اور زبردست گراؤنڈ میں کسی مرد لکھاری سے کم نہیں۔ کشور اور آفتاب کا کپل شاندار ہے مگر خدارا ان کا اینڈ بُرا مت کیجیے گا۔ آخری دونوں رنگوں میں ہیروئنز کے حالات میں کافی مماثلت تھی۔ دونوں کم عمر، دونوں پٹھان، دونوں حد درجہ خوب صورت، دونوں گھر سے دربدر اور دونوں کا ملک دشمن عناصر کے ہتھے چڑھنا۔ منظر امام کی دلدار وادی کچھ زیادہ ہی سیدھی سیدھی کہانی تھی جس کا اینڈ بھی بہت سادہ سا تھا۔ دشمن دوست میں زندگی کی چند تلخ حقیقتیں تھیں جن کا سدِباب شاید کبھی نہ ہو سکے... کہ اکبر خان جیسے مرد ہمارے معاشرے میں ہر جگہ ہیں۔ دیگر کہانیاں عام روایتی مغربی کہانیاں تھیں جن میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے، دوسروں کے لیے بے حسی اور بربریت۔ پھر وہ چاہے مُردہ چرانے والا ''اسٹارک'' ہو یا خریدنے والا ''ولبرٹ'' اجرتی قاتل ''پاپا'' ہو یا اس سے مستفید ہونے والا ''پیٹس'' ہو... ''مسٹر چانس'' کی بیوی ہو یا اس کا باس ''ایمرے'' سب کے سب سفاکیت میں اپنی مثال آپ... مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ بے حسیاں، یہ سفاکیاں آہستہ آہستہ ہمارے معاشرے میں بھی سرایت کرتی جا رہی ہیں۔''

آمنہ پٹھانی، فتح پور لیہ سے حاضر ہیں ''اپریل کا دیدہ زیب، ہنستا، مسکراتا شمارہ بروقت دستیاب ہونے سے انتہائی مسرت ہوئی۔ سرورق پر نظر دوڑائی تو صراحی دار گردن، جھیل سی گہری نیلگوں آنکھیں، خوب صورت ترشے ہوئے لب والی ٹائٹل گرل بہت پیاری لگی، اپنی طرح، ویلڈن ذاکر انکل۔ محفلِ خطوط میں جعفر حسین اول انعام کے حق دار ٹھہرے، بھئی مبارکباد۔ ہاں، یہ ضرور بتا دیں کہ کبھی تو آپ بھوانہ سے وارد ہوتے ہیں اور کبھی چنیوٹ سے؟ اعجاز احمد ساہیوال! مان لیا کہ تخلیقِ کائنات میں پہلا نمبر مردوں کا ہے لیکن یہ بھی ذہن میں رکھو کہ یہ تقسیم خالقِ کائنات کی ہے، اس پر اتنا اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمایوں سعید رومیو! کتنے کم ظرف ہو کہ آسیہ خان کی تعریف میں آپ کو طنز کا پہلو نظر آ گیا۔ محمد سلیم شبلی! اگر چار جماعتیں پڑھ لیتے تو جناب کو بہ خوبی علم ہوتا کہ تعلیمی شیڈول میں مصروف ہونا کسے کہتے ہیں۔ ایس ایس ناز! میں تو ایف ایس سی کر رہی ہوں اور آپ ذرا یہ بتائیں کہ شبلی صاحب کا اتنے میٹھے انداز میں شکریہ اور عبدالسلام صدیقی کی تنقید سے گھبراہٹ، جاناں تم نے تو ہمارا نام ڈبو دیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ موجودہ قسط میں بھی عمران ہی ہیرو نظر آیا جبکہ تابش بزدل سا بنا پس منظر میں رہا۔ اب جبکہ میڈم صفورا کا ٹکراؤ ان سر پھروں سے ہو گیا ہے تو امید ہے کہانی میں اور خوب صورتی پیدا ہو گی۔ گرداب کی موجودہ قسط سابقہ تمام قسطوں سے اچھی لگی۔ منظر امام سرورق کا پہلا رنگ دلدار وادی لے کر آئے۔ کہانی کا عنوان بہت رومانٹک لگا۔ فرزین کا کردار بھی بہت اچھا لگا لیکن اختتام رلا دینے والا تھا۔ تخریبی کارروائیوں کو آشکارا کرتی کاشف زبیر کی دشمن دوست لاجواب تحریر ثابت ہوئی۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں مُردہ فروش اور بدمعاش اچھی کاوشیں تھیں۔''

اعجاز احمد کی ساہیوال سے تعریف و توصیف ''ماہِ اپریل کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق پر سب سے پہلے اک مکروہ صورت والے مرد پر نظر پڑی۔ اس کے بالکل نیچے ایک چڑ گنجو شاید مووی بنا رہا تھا۔ ساتھ ہی خوب صورت جیولری سے آراستہ اک ماہ جبیں مہتابی چہرہ، نرم و گداز سرخ لب، گھنیری سیاہ زلفیں... شاید کسی کے خیالوں میں گم تھی جس کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوب کر اپنی محفل میں جا نکلے۔ اس دفعہ نمبر ون پر رہے جعفر حسین فرام چنیوٹ، مبارک ہو بھائی صاحب۔ محمد سلیم شبلی اینڈ جعفر حسین تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آمنہ پٹھانی بڑی مہربانی۔ چوہدری سسٹرز ہماری صنف سے اتنی بغاوت، خیر تو ہے؟ دلنشیں صاحب نے پورے ملتان کی سیر کرا دی اور ہاں، کبیر عباسی، عتیق الرحمٰن اینڈ قاری عبدالماجد، آپ نے جاسوسی پڑھنا چھوڑ دیا؟ ماسٹر اعجاز احمد فرام 98/D آپ بھی اب تبصرہ بھیجا کریں۔ خلافِ معمول بدخصلت پڑھی۔ کامران کا کردار پسند آیا، جینی کی موت افسردہ کر گئی۔ نوشین کو اپنا پیار مل گیا۔ سلیم فاروقی کی اچھی کاوش تھی۔ مغل صاحب کی للکار پڑھی۔ اس میں اب آہستہ آہستہ نکھار آ رہا ہے۔ چھوٹی میڈم پر لگتا ہے سب گندل کا تجربہ کیا گیا ہے، مغل صاحب یو آر گریٹ۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ اسما قادری بے شک ذمے داری سے لکھتی ہیں۔ کہانی رفتار پکڑتی جا رہی ہے۔ غیر ملکی گورے کا ماہ بانو کی تصویر کھینچنا اور چودھری کا اچانک امریکا کی تیاری، خاص بات لگتی ہے۔ رانی کے بارے میں اگلی قسط میں پڑھیں گے۔ پہلا رنگ دلدار وادی پڑھا۔ بے شک وہ وادی ایسی ہی تھی مگر فرزین کے حسن نے وہاں نہ رہنے دیا۔ شہر میں آ کر اس نے اپنی محبت کو بھی پا لیا۔ آخر میں دانیال اور اس کی موت افسردہ کر گئی۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر نے لکھا۔ اکبر خان اپنی فطرت کے مطابق عورت کو پاؤں کی جوتی ہی سمجھتا رہا لیکن جذبے اپنا راستہ خود بناتے ہیں۔ آخر میں اس کے دل میں بھی باپ کی محبت جاگ گئی۔ اس نے جان دے کر اپنے ملک اور بیٹی کے دشمنوں کا خاتمہ کر دیا۔ مختصر کہانیوں میں ثمر عباس کی بلامعاوضہ پڑھی۔ پاپا بلاشبہ خود اعتماد آدمی تھا، پیٹس کی چالاکی اس کی زندگی بھی لے گئی۔ بدمعاش میں ایک باضمیر بدمعاش سے ملاقات ہوئی۔ نمبر پلیٹ میں روجر نے اپنی ذہانت سے قاتل کو تلاش کیا۔ مریم کے خان کی مُردہ فروش اچھی تحریر تھی۔ سلیم انور کی کہانی مذاق میں سونیا نے ثابت کر دیا کہ حسن اور وفا کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ اصل سرمایہ اور معما اچھی کہانیاں تھیں۔ مجموعی طور پر شمارہ پسند آیا۔''

ٹریل ایس کے اسماعیل کی دستک خیبر ایجنسی شاہ کس سے ''چار تاریخ کو ڈائجسٹ پوری آب و تاب کے ساتھ ملا۔ انکل! اس ڈائجسٹ کی کوئی ایک تاریخ مقرر کر لیں۔ یہ کبھی سات، کبھی چھ اور کبھی تین تاریخ پر ملتا ہے۔ ہم روز روز تو دور دیہات، گاؤں سے شہر نہیں آ سکتے ڈائجسٹ حاصل کرنے کے لیے۔ سرورق پر

ایک حسینہ موجود تھی جس کے کان اور گلے میں چار کلو نقلی زیور آویزاں تھا اور سر کو تھوڑا سا خم کر کے کسی چیز کو دیکھ رہی تھی۔ رنگت سرخ اور بالکل صاف تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں بھی متوجہ کرنے والی تھیں۔ نزدیک ہی ایک گنجا تصویر لے رہا تھا۔ جعفر حسین مبارک ہو جی۔ سیاست سے دور رہو۔ کولمبو اردو لوجی، ہم واپس آ گئے پھر سے۔ سائرہ! آپ کو ڈائجسٹ شاید کچھ زیادہ ہی لیٹ ملا ہے لیکن دیکھو آپ کا تبصرہ دوسرے صفحے پر ہے۔ ہمایوں! ارے آپ کو خوشی نہیں ہو گی، آپ کو جیلسی ہو گی اس کے پہلے نمبر پر آنے پر۔ سویرا اینڈ ندیم! اپنا تعارف تو کراتے جاؤ تا کہ ہمیں بھی تو پتا چلے کہ دونوں کس رشتے میں بندھے ہو۔ دلنشیں! اپنا نام جام شیریں رکھ لو پھر زیادہ میٹھا ہو گا نام۔ محمد سلیم! میں بتاتا ہوں جی۔ آمنہ پٹھانی میٹرک کا امتحان تیسری مرتبہ دے رہی ہیں، فیل ہونے کی وجہ سے۔ گرداب میں را ایجنسی نے دوسرا دھماکا بھی کر دیا۔ سجاد نے کچھ تو ان کا معلوم کیا تھا مگر را والے اور بھی چالاک نکلے۔ ادھر ماہ بانو کی تصویریں جو انگریز نے اتار لیں، شاید چودھری کو امریکا میں مل جائیں کیونکہ وہ امریکا جا رہا ہے۔ للکار میں تابش کی جگہ عمران کو ہونا چاہیے۔ عمران نے قادرے، فیاض کو ان کی بہن اور امی سے ملا کر ظالموں کے ہاتھوں سے آزاد کیا۔''

ایم احمد ہاشمی، ڈسٹرکٹ بونیر سے لکھتے ہیں ''زمانے کی سختیاں اور غمِ دوراں انسان کو کبھی خوش حال نہیں دیکھ سکتے اور پھر جاسوسی کا بھی دیر سے ملنا ہو تو ٹینشن اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اپریل کا شمارہ خلافِ توقع 4 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر کیا تبصرہ کروں۔ حسینہ کی کشادہ پیشانی، چہرے کی رنگت میں گلاب کی ناکام سی آمیزش، بال سنہری، ہونٹوں میں ایک نیم وا غنچے کی تازگی اور لطافت تو تھی مگر پھر بھی حسینہ قبول صورت نہ تھی۔ پیچھے ایک گنجا فوٹوگرافر پوز دے رہا تھا۔ اوپر ایک بڑے میاں نے اپنے پیلے دانت نکالے ببر شیر کا حلیہ بنا رکھا تھا جیسے ابھی کسی جنگل سے وارد ہوا ہو۔ جعفر حسین صاحب! وزارت کے بعد صدارت کی پیشگی مبارکباد۔ پٹھانی بی بی لگتا ہے تمہاری زبان 440 وولٹ کرنٹ کے ذریعے چل رہی ہے ورنہ دلنشیں بلوچ تو تم سے زیادہ تربیلا ڈیم کے قریب ہے۔ ہمایوں سعید یار! پٹھان اب اتنے گئے گزرے تو نہیں کہ آپ چوکیداری کے فرائض سونپ دیں۔ آسیہ خان بھی پتا نہیں کس جنگل سے تشریف لائی ہیں۔ صنفِ مخالف پر تنقید یا مذاق اڑانا اپنا شیوہ نہ بناؤ۔ عصمت علی محفل میں کش لگانے سے پرہیز کرو۔ انعام علی مہمند صاحب! یار دل چھوٹا نہ کرو۔ باقاعدگی سے زبردست خط لکھا کرو۔ ہم بھی تو بہت دور سے ہیں۔ سلیم فاروقی کی بدخصلت ایک عمدہ تحریر تھی۔ للکار میں عمران کا کردار بہت ہی فنٹاسٹک ہے۔ نڈر، بے باک، ایمان دار، ہر ایک کے لیے نجات دہندہ۔ بالآخر تابش نے عمران کی رفاقت میں مار دھاڑ کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ آخر میں عمران کی گم شدگی اور تشدد نے افسردہ کر دیا۔ منظر امام کا پہلا رنگ پڑھ کر بے ساختہ لبوں سے نکلا۔ آہ بے چاری فرزین! تیکھے نقوش تمہارے لیے عذاب بن گئے۔ کاشف زبیر کا دوسرا رنگ معصوم مینا کے گرد گھومتی کہانی مزہ دے گئی۔ والد کی نفرت اور بربریت نے بے چاری کو در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا۔ آخر میں دہشت گردوں کے گھناؤنے روپ بھی بے نقاب ہوئے۔ اللہ ہمارے وطن کو امن کا گہوارہ بنا دے۔''

واہ کینٹ سے **ایم اے صدیقی** کی پُرمغز باتیں ''اپریل فول کو ہمیں دیدارِ جاسوسی نصیب ہوا۔ حسبِ سابقہ اور حسبِ ذائقہ بھرپور کہانیوں سے مزین اور دلکش ماہ جبیں سے جگمگا رہا تھا۔ طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے لڑکی اس بدنصیب انسان کے بارے میں سوچ رہی تھی جو کہ کیمرے میں حسن کو مقید کرنا چاہتا تھا مگر ایسا ہونا تو دل کے ارماں آنسوؤں میں بہانے کے مترادف ہے۔ جعفر حسین صاحب خوب صورت تبصرے کے ساتھ وکٹری اسٹینڈ پر موجود تھے۔ مبارکباد نہ دینا موصوف کی حق تلفی ہو گی اور ہم ایسا کر کے گناہ گار ہونا نہیں چاہتے، سو وڈیاں وڈیاں مبارکاں...! سائرہ صاحبہ! مایوسی گناہ ہے، اگر مایوسی آپ کی فطرتِ ثانیہ ہے تو دوسروں کو الزام کیوں...؟ آمنہ صاحبہ! سات لائنیں تو پرائمری پاس بچہ بھی لکھ لیتا ہے۔ اگر آپ کے پاس ذخیرہ الفاظ کم ہیں تو برائے مہربانی اتنی زحمت بھی نہ کیا کریں۔ ارسلان صاحب! اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے۔ اگر آپ باہمت ہیں تو دشمن (انڈیا) کو للکاریں اور اپنے اسلاف کی یاد تازہ کر دیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ دلنشیں صاحبہ! گول گپوں سے پرہیز کیا کریں۔ آپ پہلے ہی گول گپا ہیں اوپر سے مزید گول گپے... ایسا نہ ہو گھر والے پہچاننے سے بھی انکار کر دیں۔ شاہ صاحب! اہلِ جاسوسی کے چاہنے سے تو اسلحہ کلچر ختم نہیں ہو گا۔ جب تک عوام بالخصوص حکومت عزمِ نو نہ کرے، اسلحہ کلچر ختم نہیں ہو گا۔ تصویر العین کا تصویری تبصرہ مگر تصویر کہاں ہے؟ کہیں محترمہ بھوت چڑیل تو نہیں جو تصویر غائب ہو گئی؟ (تصویر العین... بھرپور جاسوسی اسکیچ سے مزین خط لکھتی ہیں) چودھری سسٹرز کے صنف خوامخواہ سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ کہانیوں کی ابتدا شہنشاہِ جذبات للکار سے کی۔ عمران کی چستی اور حاضر دماغی نے بہت متاثر کیا۔ تابش آہستہ آہستہ عمران کے ٹریک پر آ رہا ہے اور آنے والے دنوں میں دشمنوں کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو گا۔ اسما قادری کی گرداب مزید ابر آلود ہوتی جا رہی ہے۔ چودھری کا جو گھناؤنا روپ سامنے آیا، اس نے تو شیطان کو بھی شرما ڈالا۔ ایسے بے غیرت انسانوں کو جو مقدس رشتوں کی عظمت کی داغداری کا سبب بنے، زندہ درگور کر دینا چاہیے۔ کتوں کے آگے ڈال دینا چاہیے۔ کشور اور آفتاب کی محبت کا راز عنقریب فاش ہونے والا ہے۔ سلیم فاروقی کی تحریر بدخصلت کا اینڈ زبردست تھا۔ کامران نے انڈیا کی ایجنسیوں کو بہترین حکمتِ عملی سے شکستِ فاش دی۔ جینی کی قربانی عظیم تھی۔ مقدر کا ستارہ کامران اور نوشین کے ملاپ کے لیے طلوع ہو چکا تھا۔ نمبر پلیٹ انتقام کی اندھی خواہشات کی اسٹوری تھی۔ کیرل نے جذبات کا شکار ہو کر قتل کیے اور یہ اس کی بے وقوفی تھی۔ موجد ایک ذہین انسان کی داستان تھی۔ کلیروٹ نے اپنی ذہانت کو منفی کاموں میں استعمال کیا، دوسروں کے لیے موت کا سامان کرتے ہوئے خود ہی اس کا شکار ہو گیا۔ ایسے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ مریم کے خان مُردوں کے ساتھ حاضرِ خدمت تھیں۔ ڈاکٹر ولکوکس کا تجربہ حیران کن تھا۔ میریا کا زندہ ہونا ناقابلِ یقین ہے۔ ولبرٹ بدخصلت انسان تھا جو کہ لاشوں سے اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کرتا تھا۔ اسٹارک اینڈ کمپنی نے ولبرٹ کا صحیح علاج کیا۔ بدمعاش نیکی و بدی کی داستان تھی۔ ایرکسن شہرت پسند انسان تھا۔ اس سے اچھا تو ہوگارڈ تھا جس نے اپنا سب کچھ کالج کے لیے وقف کر دیا۔ پروفیسر ڈینس کی محنت نے آخرکار اسے کامیاب کر ڈالا۔ بلامعاوضہ اور معما بھی خوب صورت کہانیاں تھیں۔ مذاق ایک بے وقوف عاشق کی اسٹوری تھی۔ سونیا نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے جمال کو بے وقوف بنایا۔ جمال اتنا بڑا گاؤدی تھا جو سونیا کی چالاکیوں کو سمجھ نہ سکا۔ پہلا رنگ دلدار وادی خوب صورت تحریر تھی۔ فرزین ایک معصوم تتلی تھی۔ فیاض کا انجام تو اس سے بھی بدتر ہونا چاہیے تھا۔ آخری رنگ دشمن دوست بے ضمیر اور ایمان فروشوں کی داستان تھی۔ اکبر خان نے شازمین کو مار کر اچھا کیا۔ بے وفا لوگوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ اکبر خان کے آخری فیصلے نے اس کے گناہوں کا ازالہ کر دیا۔ ماڈل نہ بننا مینا کا احسن فیصلہ تھا۔''

نومی کی خواہش بہاولپور سے ”معجزاتی طور پر اس بار ڈائجسٹ جلد مل گیا۔ گاندھی ٹائپ بندہ شاید حسینہ سرورق کی تصویر لینا چاہ رہا تھا۔ موصوفہ نے عقب میں موجود جن ٹائپ بندے سے ڈر کے منہ پھیر لیا۔ جعفر حسین صاحب کو دلی مبارکباد۔ کولمبو صاحب اتنا طویل نام... اف! پڑھتے ہوئے زبان ہی اٹک گئی۔ سائرہ آپی! زیادہ تیز بھی نہ دوڑیں، کہیں سر کے بل... ٹھاہ۔ آمنہ پٹھانی! لگتا ہے آپ کا حافظہ تھوڑا کمزور ہے جو گرداب کو کرداروں کی بنیاد پر بور کہہ دیا۔ لو، اعجاز بھائی! آپ نے یاد کیا اور ہم آگئے۔ رومیو صاحب بڑے ناشکرے ہو یار۔ ارسلان صاحب مبارک ہو، آپ جوان ہو گئے؟ دلنشیں صاحبہ اداؤں والی وارننگ پر غور کیجیے گا۔ آسیہ خان، تصور العین صاحبہ کا مشورہ غور طلب ہے۔ لو، عابد جان کے لیے چودھری سسٹرز کی طرف سے ایک اور نام... خیر ڈونٹ وری عابد بھائی! دنیا اچھے لوگوں سے ہمیشہ جلتی ہے۔ بدخصلت اچھی رہی جینی کی موت کا افسوس ہوا، پر کامران اور نوشین کے ملنے کی سلیم شبلی کی خواہش پوری ہو گئی۔ گرداب اس بار کچھ سلوموشن میں رہی، لیکن اختتامی لمحات کافی سنسنی خیز تھے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ للکار میں کافی تیزی اور تھرل رہا، ویلڈن مغل صاحب۔ نمبر پلیٹ سادہ سی... دلچسپ تحریر تھی۔ موجد فضول سی ہی تھی۔ دلدار وادی میں منظر کشی بہت خوب صورت کی گئی۔ دشمن دوست کو خوامخواہ طول دیا گیا۔ کاشف زبیر صاحب! شامی اور تیمور کا کوئی نیا کارنامہ لے آئیں پلیز...“

شیخ محمد سجاد شانی کی شمولیت آزاد کشمیر سے ”ماہ اپریل کا شمارہ بک اسٹال کے کئی چکر لگانے کے بعد ملا۔ ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا جس پر تبصرہ کر سکوں۔ محفلِ یاراں میں کرسیِ صدارت پر جعفر حسین صاحب کو طویل تحریر کے ساتھ براجمان پایا۔ مبارکاں کرسیِ صدارت کے لیے اور ہم شکرگزار ہیں انکل کہ آپ نے ہماری تحریر کو بزم کے قابل سمجھا۔ یہ عصمت علی کش لگانے کے سوا بھی کوئی کام کرتے ہیں کیا؟ کش لگائیے مگر ہلکا سا، ایسا نہ ہو جناب کی صحت کے لیے مضر ثابت ہو۔ کہانیوں میں بدخصلت سے آغاز کیا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسٹوری پڑھ ڈالی۔ ہمارے اس شوق سے دوست بہت چڑتے ہیں۔ کامران میاں کے کارنامے ہماری سرشاری کے لیے کافی تھے۔ سلیم فاروقی صاحب کو اتنی اچھی تحریر لکھنے پر مبارک۔ موجد رضوانہ منظر کی مختصر مگر دلچسپ سی تحریر تھی۔ مریم کے خان کی مردہ فروشی نے بھی بہت متاثر کیا۔ للکار کا آغاز کیا مگر لمحوں میں اختتام ہو گیا اور پھر ایک ماہ کا طویل انتظار... آخر اونٹ آیا پہاڑ کے نیچے۔ عمران میاں آخر دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ لگتا تو ہے کہ یہاں بھی کوئی چالاکی دکھا ہی دیں گے مگر ساتھ تابش میاں کی پوزیشن ذرا کمزور ہے۔ میڈم نادیہ ابھی تو ان پر مہربان لگتی ہے مگر شاید کچھ لمحوں کے لیے لیکن وہ پھر بھی میڈم کی مخمور نگاہوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں آگے ہوتا ہے کیا؟ بدمعاش اتنی جان دار تحریر تھی کہ آصف ملک کو داد نہ دینا کنجوسی ہوگی۔ ہوگارڈ واقعی ایک اچھا انسان تھا جس نے وہ کر دکھایا جو کوئی تعلیم یافتہ اور اچھا انسان کہلوانے والا نہ کر سکا۔ چونکہ وہ سب شہرت کے طالب تھے اور ہوگارڈ کو شہرت سے سروکار نہ تھا۔ گرداب اب نئے موڑ پر پہنچ گئی ہے۔ شہریار کی جان کو اب زیادہ خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ کشور نے اپنے باپ سے بغاوت کر کے انتہائی دلیری کا ثبوت دیا اور ایسی ہی ہمت اور حوصلہ انہیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے درکار ہوگا۔ کشور اور آفتاب کا ملن قابلِ دید تھا۔ بڑا عجیب زمانہ ہے بابا کہ دلہن کو سب کچھ خود کرنا پڑا۔ ویسے میاں بیوی کے ملن پر پابندی عجیب زمانہ ہے۔ مذاق اچھی کہانی تھی۔ جمال میاں کو بڑی خوب صورتی سے بے وقوف بنایا۔ دل پھینک مردوں کو عورتیں بہت جلد الو بناتی ہیں، یعنی قربانی کا بکرا۔ معما کچھ خاص تحریر نہ تھی۔ رنگوں میں دلدار وادی بہت شان دار تحریر تھی مگر رشتوں سے عاری۔ فرزین بڑی مشکل سے اپنی منزل پانے میں کامیاب ہوئی تھی مگر کیا کیجیے، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ فرزین اور دانیال کا انجام ہمیں بہت رنجیدہ کر گیا۔ دشمن دوست بالکل آج کے پاکستان سے وابستہ ہے۔ اکبر خان جاتے جاتے اپنی بیٹی کو زندگی کی نوید دے گیا۔“

اے ڈبلیو عامر کی کوشش کلر سیداں سے ”پہلی مرتبہ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے قلم اٹھا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے اور مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ اس مرتبہ جاسوسی 3 اپریل کو ہی اسٹال سے مل گیا۔ سب سے پہلے محفل اکھاڑ پچھاڑ میں پہنچے۔ کرسیِ صدارت پر جعفر حسین براجمان تھے۔ جعفر صاحب مبارکباد۔ اس خوب صورت محفل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہانیوں میں جا پہنچے۔ سب سے پہلے بدخصلت کا دوسرا اور آخری حصہ پڑھا۔ سلیم فاروقی نہایت خوب صورت انداز سے ہندو کا گھناؤنا چہرہ بے نقاب کر رہے تھے۔ سلیم فاروقی زبردست رائٹر ہیں مگر ہمیشہ ان کی کہانی میں ہیرو اپنے منہ میاں مٹھو بنا ہوتا ہے۔ بھئی ہیرو کے بجائے خود اس کے کارنامے لکھ دیا کریں۔ اس کے بعد للکار تک پہنچے۔ مغل صاحب نے ہیرو کو بزدل جبکہ سائیڈ ہیرو (عمران) کو بہادر بنا کر رکھ دیا ہے اور عمران کو اس قسط میں میڈم نادیہ کے ہاتھوں پھنسا دیا ہے۔ اب پتا نہیں تابش اس کو وہاں سے کیسے نکالے گا؟ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ اس کہانی میں اسما قادری نے کہانی کو بہت سے رخ دے دیے ہیں۔ اب کہانی واقعی گرداب میں پھنس چکی ہے۔ سرورق کے رنگوں کی طرف رخ کیا۔ پہلا رنگ دلدار وادی کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکا، اس کہانی میں کئی جھول تھے اور اس کا اینڈ بھی کچھ عجیب تھا، البتہ دوسرا رنگ ٹاپ پر رہا۔“

آسیہ خان کی وضاحتیں پشاور سے ”اس دفعہ جاسوسی 3 کو ہی مل گیا۔ محفل میں بہت سے دوستوں سے اپنا ذکر سن کے خوشی ہوئی۔ ہمایوں سعید! آئی ایم سوری، میرا مطلب آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ میں نے سچے دل سے تعریف کی تھی۔ آمنہ جی! اگر آپ پٹھانی نہیں تو اپنے نام کے ساتھ پٹھانی کیوں لکھتی ہو؟ اداس صاحب! اگر مجھے صرف رومیو اور آمنہ کے تبصرے اچھے لگتے ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟ جعفر اور رضا صاحب! کیا آپ دونوں کا تعلق پولیس سے ہے جو شکوک فوبیا میں مبتلا ہو۔ تصور العین جی! اگر ہر انسان کی علیحدہ پسند ہوتی ہے تو آپ کو گرداب کے تبصرے پر دکھی ہونے کے بجائے مجھے خوش آمدید کہنا چاہیے تھا۔ نومی اے! اگر میں رومیو کے بجائے آپ کی تعریف کرتی تو کیا تب بھی آپ کے یہی ارشادات ہوتے؟ سب سے پہلے للکار پڑھی جس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ کاشف زبیر کی دشمن دوست میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ہم پاکستانی چند ڈالرز کے عوض اپنے ہی پاکستانی بھائیوں اور بہنوں کی زندگی کا سودا کرتے ہیں۔ کاش! ہم سب اپنی خودی کو ایک بار پھر اتنا بلند کر لیں جتنا قیام پاکستان کے دوران کیا تھا۔ دلدار وادی کچھ خاص پسند نہ آئی۔ بدخصلت پڑھنے کے بعد انڈیا سیر کرنے کی شدید ترین خواہش جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ مختصر کہانیوں میں مردہ فروش اور اصل سرمایہ پسند آئیں۔“

امتحان گاہ سے ہمایوں سعید رومیو کا منصفانہ انداز... بنوں سے ”یکم کو جاسوسی کے دیدار ہوئے۔ محفلِ یاراں میں جعفر بھائی تعریف و توصیف کے آزمودہ ہتھیاروں کا استعمال کر کے گولڈ میڈلسٹ قرار پائے۔ جعفر صاحب! آپ کے لمبے لمبے تبصروں کا شائع ہونا بھی کچھ کم مشکوک نہیں۔ ایم اے اردو صاحب ویلکم۔ سائرہ جی! صنف کرخت بہت کرخت سا لفظ ہے، آپ اس کے بجائے صنف وجاہت، صنف صاف دل یا صنف مہرباں بھی لکھ سکتی ہیں۔ آمنہ پٹھانی! آپ نے تو انکسار پسندی کی حد کر دی۔ ایس ایس ناز! آپ ہمیں نام مت بتائیے، ہمیں پہلے سے پتا ہے۔ ایس ایس ناز کا مطلب ہے صبح شام ناز۔ یزدانی جی! غیر ملکی کہانیوں کا ترجمہ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ لاکھوں کہانیوں کے دریا میں دلچسپ، غیر ترجمہ شدہ اور جاسوسی کے معیار کے مطابق کہانی ڈھونڈنے میں کتنا وقت اور کتنی محنت درکار ہوگی، اس پر سوچیے گا ضرور۔ ارسلان جی! کسی نے کب آپ کو منا، چھوٹو یا پپو کہا ہے جو آپ خود کو جوان ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ دلنشین بلوچ! ہمیں پہلے ہی شک تھا کہ آپ کا تعلق کسی پڑوسی سیارے سے ہے اور اب آپ نے اپنی تنہائی کا راز افشا کر کے ہمارا شک یقین میں بدل دیا۔ خیر، اب آپ زمین پر آ گئی ہیں نا۔ بہت سے دوست، رشتے دار مل جائیں گے یہاں۔ عصمت بھائی! کم از کم خواتین کو تو کش لگانے کی دعوت مت دو۔ نومی جی! آپ ہمیشہ اتنے جلے بھنے سے کیوں رہتے ہیں؟ کیا کوئی تم سے ادھار لے کے بھاگ گیا ہے؟ بدخصلت قوم کی شیطانی فطرت کو بے نقاب کرتی خوب صورت ترین کہانی لکھنے پر سلیم فاروقی کو مبارک باد۔ جینی کی موت نے بے طرح اداس کیا۔ ڈھیر ساری اداسی لیے تابش اور عمران کے پاس پہنچے جو حسبِ معمول نت نئے ایڈونچرز میں گم تھے۔ عمران کے اغوا ہونے کے بعد تابش کا ایکشن میں آنا ناگزیر ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہ دوست کی خاطر کس حد تک جاتا ہے۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ چودھری کو جھنجلاتا پا کر بے پناہ راحت محسوس کی۔ اسما جی! آپ ماہ بانو کے بارے میں اتنا کم کیوں لکھتی ہیں؟ مرکزی کردار وہ ہے یا کشور؟ اور یہ اپنے ماسٹر جی کچھ زیادہ ہی رومینٹک نہیں ہوتے جا رہے۔ پہلا رنگ دلدار وادی اپنے نام کی طرح خوب صورت کہانی تھی مگر فرزین اور دانیال کی سالوں بعد ہونے والی ملاقات میں ایک دوسرے کو پہلی نظر میں پہچاننا کچھ عجیب سا لگا۔ آخر میں دانیال کا ہتھیار ڈالنا بھی ہضم نہیں ہوا۔ اگر وہ آسان موت مرنے کے بجائے آخری سانس تک لڑا ہوتا تو بے شک وہ زندہ محبوب کی آغوش میں جاتا یا شہادت کے بعد، ہمیں افسوس نہ ہوتا۔ یوں ہار ماننا پاکستانی سپاہی کو سوٹ نہیں کرتا۔ دشمن دوست میں کاشف زبیر نے ایک بار پھر پاکستان کے دوست نما دشمنوں کی بھرپور منظر کشی کی۔ مختصر کہانیوں میں آصف ملک کی بدمعاش 99 فیصد مارکس کے ساتھ سرِفہرست رہی۔ ہوگارڈ کے کردار نے حد سے زیادہ متاثر کیا۔ ڈینس کو کامیاب ہوتے دیکھ کر یقین ہو گیا کہ کچھ بھی ناممکن نہیں۔ ثمر عباس کی بلامعاوضہ 90 فیصد مارکس کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہی۔ پاپا کی پلاننگ، ہوم ورک، حاضر دماغی اور کول مائنڈڈ صلاحیتیں بلامبالغہ لاجواب تھیں۔ مردہ فروش اور نمبر پلیٹ 50 فیصد مارکس لے سکیں۔ میری نے اپنے باپ سے انتقام لینے کا جو طریقہ اپنایا، وہ بے حد غیر موزوں تھا۔ اگر انتقام ہی لینا تھا تو دوسرے طریقے سے بھی لے سکتی تھی۔ اتنے لوگوں کو قربان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مردہ فروش اور معما دونوں حقیقت سے بہت دور لگیں۔ بھلا مردے بھی کبھی زندہ ہوتے ہیں۔ موجد اور مذاق 33 فیصد مارکس بھی نہ لے سکیں، لہٰذا فیل قرار پائیں۔“

جہانگیر اسلم گوندل ڈسٹرکٹ جیل منڈی بہاؤالدین سے لکھتے ہیں ”السلام علیکم! انکل جی کیا حال ہیں؟ آپ کی صحت کیسی ہے اب؟ دیکھیں نا، طویل غیر حاضری کے بعد آخر واپس آ ہی گیا ہوں خوشبو لگا کے! مجال ہے جو کسی نے اتنے عرصے میں بھولے سے بھی یاد کیا ہو۔ ناصر کاظمی نے کیا خوب کہا ہے کہ

زندگی کے اُداس لمحوں میں ناصرؔ
بے وفا دوست بہت یاد آتے ہیں

جاسوسی اس دفعہ 3 اپریل کو ملا۔ میں نے اپنے بھائی سے پچھلے ہفتے ہی کہہ دیا تھا کہ 3 اپریل کو ملاقات پر آتے ہوئے جاسوسی ضرور لانا۔ بھائی نے دوسرے ملاقاتیوں سے چوری ڈائجسٹ میرے کپڑوں میں رکھ دیا خوشبو لگا کے! ٹائٹل گرل اس دفعہ دل میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ہم نے اسے گرین سگنل ہی نہیں دیا خوشبو لگا کے! کمرشلز کو دیکھتے ہوئے اپنی پیاری محفل نکتہ چینی میں پہنچے تو انکل جی سو فیصد سچی باتیں کرتے ہیں خوشبو لگا کے۔ کرسیِ صدارت پر براجمان پایا جعفر حسین کو، کافی لمبا چوڑا تبصرہ تھا۔ بہرحال، ایک قیدی سے مبارکباد قبول کریں خوشبو لگا کے۔ ایم عزیز اسد صاحب لگتا ہے آپ کو شاعری سے کافی لگاؤ ہے، ہے نا؟ کولمبو ارووِدان بن ایم اے صدیقی صاحب! پلیز، نام کوئی اور رکھ لیں... خوشبو لگا کے! آمنہ پٹھانی صاحبہ! کیا ہوا جو رسالہ لیٹ ملا۔ ہمیں تو بعض دفعہ اس سے بھی لیٹ ملتا ہے۔ اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے خوشبو لگا کے! اعجاز احمد صاحب! آپ کا تبصرہ اور شعر دونوں ہی بہت پسند آئے۔ دلنشین بلوچ صاحبہ! خدا کا شکر ہے کہ کتابیں ہم سے بے وفائی نہیں کرتیں خوشبو لگا کے! عصمت علی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو خوشبو لگا کے! باقی سب دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے! رانا ادیب الرحمٰن، اجمل خان، دل پسند سیال، آبگینے آفندی، میرب حجازی، ڈاکٹر شیریں، بھئی آپ سب لوگ کہاں ہیں؟ آپ سب کے بغیر نکتہ چینی میں مزہ نہیں آتا خوشبو لگا کے۔ کہانیوں میں سلیم فاروقی کی بدخصلت پڑھ کر بہت مزہ آیا لیکن آخر میں جینی کی موت نے دل اداس کر دیا۔ بہرحال زبردست اسٹوری تھی خوشبو لگا کے! طاہر جاوید مغل کی للکار میں دیکھتے ہیں میڈم، تابش سے کیسا سلوک کرتی ہے۔ اسما قادری کی گرداب میں چودھری کا مکروہ چہرہ کشور کے سامنے بھی آ گیا۔ چودھری کو چاہیے تھا کہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرے لیکن وہ تو کچھ زیادہ ہی بے غیرت نکلا۔ پتا نہیں کشور کا بھید کھلتا ہے یا نہیں... خوشبو لگا کے! ثمر عباس کی بلامعاوضہ میں پاپا کا کردار بڑا پسند آیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے پیٹس اور ہینکس کا کام تمام کر دیا خوشبو لگا کے! سلیم انور کی مذاق پسند نہیں آئی۔“

ان قارئین کے نام جن کے مکتوبات شاملِ محفل نہ ہو سکے۔

تنویر احمد، دادو۔ عبدالسلام صدیقی، ملتان۔ محمد ارشد اللہ رکھا، کوٹ غلام محمد۔ چودھری محمد سرفراز، جتوئی۔ محمد سلیم شبلی، ملتان۔ دلنشین بلوچ، ٹیکسلا۔ جعفر حسین، چنیوٹ۔ تنویر پاکیا، آزاد کشمیر۔ اے ایس کیانی، فتح جھنگ اٹک۔

انتباہ

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

شہرۂ آفاق مصنف ہرلان کوبن کا یادگار گوہرِ آب دار

دل سنگ

تلخیص و ترجمہ

تنویر ریاض

مشرق و مغرب سمتیں نہیں…… لوگ، اطوار، کچھ ایک دوسرے سے محض الگ الگ دو مختلف دنیائیں ہیں…… رنگت اور موسم سب مختلف ہیں…… حتیٰ کہ جذبات و تعلقات میں بھی کسی قسم کی مماثلت نظر نہیں آتی…… مغرب میں جذبات وحشی ہوتے ہیں جبکہ مشرقی جذبات میں پھولوں کی سی لطافت پوشیدہ ہوتی ہے۔ مغربی ماحول سے متعلق ہرجائی پن اور تغافل کی ایک انوکھی والجھی داستان…… جس کا ہر کردار ریشم کے دھاگوں کے مانند الجھا ہوا نظر آتا ہے…… اس کے ایک سرے کی تلاش میں انگلیاں فگار ہورہی تھیں……

خودغرض و احسان فراموش معاشرہ اور انسانی احساسات کے اسرار و رموز میں ڈوبی داستانِ تحیر

میرون نے اپنے کندھے اچکائے اور بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”میں اسپورٹس ایجنٹ ہوں، کوئی رکھوالا نہیں۔“

”میں نے یہ کب کہا؟“ نارم نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔“ میرون نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں میڈیسن اسکوائر گارڈن کے اس حصے میں بیٹھے تھے جہاں باسکٹ بال کورٹ کے آدھے حصے میں کسی اشتہار کی شوٹنگ ہورہی تھی۔ بہت سے بچے، مرد اور عورتیں شوٹنگ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ وہ دونوں جن کرسیوں پر بیٹھے باتیں کررہے تھے، ان کی پشت پر اسٹارز کے نام لکھے ہوئے تھے۔ میرون اس انتظار میں رہا کہ کوئی اسے بھی غلطی سے ماڈل سمجھ بیٹھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

”ایک نوجوان لڑکی خطرے میں ہے۔“ نارم بولا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

نارم ذوکرمین کی عمر ستّر کے لگ بھگ تھی اور وہ زوم نامی ایک بڑی کمپنی کا چیف ایگزیکٹو آفیسر تھا جو کھیلوں کا سامان بناتی تھی لیکن اس کا حلیہ دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اتنا امیر کبیر شخص ہے۔

”تمہیں میری نہیں بلکہ ایک باڈی گارڈ کی ضرورت ہے۔“ میرون نے بے یقینی سے کہا۔

”تم برینڈا اسلاٹر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”کچھ زیادہ نہیں۔“ میرون نے عام سے لہجے میں کہا۔

”تم خود باسکٹ بال کے کھلاڑی رہ چکے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس وقت برینڈا اسلاٹر باسکٹ بال کی سب سے بڑی خاتون کھلاڑی ہے اور میں نے اسے اپنی نئی لیگ کے لیے سائن کرلیا ہے۔ میری پریشانی یہ ہے کہ اگر اسے کچھ ہو جاتا ہے تو سارا کھیل چوپٹ ہوجائے گا اور اس کے ساتھ ہی میرا سرمایہ بھی ڈوب جائے گا۔“

”مجھے اس میں انسانی ہمدردی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔“ میرون نے اس پر طنز کیا۔

”چلو مان لیا کہ میں ایک لالچی سرمایہ دار ہوں لیکن تم تو اسپورٹس ایجنٹ ہو۔ تمہارے اندر سرمایہ داروں والی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی… اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنے کلائنٹ کے لیے بے اندازہ کام کرتے ہو… میری بات غور سے سنو میرون! برینڈا بہت ہی پیاری لڑکی اور باسکٹ بال کی شان دار کھلاڑی ہے۔ ایسے لوگوں سے حسد کرنے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔ خواہ ان میں ان کا باپ ہی شامل کیوں نہ ہو۔“

”گویا اسے باپ کی طرف سے کوئی مسئلہ ہے؟“ میرون نے پوچھا۔

”شاید لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“ نارم نے کہا۔

”بہتر ہے کہ کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرلی جائیں وہ اس پر نظر رکھے گا اور خطرے کی صورت میں پولیس کو مطلع کرسکے گا۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“ نارم نے کورٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ غائب ہو چکا ہے اور برینڈا بہت خوف زدہ ہے۔“

”اور تم سمجھتے ہو کہ اس کا باپ اس کے لیے خطرہ ہو

سکتا ہے؟’’
‘‘وہ کچھ بھی کرسکتا ہے، اس طرح کے لوگوں سے کچھ بعید نہیں۔ اس کا نام غالباً...’’
‘‘ہوریک سلاٹر۔’’ میرون بے ساختہ بول پڑا۔
‘‘کیا تم اسے جانتے ہو؟’’ نارم نے چونکتے ہوئے کہا۔
میرون نے آہستہ سے سر ہلایا اور بولا۔ ‘‘ہاں، میں اسے جانتا ہوں۔’’
‘‘تم اس سے عمر میں بہت چھوٹے ہو، اس لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس کے ساتھ کھیلتے رہے ہوگے... پھر تم اسے کیسے جانتے ہو؟’’ نارم کے لہجے میں بے یقینی تھی۔
‘‘تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔’’ میرون نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ‘‘تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ برینڈا خطرے میں ہے؟’’
‘‘اسے فون پر قتل کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ ایک کار اکثر اس کا پیچھا کرتی ہے اور بھی اس طرح کی باتیں ہیں جن سے وہ خوف زدہ ہوگئی ہے۔’’
‘‘تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟’’ میرون نے پوچھا۔
‘‘یہی کہ تم اس کی نگرانی کرو۔’’
میرون نے سر ہلایا اور بولا۔ ‘‘میرے ہاں کہنے سے کیا ہوتا ہے جبکہ تم کہہ چکے ہو کہ وہ باڈی گارڈ رکھنے پر تیار نہیں ہوگی۔’’
‘‘برینڈا کے پاس فی الحال کوئی ایجنٹ نہیں ہے۔ تم چاہو تو اس موقعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔’’
‘‘میرا خیال ہے کہ اس نے زوم کے ساتھ ایک بھاری تشہیری معاہدہ کیا ہے۔’’
‘‘وہ اس جانب رجوع کر رہی تھی کہ اس کا باپ غائب ہوگیا۔ وہی اس کا منیجر بھی تھا۔ وہ اب اکیلی ہے اور کسی حد تک میرے فیصلوں پر بھروسا بھی کرتی ہے لیکن ہم اسے بے وقوف نہیں کہہ سکتے۔ برینڈا چند منٹوں میں یہاں آنے والی ہے۔ میرا منصوبہ یہ ہے کہ میں تم دونوں کا تعارف کرا دوں۔ اس کے بعد تمہارا کام ہے کہ اپنی خوب صورتی اور لچھے دار باتوں سے اسے کس طرح متاثر کرتے ہو۔’’
میرون اب بھی قائل نہیں ہوا۔ ‘‘اگر میں تمہاری اسکیم سے متفق ہو جاؤں، تب بھی رات کو تو وہ تنہا ہی رہے گی۔ کیا تم مجھ سے یہ توقع کر رہے ہو کہ چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی کروں؟’’
‘‘یقیناً نہیں! ایسی صورت میں وِن تمہاری مدد کرے گا۔’’

‘‘اس کے پاس کرنے کے لیے اس سے زیادہ بہتر کام ہیں۔’’
‘‘تم میری خاطر اس سے بات کرنا، وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔’’ نارم نے بڑے اعتماد سے کہا۔
اسی لمحے برینڈا بھی وہاں پہنچ گئی۔ وہ چھ فٹ کی دراز قد لیکن پُرکشش لڑکی تھی۔ اس نے پرانی جینز اور آسمانی رنگ کا سویٹر پہنا ہوا تھا جس میں اس کی خوب صورتی پوری طرح عیاں ہو رہی تھی۔ نارم اسے دیکھتے ہی کرسی سے کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ‘‘برینڈا ڈارلنگ! یہاں آجاؤ۔ میں تمہیں کسی سے ملوانا چاہتا ہوں۔’’
برینڈا کی بڑی بڑی بھوری آنکھیں میرون کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ مسکراتی ہوئی ان کی جانب بڑھی میرون بھی اسے دیکھ کر خیر مقدمی انداز میں کھڑا ہوگیا۔ دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ برینڈا بولی۔
‘‘وِیل... مسٹر میرون بولیٹر!’’
نارم نے حیرت سے اسے دیکھا اور بولا۔ ‘‘کیا تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟’’
‘‘مجھے یقین ہے کہ مسٹر میرون نے مجھے یاد نہیں رکھا ہوگا۔’’ وہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ ‘‘یہ کافی پرانی بات ہے۔’’
میرون نے ذہن پر زور ڈالا اور اسے چند سیکنڈ میں ہی سب کچھ یاد آگیا۔ ‘‘تم اپنے والد کے ساتھ کورٹ میں آیا کرتی تھیں۔ اس وقت تمہاری عمر پانچ یا چھ سال ہوگی۔’’
‘‘میں تمہیں کھیلتے دیکھ کر جوان ہوئی ہوں۔ ڈیڈی بھی تمہارے کیریئر میں ایسی دلچسپی لیتے تھے گویا تم ان کے اپنے بیٹے ہو۔’’
نارم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ‘‘اب میرون ایک اسپورٹس ایجنٹ ہے اور میری نظر میں بہترین ہے... ایمان دار اور وفادار! شاید میں کچھ زیادہ بول گیا ہوں۔’’
اس نے ان دونوں کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ‘‘میرون اس لیگ کی تیاری میں کنسلٹنٹ کے طور پر میری مدد کر رہا ہے۔ تم چاہو تو اپنے کیریئر، مستقبل اور دیگر معاملات کے حوالے سے اس سے بات کر سکتی ہو۔ یہ تمہارے لیے ایک اچھا ایجنٹ ثابت ہوگا۔’’
یہ کہہ کر اس نے میرون کو آنکھ سے اشارہ کیا اور وہاں سے اٹھ گیا۔
اس کے جانے کے بعد برینڈا اپنی جگہ سے اٹھی اور میرون کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ‘‘اس نے جو کچھ کہا، اس میں کتنا سچ ہے؟’’

‘‘یہ کہ میں اسپورٹس ایجنٹ ہوں لیکن ہماری ملاقات کی صرف یہ وجہ نہیں ہے۔’’
‘‘اوہ!’’ برینڈا نے اپنے ہونٹ سکیڑے۔
‘‘نارم تمہارے بارے میں فکرمند ہے اور چاہتا ہے کہ میں تمہاری نگرانی کروں۔ وہ سمجھتا ہے کہ تم خطرے میں ہو۔’’
برینڈا نے ایک بار پھر اپنے ہونٹ سکیڑے اور بولی۔
‘‘میں اسے بتا چکی ہوں کہ مجھے کسی نگرانی کی ضرورت نہیں۔’’
‘‘یہ کام میں اسپورٹس ایجنٹ کے روپ میں کروں گا۔’’
‘‘پھر مجھے کیوں بتا رہے ہو؟’’
‘‘کیونکہ مجھے کچھ چھپانے کی عادت نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ہمارے تعلق کی ابتدا جھوٹ سے ہو۔’’
‘‘ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں لیکن زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم اگر یہ کام نہیں کرو گے تو نارم کسی دوسرے شخص کا بندوبست کرے گا جو شاید تم سے بہتر نہ ہو... لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔’’
‘‘میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم ضرور کچھ شرطیں عائد کرو گی۔’’
‘‘میں جب اور جہاں جانا چاہوں، جاؤں گی۔ تم میری تنہائی میں مخل نہیں ہوگے، میری جاسوسی نہیں کرو گے، میرے معاملات میں دخل نہیں دو گے... اگر ساری رات گھر سے باہر رہوں تو اس بارے میں بھی کوئی سوال نہیں کرو گے اور کسی بھی قسم کی تفریح میں حصہ لوں تو تمہیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔’’
میرون نے اس کی تمام شرائط بڑے سکون سے سنیں اور ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ‘‘کم از کم میں تمہاری نگرانی تو کر سکتا ہوں؟’’
برینڈا مسکراتے ہوئے بولی۔ ‘‘مجھے صرف یہ یقین ہونا چاہیے کہ ہم دونوں چوبیس گھنٹے ایک دوسرے سے نہیں چپکے رہیں گے۔ تم دور رہ کر بھی میری نگرانی کر سکتے ہو۔’’
‘‘کیا تم مجھے ان دھمکیوں کے بارے میں بتا سکتی ہو جو تمہیں مل رہی ہیں؟’’
‘‘میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔’’
‘‘لیکن نارم کے دماغ میں تو یہی بات بیٹھ گئی ہے۔’’
برینڈا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر میرون نے ایک اور کوشش کی۔
‘‘ان دنوں تمہاری رہائش کہاں ہے؟’’
‘‘ریسٹن یونیورسٹی میں ایک کمرا لے رکھا ہے، میں وہاں میڈیکل اسکول کے فورتھ ایئر میں ہوں۔’’
‘‘آگے چل کر کیا کرنے کا ارادہ ہے؟’’
‘‘پیڈیاٹرکس میں اسپیشلائز کروں گی۔’’
میرون متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور بولا۔ ‘‘تمہارے ڈیڈی کو تم پر ضرور فخر کرنا چاہیے۔’’
اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ ‘‘ہاں! میں اندازہ کر سکتی ہوں۔’’ پھر وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ‘‘بہتر ہوگا کہ میں اس شوٹ کے لیے کپڑے تبدیل کرلوں۔’’
‘‘تم نہیں بتانا چاہتیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟’’
‘‘ڈیڈی غائب ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔’’ وہ آہستہ سے بولی۔
‘‘کب سے؟’’
‘‘ایک ہفتہ ہوگیا۔’’
‘‘اور اس کے ساتھ ہی تمہیں دھمکیاں ملنی شروع ہوگئیں؟’’
وہ میرون کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔
‘‘تم میری مدد کرنا چاہتے ہو تو میرے باپ کو تلاش کرو۔’’
‘‘کیا وہی تمہیں دھمکیاں دے رہا ہے؟’’
‘‘دھمکیوں کے بارے میں پریشان مت ہو۔ یہ بھی کسی کو دہشت زدہ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔’’
‘‘میں سمجھا نہیں۔’’
‘‘تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ تمہارا دوست ہے نا!’’
‘‘میں نے اسے دس سال سے نہیں دیکھا۔’’
‘‘اس میں کس کی غلطی ہے؟’’

ایک ڈاکٹر صاحب رات گئے اسپتال سے نکلے۔ ابھی وہ اپنی کار تک پہنچے ہی تھے کہ ایک پاگل ان کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر ڈر کے بھاگ اٹھا اور پھر پاگل بھی ان کے پیچھے ہولیا۔ آخر ڈاکٹر بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور زمین پر گر پڑا۔ پاگل نے اس کے قریب پہنچ کر آہستہ سے اسے ہاتھ لگایا اور کہا۔
‘‘آخر چھو لیا نا!’’

ٹرک کے حادثے میں ایک شخص کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تو انشورنس کمپنی نے اسے بیمے کی رقم فوراً ادا کردی۔ بیوی نے دیکھا تو جھٹ بولی۔ ‘‘ہائے اللہ! کاش کم بخت ٹرک والا دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا۔’’

برینڈا کے لہجے کی تلخی نے میرون کو حیران کر دیا۔ ''میں اس سے کیا سمجھوں؟''

''کیا تمہیں اب بھی اس کی پروا ہے؟'' برینڈا نے پوچھا تو میرون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے جانے کے لیے ایک قدم آگے بڑھایا۔ ''وہ مشکل میں ہے، اسے تلاش کرو۔''

برینڈا کچھ دیر بعد تیار ہو کر واپس آئی تو وہ پہلے سے زیادہ پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ شوٹ کا مرحلہ شروع ہوا تو تمام ماڈلز ایک سے بڑھ کر ایک پوز دینے لگیں۔ میرون نے اپنے سیل فون کے ذریعے وِن کا پرائیویٹ نمبر ملایا۔ وہ لاک ہارن سیکیورٹیز کا فنانشل کنسلٹنٹ تھا جو ایک پرانی سرمایہ کار کمپنی تھی۔ اس کا دفتر مین ہٹن کے وسط میں سینتالیسویں اسٹریٹ پر واقع پارک ایونیو میں تھا۔ میرون نے بھی وہاں وِن سے کرائے پر جگہ لی ہوئی تھی۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میرون کس پائے کا اسپورٹس ایجنٹ تھا۔

تین دفعہ بیل بجنے کے بعد بھی کسی نے فون نہیں اٹھایا تو میرون نے اپنا پیغام ریکارڈ کروایا اور پھر اپنے دفتر کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف سے اسپیرینزا کی آواز سنائی دی۔

''ایم بی اسپورٹس ریپریزنٹیٹو۔''

''کوئی پیغام؟'' میرون نے پوچھا۔

''تقریباً ایک ملین کے قریب ہیں۔'' اسپیرینزا اسی انداز میں گفتگو کیا کرتی تھی۔

''کوئی خاص بات؟''

''گرین اسپین والے تم سے شرح منافع میں اضافے پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ نارم سے کیا بات ہوئی... وہ کیا چاہتا ہے؟''

اسپیرینزا ڈیاز، ایم بی اسپورٹس کے آغاز سے ہی اس کے ساتھ تھی۔ اس سے پہلے وہ پروفیشنل ریسلر تھی۔ بعد میں اس نے اپنا کیریئر تبدیل کر لیا اور ایتھلیٹس کی نمائندگی کرنے لگی۔ وہ میرون کے ہر معاملے سے باخبر رہتی تھی۔ اس لیے اسے تفصیل سے بتانا ضروری تھا۔

''اس کا تعلق برینڈا اسلاٹر سے ہے... وہی جو باسکٹ بال پلیئر ہے۔''

''میں نے اس کا کھیل دو مرتبہ دیکھا ہے۔''

''نارم چاہتا ہے کہ ہم اس کی نگرانی کریں۔''

''میرون! خدا کی پناہ... ہم اسپورٹس ایجنسی چلا رہے ہیں یا لوگوں کے گھروں میں جھانکتے پھر رہے ہیں؟''

''کلائنٹ بنانے کے لیے ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''اس کا باپ ہوریک سلاٹر ایک ہفتے سے غائب ہے۔ تم اس کا کھوج لگانے کی کوشش کرو۔''

''مجھے اس سلسلے میں کسی کی مدد چاہیے ہوگی۔''

میرون نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم سنڈی کو بلا لو لیکن اسے جتا دینا کہ یہ جاب محض آزمائشی بنیاد پر ہے اور اسے کسی کلائنٹ کے سامنے نہیں آنے دینا۔''

جیسے ہی فوٹو شوٹ ختم ہوا، برینڈا اسلاٹر اس کے پاس آ گئی۔

''تمہارا باپ ان دنوں کہاں رہتا ہے؟'' میرون نے پوچھا۔

''اسی پرانے گھر میں۔'' برینڈا نے جواب دیا۔

''اس کی گمشدگی کے بعد تم وہاں گئی تھیں؟''

''نہیں۔''

''تب ہمیں وہیں سے ابتدا کرنی چاہیے۔''

نیوجرسی میں واقع نیوآرک کا وہ علاقہ کسی کھنڈر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بیشتر عمارتیں بوسیدہ اور خستہ حال تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے برسوں سے ان کی مرمت اور دیکھ بھال پر کوئی توجہ نہ دی گئی ہو۔ میرون کی کار جب پرانے کھیل کے میدان سے گزری تو کئی کالے چہروں نے اسے غور سے دیکھا۔ بہت سے بچے میدان کے اطراف بیٹھے میچ دیکھ رہے تھے۔ کھیلنے والوں میں سے کسی نے بھی نیکر نہیں پہن رکھے تھے بلکہ وہ سب جینز اور شرٹ میں ملبوس تھے۔ میرون نے سوچا کہ یہ لباس پہن کر کس طرح کھیل پر توجہ دی جاسکتی ہے۔ میرون نے ان لڑکوں کی نظروں میں بہت بڑی تبدیلی محسوس کی۔ وہ پندرہ سال کی عمر میں پہلی بار یہاں کھیلنے آیا تھا... گو کہ اس وقت بھی اس کا کوئی خاص استقبال نہیں ہوا تھا لیکن اس رویّے کا موازنہ ان لڑکوں کی نفرت بھری نگاہوں سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

برینڈا اسے سوچوں میں گم دیکھ کر بولی۔ ''میں تو یہاں کبھی کھیلنا پسند نہ کروں۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے بھی یہاں آ کر کھیلنا آسان نہیں رہا ہوگا۔''

''تمہارے والد کی وجہ سے آسانی ہو گئی تھی۔'' میرون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں کبھی نہیں سمجھ سکی کہ وہ تمہیں کیوں اتنا پسند کرتے تھے... جبکہ انہیں عام طور پر گوروں سے نفرت تھی۔''

میرون نے اس کا خوش گوار موڈ دیکھ کر ایک اور کوشش کی۔ ''تم مجھے ان دھمکیوں کے بارے میں بتاؤ۔''

''زیادہ تر دھمکیاں رات میں ملتی تھیں۔ ایک مرتبہ کہا گیا کہ اگر انہیں میرا باپ نہیں ملا تو وہ مجھے کوئی بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ میں اپنے باپ کو منیجر کے طور پر رکھ لوں...وغیرہ وغیرہ۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں... یا وہ کون ہے جو تمہارے باپ کو تلاش کرنا چاہتا ہے؟''

''نہیں۔'' برینڈا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے باپ کے غائب ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟'' میرون نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی۔''

''نارم کا کہنا ہے کہ کوئی کار تمہارا تعاقب کرتی رہتی ہے؟''

''میں اس بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی۔''

''ٹیلی فون پر جو آواز تم نے سنی، وہ ہر بار ایک ہی ہوتی ہے؟ اور یہ بھی بتا دو کہ وہ مرد ہے یا عورت؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔'' برینڈا نے الجھتے ہوئے کہا۔ ''البتہ وہ مرد ہے اور شاید گورا... کم از کم اس کے لہجے سے تو یہی لگتا ہے۔''

''کیا تمہارا باپ جوا کھیلتا ہے؟''

''نہیں! البتہ میرے دادا کو یہ عادت تھی۔ اس نے جوئے میں اپنا سب کچھ ہار دیا۔ ڈیڈی نے کبھی جوا نہیں کھیلا۔''

''کیا وہ کسی سے ادھار لیتا تھا کیونکہ کسی مالی مدد کے بغیر تمہارے اسکول کے اخراجات برداشت کرنا مشکل تھا؟''

''میں بارہ سال کی عمر سے وظیفہ لے رہی ہوں۔''

''ان دھمکیوں کا سلسلہ کب شروع ہوا؟''

''ایک ہفتہ پہلے جب ڈیڈی اچانک ہی غائب ہو گئے۔ پہلی بار مجھ سے کہا گیا کہ میں اپنی ماں کو فون کروں۔''

''وہ کہاں رہتی ہے؟'' میرون کی دلچسپی بڑھ گئی۔

''میں نہیں جانتی کیونکہ میں نے اسے بہت عرصے سے نہیں دیکھا۔ وہ بیس سال پہلے ہمیں چھوڑ کر چلی گئی تھی، اس وقت میں پانچ سال کی تھی۔''

''اس کے بعد تمہارا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا؟''

''مجھے اس کے دو خط ملے تھے جن پر کوئی پتا درج نہیں تھا۔ وہ خطوط نیویارک سٹی سے پوسٹ کیے گئے تھے۔''

''کیا ہوریک جانتا ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے؟''

''نہیں، ڈیڈی نے تو گزشتہ بیس برس میں اس کا نام بھی نہیں لیا۔''

''ممکن ہے کہ ٹیلی فون کرنے والا تمہاری ماں کے بارے میں نہ کہہ رہا ہو۔'' میرون نے کہا۔ ''کیا تمہاری کوئی سوتیلی ماں ہے یا ہوریک کسی دوسری عورت کے ساتھ رہتا ہو؟''

''نہیں، میری ماں کے بعد ڈیڈی کی زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی۔''

میرون سوچنے لگا کہ بیس سال بعد اس کی ماں کا ذکر کیسے آ گیا؟ اس نے برینڈا سے پوچھا کہ کیا وہ اس کا فون ٹریس کر سکتا ہے؟ ممکن ہے کہ دھمکی آمیز کال دوبارہ آئے۔

''ہوریک سے تمہارے تعلقات کیسے تھے؟ تم نے اس سے دور رہنے کے لیے کورٹ آرڈر لیا تھا؟''

''وہ میرے معاملے میں بہت حساس ہے۔ اسے ہر وقت یہی ڈر رہتا ہے کہ وہ مجھے کھو دے گا یا میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ تین ہفتے پہلے میں ایسٹ اورنج اسکول میں کھیل رہی تھی کہ مجمعے میں سے دو لڑکے کھڑے ہو گئے اور مجھ پر نازیبا جملے کسنے لگے۔ میرے باپ سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور وہ ان کے پیچھے چلا گیا۔ اس وقت تو سیکیورٹی گارڈز نے بیچ بچاؤ کروا دیا لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔ تین دن بعد وہ دونوں لڑکے کلے جیکسن اور آرتھر ہیرس ایک بلڈنگ کی چھت پر اس حالت میں پائے گئے کہ کسی نے انہیں باندھ کر جسم کے نازک حصے کی رگ آدھی کاٹ دی تھی۔''

میرون کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ حرکت تمہارے باپ نے کی تھی؟''

برینڈا نے سر ہلایا اور بولی۔ ''میں نے ساری زندگی اسے ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ جس کسی نے بھی مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی، وہ اس کے آڑے آیا۔ بچپن میں مجھے ان باتوں سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا لیکن اب میں چھوٹی بچی نہیں رہی۔''

''پولیس کو تمہارے باپ پر شبہ نہیں ہوا؟''

''ہوا تھا لیکن عدم ثبوت کی بنا پر وہ اسے گرفتار نہ کر سکی۔''

''کیا ان لڑکوں نے بھی اسے شناخت نہیں کیا؟''

''وہ بہت خوف زدہ تھے۔ دوسری بار کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔'' پھر اس نے گاڑی سے باہر دیکھا اور بولی۔ ''یہیں پارک کر لو۔''

میرون گاڑی سے باہر نکلا تو لوگوں نے اسے یوں دیکھا جیسے پہلی بار کسی گورے سے سامنا ہوا ہو۔ برینڈا اسے لے کر آگے بڑھ گئی۔ بلڈنگ کے دروازے پر دو آدمی

کھڑے تھے۔ میرون کو اندازہ ہو گیا کہ وہ پہلے یہاں نہیں آیا۔ ہوریک سلاٹر کے ساتھ اس کے تعلقات باسکٹ بال کورٹ تک محدود تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسری منزل پر پہنچے۔ برینڈا نے اپنی جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرون کو احساس ہوا کہ ہوریک نے اپارٹمنٹ کی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا تھا اور ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ پر موجود تھی لیکن ساتھ ہی اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ کسی نے کمرے کی تلاشی لی ہے۔

برینڈا اپنے باپ کو پکارتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ میرون بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ اس وقت اسے شدت سے کسی اسلحے کی کمی محسوس ہوئی۔ وہ اپارٹمنٹ تین کمروں اور ایک کچن پر مشتمل تھا لیکن انہیں وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔

''کوئی چیز غائب تو نہیں ہے؟'' میرون نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میں کیسے جان سکتی ہوں؟'' وہ جھلاتے ہوئے بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ یہ ڈاکا زنی کی واردات تو نہیں ہے؟''

''نہیں، مجھے ایسا نہیں لگتا۔'' برینڈا کمرے میں رکھی چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوریک کسی جگہ پیسے چھپا کر رکھتا تھا؟''

برینڈا نے ہوریک کے کمرے کی الماری کھولی اور بولی۔ ''اس کے بہت سے کپڑے غائب ہیں اور سوٹ کیس بھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ کوئی جرم کر کے فرار ہو گیا ہے۔''

وہ ایک چھوٹے سے بیڈ روم میں داخل ہوئے تو میرون نے کہا۔ ''یہ تمہارا کمرا ہے؟''

''ہاں لیکن میں یہاں زیادہ نہیں رہتی۔''

برینڈا کی نظر اپنی میز پر گئی۔ پھر اچانک ہی وہ جھک کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور بولی۔ ''میری ماں نے جو خط مجھے لکھے تھے، وہ کوئی لے گیا۔''

میرون نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے باہر آ گیا۔ برینڈا نے اس کی تقلید کی۔ راستے میں ان دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ میرون نے اس کے گھر کے قریب کار روکی، تب وہ اپنے خیالوں سے باہر آئی اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ''میں صرف پانچ سال کی تھی جب وہ مجھے اس شخص کے پاس چھوڑ کر چلی گئی لیکن مجھے اس کے بارے میں سب کچھ یاد ہے۔ میں نے گزشتہ بیس سالوں میں شاید ہی کبھی اس کے بارے میں بات کی ہو... لیکن سوچتی ضرور ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی... اور یہ کہ اب بھی اسے کیوں یاد کرتی ہوں؟''

اس نے کار کا دروازہ کھولا اور میرون کے جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی۔ میرون اسے جاتے دیکھتا رہا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے بھی گھر کی راہ لی۔ جیسیکا اپنے کام میں مصروف تھی۔ وہ سیدھا بیڈ روم میں گیا اور اپنی آنسرنگ مشین چیک کرنے لگا کیونکہ جیسیکا لکھتے وقت کسی فون کال کا جواب نہیں دیتی تھی۔ میرون نے مشین کا بٹن دبایا تو اسے ماں کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو میرون! تمہاری ماں بول رہی ہوں۔ مجھے اس مشین سے نفرت ہے۔ وہ فون کیوں نہیں اٹھاتی جبکہ میں جانتی ہوں کہ وہ گھر پر ہے۔ خیر، اس وقت تو میں نے ہیلو کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔''

زندگی کے پہلے تیس سال میرون نے اپنے والدین کے ساتھ ہی گزارے تھے۔ اس دوران وہ چار سال کے لیے نارتھ کیرولینا میں واقع ڈیوک ڈاؤن بھی گیا۔ کبھی کبھی وہ جیسیکا یا وِن کے ساتھ بھی کچھ روز گزارتا لیکن اس کا اصل گھر وہی تھا جہاں اس کے ماں باپ رہتے تھے۔ کئی ماہ پہلے جیسیکا کے کہنے پر وہ اس کے ساتھ رہنے لگا لیکن وہ اب بھی ہفتے میں ایک بار ان سے ملنے ضرور جاتا اور تقریباً روزانہ ہی ممی یا ڈیڈی سے فون پر ضرور بات کرتا۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔ جیسیکا اندر آئی اور بولی۔ ''کیا موڈ ہے؟ کھانا یہیں کھاؤ گے یا باہر چلیں؟''

''تم آرڈر کر دو... ہم گھر پر ہی کھائیں گے۔''

کھانے کے دوران وہ دونوں دن بھر کی سرگرمیوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میرون نے اسے برینڈا سلاٹر کے متعلق بتایا۔ جیسیکا پوری توجہ سے سنتی رہی۔ جب اس کی بات ختم ہو گئی تو وہ بولی۔

''میں منگل کو لاس اینجلس جا رہی ہوں۔''

''کتنے دنوں کے لیے؟''

''میں نہیں جانتی۔ شاید ایک یا دو ہفتے لگ جائیں۔''

''لیکن پچھلے ہی دنوں تو تم وہاں گئی تھیں؟'' میرون نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں، اس وقت ایک فلم کے سلسلے میں بات کرنے گئی تھی اور اب مجھے ایک کتاب کے سلسلے میں کچھ ریسرچ کرنی ہے۔''

''کیا اس طرح ہمارا ساتھ رہنا کارآمد ہو سکتا ہے؟'' میرون نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''میرون! دو ہفتوں کی تو بات ہے۔ اس ریسرچ کے لیے میرا جانا بہت ضروری ہے۔''

''یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا... کبھی ریسرچ، کبھی کانفرنس، کبھی مووی ڈیل وغیرہ وغیرہ۔''

''تم کیا چاہتے ہو کہ میں گھر پر بیٹھ کر چولہا جھونکوں؟''

''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن جب تم دور چلی جاتی ہو تو میں تمہیں بہت یاد کرتا ہوں۔''

''میرا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ جب تم اپنے بزنس کے سلسلے میں کہیں جاتے ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ہماری آزادی اس سے بھی زیادہ اہم ہے... پھر جب ہم دوبارہ ملتے ہیں تو اس ملاپ کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرون اور جیسیکا دونوں ہی اپنے اپنے کیریئر میں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے دنیا کو فتح کرنے جا رہے ہوں اور ان کے بیچ عارضی جدائی اس عمل کا حصہ تھی۔ لڑنا، جھگڑنا، روٹھ جانا اور منانا... یہ سب کچھ اس تعلق کا حسن تھا اور تمام تر اندیشوں اور وہم کے باوجود وہ اس تعلق کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

دوسرے دن میرون جیسے ہی گھر سے باہر نکلا، ایک سیاہ لیموزین نے اس کا راستہ روک لیا اور اس میں سے دو بھاری بھرکم آدمی برآمد ہوئے۔ انہوں نے بے ڈھنگا سا لباس پہنا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک غرایا۔ ''کار میں بیٹھ جاؤ۔''

میرون نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''میری ممی کہتی ہیں کہ کسی اجنبی کی گاڑی میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔''

''اوہ!'' دوسرا بولا۔ ''ہمارا واسطہ ایک کامیڈین سے پڑ گیا ہے۔''

''میں بہت اچھا گلوکار بھی ہوں۔ کہو تو کچھ سناؤں؟'' میرون بولا۔

''اگر تم کار میں نہیں بیٹھے تو تمہارے بدن کے ہر حصے سے سُر نکلیں گے۔''

میرون ان سے بالکل بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ انہیں کسی نے بھیجا تھا اور وہ اسے صحیح سلامت لے جانے کے پابند تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''مسٹر فرینک ایچ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

ایچ برادرز کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ میرون نے گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے اور پچھلی سیٹ پر دراز ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

''کیا ہم کلینسی جا رہے ہیں؟'' اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص سے پوچھا۔ اسی جگہ ایچ برادرز سے ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ وہ دو برس پہلے وِن کے ساتھ وہاں جا چکا تھا۔

''خاموش بیٹھے رہو۔'' ان میں سے ایک غرایا۔

جب انہوں نے مغربی شاہراہ کے شمال میں دائیں جانب 57 ویں اسٹریٹ کا رخ کیا اور ففتھ ایونیو پر گاڑی پارک کی تو میرون کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں آئے ہیں۔ یہ ٹروبرو کا دفتر تھا جو امریکا کی ایک بڑی اسپورٹس ایجنسی تھی۔ کئی سالوں سے اسے رائے اوکونر نامی شخص چلا رہا تھا جو قانون توڑنے کا ماہر تھا۔ اس نے کئی ایتھلیٹس کو غیر قانونی طور پر بہت کم عمری میں سائن کیا اور کام نکل جانے کے بعد چلتا کر دیا لیکن اپنی بداعمالیوں کے سبب اسے نقصان ہونے لگا اور وہ مقروض ہو گیا۔ قرض کی ادائیگی نہ ہونے کے سبب اس ایجنسی کا انتظام ایچ برادرز نے سنبھال لیا۔

میرون ان دونوں باڈی گارڈز کے ساتھ لفٹ کی جانب بڑھا اور آٹھویں منزل پر واقع ایک دفتر میں داخل ہو گیا۔ فرینک نے اسے دیکھتے ہی بازو پھیلا دیے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میرون!''

وہ بڑی گرم جوشی سے میرون سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم کتنے عرصے بعد مل رہے ہیں؟''

''تقریباً ایک سال بعد!'' میرون نے جواب دیا۔

''غالباً ہماری ملاقات کلینسی میں ہوئی تھی؟''

''نہیں، ہماری ملاقات پیلسوانیا کی ایک سڑک پر ہوئی تھی۔'' میرون نے جل کر جواب دیا۔ ''یہ بتاؤ کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

عقبی دروازے سے دو افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک ٹروبرو کا سابق صدر رائے اوکونر اور دوسرا بیس پچیس سال کا ایک خوش لباس شخص تھا۔ فرینک نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا بیٹا فرینک جونیئر ہے۔ تم اسے ایف جے کہہ سکتے ہو۔ تم دونوں میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں ہی ہارورڈ جا چکے ہو۔''

پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ ڈیسک پر جمائے اور بولا۔ ''ہم نے سنا ہے کہ تم برینڈا اسلاٹر کے لیے کام کر رہے ہو؟''

''ہاں۔'' میرون نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا وہ بوڑھا شخص اب بھی اس کا منیجر ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔ تم یہ بات خود اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟''

''تم کل اس کے ساتھ تھے... کیا کرتے رہے؟''

''تمہیں ان سب باتوں سے کیا دلچسپی ہے؟'' میرون نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''کیا میں یہاں تمہارے احمقانہ سوالات کے جواب دینے کے لیے بیٹھا ہوں؟'' فرینک نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

فون کی بیل بجی۔ فرینک نے ریسیور اٹھایا۔ آپریٹر کہہ رہی تھی۔ ''مسٹر میرون کے دوست آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

فرینک نے بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے وِن بول رہا تھا۔ ''ہیلو فرینک! مجھے یقین ہے کہ میں تمہارے کام میں مخل نہیں ہو رہا ہوں گا۔''

فرینک نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''تمہارا بھائی ہرمن کیسا ہے؟ میں اسے بھی فون کروں گا، ہمارے درمیان کبھی تعلقات خراب نہیں ہوئے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بتا دوں گا کہ تم اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔'' فرینک نے بے دلی سے کہا۔ ''لیکن میں اس طرح کی بے ہودہ مداخلت پسند نہیں کرتا۔ تم سن رہے ہو نا؟''

''سب کچھ سن رہا ہوں۔ رائے اور اپنے بیٹے کو بھی میری طرف سے پوچھ لینا۔'' وِن نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

فرینک نے کھا جانے والی نظروں سے میرون کو دیکھا اور بولا۔ ''گیٹ آؤٹ!''

''تم برینڈا اسلاٹر میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟'' میرون نے ایک بار پھر اسے کریدا۔

فرینک اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''اب اگر ایک لفظ بھی کہا تو تمہیں کرسی سے باندھ کر آگ لگا دوں گا۔''

میرون نے اسے گڈ بائے کہنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور تیزی سے لفٹ کے ذریعے نیچے آ گیا۔ وِن لابی میں موجود تھا۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق میرون پر کچھ فقرے چست کیے۔ میرون نے اپنا سیلولر فون بند کیا۔ یہ ایک نئی ترکیب تھی جو ان دونوں نے ایک دوسرے سے باخبر رہنے کے لیے ایجاد کی تھی۔ جیسے ہی میرون کو زبردستی گاڑی میں بٹھایا گیا تو اس نے فون آن کر کے اس کا پروگرام بٹن دبا دیا جس کا رابطہ وِن کے فون سے تھا۔ اس طرح وہ سب باتیں سن سکتا تھا جو میرون کسی سے کرتا۔ اسی لیے میرون کار میں بیٹھنے کے بعد ان دونوں آدمیوں سے راستے کے بارے میں معلومات لیتا رہا تا کہ وِن کو پتا چل سکے کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ وِن نے فرینک کو یہ جتانے کے لیے ہی فون کیا تھا کہ اسے یہاں میرون کی موجودگی کا علم ہو چکا ہے۔

جب میرون نے اسے برینڈا اسلاٹر کے بارے میں بتایا تو اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور وہ بولا۔

''فرینک کو اس معاملے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میرون نے بیزاری سے کہا۔

''ممکن ہے کہ ٹروبرو اس کے لیے کام کرنا چاہ رہے ہوں؟''

''مجھے شبہ ہے۔ وہ اتنی آسانی سے کسی کے قابو آنے والی نہیں۔''

''ایف جے کوئی مسئلہ کھڑا کر سکتا ہے۔'' وِن نے

آگ

ہوٹل میں قیام کے دوران میں ایک صاحب رات کو مخمور سی حالت میں لڑکھڑاتے ہوئے کاؤنٹر پر پہنچے اور تحکمانہ لہجے میں بولے۔ ''منیجر کہاں ہیں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔''

''وہ اس وقت ہوٹل میں موجود نہیں ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔'' کلرک نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''مجھے کمرے کے بارے میں بات کرنی ہے۔'' وہ فضا میں ہاتھ لہرا کر بولے۔

''کیا بیڈ ٹھیک نہیں ہے؟'' کلرک نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بیڈ تو بہترین ہے۔ میں نے زندگی میں اتنا شان دار بیڈ نہیں دیکھا۔'' انہوں نے کہا۔

''تولیوں اور چادروں وغیرہ کے بارے میں کوئی شکایت ہے؟'' کلرک نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں تولیے چادریں تو بہترین ہیں، میں نے زندگی میں اتنے شان دار تولیے اور چادریں نہیں دیکھیں۔'' انہوں نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا باتھ روم میں گرم پانی نہیں آ رہا؟ باتھ روم گندہ ہے؟'' کلرک ان کا مسئلہ جاننا چاہ رہا تھا۔

''نہیں گرم پانی بھی آ رہا ہے۔ باتھ روم بھی صاف ستھرا ہے۔ میں نے زندگی میں اتنا شان دار باتھ روم نہیں دیکھا۔'' انہوں نے غنودہ لہجے میں دعویٰ کیا۔

''تو پھر آخر کمرے میں کیا کمی ہے؟ آپ کو کیا شکایت ہے؟'' کلرک نے تنگ کر پوچھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

''دراصل کمرے میں آگ لگی ہوئی ہے!'' انہوں نے اطمینان سے انکشاف کیا۔

خدشہ ظاہر کیا۔

''تم اسے جانتے ہو؟''

''تھوڑا بہت۔'' وِن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ باپ اسے شرافت کا لبادہ اوڑھانا چاہتا ہے۔ اسی لیے اعلیٰ تعلیمی اداروں لارنس وِل، پرنسٹن اور ہارورڈ میں بھیجا۔ اب وہ اسے بزنس میں شامل کرنا چاہتا ہے تاکہ ایتھلیٹس کے لیے کام کرے لیکن وہ اسے پسند نہیں کرتا۔ وہ ابھی تک فرینک کا بیٹا ہے اور اس تربیت کے باوجود یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مضبوط جسم کا مالک ہے اور ہر طرح کے لڑائی جھگڑے میں اپنے جوہر دکھا سکتا ہے۔''

''یہ یقیناً کوئی اچھی بات نہیں ہے۔'' میرون نے آہستہ سے کہا۔

باتیں کرتے کرتے وہ دونوں 47 ویں اسٹریٹ پر واقع لاک ہارن بلڈنگ میں پہنچ گئے۔ میرون بارھویں منزل پر اتر گیا جبکہ وِن کا دفتر چودھویں منزل پر تھا۔ ریسیپشن پر اسے اسپیرینزا کی جگہ سنڈی بیٹھی نظر آئی۔ اس کی بھاری بھرکم جسامت کی وجہ سے وہ جگہ اس کے لیے چھوٹی تھی۔ میرون نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو سنڈی!''

جواب میں اس نے بھی دانت نکال دیے۔ ''ہیلو مسٹر میرون!''

وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اسپیرینزا اس کی میز پر بیٹھی کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر میرون کو دیکھا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ میرون اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ گفتگو ختم کرنے کے بعد اسپیرینزا اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''تمہیں آنے میں دیر ہوگئی؟''

''ہاں، فرینک ایچ مجھ سے ملنا چاہ رہا تھا، اسے برینڈا کے بارے میں کچھ جاننا ہے۔''

''گویا ہمارے لیے مشکل پیدا ہوگئی؟''

''شاید!''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں برینڈا کے معاملے سے الگ ہو جانا چاہیے۔''

''نہیں۔'' میرون نے کہا۔ ''تمہیں ہوریک کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟''

اسپیرینزا نے کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور بولی۔ ''گزشتہ ہفتے کے دوران اس کے کریڈٹ کارڈ کا استعمال نہیں ہوا۔ اس کا ایک اکاؤنٹ نیویارک فیڈیلیٹی میں ہے اور بیلنس صفر ہے۔ اس کے اکاؤنٹ میں گیارہ ہزار ڈالرز تھے جو اس نے نکال لیے۔''

''گویا وہ بھاگنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ ہم نے جو کچھ اس کے اپارٹمنٹ میں دیکھا، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اب تمہیں اس کے ساتھ اس کی بیوی انیتا سلاٹر کے بارے میں بھی معلوم کرنا ہوگا۔ وہ بیس سال پہلے اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی لیکن قانونی طور پر وہ اب بھی اس کی بیوی ہے... اور لگتا یہی ہے کہ ان کے درمیان طلاق نہیں ہوئی۔''

''تم نے کہا کہ وہ بیس سال پہلے چلی گئی تھی؟''

''ہاں کیونکہ اس کے بعد اسے کسی نے نہیں دیکھا۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ نہ ہو اور اگر کہیں چھپی ہوئی ہے تو اس نے اپنا نام بدل لیا ہو... یا ملک چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ اور اگر بیس سال پہلے اس کا کوئی ریکارڈ تھا تو شاید اب کمپیوٹر پر کچھ بھی نہ ملے۔''

میرون اس کی ہر بات کی تائید کرتا رہا پھر بولا۔ ''تمہیں برا نہیں لگتا جب میں ہر بات کو اتنا آسان لیتا ہوں۔''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں محسوس کر سکتی ہوں لیکن کیا کروں، تمہاری معمولی سی اسسٹنٹ ہی تو ہوں۔''

''میں تمہیں معمولی اسسٹنٹ نہیں سمجھتا۔''

''لیکن میں تمہاری پارٹنر بھی تو نہیں ہوں۔''

اس کے بعد وہ دونوں دوسرے دفتری معاملات پر باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد اسپیرینزا نے پھر وہی قصہ چھیڑ دیا۔ ''تم اس کے والدین کو تلاش کرو گے؟''

''ہاں، اس کا باپ میرا پرانا دوست ہے اور پھر یہ سب کچھ ہمارے کام کا حصہ ہے۔''

''اس بھاگ دوڑ کی وجہ سے تم اکثر دفتر سے باہر رہتے ہو جبکہ کئی کلائنٹ اور اسپانسرز تم سے براہِ راست بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ وہ مجھ سے فون پر بھی بات کر سکتے ہیں۔''

''نہیں میرون! ہم اس طرح ساتھ نہیں چل سکتے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' میرون نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تم مجھے اپنا پارٹنر بنا لو ورنہ میں چلی جاؤں گی۔''

''تم مجھے ایسی دھمکیاں مت دو پلیز!'' میرون نے آہستہ سے کہا۔ ''میں تمہارے لیے آفس بنا رہا ہوں، جلدی میں کوئی کام نہیں کرنا چاہتا اس لیے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہوں۔''

''تم ایک قدم آگے بڑھتے ہو اور اس کے بعد اپنی

زبان سے پھر جاتے ہو۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کچھ نہیں کہا لیکن اب میں تمہاری پارٹنر بننا چاہتی ہوں۔ پوری نہ سہی لیکن برابری کی بنیاد پر!''

وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے پاس سوچنے کے لیے ایک ہفتہ ہے۔''

میرون کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ وہ اس کی بہترین دوست تھی۔ وہ اسے پسند کرتا تھا اور اس کی یہاں بہت ضرورت تھی۔ وہ اس فرم کا اہم حصہ تھی لیکن پارٹنر بنانے والا معاملہ اتنا آسان نہیں تھا۔

اسپیرینزا نے دروازہ کھولا اور بولی۔ ''تم برینڈا سے ملنے جا رہے ہو؟''

''ہاں، کچھ دیر بعد جاؤں گا۔''

''میں تلاش شروع کر رہی ہوں۔ تم چند گھنٹوں بعد مجھے فون کرنا۔''

وہ چلی گئی تو میرون نے وِن کا نمبر ملایا کیا۔ ''آج رات تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' وِن نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیا میں تمہارے گھر آ سکتا ہوں؟ تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، آجاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔''

میرون کو پتا تھا کہ برینڈا سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ اس سے ملنے اینگل روڈ ہائی اسکول چلا گیا جہاں برینڈا کی ٹیم نیویارک ڈولفن پریکٹس کرتی تھی۔ برینڈا نے اسے دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کے مسکرانے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے محبوب سے پہلی بار مل رہی ہو۔ میرون سیدھا اس کے پاس گیا اور بولا۔

''مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

برینڈا نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک بینچ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''تمہارے باپ نے غائب ہونے سے پہلے اپنا بینک اکاؤنٹ خالی کر دیا۔''

''پہلے کپڑے گئے اور اب پیسے بھی۔'' برینڈا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میری ماں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔''

''کیا وہ بھی پیسے لے گئی تھی؟'' میرون نے پوچھا۔

''ہاں، ایک ایک پائی سمیٹ کر چلی گئی تھی۔''

میرون نے اس کی جانب دیکھا۔ اسے لگا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ اس نے کہا۔

مصروفیت

ہالی وڈ کی ایک ایکٹریس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث جلدی جلدی شادیاں کرنے کے لیے وقت نہیں نکال پائی۔ چنانچہ اس نے اس کام کے لیے کچھ سیکریٹریاں رکھ چھوڑی ہیں۔ جب کوئی شخص اس سے شادی کی درخواست کرتا ہے تو وہ اپنی کسی ایک سیکریٹری کو اس سے شادی کرنے کے لیے بھیج دیتی ہے۔

''کیا تمہارا باپ کوئی کام کرتا تھا؟''

''ہاں، وہ سینٹ بارناباس اسپتال میں سیکیورٹی گارڈ تھا۔ میں بھی وہیں کام کرتی ہوں۔ یہ ایک طرح کا اسٹڈی پروگرام ہے۔ میں نے ہی اسے وہاں ملازمت دلوائی تھی اور اس کے غائب ہونے کی اطلاع بھی مجھے اس کے سپروائزر نے دی۔''

''ہوریک وہاں کتنے عرصے سے کام کر رہا تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ چار پانچ مہینے ہو گئے تھے۔''

باتوں باتوں میں برینڈا نے بتایا کہ ہوریک اپنی بہن میبل پر بہت بھروسا کرتا تھا جو ویسٹ اورنج میں رہتی ہے۔ میرون نے فوری طور پر اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور برینڈا سے کہا۔ ''تم اسے فون کر کے بتا دو کہ میں اس سے ملنے آ رہا ہوں۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تمہاری پریکٹس ختم ہونے سے پہلے واپس آجاؤں گا۔''

راستے میں اسے نارم کی کال موصول ہوئی اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کہیں جا رہا ہے تو وہ بولا۔

''تمہیں اس وقت برینڈا کے پاس ہونا چاہیے تھا۔''

''وہ اس وقت پریکٹس کر رہی ہے اور درجن بھر لوگ اس کے ساتھ ہیں۔ بے فکر رہو، اسے کچھ نہیں ہوگا۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے وہ مطمئن نہیں ہے۔ پھر وہ بولا۔ ''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم کتنی دیر میں واپس آ رہے ہو؟''

''میں ایک گھنٹے تک واپس آجاؤں گا۔ بات کیا ہے نارم؟''

''ٹھیک ہے، تم سے ایک گھنٹے بعد ملاقات ہوگی۔''

میبل، مضافاتی علاقے ویسٹ اورنج میں رہتی تھی جہاں گوروں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تھی کیونکہ کالوں نے شہر سے نکل کر قریبی مضافات میں رہائش اختیار

کرنا شروع کر دی تھی۔ میرون اس جگہ سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ اس کا آبائی ٹاؤن لیونگسٹن اس سے متصل تھا۔ میرون نے اپنی گاڑی پورچ میں پارک کی اور ڈور بیل بجائی۔ میبل نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر پینتالیس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ بھاری بھرکم عورت تھی جس نے پرانی وضع کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرون کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''تم بیٹھو، میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔''

میرون ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ آتش دان پر کئی تصویریں رکھی ہوئی تھیں اور ان سب میں ایک چہرہ بہت نمایاں تھا۔ میرون کو وہ شخص کچھ جانا پہچانا لگا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ میبل کا بیٹا ہوسکتا ہے۔ میبل ایڈورڈ ایک ٹرے میں کافی لے کر آئی اور بولی۔ ''ہم ایک دفعہ پہلے بھی مل چکے ہیں۔'' میرون نے سر ہلایا اور یاد کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میبل اسے کافی کا کپ تھماتے ہوئے بولی۔

''تم ان دنوں ہائی اسکول میں ہوا کرتے تھے۔ ہوریک مجھے تمہارا کھیل دکھانے لے گیا تھا۔ مجھے تمہاری سب سے اچھی بات یہ لگی کہ تم بہت سکون سے کھیل رہے تھے جبکہ دوسرے لڑکے کافی گھبرائے ہوئے تھے۔''

''یہ سب تمہارے بھائی کی وجہ سے ہوا۔''

اس نے اپنا سر ہلایا اور بولی۔ ''ہوریک نے کہا تھا کہ اس نے جتنے لڑکوں کے ساتھ کام کیا، تم ان سب میں بہترین ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ تم ایک دن ضرور بڑے کھلاڑی بنو گے۔ وہ تمہیں بہت پسند کرتا تھا اور ہر وقت تمہاری ہی باتیں کیا کرتا تھا۔''

''حال ہی میں تمہاری اس سے کوئی ملاقات ہوئی؟'' میرون نے پوچھا۔

''تم یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟'' میبل چونکتے ہوئے بولی۔

''وہ کام پر نہیں آرہا اور برینڈا سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔''

''میں سمجھتی ہوں لیکن تمہیں اس میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟''

''میں برینڈا کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ کورٹ آرڈر کے مطابق وہ اپنے باپ سے دور رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ تم اس معاملے میں نہ پڑو۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے؟'' ہوریک نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ ''برینڈا خطرے میں ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اس میں ہوریک بھی ملوث ہے۔''

میبل نے کافی کی پیالی میز پر رکھی اور بولی۔ ''تم سمجھتے ہو کہ ہوریک اپنی ہی بیٹی کو نقصان پہنچائے گا؟''

''نہیں لیکن اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ہوسکتا ہے کیونکہ کسی شخص نے ہوریک کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی ہے۔ ہوریک اپنا سامان لے کر اور بینک اکاؤنٹ خالی کر کے غائب ہوگیا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ بھی کسی مشکل میں ہے۔''

''اگر وہ مشکل میں ہے تو اس کے لیے چھپے رہنا ہی بہتر ہوگا۔''

''یہ تمہارا بیٹا ہے؟'' میرون نے ایک تصویر کی جانب اشارہ کیا۔

''ہاں، یہ ٹیرینس ہے۔ میری شادی سترہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی اور ایک سال بعد یہ پیدا ہوا۔ رونالڈ کا انتقال ہوا تو یہ بہت چھوٹا تھا لیکن اس نے تعلیم جاری رکھی اور یہ ہمارے خاندان کا پہلا گریجویٹ ہے۔ پچیس سال کی عمر میں وہ ٹاؤن کونسلر بن گیا اور اگر وہ اس سال الیکشن جیت گیا تو تیس سال کی عمر سے پہلے سینیٹ کا ممبر بن جائے گا۔''

''تمہیں یقیناً اس پر فخر ہونا چاہیے۔''

''بالکل۔'' وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''بہت پہلے کی بات ہے جب ہوریک تم پر بھروسا کیا کرتا تھا لیکن اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ہم تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کچھ اور لوگ بھی ہوریک کو تلاش کررہے ہیں۔ یہ دیکھو!'' اس نے اپنی سوجی ہوئی آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔ ''گزشتہ ہفتے دو آدمی یہاں آئے تھے اور مجھ سے ہوریک کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میں کچھ نہیں جانتی۔''

''کیا انہوں نے تم پر حملہ کیا تھا؟ دیکھنے میں وہ کیسے لگ رہے تھے؟''

''دونوں گورے تھے۔ ان میں ایک طویل قامت تھا جبکہ دوسرے کے بازو پر سانپ کا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ہوریک کے بارے میں پوچھتے رہے اور جب میں نے لاعلمی ظاہر کی تو طویل قامت شخص نے میری آنکھ پر گھونسا مارا لیکن دوسرے آدمی نے اسے کھینچ لیا۔''

''کیا تم نے پولیس کو فون کیا؟''

''نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں ڈر گئی تھی۔ اس طرح کے لوگ مجھے خوف زدہ نہیں کرسکتے لیکن ہوریک نے مجھے منع کر دیا تھا۔''

''مسز ایڈورڈ!'' میرون بولا۔ ''ہوریک کہاں ہے؟''

''میں تمہیں بتا چکی ہوں اور یہ سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ لگتا ہے تم انہی کے لیے کام

''یہ کون سا ہیئر اسٹائل ہے؟''

کر رہے ہو اور تم بھی یہاں ہوریک کو ہی ڈھونڈنے کے لیے آئے ہو؟''

میرون کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''برینڈا کی ماں کے بارے میں تم کیا بتا سکتی ہو؟''

''تمہیں اس کی فکر کیوں پڑ گئی؟''

''کچھ دیر پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ کسی شخص نے تمہارے بھائی کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی تھی۔ وہاں سے وہ خطوط غائب ہیں جو برینڈا کی ماں نے اسے لکھے تھے۔ اس کے علاوہ برینڈا کو دھمکی آمیز فون بھی موصول ہورہے ہیں جن میں سے ایک میں اسے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی ماں کو فون کرے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ اسے گئے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟''

''بیس سال پہلے وہ میرے بھائی کے نام ایک خط لکھ کر چلی گئی تھی؟''

''اس خط میں کیا لکھا تھا؟''

''کچھ اس طرح کی باتیں کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتی اور ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتی ہے... وغیرہ وغیرہ۔''

''وہ دیکھنے میں کیسی لگتی تھی؟''

''میں نے ہی ان دونوں کو متعارف کروایا تھا۔ میں اور انیتا ایک ساتھ بریڈفورڈ اسٹیٹ میں میڈ کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس وقت ہماری عمریں بیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ میں نے چھ مہینے بعد وہ جاب چھوڑ دی لیکن انیتا چھ سال تک ان لوگوں کی غلامی کرتی رہی۔''

''لیکن تم تو بریڈفورڈ اسٹیٹ کا نام لے رہی تھیں؟'' میرون نے چونکتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب بریڈفورڈز سے تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ان کی نوکرانی تھی اور زیادہ تر اس گھر کی مالکہ کے کام کیا کرتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ٹھہرو، میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتی ہوں۔''

وہ دوسرے کمرے میں گئی اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں تصویر لے کر آگئی۔ انیتا اپنی بیٹی کے ساتھ کھڑی تھی۔ میرون نے انیتا اور برینڈا کا موازنہ کیا تو اسے دونوں میں کافی مشابہت نظر آئی لیکن انیتا زیادہ خوب صورت تھی۔

''انیتا، میرے بھائی کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر چلی گئی۔ وہ اور برینڈا آج تک اس کی جدائی کے صدمے سے باہر نہیں آسکے۔ برینڈا ہر رات اسے یاد کر کے روتی۔ یہاں تک کہ ہائی اسکول میں آنے کے بعد بھی اس کی یہ کیفیت برقرار رہی۔''

میرون نے تصویر پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے کہ وہ بھاگی نہ ہو۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' میبل نے پوچھا۔

''ممکن ہے وہ کسی مصیبت میں پھنس گئی ہو۔''

میبل کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اس تصویر کو دیکھ کر کوئی بھی یقین نہیں کرسکتا کہ کوئی ماں اپنی

اتنی پیاری بچی کو چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ ایسا کرنا بہت مشکل ہے لیکن...“

”وہ خط جعلی بھی ہو سکتا ہے۔ شاید کسی نے ہوریک کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے ایسا کیا ہو؟“

”نہیں۔“

”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟“ میرون نے پوچھا۔

”انیتا مجھے فون کرتی رہتی ہے۔“

”کیا؟“ میرون سکتہ زدہ رہ گیا۔

”باقاعدگی سے تو نہیں لیکن شاید دو سال میں ایک مرتبہ وہ برینڈا کے بارے میں پوچھتی ہے۔ میں نے اسے واپس آنے کے لیے کہا لیکن وہ ٹال گئی۔“

”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ تمہیں کہاں سے فون کرتی تھی؟“

”شروع شروع میں ایسا لگا کہ وہ بہت دور سے فون کر رہی ہے... جیسے وہ سمندر پار چلی گئی ہو۔“

”آخری بار اس نے تمہیں کب فون کیا تھا؟“

”تین سال پہلے... میں نے اسے بتا دیا تھا کہ برینڈا کو میڈیکل اسکول میں داخلہ مل گیا ہے۔“

”کیا ہوریک کو اس کا علم ہے؟“

”میں نے اسے پہلے پہلے بتایا تھا لیکن یہ اس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا... پھر میں نے اسے بتانا چھوڑ دیا لیکن میرا خیال ہے کہ شاید وہ اسے بھی فون کرتی ہو۔“

”یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہی ہو؟“

”ایک مرتبہ نشے کی حالت میں اس نے ایسی کوئی بات کہہ دی تھی لیکن جب میں نے بعد میں پوچھا تو وہ مکر گیا۔ اس کے بعد میں نے بھی زور نہیں دیا۔ ہم نے کبھی انیتا کے بارے میں بات نہیں کی لیکن وہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہی۔“

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر میبل نے کہا۔ ”میں بہت تھک گئی ہوں۔ کیا ہم پھر کسی وقت اس موضوع پر بات کر سکتے ہیں؟“

”بالکل!“ وہ اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اگر تمہارا بھائی دوبارہ فون کرے...“

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”وہ فون نہیں کرے گا۔ شاید اسے ڈر ہے کہ اس کا فون سنا جائے گا اسی لیے میں نے گزشتہ ایک ہفتے سے اس کی آواز نہیں سنی۔“

میرون نے ایک کارڈ پر اپنا سیل نمبر لکھا اور میبل کو دیتے ہوئے بولا۔ ”تم اس نمبر پر مجھ سے چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت رابطہ کر سکتی ہو۔“

☆☆☆

واپسی پر میرون کی ملاقات نارم سے ہوئی جہاں برینڈا کی ٹیم پریکٹس کر رہی تھی۔ نارم اسے بتا رہا تھا۔ ”مجھے کھیلوں سے زیادہ دلچسپی نہیں لیکن اس لیگ کی وجہ سے ہماری کمپنی کے تیار کردہ ملبوسات کی مانگ بڑھ جائے گی۔ برینڈا کو کچھ ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

”اور تم سمجھتے ہو کہ کوئی تمہیں تباہ کرنا چاہتا ہے؟“ میرون نے پوچھا۔

”تم بچے نہیں ہو جو اتنی معمولی بات نہیں سمجھ سکتے۔“ نارم نے برہمی سے کہا۔ ”کاروباری دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہاں سب ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور اسی کا نام کیپٹلزم ہے۔ تم نے پی ڈبلیو بی ایل کا نام سنا ہے؟“

”نہیں۔“ میرون نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

”اس کا مطلب ہے پروفیشنل ویمن باسکٹ بال لیگ۔“

”گویا ایک اور لیگ؟“

”ہاں اور یہ اگلے سال شروع ہو گی۔“

”میرا اندازہ ہے کہ اس کے پیچھے ٹروبرو کا ہاتھ ہو گا۔“ میرون نے پُرخیال انداز میں کہا۔

”تم انہیں جانتے ہو؟“ نارم نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”انہوں نے جس شخص کو لیگ کمشنر بنایا ہے وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹا ہے لیکن باتیں بڑی بڑی کرتا ہے۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ وہ لوگ مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیں گے۔“

”پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو نارم؟“

”میں نہیں جانتا... لیکن بھاگنے اور چھپنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”کیا ٹروبرو نے اس کے علاوہ بھی کچھ کہا ہے... یا کوئی دھمکی دی ہے؟“

”نہیں لیکن تم نہیں سمجھتے کہ برینڈا کو ملنے والی دھمکیوں کا تعلق ان سے ہو سکتا ہے۔“

یہ بات سمجھ میں آتی تھی۔ پرانے بدمعاشوں نے کمائی کے لیے قانونی ذریعہ اختیار کیا تھا لیکن ایچیز جیسے لوگ زیادہ دیر سیدھے راستے پر نہیں چل سکتے اور جہاں انہیں اپنے کام میں کوئی رکاوٹ نظر آتی ہے تو وہ اپنے پرانے طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی ٹروبرو نے یہی سوچا ہو گا کہ برینڈا کو راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ اسی لیے انہوں نے دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ ہوریک اور برینڈا تک تو یہ بات سمجھ میں آتی تھی لیکن اس فون کال کو کس خانے میں فٹ کیا جائے جس میں برینڈا کی ماں کا ذکر ہوا تھا؟

دوسرا اسیشن شروع ہونے سے پہلے دو گھنٹے کا وقفہ ہوا تو برینڈا شاور لینے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد میرون کے پاس چلی آئی اور بولی۔ ”آنٹی میبل سے کچھ معلوم ہوا؟“

میرون نے میبل کے ساتھ ہونے والی گفتگو مختصراً بتائی اور اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ برینڈا ابھی اس کے ساتھ تھی۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں سینٹ بارناباس جا کر تمہارے باپ کے سپروائزر سے ملنا چاہیے۔“

میرون نے کار کا دروازہ کھولا تو وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تمہارے وقت کا معاوضہ ادا کرنا چاہیے۔“

”میں کوئی پرائیویٹ سراغ رساں نہیں ہوں اور نہ ہی گھنٹوں کے حساب سے کام کرتا ہوں۔ میں تمہیں اپنا کلائنٹ بنانا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے اپنی آفر کے بارے میں بتاؤ۔“ برینڈا نے کہا۔

”اس آفر کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ تمہاری آمدنی سے متعلق ہے۔ میں تمہارے معاہدوں کے بارے میں بات چیت کروں گا، اس کے علاوہ تم اشتہارات سے بہت کما سکتی ہو کیونکہ تم اس ملک کی بہترین کھلاڑی ہو۔ دوسرے یہ کہ میڈیکل کی طالبہ ہو اور تیسری بات کہ دیکھنے میں اچھی لگتی ہو۔ صرف ملبوسات ہی نہیں بلکہ تمہیں اور بھی کئی اسپانسرز مل سکتے ہیں... مثلاً فوڈ پروڈکٹس، ریستوران اور کاسمیٹکس بنانے والی کمپنیاں وغیرہ۔“

”اور دوسرا حصہ کیا ہے؟“

”تمہاری آمدنی کا بہتر استعمال...! میرے سبھی کلائنٹس لاک ہارن سیکیورٹیز میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ اس وقت وِن سے اچھا مالی مشیر اور کوئی نہیں۔“

”میں اس کنٹریکٹ کے تیسرے حصے کے بارے میں بھی جاننا چاہوں گی۔“

”اس کا تعلق اسپیرینزا ڈیاز سے ہے اور وہ میرے تمام معاملات دیکھتی ہے۔ میں اور بھی کئی کام کرتا ہوں لیکن اس سے مجھے بہت مدد ملتی ہے۔ میرے سبھی کلائنٹس اس سے خوش ہیں کیونکہ وہ گفتگو کا ہنر جانتی ہے۔“

نارتھ فیلڈ ایونیو کی جانب مڑتے ہوئے میرون کو یوں لگا جیسے اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو اسے ایک گرے کار اپنے عقب میں نظر آئی۔ اس نے کار کی رفتار آہستہ کی اور کار کا نمبر ذہن نشین کرنے لگا لیکن جب وہ سینٹ بارناباس میڈیکل سینٹر میں داخل ہوا تو وہ کار آگے بڑھ گئی۔

ایمان دار

ایک مرغی خانے کے مالک کو صاف ستھرے لیکن دیانت دار ملازم کی ضرورت تھی۔ ایک امیدوار آیا تو اس نے پوچھا۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم انڈے چوری نہیں کرو گے۔“

جواب ملا۔ ”آپ اس بات سے اندازہ لگالیں کہ میں نے ایک حمام میں تین سال تک ملازمت کی اور ایک مرتبہ بھی نہیں نہایا۔“

کار سے اترتے ہوئے میرون نے کہا۔ ”میں اس سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں۔ تمہاری غیر موجودگی میں وہ کھل کر بات کر سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چوتھے فلور پر کچھ مریض دیکھ لوں۔“

سپروائزر کیلون کیمبل سیکیورٹی آفس میں موجود تھا۔ میرون نے اس سے ہوریک کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ تین دن سے نہیں آ رہا اور نہ ہی اس نے کوئی فون کیا۔ لہٰذا اس نے اسے فارغ کر دیا ہے۔

”کس طرح... جب تمہارا اس سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہے؟“

”میں نے اسے فون کیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا، لہٰذا میں نے اسے خط لکھ دیا۔“

”کیا اس نے وہ خط وصول کر لیا ہے؟“ میرون نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ کیلون نے کندھے اچکائے۔ ”مجھے ابھی تک رسید نہیں ملی۔“

میرون نے اس سے دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں تاکہ ہوریک کے بارے میں مزید معلومات مل سکیں لیکن کوئی خاص نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ جب وہ اس کا شکریہ ادا کر کے جانے لگا تو کیلون نے کہا۔ ”اس کی بیٹی سے کہنا کہ وہ ہوریک کا لاکر خالی کر دے۔ میں نے نیا آدمی رکھ لیا ہے۔ اسے لاکر کی ضرورت ہو گی۔“

میرون چوتھے فلور پر آیا جہاں برینڈا ایک سات سالہ بچی کے بیڈ پر بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے گلے میں اسٹیتھ اسکوپ جھول رہا تھا۔ میرون کو اس روپ میں وہ بہت اچھی لگی اور وہ کھڑکی میں کھڑا اسے مسحور کن انداز میں دیکھتا رہا۔ جب وہ فارغ ہو کر باہر آئی تو اس کی نظر میرون پر گئی۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہوتے ہوئے بولی۔ ”تم کب سے یہاں کھڑے ہوئے ہو؟“

''زیادہ دیر نہیں ہوئی۔'' میرون نے جواب دیا۔

''کیا رہا... سپروائزر سے کچھ معلوم ہوا؟''

''کچھ خاص نہیں۔ البتہ یہاں تمہارے والد کا ایک لاکر ہے۔ کیلون چاہتا ہے کہ تم اسے خالی کردو۔''

وہ دونوں تہ خانے میں پہنچے جہاں کیلون ان کا منتظر تھا۔ اس کی مدد سے لاکر کھولا۔ کیلون نے کونے میں رکھے ہوئے خالی کارٹن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے استعمال کرسکتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میرون نے سامان نکالنا شروع کیا جس میں گندے کپڑے، بیئر کے خالی ٹن، پرانے اخبار اور یہاں تک کہ بیئر کا ایک باکس بھی شامل تھا۔ انہوں نے یہ سب چیزیں خالی کارٹن میں ڈالنا شروع کیں۔ اس کا یونیفارم بھی وہاں موجود تھا۔ میرون نے جیبوں کی تلاشی لی تو اس میں سے ایک مڑا تڑا لفافہ برآمد ہوا۔ یہ کسی وکیل کا خط تھا جس میں لکھا تھا:

''مسٹر سلاٹر!

ہمیں آپ کے خط موصول ہورہے ہیں... جیسا کہ آپ کو ذاتی طور پر بتایا جاچکا ہے کہ آپ جس معاملے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں، وہ خفیہ ہے۔ برائے مہربانی ہم سے رابطہ کرنا بند کردیں۔ آپ کا رویہ ہراساں کرنے کے مترادف ہے۔ آپ کا مخلص... تھامس کنیڈ!''

''کیا تم جانتی ہو کہ وہ کس بارے میں بات کررہا تھا؟'' میرون نے پوچھا۔

وہ تھوڑا سا ہچکچائی۔ ''نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔ ''لیکن یہ نام کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔''

''ممکن ہے کہ پہلے وہ تمہارے والد کے لیے کام کرتا رہا ہو؟''

بریںڈا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی وکیل کی خدمات حاصل کی ہوں۔''

میرون نے اپنا سیل فون نکالا اور دفتر کا نمبر ملانے کے بعد اسپیریزا سے پوچھا۔ ''ہوریک کے ٹیلی فون بل کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟''

''میرے سامنے پڑا ہے اور میں اسی پر کام کررہی ہوں۔''

میرون نے وکیل کے خط پر نظر ڈالی اور اس کا فون نمبر دُہراتے ہوئے بولا۔ ''اس نمبر پر کوئی کال ہوئی ہے؟''

''ہاں... آٹھ مرتبہ لیکن وہ سب پانچ منٹ سے کم دورانیے کی تھیں۔'' اسپیریزا نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ اس نے آرتھر بریڈفورڈ کے ہیڈکوارٹر پر بھی دو مرتبہ فون کیا تھا۔''

یہ نام سن کر میرون کا حلق کڑوا ہوگیا۔ آرتھر بریڈفورڈ نومبر میں ہونے والے گورنر کے الیکشن میں حصہ لے رہا تھا۔ اس نے فون بند کیا اور بریںڈا کو تمام تفصیل بتادی جسے سن کر وہ بھی پریشان ہوگئی اور بولی۔

''اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔ کیا تمہارے والد کو سیاست سے دلچسپی تھی؟ وہ آرتھر بریڈفورڈ یا اس کی انتخابی مہم میں حصہ لینے والے کسی فرد سے واقف تھا؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' اس نے پرانے کپڑوں کا بیگ کھولا اور بولی۔ ''اوہ میرے خدا!'' وہ ایک ریفری کی قمیص تھی جس پر سفید اور کالی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ دائیں جیب پر نیوجرسی باسکٹ بال ریفری ایسوسی ایشن لکھا ہوا تھا جبکہ بائیں جانب ایک خون کا دھبّا نمایاں تھا۔

''ہمیں پولیس کو اطلاع کرنی چاہیے۔'' میرون نے کہا۔

''انہیں کیا بتاؤ گے؟''

میرون سوچ میں پڑ گیا۔ اس قمیص میں کوئی سوراخ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کہیں سے اُدھڑی یا پھٹی ہوئی تھی۔ پھر یہ خون کا دھبّا کیسا تھا؟ اگر ہوریک کو گولی لگی ہوتی تو اس قمیص میں سوراخ ہوتا یا اس کی نکسیر پھوٹی ہوتی تو خون کے دھبّے قمیص کے دوسرے حصوں پر بھی نظر آتے۔ بس ایک ہی امکان نظر آرہا تھا کہ اس قمیص کو خون روکنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

میرون نے کوئی جواب نہیں دیا اور قمیص کو دوبارہ پلاسٹک بیگ میں ڈال کر بقیہ سامان کے ساتھ رکھ دیا۔ لاکر خالی کرنے کے بعد انہوں نے واپسی کا قصد کیا۔ میرون کی نظریں بار بار بیک ویو مرر کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کہیں وہ گرے کار ان کا تعاقب تو نہیں کررہی... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرون نے بریںڈا کو جم پر اتارا اور خود ایگل ووڈ پبلک لائبریری کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے پاس دو گھنٹے تھے اور وہ بریڈفورڈ فیملی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

لائبریری میں داخل ہوکر وہ پُراعتماد انداز میں لائبریرین کی طرف بڑھا اور بولا۔ ''میں بیس سال پہلے کے جرسی لیجر، میں سے کچھ آرٹیکلز دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری مدد کرسکو گی؟''

لائبریرین اپنی جگہ سے اٹھی اور اسے ایک مشین پر لے گئی۔ ''تم خوش قسمت ہو۔ ہم نے حال ہی میں یہ سارا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کردیا ہے۔''

میرون نے اس کے جاتے ہی انیتا سلاٹر کا نام ٹائپ کیا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا... پھر اس نے بریڈفورڈز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ ساٹھ کی دہائی میں آرتھر بریڈفورڈ کا باپ ریاست کا گورنر رہ چکا تھا اور اب خود آرتھر اس عہدے کا امیدوار تھا۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی چانس بھی تھا۔ بوڑھا بریڈفورڈ ساٹھ کی دہائی میں یہاں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آدھے قصبے کا مالک بن گیا۔ وہ سستے داموں زمین خریدتا اور انہیں چھوٹے چھوٹے پلاٹوں میں تقسیم کرکے تعمیراتی کمپنیوں کے ہاتھوں فروخت کردیتا۔ اس کی اپنی رہائش پرانے فارم ہاؤس میں تھی جسے اس کی بیوی نے بڑے عالی شان طریقے سے سجایا تھا۔

میرون نے 1978ء کے بعد کا ریکارڈ دیکھنا شروع کیا جب انیتا غائب ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اسی زمانے میں آرتھر بریڈفورڈ کی بیوی ایلزبتھ کا بھی انتقال ہوا تھا۔ اس نے اموات کے خانے میں دیکھنا چاہا لیکن اس کی موت کی وجہ معلوم نہ ہوسکی۔ ایلزبتھ بریڈفورڈ تیسری منزل پر واقع بالکونی سے نیچے گر گئی تھی اور اس کا سر اینٹوں کے بنے ہوئے فرش سے جا ٹکرایا۔ پولیس نے اسے دردناک حادثہ قرار دیتے ہوئے فائل بند کردی۔ میرون کو یاد آیا کہ کچھ دنوں تک لوگ اس بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ مثلاً یہ کہ مارچ کے مہینے میں وہ بالکونی میں کھڑی کیا کررہی تھی؟ کیا وہ نشے کی حالت میں تھی یا اسے کسی نے دھکا دیا تھا؟ لیکن یہ سب وقتی باتیں تھیں۔ چند دن بعد لوگ سب کچھ بھول گئے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ واقعہ انیتا کے غائب ہونے سے نو ماہ پہلے پیش آیا تھا۔

میرون نے 18 مارچ 1978ء کے بعد کے اخبارات دیکھنا شروع کیے پھر اس کی نظر بس ایک لائن پر جم کر رہ گئیں۔ بہ ظاہر اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر توجہ دی جاتی لیکن میرون کے لیے یہ بے حد اہم اشارہ تھا۔ ''مسز بریڈفورڈ کی لاش سب سے پہلے صبح ساڑھے چھ بجے ایک ملازمہ نے دیکھی جو کام کے لیے بریڈفورڈ اسٹیٹ پہنچی تھی۔''

میرون سوچ میں پڑ گیا۔ 'وہ ملازمہ کون تھی؟'

اس نے میبل کا نمبر ملایا اور پوچھا۔ ''تمہیں ایلزبتھ بریڈفورڈ یاد ہے؟''

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں!''

''کیا انیتا نے ہی سب سے پہلے اس کی لاش دیکھی تھی؟ اس نے تمہیں اس بارے میں کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں، وہ صدمے کی کیفیت میں تھی اور اس نے اس بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب رپورٹرز نے اسے فون کیا، تب بھی وہ خاموش ہی رہی۔''

''مسز ایڈورڈ! کیا تمہارے بھائی نے کبھی تھامس کنیڈ نامی وکیل کا تذکرہ کیا تھا؟''

''نہیں۔'' میبل نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

میرون نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔ کچھ دیر بعد اس کے فون کی بیل بجی۔ دوسری جانب فون کمپنی سے لیزا بول رہی تھی۔ ''مسٹر میرون! آپ کے لیے ایک عجیب اطلاع ہے۔''

میرون چونکا۔ ''کیسی اطلاع؟''

لیزا بولی۔ ''آپ نے مجھے بریںڈا کا فون ٹریس کرنے کے لیے کہا تھا لیکن کوئی مجھ سے بھی زیادہ تیز نکلا۔ اس کا فون پہلے ہی ٹیپ کیا جارہا ہے۔ اس کا نمبر بلاک ہوچکا ہے۔ اب میں اس کا نمبر ٹریس کرسکتی ہوں اور نہ ہی کمپیوٹر سے پرانا ریکارڈ دیکھ سکتی ہوں۔ لگتا ہے کہ اس کے پیچھے کسی قانون نافذ کرنے والی ایجنسی کا ہاتھ ہے۔ میں جاننے کی کوشش کررہی ہوں لیکن کامیابی کی امید کم ہے۔''

''پلیز لیزا! کوشش جاری رکھو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ!''

میرون نے واقعات کی کڑیاں ملانے کی کوشش کی۔ پہلے باپ غائب ہوا پھر بریںڈا کو دھمکی آمیز فون ملنے لگے۔ اس کا تعاقب کیا گیا اور اب فون ٹیپ کیا جارہا ہے۔ کیا دھمکیاں دینے والا اور فون ٹیپ کرنے والا ایک ہی ہے؟ کیا اس طرح وہ اس کے باپ تک پہنچنا چاہتا ہے؟ اگر صرف یہی بات تھی تو بریںڈا سے یہ کیوں کہا گیا کہ وہ اپنی ماں کو فون کرے؟ اگر بریںڈا کو معلوم ہوتا کہ اس کی ماں کہاں چھپی ہوئی ہے تو اس طرح فون ٹریس کرنے والا انیتا تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ میرون الجھ کر رہ گیا۔ انہیں ہوریک کی تلاش ہے یا انیتا کی؟

میرون واپس جم آیا۔ بریںڈا اس کا انتظار کررہی تھی۔ کار میں بیٹھتے ہی میرون نے بتایا کہ اس کا فون ٹیپ کیا جارہا ہے۔ کچھ لوگ اس کے باپ کی تلاش میں ہیں۔ انہوں نے ہی میبل پر حملہ کیا تھا اور اب اس کا بھی نمبر آسکتا ہے۔

''تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟''

''سب سے پہلے تمہارا کمرا چیک کرنا ہوگا تاکہ وہاں سے وہ آلہ ہٹایا جاسکے۔ دوسری بات یہ کہ تم کچھ عرصے کے لیے وہ کمرا چھوڑ دو۔ میرے خیال میں تم وہاں محفوظ نہیں ہو۔''

"میں چیرائل سٹن کے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ وہ دوسری ٹیم کی کیپٹن ہے۔"

"یہ مناسب نہیں ہوگا۔ وہ تمہارا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے تمہارے فون بھی سنے ہوں گے اور تمہارے دوستوں کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے... اور یہ امکان موجود ہے کہ وہ وہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"پھر مجھے کہاں ٹھہرنا چاہیے؟"

"میں نے تمہیں اپنے ایک دوست وِن کے بارے میں بتایا تھا۔ تم ایک رات کے لیے وہاں رہ سکتی ہو۔ اس کے پاس اور بھی محفوظ ٹھکانے ہیں۔ ہم تمہارے لیے کوئی جگہ تلاش کرلیں گے۔"

"ٹھیک ہے... لیکن تم جانتے ہو کہ یہ لیگ میرے اور میری ٹیم کے لیے بہت اہم ہے۔ ایسی صورت میں پریکٹس کرنا اور اتوار والے دن میچ کھیلنا ممکن ہوگا؟"

"بالکل!" میرون نے اسے یقین دلایا۔

میرون نے گاڑی کا رخ اس کی رہائش گاہ کی طرف موڑ دیا۔ وہ نیچے ہی کھڑا رہا۔ برینڈا اپنا سامان لینے گئی۔ اس نے اپنے سوئٹ میں رہنے والی لڑکی کے نام رقعہ لکھا کہ وہ چند دنوں کے لیے کسی دوست کے پاس جارہی ہے۔ دس منٹ سے بھی کم وقت میں وہ واپس آگئی۔ اس کے کندھوں پر دو بیگ لٹک رہے تھے۔ میرون نے ان میں سے ایک لے لیا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھے تو میرون کی نظر ایف جے پر گئی جو اس کی کار کے برابر میں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دونوں باڈی گارڈز بھی تھے۔

ایف جے تھوڑا سا جھکا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہیلو برینڈا... ہیلو میرون!"

میرون نے حیرانی سے اسے دیکھا اور بولا۔ "تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟"

"ہاں، ہم دونوں پریپ کلاس میں ساتھ پڑھتے تھے۔"

"ہم تمہارے لیے کیا کرسکتے ہیں؟" میرون نے پوچھا۔

"میں صرف یہ یقین دہانی چاہتا ہوں کہ مس برینڈا میرے ساتھ کیے گئے معاہدے پر قائم ہیں؟"

"میں نے تمہارے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں کیا۔" برینڈا بولی۔

"کیا ہوریک، تمہارا ایجنٹ نہیں تھا؟"

"نہیں! میرا ایجنٹ میرون ہے۔"

"اوہ! مجھے کچھ اور ہی اطلاع ملی تھی۔" ایف جے مکاری سے مسکرادیا۔ "میرون سے پہلے تمہارا باپ ہی یہ کام کرتا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ اس معاہدے پر دستخط کیے تھے جس کے مطابق برینڈا ڈبلیو پی بی اے کے بجائے پی ڈبلیو بی ایل کے لیے کھیلے گی۔"

میرون نے پوچھا۔ "کیا اس معاہدے پر مس برینڈا کے دستخط موجود ہیں؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ اس کے باپ نے..."

میرون نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ "اس معاملے میں اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ برینڈا نے دستخط کیے تھے یا نہیں؟"

"نہیں۔"

"پھر ایسا کوئی معاہدہ قابلِ عمل نہیں۔ بہرحال، مجھے یہ ملاقات یاد رہے گی۔" میرون نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ایف جے کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "اگر تم واقعی اس کے ایجنٹ ہو تو اس کی خاطر تمہیں مجھ سے بات کرنی ہوگی۔"

"میرے دفتر فون کرکے ملاقات کا وقت طے کرلو۔"

یہ کہہ کر میرون اور برینڈا کار میں بیٹھ گئے۔ ایف جے نے میرون سے کہا۔ "تم ہم سے معاہدہ کرو یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... لیکن جب میں تمہیں قتل کروں گا تو وہ واقعی ایک تفریح ہوگی۔"

☆☆☆

وہ دونوں وِن کے پاس پہنچے تو اس نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ میرون نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم آرتھر بریڈفورڈ سے ملے ہو؟"

"ہاں، کئی مرتبہ... میں اس کے ساتھ گالف کھیلتا رہا ہوں۔ اس کے بھائی سے بھی ایک مرتبہ ملاقات ہوئی ہے۔"

"کیا اس سے میری ملاقات کا بندوبست کرسکتے ہو؟"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ وہ لوگ اکثر مجھ سے چندے کے لیے رابطہ کرتے رہتے ہیں... لیکن آرتھر بریڈفورڈ کا ذکر کہاں سے آگیا؟" وِن نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

میرون نے دن بھر میں پیش آنے والے واقعات سے اسے آگاہ کیا۔ مشکوک کار کا تعاقب کرنا، فون ٹیپ ہونا، خون آلود قمیص، ہوریک کا بریڈفورڈ کے دفتر فون کرنا، ایف جے سے ملاقات، ایلزبتھ بریڈفورڈ کا قتل اور انیتا سلاٹر کا سب سے پہلے اس کی لاش دیکھنا... وغیرہ وغیرہ۔

وِن بالکل بھی متاثر نہیں ہوا اور کہنے لگا۔ "کیا تم واقعی بریڈفورڈ کے ماضی اور انیتا کے حال میں کوئی تعلق محسوس کرتے ہو؟"

"ممکن ہے۔"

"اگر تمہارے شبہات درست ہیں، تب بھی یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ انیتا سلاٹر نو مہینے تک وہاں کیا کرتی رہی؟ اگر بریڈفورڈ کو اس پر ذرا سا بھی شک ہوتا تو وہ فوراً ہی اسے راستے سے ہٹا دیتا۔ اس لیے مجھے ان دونوں واقعات میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔"

برینڈا بولی۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میری ماں کو اس وقت کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی ہو لیکن بعد میں گھر کی صفائی کے دوران کسی دراز یا الماری سے کوئی ایسی چیز ہاتھ لگ گئی ہو جس کا تعلق ایلزبتھ کی موت سے ہو اور وہ اس نتیجے پر پہنچی ہو کہ وہ محض ایک حادثہ نہیں تھا... لیکن اس کے باوجود بہت سے سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ میری ماں کو اس طرح بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس نے میرے باپ کے نام خط کیوں لکھا کہ وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ جارہی ہے؟ وہ سارا پیسا لے کر کیوں گئی... اور سب سے بڑھ کر اس بیٹی کو چھوڑ دیا جس سے وہ بہت محبت کرتی تھی؟"

"ممکن ہے وہ اپنی بیٹی کو کسی نقصان سے بچانا چاہتی ہو اور چاہتی ہو کہ اس کا شوہر اسے تلاش نہ کرے۔"

"میں تمہاری کوششوں کی تعریف کرتی ہوں لیکن ذرا سوچو، وہ بیس سال پہلے چلی گئی تھی اور اس دوران اس نے مجھے دو خط لکھے اور آنٹی کو فون کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے کوئی راستہ نہیں نکال سکتی تھی؟ کم از کم ایک بار ہی سہی!"

وِن اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ "میں آرتھر بریڈفورڈ کو فون کرکے ملاقات کا وقت طے کرتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے بتایا کہ اگلے روز دس بجے کا وقت طے ہوا ہے۔ اس نے ان دونوں کو اپنے گھر ٹھہرنے کی دعوت دی اور برینڈا کو بتایا کہ وہ کوریڈور کے آخری سرے پر واقع بیڈروم میں قیام کرسکتی ہے۔ برینڈا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گڈ نائٹ کہہ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وِن نے پوچھا۔

"تمہارا کیا مسئلہ ہے جس پر مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے؟"

"اسپیرینزا میری پارٹنر بننا چاہتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟"

"وہ تمہاری بہترین دوست ہے... لیکن تم بھول رہے ہو کہ اب وہ محض تمہاری ملازمہ ہے اور اس فیصلے میں تمہاری دوستی بے معنی سمجھی جائے گی۔"

"میں اسے ترقی دے سکتا ہوں، اس کے لیے نیا دفتر بنا سکتا ہوں، اس کی ذمے داریوں میں اضافہ کرکے منافع میں حصے دار بنا سکتا ہوں... لیکن وہ پارٹنر سے کم کسی بات پر راضی نہیں... جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ دوستوں اور فیملی میں پارٹنرشپ کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ میرے باپ اور اس کے بھائی کے درمیان اسی پارٹنرشپ کی وجہ سے بات چیت بند ہے۔ میں ایسی صورتِ حال میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن اسپیرینزا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی۔ اس نے مجھے ایک ہفتے کا وقت دیا ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ تم ہی کوئی حل بتاؤ۔"

"مجھے تمہاری دلیل سے اتفاق نہیں ہے۔" وِن مسکراتے ہوئے بولا۔ "شادی سے بڑھ کر کوئی معاہدہ اہم نہیں ہوتا لیکن بیشتر شادیاں ناکام ہوجاتی ہیں۔ اس طرح تو لوگ شادی کرنا ہی چھوڑ دیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سارا مسئلہ اعتماد اور بھروسے کا ہے۔ اسی کے مطابق ہم لوگ اپنی اپنی پوزیشن تبدیل کرتے رہتے ہیں۔"

میرون فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکا۔ اسے نیند آرہی تھی۔ وہ اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ راستے میں برینڈا کا کمرا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کورس کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ برینڈا نے آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا اور مسکرادی۔

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں۔"

"اوکے، گڈ نائٹ!"

"گڈ نائٹ!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میرون کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی۔

☆☆☆

دوسری صبح وہ لوگ وِن کی جیگوار میں بریڈفورڈ اسٹیٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ برینڈا کو پریکٹس کے لیے جانا تھا اس لیے وہ راستے میں اتر گئی۔ اسٹیٹ کے داخلی دروازے پر ایک محافظ نے ان کا استقبال کیا اور ان کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ فارم ہاؤس پر ایک بوڑھے سیاہ فام نے دروازہ کھولا اور وہ اس کے پیچھے چل دیے۔ کوریڈور میں دو محافظ کھڑے تھے۔ ان میں ایک طویل قامت اور دوسرا چھوٹے قد کا تھا۔ ان کا حلیہ میبل کے بتائے ہوئے حملہ آوروں جیسا تھا لیکن اس کی تصدیق تب ہی ہوسکتی تھی جب وہ ان کے بازو پر ٹیٹو دیکھ سکتا جو اس وقت ممکن نہ تھا۔

بٹلر انہیں لائبریری تک لے گیا جس کی تمام دیواریں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ لگتا تھا جیسے کسی نے انہیں ہاتھ

بھی نہیں لگایا۔ جابجا پرانے جہازوں کی پینٹنگز بھی آویزاں تھیں اور کمرے کے وسط میں قدیم طرز کا گلوب لٹک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دوسری جانب کا دروازہ کھلا اور آرتھر بریڈفورڈ اپنے بھائی چانس کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کا قد چھ فٹ چھ انچ تھا جبکہ سر کے بال غائب تھے۔ چانس کا قد چھ فٹ سے کم تھا اور وہ خوش شکل ہونے کی وجہ سے کم عمر لگتا تھا۔

آرتھر نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ”وِنڈسر! تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔“ وِن کو بھی اخلاقاً مسکرانا پڑا۔ ”کیا تم میرون بولیٹر سے واقف ہو؟“

”ہم پہلے کبھی نہیں ملے لیکن نیوجرسی میں سبھی لوگ میرون بولیٹر کو جانتے ہیں۔ میں تمہیں اس وقت سے کھیلتا ہوا دیکھ رہا ہوں جب تم ہائی اسکول میں تھے اور تمہارا بہت بڑا فین ہوں۔“

میرون کو اس کے جھوٹ بولنے پر صدمہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ دونوں بھائیوں میں سے کسی نے کبھی لیونگسٹن ہائی اسکول کے جمنازیم میں قدم تک نہیں رکھا تھا۔

تعارف کے بعد کافی کا دور چلا پھر آرتھر نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں کو یہاں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔ تمہاری حمایت ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں تو ضرور بتاؤ۔ مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔“

”دراصل مسٹر بریڈفورڈ...“

”تم مجھے آرتھر کہہ کر بلا سکتے ہو۔“

”کیا تمہیں انیتا سلاٹر نام کی عورت یاد ہے؟“

یہ بات سنتے ہی دونوں بھائی اپنی جگہ پر اس طرح ساکت ہوگئے جیسے کسی نے ان پر گن تان لی ہو پھر انہوں نے جلد ہی اپنے آپ پر قابو پالیا۔ آرتھر نے بھائی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کچھ یاد نہیں آرہا۔“

”بیس سال پہلے وہ ملازمہ کی حیثیت سے یہاں کام کرتی تھی۔“ میرون نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی۔

”ممکن ہے لیکن میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ یہ معاملات میری والدہ دیکھتی تھیں۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس نے یہاں سے ملازمت کیوں چھوڑی؟“ میرون نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

آرتھر کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس نے بھائی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”یہ کوئی خاص بات نہیں... ملازم تو آتے جاتے رہتے ہیں۔“

”وہ خود چلی گئی یا اسے نکالا گیا تھا؟“

”میری والدہ بہت رحم دل خاتون ہیں۔ اس کا امکان بہت کم ہے کہ اسے نکالا گیا ہو۔“

میرون نے دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی فیملی کے مطابق وہ جب غائب ہوئی، تب بھی یہیں کام کررہی تھی۔“

”مجھے افسوس ہے کہ اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکوں گا کیونکہ میری والدہ ہی ان معاملات کو دیکھتی تھیں۔“

”ایسی صورت میں مجھے ان سے ہی بات کرنا ہوگی۔“

”یہ ممکن نہیں۔ ان کی عمر اسّی سال سے زیادہ ہے اور وہ بیمار ہیں۔“

”ہوریک سلاٹر کو جانتے ہو؟“ میرون نے پوچھا۔

”نہیں، ممکن ہے کہ وہ انیتا کا کوئی رشتے دار ہو۔“

”وہ اس کا شوہر ہے اور یہ بات تمہیں بھی معلوم ہو گی۔ اس کے علاوہ وہ تمہارے دفتر فون بھی کرتا رہتا ہے۔“

چانس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”بہت سے لوگ ہمارے ہیڈ کوارٹر فون کرتے رہتے ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں۔“

میرون اور وِن جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دروازے پر پہنچ کر میرون مڑا اور آرتھر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”بڑی عجیب بات ہے کہ تم انیتا سلاٹر کو بھول گئے۔“

آرتھر اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”ہمارے یہاں کئی لوگ برسوں سے کام کررہے ہیں۔ ہر ایک کو یاد رکھنا بہت مشکل ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے تمہاری بیوی کی لاش دیکھی ہوگی؟“

دونوں بھائی اس بات پر ایک بار پھر گنگ رہ گئے۔ میرون ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

فارم ہاؤس سے باہر آنے کے بعد میرون نے وِن سے کہا۔ ”یہ لوگ ضرور کچھ چھپا رہے ہیں۔“

”اب تم کیا کرو گے؟“ وِن نے پوچھا۔

”ہمیں ایلزبتھ بریڈفورڈ کی بے وقت موت کے بارے میں تحقیقات کرنی ہوں گی۔ تم گاڑی ساؤتھ ایونیو کی جانب لے چلو۔“

میرون پولیس اسٹیشن پہنچا۔ وہاں اس کی اسکول کے زمانے کی کلاس فیلو فرینکن نیگلے بطور آفیسر تعینات تھی لیکن ڈیوٹی پر موجود سارجنٹ نے بتایا کہ وہ لنچ کے لیے رنڈ ڈائنر گئی

ہوئی ہے۔ میرون اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا جبکہ وِن کار میں بیٹھا رہا۔ وہ کاؤنٹر کے ساتھ ایک اسٹول پر بیٹھی برگر کھا رہی تھی۔ میرون کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری۔ وہ کچھ دیر اسکول کے ساتھیوں کی باتیں کرتے رہے پھر میرون نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

”تمہیں ایلزبتھ بریڈفورڈ کی موت یاد ہے... ان دنوں ہم ہائی اسکول میں ہوا کرتے تھے؟“

”کچھ کچھ!“

”کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ کیس کس نے ہینڈل کیا تھا؟“

”سراغ رساں وکنز نے۔ وہ اب ریٹائر ہو چکا ہے لیکن وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔“

”کیا اس کیس کی فائل اب بھی پولیس اسٹیشن میں ہوگی؟“

”اس واقعے کو کتنا عرصہ ہو گیا؟“

”بیس سال ہو چکے ہیں۔“

”ممکن ہے پرانے ریکارڈ میں ہو... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ وہ چونکتے ہوئے بولی۔

”مجھے اس کی ضرورت ہے۔“ میرون بولا۔

”اور تم چاہتے ہو کہ میں وہ فائل تمہیں دے دوں؟ تم جانتے ہو کہ وہ کتنے طاقت ور لوگ ہیں؟ آرتھر گورنر کا الیکشن لڑ رہا ہے۔ تم اسے نقصان پہنچانا چاہتے ہو یا کوئی اور وجہ ہے؟“

”میں صرف یہ تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ وہ واقعی ایک حادثہ تھا یا نہیں۔“

”کیا تمہارے ذہن میں اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟“

”ہاں، مجھے تھوڑا سا شبہ ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں، اگر تمہیں کچھ معلوم ہو جائے تو پہلے مجھے بتانا۔ پریس یا محکمے والوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

☆☆☆

میرون واپس آیا تو وِن نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”مبارک ہو! بریڈفورڈ کے آدمی حرکت میں آگئے ہیں۔ کچھ دیر پہلے وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں سے گزرے ہیں۔ ممکن ہے کسی سنسان جگہ پر وہ ہمارا راستہ روکیں اور ہمیں اٹھالیں۔“

”تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”مجھے دو بجے تک دفتر پہنچنا ہے۔“ وِن نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے برینڈا کے پاس چھوڑ دو۔“

وہ راستے میں مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے پھر اچانک ہی میرون کو کچھ یاد آگیا۔ اس نے وِن سے کہا۔ ”ہوریک کے پاس صرف دو کریڈٹ کارڈز تھے۔ کیا تم انہیں چیک کر سکتے ہو؟“

وِن نے سر ہلا دیا اور اسے برینڈا کے پریکٹس کورٹ میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہاں تقریباً نصف درجن لوگ بیٹھے پریکٹس میچ دیکھ رہے تھے۔ میرون بھی سامنے والی قطار میں بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی کوچ جین پوڈج وہاں آئی اور بولی۔ ”ہمارے ایک کھلاڑی کا بازو مڑ گیا ہے اور ہمیں ایک کھلاڑی کی ضرورت ہے۔ تم اسٹور میں جا کر لباس تبدیل کرلو۔“

”میرے گھٹنے میں تکلیف ہے۔“ میرون نے بہانہ بنایا۔

”ٹرینر تمہارے گھٹنے کے گرد بینڈیج باندھ دے گا۔ چلو، جلدی کرو۔“

میرون کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسی دوران برینڈا بھی وہاں آگئی۔ میرون نے اسے بتایا کہ وہ میچ میں حصہ لینے کے لیے لباس تبدیل کرنے جارہا ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ چل دی۔ اس نے میرون کو بتایا۔ ”جس وکیل نے ڈیڈی کو خط لکھا تھا، تھامس کنیڈ... مجھے یاد آیا کہ اس کا نام پہلے بھی سن رکھا ہے۔ جب مجھے بارہ سال کی عمر میں پہلا وظیفہ ملا تو وہی میرے چیک پر دستخط کیا کرتا تھا۔“

”کیا تمہیں وظیفہ ملتا تھا؟“ میرون نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، میں اسے ٹیوشن فیس، بورڈنگ اور کتابوں وغیرہ کے اخراجات لکھ کر بھیج دیتی تھی اور وہ میرا چیک سائن کر دیتا تھا۔ یہ سلسلہ ہائی اسکول تک چلتا رہا۔ اب مجھے میڈیکل کالج کے لیے دوسرا اسکالرشپ مل رہا ہے جسے رک پیٹرسن ڈیل کرتا ہے۔“

”تم میرا ایک کام کرو گی؟ مجھے کچھ ضروری فون کرنے ہیں، تم اتنی دیر کے لیے میری جگہ کورٹ میں چلی جاؤ۔“ برینڈا کے جانے کے بعد اس نے ڈریس تبدیل کیا اور ٹرینرز روم میں آکر دفتر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف اسپیرینزا موجود تھی۔

”کیا تمہارے پاس ہوریک کی فون کالز کا ریکارڈ موجود ہے؟“

”ہاں۔“

”ذرا دیکھ کر بتاؤ کہ اس نے رک پیٹرسن نامی کسی وکیل کو فون کیا تھا؟“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر اسپیرینزا بولی۔ ”ہاں! اس نمبر پر پانچ مرتبہ فون کیا گیا تھا۔“

میرون کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور بولا۔ ''کوئی اور پیغام؟''

''تمہاری چہیتی کا دو مرتبہ فون آچکا ہے۔'' اس کا اشارہ جیسیکا کی جانب تھا۔ ''وہ یہاں کیوں فون کرتی ہے؟ کیا اسے تمہارا اسیل نمبر معلوم نہیں؟''

''وہ کیا کہہ رہی تھی؟''

''تم اسے فون کرلو۔ وہ بیورلے ولشائر کے کمرا نمبر 618 میں مقیم ہے۔''

''اس کے علاوہ کوئی اور پیغام؟''

''تمہاری ممی کا فون آیا تھا۔ آج رات ڈنر پر مر جانا نہ بھولنا۔ ڈیڈی نے باربی کیو کا انتظام کیا ہے۔''

میرون نے اس کا شکریہ ادا کیا اور فون بند کر دیا۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ جیسیکا نے اسے دو مرتبہ فون کیا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر جیسیکا کے ہوٹل کا نمبر ملایا جو اسپیریتزا نے ازراہِ عنایت اسے لکھوا دیا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میرون نے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

''میرے پاس کچھ اچھی خبریں ہیں۔'' وہ چہکتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ہالی ووڈ کا ایک اسکرپٹ مل گیا ہے۔ اب میں ویک اینڈ پر ہی گھر آیا کروں گی۔ البتہ اگر تم چاہو تو درمیان میں وقت نکال کر آسکتے ہو۔''

میرون نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم یہ خبر سن کر خوش نہیں ہوگے۔ میں بھی تمہیں پاگلوں کی طرح مس کروں گی لیکن یہ بہت بڑا موقع ہے جسے میں نہیں کھونا چاہتی۔''

''پلیز! گھر آجاؤ۔'' میرون نے التجا کی۔ ''ایسا مت کرو۔ اس طرح ہمارے درمیان فاصلے بڑھ جائیں گے۔''

''تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟'' جیسیکا نرم لہجے میں بولی۔ ''تم ابھی تک خوف زدہ ہو؟''

''اور تم اس خوف کو مزید بڑھا رہی ہو۔'' میرون نے چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ گھر آجاؤ۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

اسی دوران کوچ نے اس کا نام پکارا۔ جیسیکا بولی۔ ''مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے ہم بعد میں بات کریں گے۔''

برینڈا اسے دروازے میں ملی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گئی۔ ''میرون! کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

جب وہ دونوں کورٹ کے کنارے پر پہنچے تو سائڈ لائن پر دو آدمیوں کو کھڑے دیکھا۔ میرون انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ پولیس والے ہیں۔ کسی نے میرون اور برینڈا کی طرف اشارہ کیا تو وہ دونوں ان کے پاس آگئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''کیا تم ہی برینڈا اسلاٹر ہو؟''

''ہاں۔'' برینڈا نے جواب دیا۔

''میرا نام ڈیوڈ بیب ہے اور یہ میرا ساتھی مائک رِتسکی ہے۔ ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔ کیا تم ہمارے ساتھ چلنا چاہو گی؟''

میرون ایک قدم آگے بڑھا اور بولا۔ ''کس سلسلے میں؟''

''تم کون ہو؟'' ایک پولیس والے نے پوچھا۔

''میرا نام میرون بولیٹر ہے اور میں مس برینڈا کا اٹارنی ہوں۔''

پولیس والے نے ایک نظر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولا۔ ''لگتے تو نہیں ہو۔''

''میں اس وقت کھیل رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم مس برینڈا کو پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتے ہیں۔''

میرون نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ دونوں پولیس کار میں سوار ہوگئے۔ مضافاتی علاقے میں واقع یہ پولیس اسٹیشن آبادی سے الگ تھلگ تھا۔ ان دونوں کو تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا۔ دونوں پولیس والے انہیں وہاں بٹھا کر چلے گئے۔ برینڈا نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، ہمیں کس لیے یہاں لایا گیا ہے؟''

میرون کندھے اچکا کر رہ گیا۔ دس منٹ بعد ایک مرد اور ایک عورت کمرے میں داخل ہوئے۔ عورت نے مسکرا کر دیکھا اور بولی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ میرا نام ڈیٹیکٹو مورین میکلالین ہے اور یہ ڈیٹیکٹو ڈان ٹائلز ہے۔'' پھر وہ بولی۔ ''مس سلاٹر! کیا میں تمہیں برینڈا کہہ سکتی ہوں؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' برینڈا نے جواب دیا۔

''برینڈا! میں تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتی ہوں۔''

''کس سلسلے میں؟'' میرون نے احتجاج کیا۔

''انہیں بتادو۔'' ٹائلز نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

''برینڈا! کیا تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟'' میکلالین نے پوچھا۔

برینڈا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی۔ ٹائلز نے ایک بار پھر کہا۔ ''انہیں بتادو۔''

میکلالین کی نگاہیں برینڈا پر جم کر رہ گئیں۔ وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہمیں اس کی لاش تین گھنٹے پہلے ملی ہے۔''

برینڈا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا جیسے اس کی سانس رک گئی ہو۔ میرون نے مضبوطی سے میز کو تھام لیا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ یہ بہت مشکل وقت ہے۔'' میکلالین نے کہا۔ ''لیکن کچھ سوالات پوچھنا ضروری ہیں۔''

برینڈا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اسے کیسے قتل کیا گیا؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اسے قتل کیا گیا ہے؟'' ٹائلز نے کہا۔ ''ہم نے تو صرف یہ بتایا تھا کہ تمہارا باپ مر چکا ہے۔''

''جس انداز میں تم لوگ ہمیں یہاں لے کر آئے ہو، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔'' میرون نے کہا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ اسے کیسے قتل کیا گیا؟''

''اسے بہت قریب سے سر میں گولی ماری گئی ہے۔'' میکلالین نے کہا۔

''لگتا ہے کہ وہ قاتل کو جانتا تھا اور اس پر بہت بھروسا کرتا تھا۔'' ٹائلز بولا۔

''برینڈا! تم آخری بار اپنے باپ سے کب ملی تھیں؟'' میکلالین نے پوچھا۔

''ان کے کسی سوال کا جواب مت دینا۔'' میرون نے تنبیہہ کی۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' ٹائلز نے کہا۔ ''ہم میڈیا کو بتا دیں گے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون نہیں کر رہی ہو۔''

''تم آخری بار اپنے باپ سے کب ملی تھیں؟'' میکلالین نے اپنا سوال دُہرایا۔

میرون کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن برینڈا نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''نو دن پہلے۔''

''برینڈا... پلیز! بتاؤ۔ اس ملاقات کے دوران کیا ہوا تھا؟ میرے پاس ایک تحریری شکایت موجود ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک کاغذ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دستخط تمہارے ہی ہیں؟''

''ہاں۔'' برینڈا نے کہا۔

''اس کے مطابق جب تم اپنے باپ سے ملنے گئیں تو اس نے تم پر حملہ کر دیا تھا... کیا یہ صحیح ہے؟''

''ہاں، اس نے مجھے دھکا دیا تھا۔''

''کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' برینڈا نے جواب دیا۔

''بس اتنا کافی ہے۔ ہم جا رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر میرون نے برینڈا کا بازو پکڑا۔ یہ دیکھ کر ٹائلز فوراً ہی ان کا راستہ روکنے کے لیے دروازے پر کھڑا ہوگیا۔

میکلالین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں برینڈا... لیکن یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ تمہارے باپ کی لاش کچھ دیر پہلے ملی ہے اور ابھی اس کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا ہے... لیکن میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اسے مرے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم دونوں باپ بیٹی میں اختلافات تھے۔ نو دن پہلے تم اس سے ملنے گئیں۔ اس نے تم پر حملہ کیا اور تم نے کورٹ سے آرڈر لے لیا کہ وہ تم سے دور رہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تمہارے باپ نے اس آرڈر کی تعمیل نہیں کی۔ کیا ایسا ہی ہوا تھا؟''

میرون بولا۔ ''کوئی جواب مت دینا۔''

''وہ تمہیں اس نافرمانی کی سزا دینا چاہتا تھا اور جب وہ تمہارے پیچھے آیا تو تم نے اپنے دفاع میں اس پر گولی چلا دی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا... لیکن اگر تم سچ نہیں بتاؤ گی تو میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔''

''کیا یہ اپنے باپ کی لاش دیکھ سکتی ہے؟'' میرون نے پوچھا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' میکلالین نے جواب دیا۔ ''ہم فنگر پرنٹس کے ذریعے لاش کی شناخت کر چکے ہیں۔''

''کیا تم برینڈا کو یہ موقع نہیں دو گی کہ وہ اپنے باپ کی لاش دیکھ سکے؟''

''ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں وہاں لے چلتے ہیں۔''

☆☆☆

میڈیکل ایگزامنر کا دفتر ایک چھوٹی سی عمارت میں واقع تھا۔ میرون اس سے پہلے بھی ایک دفعہ یہاں آچکا تھا جب جیسیکا کے باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں سیکیورٹی گارڈ کی وردی پلاسٹک بیگ میں رکھی ہوئی تھی اور وسط میں ایک میز پر ہوریک کی لاش تھی۔ میڈیکل ایگزامنر نے چادر ہٹائی۔ لاش پر نظر پڑتے ہی برینڈا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور گالوں پر سے آنسو صاف کرنے لگی۔

''بس اتنا کافی ہے۔'' میکلالین نے کہا۔

میڈیکل ایگزامنر نے لاش کو دوبارہ ڈھانپنا چاہا لیکن میرون نے اسے روک دیا۔ اس نے غور سے لاش کو دیکھا اور میڈیکل ایگزامنر سے پوچھا۔ ''گولی کا زخم تو سر کے پیچھے ہو گا... لیکن اس کے داہنے گال پر یہ کیسا نشان ہے؟''

میڈیکل آفیسر بوکھلا گیا۔ ''دراصل ہم نے ابھی تک

لاش کا مکمل طور پر تجزیہ نہیں کیا اور پوسٹ مارٹم سے پہلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''یہ زخم کا نشان ہے۔'' میرون بولا۔ ''اور یہ چوٹ اسے گولی لگنے سے پہلے لگی ہے۔ اس کی ناک پر بھی ضربیں آئی ہیں۔''

میکلالین نے ڈاکٹر کو جواب دینے سے منع کر دیا۔ میرون نے برینڈا کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''ہم ٹیکسی سے چلے جائیں گے۔''

باہر آنے کے بعد برینڈا نے پوچھا۔ ''کچھ سمجھ میں آیا... ان سب باتوں کا کیا مقصد تھا؟''

''وہ تم سے اعترافِ جرم کروانا چاہ رہے تھے اور یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں وہ انہی زخموں کو تمہارے خلاف استعمال کرتے کہ تمہارے ساتھی نے ہوریک پر حملہ کیا۔ شاید اسی لیے انہوں نے بوائے فرینڈ والی بات کہی تھی۔''

''گویا ان کا خیال ہے کہ ڈیڈی کو قتل کرنے سے پہلے تشدد کا نشانہ بنایا گیا؟'' برینڈا بولی۔ ''جبکہ یہ سچ نہیں ہے۔''

''لاکر میں خون آلود قمیص کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارے باپ کو مرنے سے ایک دو دن پہلے مارا پیٹا گیا تھا۔ اس نے اسی قمیص سے خون روکنے کی کوشش کی ہوگی اور پھر وہ وہاں سے غائب ہو گیا... لیکن قاتل اس کے تعاقب میں تھا جس نے موقع ملتے ہی اسے گولی مار دی۔''

''کیا ہمیں پولیس کو اس خون آلود قمیص کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے تھا؟'' برینڈا نے کہا۔

''انہیں پہلے ہی تم پر شک ہے۔ خون آلود قمیص کی موجودگی سے تمہارے لیے مسائل بڑھ سکتے ہیں۔''

وہ دونوں ٹیکسی میں سوار ہوئے تو میرون نے پوچھا۔ ''تم کہاں جانا چاہو گی... اپنی آنٹی کے گھر یا کسی دوست کے پاس؟''

برینڈا نے اس کی طرف دیکھا اور سر جھکاتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے ساتھ رہنا چاہوں گی۔''

بولیسٹر ہاؤس میں کافی رونق تھی۔ مسز بولیسٹر نے اپنے تمام جاننے والوں اور پڑوسیوں کو دعوت میں بلایا تھا۔ میرون کے ڈیڈی باربی کیو میں مصروف تھے۔ انہوں نے ایک لمبی سی شیف والی ٹوپی اور ایپرن پہن رکھا تھا۔ مسز بولیسٹر کی نظر میرون پر پڑی تو وہ دوڑتی ہوئی آئیں اور اسے گلے سے لگا لیا۔ میرون نے برینڈا کا تعارف اپنے کلائنٹ کے طور پر کروایا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ برینڈا میڈیکل کی طالبہ بھی ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ وہاں موجود بھی مہمان برینڈا سے متاثر نظر آئے۔ اس دوران میرون کی نظریں مسلسل اس کے چہرے کا جائزہ لیتی رہیں اور وہ ان نظروں کی تپش کو محسوس کر کے مسکراتی رہی۔ پھر کھانے پینے اور خوش گپیوں کا دور چلا۔ میرون کے ڈیڈی فخریہ طور پر مہمانوں کو اپنی بنائی ہوئی ڈشیں پیش کر رہے تھے۔ پھر رات کا اندھیرا بڑھنے لگا اور مہمان بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد برینڈا نے مسز بولیسٹر کے ساتھ مل کر صفائی کی اور اس دوران وہ خوش گوار موڈ میں باتیں کرتی رہیں۔

مسز بولیسٹر نے میرون کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میرون ڈاکٹر بنے لیکن یہ تو خون بہتا دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ ہارر فلمیں بھی نہیں دیکھتا۔''

میرون نے احتجاج کرنا چاہا تو وہ بولیں۔ ''ٹھیک ہے۔ میں جا رہی ہوں۔ برینڈا! تم آج رات یہیں رک جاؤ۔ میں نے تمہارے لیے گیسٹ روم تیار کروا دیا ہے۔''

مسز بولیسٹر کے جانے کے بعد وہ دونوں باہر کھلی فضا میں آ گئے۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا۔ وہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے برنیٹ ہل تک چلے آئے جہاں میرون نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ برینڈا ایک پلیا پر بیٹھ گئی۔ اس نے میرون سے کہا۔ ''تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ڈیڈی نے مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟''

''اس کا موقع ہی نہیں ملا۔''

''جب میں ڈیڈی کے اپارٹمنٹ پہنچی تو وہ نشے میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بے قابو ہو گئے۔ انہوں نے مجھے کتیا کہا اور دروازے کی طرف دھکیلنے لگے۔ انہوں نے مجھے انیتا کہہ کر بھی پکارا۔''

''شاید نشے میں وہ تمہیں انیتا سمجھ رہا ہوگا۔''

''اس کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

میرون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں واپس آنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرون اسے گیسٹ روم تک چھوڑنے آیا۔ اچانک برینڈا اس سے لپٹ گئی۔ میرون کے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اسے آہستہ سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مناسب نہیں ہے۔ تمہارے باپ کو مرے ہوئے...''

وہ دوبارہ اس سے لپٹ گئی۔ میرون کے لیے بھی اپنے جذبات پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ اس نے بھی جواب میں گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ پھر وہ اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''گڈ نائٹ!''

☆☆☆

دوسری صبح ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے سات بجے ہی اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ آفیسر فرینکلن کا فون تھا جو اسے آدھے گھنٹے میں ہیلووین اسکیٹر پہنچنے کا کہہ رہی تھی۔ میرون نے بستر سے چھلانگ لگائی۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور کچن کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کی ممی اور برینڈا بیٹھی کافی پی رہی تھیں .... میرون نے میز پر پڑا اخبار اٹھایا۔ پہلے ہی صفحے پر ہوریک سلاٹر کے قتل کی خبر موجود تھی۔ اسے چونکتے دیکھ کر مسز بولیسٹر نے کہا۔ ''میں ضرور اس کی وکالت کرتی لیکن اس معاملے میں تمہارے ملوث ہو جانے کی وجہ سے یہ مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے میں آنٹی کلارا کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔''

''گڈ آئیڈیا۔'' میرون نے کہا اور غور سے خبر پڑھنے لگا۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن پولیس کے مؤقف سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سارا دباؤ برینڈا پر ڈال رہی ہے۔ خبر کے ساتھ برینڈا اور ہوریک سلاٹر کی ایک تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ اخبار کے دوسرے صفحے پر برینڈا کی ایک چھوٹی تصویر اور ہوریک کے بھانجے ٹیرینس ایڈورڈ کی تصویر بھی چھپی تھی جو اسٹیٹ سینیٹ کے لیے امیدوار تھا اور اس تصویر میں وہ آرتھر بریڈفورڈ کے ساتھ کھڑا تھا۔ میرون نے وہ تصویر برینڈا کو دکھائی تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ٹیرینس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ وہ تو اس وقت بہت چھوٹا تھا جب میری ماں گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔''

میرون نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں... واپسی پر بات ہوگی۔''

مسز بولیسٹر اسے ناشتے کے لیے روکتی رہ گئیں لیکن وہ تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ فرینکلن نے کوڈ ورڈ استعمال کیے تھے اور اس کا اشارہ اسی جنگل کی جانب تھا جہاں وہ اسکول کے زمانے میں چھپا کرتے تھے۔ میرون نے اپنی کار فٹ بال گراؤنڈ کے باہر پارک کی اور پیدل ہی جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ فرینکلن اسی بڑی چٹان پر بیٹھی تھی جس سے اس کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور بولی۔

''تمہیں اچانک یہ خیال کیوں آیا کہ ایلزبتھ کی موت محض ایک حادثہ نہیں تھی؟''

''مجھے شک ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس ریکارڈ میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوگی جس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے... بشرطیکہ اس پر پردہ نہ ڈال دیا گیا ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' فرینکلن نے گھٹنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے فائل دیکھی ہے۔ ایلزبتھ کی موت گرنے سے واقع ہوئی تھی۔''

''کیا اس کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا؟''

''ہاں۔ وہ سر کے بل گری جس کی وجہ سے اس کی کھوپڑی چکنا چور ہو گئی۔''

''اس کا خون ٹیسٹ کروایا گیا تھا؟''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس کی موت گرنے سے ہوئی... نشے سے نہیں۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے اسے شراب پلا کر دھکا دے دیا ہو۔''

''کیا دھکا دینے والے کو یقین تھا کہ تیسری منزل سے گر کر وہ ضرور مر جائے گی؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اس کی صرف ٹانگ ہی ٹوٹتی یا جسم کے کسی دوسرے حصے پر چوٹ لگ جاتی!''

''گویا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ اس رپورٹ پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں؟''

''ہاں۔'' فرینکلن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے میرے گھر کی تلاشی لی ہے۔ بظاہر یہ نقب زنی لگتی ہے اور اس کے فوراً بعد رائے پامیرز نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ یہ شخص وکنز کا پرانا پارٹنر تھا اور اب چیف ڈیٹیکٹو ہے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں نے بریڈفورڈ کی فائل کیوں دیکھی۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ مطمئن نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے سچ اگلوانا چاہ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ میری اس حرکت کا کوئی غلط نتیجہ نکل سکتا ہے کیونکہ الیکشن ہونے والے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی لیکن گھر جاتے وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اب جبکہ تمہاری خاطر میں نے یہ خطرہ مول لے لیا ہے، تب بھی تم مجھے اصل بات نہیں بتاؤ گے؟''

''تم نے آج صبح کے اخبار میں ہوریک سلاٹر کے قتل کی خبر تو پڑھ لی ہوگی؟ انیتا اس کی بیوی تھی جس نے سب سے پہلے ایلزبتھ بریڈفورڈ کی لاش دیکھی تھی۔''

فرینکلن کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ اپنا نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولی۔ ''ایک بات اور بتا دوں... ممکن ہے یہ اتنی اہم نہ ہو۔ وکنز نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایلزبتھ بریڈفورڈ کی موت سے پہلے انیتا سلاٹر پر بھی حملہ کیا گیا تھا اور اس کے جسم پر خراش کے نشان تھے۔ شاید اس بارے میں علیحدہ سے کوئی رپورٹ ریکارڈ میں موجود ہو لیکن میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میرون نے کہا۔ "تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ تمہارا فون ٹیپ کیا جا رہا ہو اور تمہارے گھر پر بھی ایسے آلات نصب کر دیے گئے ہوں۔ تمہارا تعاقب بھی کیا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں تم مجھے سیل فون پر مطلع کر سکتی ہو۔"

فرینکلن نے سر ہلایا اور میدان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اسکول کے دن بھی کتنے اچھے تھے۔"

☆☆☆

گھر واپس آتے ہوئے میرون کو اپنے سیل فون پر وِن کی کال موصول ہوئی۔ وہ بتا رہا تھا کہ پچھلے دو ہفتوں کے دوران ہوریک نے صرف ایک مرتبہ یعنی ایک ہفتہ پہلے جمعرات کے روز ہالی ڈے اِن میں اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کیا اور چھبیس ڈالرز خرچ کیے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہوریک اپنی موت سے قبل لیونگسٹن میں ہی موجود تھا۔ جب میرون گھر پہنچا تو برینڈا غسل کر کے لباس تبدیل کر چکی تھی۔ اس کے بال سیاہ گھٹا کے مانند شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی مسکراہٹ میرون کے دل میں اتر گئی۔ "میں نے آنٹی میبل کو فون کیا تھا۔ سب لوگ وہیں جمع ہو رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں وہاں ڈراپ کر دوں گا۔"

کار میں بیٹھتے ہوئے میرون نے کہا۔ "میں راستے میں کچھ دیر کے لیے ہالی ڈے اِن رکوں گا۔ ایک ہفتے پہلے تمہارے باپ نے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے چھبیس ڈالرز خرچ کیے تھے۔ لگتا یہی ہے کہ اس نے وہاں کسی کے ساتھ کھانا کھایا ہوگا۔"

"تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟" برینڈا نے پوچھا۔

"میرے پاس ہوریک کی تصویر ہے جو اخبار میں چھپی ہے۔ اسے دکھا کر کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ہوٹل، میرون کے گھر سے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ برینڈا کار میں ہی بیٹھی رہی۔ میرون نے لابی میں کھڑے ہو کر جائزہ لیا۔ وہاں بہت سے لوگ کھانے پینے میں مصروف تھے۔ اس نے ایک ویٹرس کو روکا اور اسے تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے؟"

وہ لڑکی مسکراتے ہوئے بولی۔ "بہتر ہوگا کہ تم کیرولین سے مل لو۔ وہ ہماری فوڈ اینڈ بیوریج منیجر ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے اس شخص کے ساتھ لنچ کیا تھا۔"

میرون کو اتنی آسانی سے کامیابی کی توقع نہ تھی۔ اس نے ویٹرس کا شکریہ ادا کیا اور کیرولین کے دفتر کی طرف چل دیا لیکن وہ دفتر میں موجود نہیں تھی۔ میرون نے انفارمیشن والوں سے اس کا نمبر معلوم کرنے کی کوشش کی اور اس پر اپنا پیغام چھوڑ دیا۔ جب وہ لابی میں واپس آیا تو برینڈا ایک کونے میں کھڑی تھی۔ میرون کو دیکھتے ہی وہ بولی۔

"مجھے لگتا ہے کہ میں پہلے بھی یہاں آ چکی ہوں لیکن یاد نہیں پڑتا کہ کب آئی تھی۔ شاید بچپن میں اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ تم جانتے ہو نا کہ میں پانچ برس کی تھی جب وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی... اتنی پرانی بات مجھے کیسے یاد رہ سکتی ہے؟"

وہ دونوں کار کی طرف بڑھے۔ میرون نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہوریک تمہاری ماں کی تلاش میں ہی یہاں آیا تھا۔ پہلے اس نے آرتھر بریڈفورڈ کے الیکشن آفس فون کیا پھر ان دونوں وکیلوں کو فون کرتا رہا جن کے ذریعے تمہیں وظیفہ ملتا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تمہیں پہلا وظیفہ کس بنیاد پر ملا؟ اس وقت تو تم باسکٹ بال بھی نہیں کھیلتی تھیں۔ لگتا ہے کسی نے تمہاری مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ وہ میری ماں تھی؟"

"میں نہیں جانتا لیکن تمہارے باپ نے تھامس کنیڈ کو فون کیوں کیا؟ میرا خیال ہے کہ وہ اس وکیل سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس حد تک آگے چلا گیا کہ اس نے آرتھر بریڈفورڈ سے بھی پوچھ گچھ شروع کر دی جو اسے ناگوار گزری ہوگی۔ وہ نہیں چاہتے کہ الیکشن کے دنوں میں کوئی ان کا ماضی کھنگالے۔"

"لہٰذا انہوں نے میرے باپ کو مار دیا؟"

"یہ کہنا قبل از وقت ہے۔ ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ آرتھر بریڈفورڈ نے اس پر تشدد کر کے اسے ڈرانا چاہا۔ اس خون آلود قمیص کو ذہن میں رکھو۔ لگتا ہے کہ اسے اسپتال کے قریب ہی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ گھر بھی نہیں گیا۔ اس نے اسپتال آ کر لاکر سے یونیفارم نکالا اور وہ پہن کر فرار ہو گیا۔"

اس نے اپنی بات ختم کی اور بولا۔ "تمہارے پاس میبل کا فون نمبر ہے... کیا تم وہ نمبر مجھے دے سکتی ہو؟"

میرون نے لیزا کو فون کر کے وہ نمبر چیک کرنے کو کہا۔ دو منٹ بعد لیزا نے بتایا کہ یہ نمبر بھی ٹیپ ہو رہا ہے۔ میرون نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ "یہ نمبر بھی ٹیپ ہو رہا ہے۔ تمہارے باپ نے میبل کو فون کیا اور وہ اس تک پہنچ گئے۔"

"اگر اسکالرشپ کے بارے میں تمہارا خیال درست ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میری ماں کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آیا؟"

"وہ چودہ ہزار ڈالرز لے کر بھاگی تھی۔ اس نے یہ رقم کہیں لگا دی ہوگی اور اس کے منافع سے تمہیں اسکالرشپ کے نام پر سپورٹ کرتی رہی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے آرتھر بریڈفورڈ کو بلیک میل کیا ہو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"وہ ایلزبتھ بریڈفورڈ کی موت کی عینی شاہد تھی۔ ہمارے سامنے دو امکانات ہیں۔ اسے خوف زدہ کیا گیا اور وہ بھاگ گئی یا اسے مارنے کی کوشش کی گئی اس لیے وہ چھپ گئی۔ اس کے پاس کچھ ایسے شواہد تھے جن کی بنا پر وہ آرتھر کو بلیک میل کر کے کچھ رقم اینٹھ سکتی تھی تاکہ تمہارا مستقبل محفوظ بنا سکے۔"

میبل کا گھر آ گیا تھا۔ وہاں کئی لوگ جمع تھے اور میرون ان میں واحد سفید فام تھا۔ بہت سے لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں برینڈا کے لیے نفرت تھی۔ اخبار میں شائع ہونے والی اسٹوری نے برینڈا کو مشکوک بنا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد میبل نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے برینڈا کو دیکھ کر بازو پھیلا دیے اور برینڈا اس کے کندھوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ میرون نے کمرے کا جائزہ لیا لیکن اسے وہاں میبل کا بیٹا ٹیرینس نظر نہیں آیا۔

میبل نے برینڈا کو تسلی دی اور میرون کے پاس آتے ہوئے بولی۔ "کیا تم جانتے ہو کہ میرے بھائی کو کس نے مارا؟"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جاننے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ کیا تم مجھے انیتا کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟"

"تمہیں اب بھی یقین ہے کہ اس کا ان معاملات سے کوئی تعلق ہے؟"

"ہاں اور میں تمہارا فون بھی چیک کرنا چاہوں گا۔ مجھے شبہ ہے کہ اسے ٹیپ کیا جا رہا ہے۔ کیا تمہارے بھائی نے فون پر ہالی ڈے اِن کا تذکرہ کیا تھا؟"

"نہیں۔"

"کیا انیتا کبھی اپنی بیٹی کو لے کر وہاں گئی تھی؟"

میبل نے برینڈا کو آتے دیکھا تو بولی۔ "یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ کیا تم رات کو آ سکتے ہو؟"

واپسی میں میرون نے اپنا سیل فون چیک کیا۔ اسکرین پر دو نمبر نمودار ہوئے۔ ان میں سے ایک اسپیرینزا اور دوسرا جیسیکا کا تھا۔ اس نے پہلے جیسیکا کا نمبر ملایا لیکن بات نہ ہو سکی۔ اس نے جیسیکا کے لیے پیغام چھوڑ دیا۔ پھر اپنے دفتر کا نمبر ملایا۔ اسپیرینزا نے اسے دفتر سے متعلق کچھ معلومات دیں۔ اسی دوران فرینکلن کی کال آ گئی۔ اس نے بتایا کہ ایک نیلے رنگ کی بیوک اسکائی لارک اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ کار کا نمبر ہے نیوجرسی فور سیون سکس فور فائیو ٹی۔ میرون نے اسے پولیس اسٹیشن پہنچنے کی ہدایت کی اور خود لیونگسٹن ایونیو کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد فرینکلن نیگلے وہاں پہنچی اور پولیس اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ اس کے عقب میں نیلے رنگ کی بیوک تھی جو وہاں رکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ میرون نے بھی اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ درمیان میں چار کاروں کا فاصلہ تھا۔ نیلے رنگ کی بیوک پہلے دائیں جانب مڑی پھر نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بائیں جانب کریسنٹ روڈ پر مڑ گئی اور کچھ دیر بعد میڈو بروک لٹل لیگ فیلڈ کے سامنے رک گئی۔ اتوار کا دن ہونے کی وجہ سے پارکنگ ملنا مشکل تھی۔ بیوک کے ڈرائیور نے غلط جگہ گاڑی پارک کی۔ اس میں سے سراغ رساں وکٹر برآمد ہوا جس نے ایلزبتھ بریڈفورڈ کی حادثاتی موت کی تحقیقات کی تھی۔ میرون کو ایک بلاک آگے جا کر گاڑی پارک کرنے کی جگہ ملی۔ یہ جگہ اس کے لیے جانی پہچانی تھی۔ وکٹر کو بہت سے لوگوں نے گھیرا ہوا تھا۔ ان سب نے بیس بال کیپ پہنی ہوئی تھیں اور وہ بچوں کے کھیل پر تبصرہ کر رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے میرون کو پہچان لیا۔ وہ اس سے گرم جوشی سے ملے۔ میرون آگے بڑھا۔ اس نے وکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"ہیلو ڈیٹیکٹو!"

وکٹر نے مڑ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "تم اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ مجھے ایلی کہہ کر بلا سکو۔"

ان کے درمیان تھوڑی رسمی باتیں ہوئیں پھر میرون نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا اور کہا کہ وہ ایلزبتھ بریڈفورڈ کے کیس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے۔

"مثلاً۔" وکٹر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بریڈفورڈ نے تمہیں رشوت کے طور پر اکٹھی رقم دی تھی یا تمہارے درمیان کوئی طویل المیعاد معاہدہ طے پایا تھا؟"

"مجھے تمہارا یہ انداز پسند نہیں آیا۔" وکٹر نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہارے پاس صرف دو راستے ہیں۔" میرون نے کہا۔ "تم مجھے سچ سچ بتا دو کہ ایلزبتھ بریڈفورڈ کے ساتھ کیا ہوا

تھا؟ میں کوشش کروں گا کہ تمہارا نام سامنے نہ آئے۔ دوسری صورت میں چلّا چلّا کر اخبار والوں کو بتاؤں گا کہ تم نے حقائق چھپانے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح تم بری طرح بدنام ہو جاؤ گے۔''

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن عین اسی وقت چیف ڈیٹیکٹو رائے پامیرنز وہاں آگیا اور اس نے میرون کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا کوئی مسئلہ ہے؟''

میرون نے ناگواری سے کہا۔ ''اپنا ہاتھ ہٹاؤ ورنہ...''

''جانتا ہوں کہ تم ڈیولین کے لیے کام کر رہے ہو اور آرتھر کو نقصان پہنچانے کے لیے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔''

ڈیولین، آرتھر بریڈفورڈ کے مقابلے پر گورنر کا الیکشن لڑ رہا تھا۔ میرون نے سختی سے اس کی تردید کی اور کہا۔

''کیا واقعی ایلزبتھ کی موت ایک حادثہ تھی؟''

''ہاں۔ تحقیقات سے یہی ثابت ہوا تھا۔'' رائے نے کہا۔

''انیتا سلاٹر پر ہونے والے حملے کے بارے میں کیا کہو گے... کیا وہ بھی حادثہ تھا؟''

پامیرنز بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟''

''تم یقیناً اس بارے میں جانتے ہو اور ایلی نے بھی اپنی رپورٹ میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔''

''تم اس فائل کی بات کر رہے ہو جو فرینکلن نے پولیس کے ریکارڈ سے چرائی تھی؟''

''اس نے فائل نہیں چرائی، صرف اسے دیکھا تھا۔'' میرون نے وضاحت کی۔

''وہ فائل وہاں سے غائب ہے اور ہمیں یقین ہے کہ فرینکلن نے ہی وہ فائل چرائی ہے۔''

میرون سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ تم بھی وہ فائل کہیں چھپا سکتے ہو... لیکن میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ اسپتال سے بھی یہ ریکارڈ معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن فرینکلن کی شامت آجائے گی۔ فائل چرانے کے الزام میں اس کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ تمہارا تعلق ڈیولین کیمپ سے ہے اور تم نے ہی اسے یہ فائل چرانے پر آمادہ کیا تھا تاکہ آرتھر بریڈفورڈ کو نقصان پہنچایا جا سکے۔''

''تم نے جیسیکا کا نام سنا ہے؟'' میرون اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''وہ بہت بڑی رائٹر ہے اور اسے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہونے والے جنسی جرائم سے بہت دلچسپی ہے۔ تم فرینکلن کے خلاف جو چاہے کارروائی کرو لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جیسیکا کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ طوفان برپا کر دے گا۔ میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے لیکن تم سب کچھ گنوا دو گے۔ ملازمت، فیملی، عزت اور ممکن ہے کہ جیل کی ہوا بھی کھانی پڑ جائے۔''

پامیرنز اور وکنز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پامیرنز کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ وکنز نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس معاملے سے دور رہے لیکن میرون نے کہا کہ وہ انیتا کی بیٹی کا ایجنٹ ہے اور حقائق جان کر ہی رہے گا۔

وکنز نے اپنی ٹوپی سیدھی کی اور کار کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''پھر کچھ اور لوگ مارے جائیں گے۔''

☆☆☆

میرون پارکنگ لاٹ کی طرف آیا تو اس کی کار کے پاس بریڈفورڈ فارم کے دو آدمی اس کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک طویل قامت اور دوسرا سیاہ فام تھا۔ ان کے حلیے وہی تھے جو میبل نے بتائے تھے۔ میرون نے ان دونوں کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

سیاہ فام نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''مستقبل کے گورنر بریڈفورڈ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی لیکن وہ مجھے خود فون کیوں نہیں کرتے؟''

''ان کے خیال میں یہی بہتر ہے کہ تم ہمارے ساتھ چلو۔''

میرون نے اِدھر اُدھر دیکھا، قریب میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور اپنے گھٹنے سے طویل قامت شخص پر کاری ضرب لگائی۔ وہ دُہرا ہو کر گر پڑا۔ میرون نے چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی گن نکالی اور سیاہ فام کو نشانے پر لے لیا۔ میرون نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری کار کہاں ہے؟''

''ہمیں یہاں اتار دیا گیا تھا کیونکہ واپسی میں ہم تمہاری ہی کار میں جاتے۔''

''اگر تم مائنڈ نہ کرو تو میں خود ہی چلا جاؤں گا۔'' میرون یہ کہہ کر اپنی کار کی طرف بڑھا۔

''تمہیں بریڈفورڈ کے بارے میں غلط فہمی ہوگئی ہے۔ حقیقت جاننا چاہتے ہو تو اپنے باپ سے پوچھو۔ وہ تمہیں میرے بارے میں بھی بتا سکتا ہے۔''

میرون کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ''میرے باپ کا ان

باتوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

سیاہ فام نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور بولا۔ ''نیوجرسی کے آئندہ گورنر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

☆☆☆

بریڈفورڈ فارم کی طرف جاتے ہوئے میرون نے اپنا سیل فون آن کیا اور اُسے پورا واقعہ سنا دیا۔ وِن نے اسے تاکید کی کہ وہ مزید تشدد سے باز رہے جب تک کہ وہ خود وہاں نہ پہنچ جائے۔ بریڈفورڈ فارم کا محافظ میرون کو اکیلا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے یہ سوچ کر گیٹ کھول دیا کہ میرون ان دونوں آدمیوں کے ساتھ آیا ہے جو اسے لینے کے لیے گئے تھے۔ میرون نے بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی اور بغیر رکے اپنی کار اندر لے گیا۔ محافظ اپنے کیبن سے نکل کر باہر آیا لیکن اس وقت تک میرون اپنی کار داخلی دروازے پر پارک کر چکا تھا۔ وہاں وہی بوڑھا بٹلر اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ تعظیماً جھکا اور میرون کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ ایک طویل راہداری سے گزرتے ہوئے ایک سوئمنگ پول تک پہنچے۔ بٹلر نے دروازہ کھولا اور اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ آرتھر بریڈفورڈ اسے دیکھ کر سوئمنگ پول سے باہر آگیا اور بولا۔

''سام اور ماریو کے ساتھ کیا ہوا؟ میں نے انہیں ساتھ لانے کے لیے بھیجا تھا؟''

''میں اب بڑا ہو گیا ہوں اور مجھے کسی محافظ کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کیوں بلایا ہے؟''

''میں تم سے پچھلی ملاقات کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ تم اور وِن یہاں کیوں آئے تھے؟''

''میں تم سے کچھ سوالات کرنا چاہ رہا تھا؟''

''کیوں... کس لیے؟ تم ایک ایسی عورت کے بارے میں کیا جاننا چاہ رہے ہو جو بیس سال پہلے میری ملازمہ تھی؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، تمہیں تو وہ یاد بھی نہیں رہا۔''

آرتھر بریڈفورڈ مسکرایا۔ ''میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے تمہارے مقاصد کے بارے میں جاننا چاہوں گا کیونکہ بہرحال، یہ ایک بڑا الیکشن ہے۔''

''تم سمجھتے ہو کہ میں ڈیولین کے لیے کام کر رہا ہوں۔''

''تم اور ونڈسر میرے گھر بہانہ کر کے آئے۔ تم نے میری ماضی کے بارے میں بے سروپا سوالات کیے۔ تم نے ایک پولیس آفیسر کو میری بیوی کی موت کی فائل چرانے کے لیے ترغیب دی۔ تمہارا ایک ایسے شخص سے تعلق ہے جس نے حال ہی میں مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور تمہیں ایسے جرائم پیشہ لوگوں سے باتیں کرتے دیکھا گیا جو ڈیولین کے ساتھی ہیں۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا سوچتے؟''

''میں نے کسی کو فائل چرانے کے لیے رشوت نہیں دی۔'' میرون نے کہا۔

''کیا تم آفیسر فرینکلن سے رٹز ڈائز میں نہیں ملے تھے؟''

''نہیں۔'' میرون نے پُرزور انداز میں تردید کی اگر وہ سچ بولتا تو اس کے لیے وضاحت پیش کرنا مشکل ہو جاتی۔

''فی الحال اس بات کو بھول جاؤ اور یہ بتاؤ کہ کس نے تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کی؟''

''ہوریک سلاٹر نے۔ اس نے میرے انتخابی دفتر فون کیا اور کہا کہ اس کے پاس انیتا سلاٹر کے بارے میں اہم معلومات ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ یونہی پھیل رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جان گیا تھا کہ انیتا کے نام سے میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ وہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا کہ میں نے اس کی بیوی کے ساتھ کیا کیا۔ اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے اس کی بیوی کو بھاگنے میں مدد دی۔ اب میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے میں کیوں دلچسپی لے رہے ہو؟''

''اس کی بیٹی برینڈا سلاٹر کی وجہ سے۔ وہ میری کلائنٹ ہے اور اس کا باپ بھی میرا دوست تھا۔ تم نے اس کے قتل کے بارے میں سنا ہوگا؟''

''ہاں، میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ یہ بتاؤ کہ اپج فیملی کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''کیا وہی ڈیولین کے جرائم پیشہ ساتھی ہیں؟'' میرون نے پوچھا۔

''ہاں... اسی لیے پوچھ رہا ہوں کہ تمہارا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟''

''کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ لوگ ایک اور باسکٹ بال لیگ شروع کر رہے ہیں اور اس کے لیے برینڈا کو سائن کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہوریک قتل ہو گیا ہے اور وہ لوگ مجھے ہراساں کرنے کے لیے اس معاملے کو اچھالیں گے۔ میرا مقصد صرف اپنے آپ کو اس سے الگ رکھنا ہے۔'' بریڈفورڈ نے کہا۔

''میرے اور تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوریک تمہیں فون کرتا رہا ہے۔ پولیس بھی اسی ریکارڈ کی بنیاد پر تم تک پہنچ جائے گی۔''

''پولیس کی پروا نہ کرو۔'' بریڈفورڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ سچ ہے کہ تم ڈیولین کے لیے کام نہیں کر رہے اور

نہ ہی تمہارے پاس میرے بارے میں کوئی ثبوت ہے تو میری انتخابی مہم کو نقصان پہنچانے کی کوشش مت کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس خاموشی کی قیمت بھی چاہو گے۔"

"شاید وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔" میرون بولا۔ "میری دو شرطیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مجھے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں اور دوسری اس وقت بتاؤں گا جب تم پہلی شرط پوری کر دو گے۔"

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

میرون اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے... پھر میں چلتا ہوں۔"

"بیٹھ جاؤ۔" بریڈفورڈ بولا۔ "میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ تم اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

"میں اس کی وجہ بتا چکا ہوں... برینڈا اسلاٹر۔"

"تمہارا خیال ہے کہ اس کی ماں زندہ ہے اور کہیں چھپی ہوئی ہے اور تم سمجھتے ہو کہ اس کی گم شدگی کا تعلق میری بیوی کی موت سے ہے اسی لیے اس کی موت کی وجہ تلاش کرتے کرتے پولیس فائل تک پہنچ گئے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ الیکشن کا سال ہے اور ایسی کوئی بھی کوشش میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اب تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ انیتا زندہ ہے؟ بیس سالوں میں کسی نے اس کی آواز تک نہیں سنی۔"

"کون کہتا ہے؟" میرون کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"گویا تم کہہ رہے ہو کہ وہ زندہ ہے اور..."

میرون کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔"

بریڈفورڈ بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے کام کرو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ میں پہلے ہی برینڈا کے لیے کام کر رہا ہوں۔ پولیس کو اس پر شبہ ہے، اگر وہ گرفتار ہو گئی تو میری ذمے داری بڑھ جائے گی۔ میں پولیس کو جو معلومات فراہم کروں گا، ان میں تمہارا ذکر بھی ہوگا۔ البتہ اگر وہ آزاد رہتی ہے تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

بریڈفورڈ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ امید ہے کہ تم اس سلسلے میں ہونے والی پیش رفت سے مجھے آگاہ کرتے رہو گے۔"

میرون جانے کے لیے مڑا پھر اسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے کہا۔ "کیا تم میرے باپ کو جانتے ہو؟"

"تم یہ بات اپنے باپ سے کیوں نہیں پوچھتے؟ شاید اس طرح تمہیں صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔"

☆☆☆

وِن پہلے سے اس کی کار کے پاس موجود تھا۔ میرون کو دیکھتے ہی بولا۔ "تم محض اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

میرون نے کار کا دروازہ کھولا۔ وِن پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "اس سے پہلے بھی ہم اس طرح کے کام کرتے رہے ہیں لیکن ان کا کوئی مقصد یا وجہ ہوتی تھی۔"

"میرے سامنے بھی تین گول ہیں۔ نمبر ایک انیتا کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ نمبر دو ہوریک کے قاتلوں کا پتا چلانا اور نمبر تین، برینڈا کی حفاظت کرنا۔"

"تم سمجھتے ہو کہ برینڈا کی حفاظت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پولیس آفیسرز، ریاست کی سب سے طاقت ور فیملی اور بدمعاشوں کو مشتعل کیا جائے۔ تم ایک ایسی عورت کو تلاش کر رہے ہو جو بیس سال پہلے غائب ہو گئی تھی اور اس دوران اس نے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اگر وہ سامنے نہیں آنا چاہتی تو تمہیں یا برینڈا کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اسے تلاش کرو؟ سیدھی سی بات ہے کہ ہم ایک معمولی وجہ کی خاطر بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں۔ میں تمہیں اس کھائی میں نہیں گرنے دوں گا۔ تم ایک ایسی عورت کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہو جو خود منظرِ عام پر نہیں آنا چاہتی اور ان لوگوں سے ٹکر لے رہے ہو جو ہم دونوں سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ یہ ایک بے مقصد لڑائی ہے۔"

میرون اس کی بات سنتا رہا اور بولا۔ "برینڈا کی مالی مدد کے لیے وظیفوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انیتا ان کے ذریعے اپنی بیٹی کو پیسے پہنچا رہی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کی حقیقت معلوم کر کے مجھے بتاؤ۔"

"کیا تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے؟"

"شاید!"

"او کے! تم مجھے اسکالرشپ کی تفصیلات دے دو۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

☆☆☆

میرون دفتر پہنچا تو اسپیرینزا نے بتایا کہ اس نے ایلزبتھ بریڈفورڈ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔ بہ ظاہر اس کی موت ایک حادثہ ہی نظر آتی ہے، البتہ اگر میرون چاہے تو اس کے بھائی سے مل سکتا ہے جو ویسٹ پورٹ میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ایلزبتھ کی ایک بہن بھی وہاں رہتی ہے لیکن ان دنوں وہ چھٹیاں گزارنے کوٹ ڈی

آزر گئی ہوئی ہے۔"

"اور کچھ؟" میرون نے بے دلی سے پوچھا۔

"اس کے علاوہ ایک بات مجھے تھوڑا سا پریشان کر رہی ہے۔ ایلزبتھ بریڈفورڈ سماجی حلقوں میں کافی مقبول تھی اور شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرتا ہو جب اس کا نام کسی تقریب کے حوالے سے اخبار میں نہ آتا ہو لیکن موت سے چھ مہینے پہلے یہ سلسلہ اچانک رک گیا تھا۔ یہاں تک کہ مقامی اخبارات میں بھی اس کے بارے میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس آرتھر کی خبریں مسلسل چھپتی رہیں۔ دی جرسی لیجر کے سوشل کالم میں بھی ایلزبتھ بریڈفورڈ کا ذکر ملتا ہے۔"

"یہ کالم کون لکھتا تھا؟" میرون نے پوچھا۔

"ڈیبورا ویٹا کر!"

"کیا ہمیں اس کا پتا مل سکتا ہے؟"

کچھ دیر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر میرون بولا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" اسپیرینزا نے جواب دیا۔ "تمہارا فیصلہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن تم ہمیشہ میرے بہترین دوست رہو گے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ پارٹنرشپ دوستی کو کھا جاتی ہے۔ میں نے آج تک ایسی کوئی پارٹنرشپ کامیاب ہوتے نہیں دیکھی۔"

اسپیرینزا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں ڈیبورا ویٹا کر کا پتا تلاش کرتی ہوں۔ تمہارے پاس معاملات طے کرنے کے لیے تین ہفتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ عرصہ کافی ہوگا۔"

میرون کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔

میرون کو ڈیبورا سے ملنے اولڈ ہوم جانا پڑا۔ وہ کافی ضعیف ہو چکی تھی اور اس کی یادداشت بھی پوری طرح کام نہیں کر رہی تھی۔ میرون بڑی مشکل سے اس سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ وہ بار بار موضوع سے ہٹ جاتی۔ میرون جاننا چاہ رہا تھا کہ ایلزبتھ نے پارٹیوں میں شرکت کرنا کیوں چھوڑ دی تھی؟ ڈیبورا نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس کی آخری پارٹی اچھی طرح یاد ہے۔"

"اس کے بعد تم نے اسے کسی پارٹی میں نہیں دیکھا؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔ جب وہ دو پارٹیوں میں نہیں آئی تو میں نے اسے فون کیا لیکن اس سے بات نہ ہو سکی۔ شاید وہ گھر میں نہیں تھی یا کسی وجہ سے فون اٹینڈ نہ کر سکی۔ میں نے اس کی تمام دوستوں سے پوچھا لیکن کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس کے بارے میں سرگوشیاں ضرور ہو رہی تھیں کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے اور آرتھر نے اسے علاج کے لیے کہیں دور بھیج دیا ہے لیکن میری نظر میں یہ محض بکواس تھی۔"

"تمہیں اس پر یقین کیوں نہیں آیا؟" میرون نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اگر وہ اسپتال یا پاگل خانے میں ہوتی تو اس کی موت اپنے گھر میں تیسری منزل سے گرنے سے کیسے واقع ہوتی؟"

میرون سر ہلا کر رہ گیا۔ یہ واقعی سوچنے والی بات تھی۔

وہ اپنی کار کی طرف آیا اور آرتھر بریڈفورڈ کے دفتر فون کیا۔ اس کی سیکریٹری نے بتایا کہ وہ اس وقت بلیول میں ہوگا۔ پھر اس نے اپنے ڈیڈی کے دفتر فون کر کے سیکریٹری کو بتایا کہ وہ دو گھنٹے بعد ان سے ملنے کے لیے آئے گا۔

آرتھر فورڈ اپنی انتخابی مہم کے سلسلے میں ایک ٹور بس کے دروازے پر کھڑا لوگوں سے خطاب کر رہا تھا۔ اس کا بھائی چانس اور بیٹا ٹیرینس دائیں بائیں کھڑے تھے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے نمائندے بھی وہاں موجود تھے۔ تقریر ختم کرنے کے بعد وہ نیچے اترا اور اردگرد کھڑے لوگوں سے ہاتھ ملانے لگا۔ وہ ہر ایک سے ایک ہی جملہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے آپ کی حمایت چاہیے۔"

اچانک میرون کو اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ چانس اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میرون بولا۔ "مجھے آرتھر سے بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم بھی اسی بس میں سوار ہو جاؤ۔"

میرون کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دس منٹ بعد ہی آرتھر، چانس اور ٹیرینس بس میں داخل ہوئے۔ آرتھر بولا۔ "میرون! تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انیتا کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہوئی؟"

"نہیں۔ البتہ تمہاری بیوی کے بارے میں ایک انکشاف ضرور ہوا ہے۔" میرون نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ انیتا کی گمشدگی کا میری بیوی کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔"

"کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ اپنی موت سے چھ مہینے پہلے اس نے پارٹیوں میں جانا کیوں چھوڑ دیا تھا؟ یہاں تک

کہ وہ کلب بھی نہیں گئی اور اس دوران کسی نے اسے نہیں دیکھا۔"

"تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ وہ تمہیں کسی مناسب جگہ پر اتار دے۔"

"ٹھیک ہے اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو تمہاری مرضی۔ میں کسی اخبار کو یہ اسٹوری دے سکتا ہوں۔"

"دیکھو میرون! ہمارے درمیان یہ طے پا چکا ہے کہ میں برینڈا کو جیل سے نکالنے میں مدد کروں گا اور تم انیتا والے معاملے میں مجھے ملوث نہیں کرو گے... لیکن تمہاری ان حرکتوں سے میرے مخالفین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

میرون کچھ نہ بولا۔ آرتھر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جو کچھ میں تمہیں بتا رہا ہوں، اسے تم اپنے تک ہی رکھو گے۔ میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ ہماری ملاقات کالج کے زمانے میں ہوئی اور ہم نے گریجویشن مکمل کرنے کے ایک ہفتے بعد شادی کر لی۔ ایک سال بعد یہ انکشاف ہوا کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ شروع شروع میں اسے افسردگی کا دورہ پڑتا تھا، میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی لیکن بعد میں ان کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت بگڑتی گئی اور وہ گھر میں قید ہو کر رہ گئی۔ میں نے اس کا بہت علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"کیا تم نے اسے کسی اسپتال میں داخل کروایا تھا؟"

"نہیں... میں اسے خود سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی دیکھ بھال کے لیے نرسوں کا انتظام کیا لیکن وہ خود فراموشی کی جانب بڑھتی گئی۔ آخری دنوں میں وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ تمہارا خیال صحیح ہے۔ اس کی موت حادثہ نہیں تھی۔ اس نے چھلانگ لگائی تھی۔ انیتا نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات پھیلے چنانچہ میں نے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔"

"تم نے اسے دھمکی دی یا اس پر تشدد کیا؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ ایلزبتھ کی موت کے بعد بھی نو مہینے تک ملازمت کرتی رہی۔"

"تم دونوں بھائیوں میں سے کس نے اسے مارا تھا؟ ایلزبتھ کی موت سے چند ہفتے قبل اس پر حملہ کیا گیا تھا اور وہ سینٹ بارناباس اسپتال میں زیر علاج رہی۔ تم اس بارے میں کچھ بتانا چاہو گے؟"

چانس چلّایا۔ "یہ بہت کچھ جانتا ہے۔ ہمیں اس کا علاج کرنا پڑے گا۔"

آرتھر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میرون سے بولا۔ "ہمارا معاہدہ اب بھی قائم ہے۔ تم انیتا کو تلاش کرتے رہو اور میں برینڈا کو جیل سے باہر رکھنے میں مدد کروں گا لیکن میری بیوی کی موت کو اس معاملے سے الگ رکھا جائے گا۔"

میرون کچھ نہ بولا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا اور بس سے نیچے اتر گیا۔

☆☆☆

میرون اپنے ڈیڈی کے دفتر پہنچا تو اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سیکریٹری نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ڈیڈی فون پر کسی سے باتیں کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے فون بند کر دیا اور تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولے۔ "سب ٹھیک تو ہے نا... تمہیں پیسے چاہئیں یا کوئی اور مسئلہ ہے؟"

"نہیں ڈیڈی! مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں۔ میں آرتھر بریڈفورڈ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

بولیٹر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ انہوں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

"میں ایک ایسے معاملے میں الجھ گیا ہوں جس کا تعلق آرتھر بریڈفورڈ سے ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے اپنے آپ کو اس معاملے سے الگ کر لو۔ وہ ایک شیطان صفت شخص ہے اور اس کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں... تفصیل سے بتائیں۔"

"یہ فسادات سے ایک سال بعد کی بات ہے۔ فسادیوں نے اس شہر کو برباد کر دیا۔ میرے ورکرز کام پر تو آ گئے لیکن ان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ پھر کچھ لوگوں کے اکسانے پر یونین بنانے کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے اس کی مخالفت کی۔ آرتھر بریڈفورڈ کا باپ ان بدمعاشوں کی باتوں میں آ گیا لیکن میں ان لوگوں سے لڑتا رہا اور جیتنے کے قریب تھا کہ ایک روز اس نے اپنے بیٹے آرتھر کو میرے پاس بھیجا۔ سام بھی اس کے ساتھ تھا۔ آرتھر بڑی بدتمیزی سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ وہ اس یونین کو قائم کرنے کے حق میں ہے اور اس کی مالی مدد بھی کرے گا۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اسے دفتر سے نکل جانے کے لیے کہا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"سام اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔ اس نے ایک نظر میری میز پر رکھے فیملی فوٹو پر ڈالی اور پھر ایک قینچی وہاں رکھ دی۔ آرتھر نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا پھر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میں گھر چلا گیا لیکن کسی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا لیکن سام کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ وہ کسی بھی شخص کے ٹکڑے کر سکتے تھے۔ پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ میں نے فون اٹھایا لیکن کسی کی آواز سنائی نہیں دی۔ پھر میں بستر سے اٹھا اور تمہارے کمرے کی طرف چل دیا۔ تم گہری نیند سو رہے تھے۔ میں تمہارے بیڈ کے قریب گیا تو وہاں بھی مجھے ویسی ہی قینچی نظر آئی۔ مجھے لگا جیسے کوئی تمہارے کمرے میں آیا اور وہ قینچی رکھ کر چلا گیا۔ تم ایسے لوگوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اس لیے اس معاملے سے علیحدگی اختیار کر لو، اس میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔"

ڈیڈ کے دفتر سے واپس آتے ہوئے اس نے برینڈا کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ رات کو میچ کھیلنے جائے گی۔ میرون نے پوچھا کہ کیا وہ اسے پک کرے؟ لیکن اس نے بتایا کہ وہ ٹیم بس سے چلی جائے گی پھر اس نے برینڈا سے پوچھا۔ "کیا تم مجھے ان دو لڑکوں کے نام بتا سکتی ہو جن کی رگیں کاٹی گئی تھیں؟"

"کلے جیکسن اور آرتھر ہیرس۔"

"اور وہ دونوں ایسٹ اورنج میں رہتے ہیں؟" میرون نے تصدیق چاہی۔

"ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ ہوریک نے یہ حرکت کی ہوگی؟"

"پھر کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ لمبی کہانی ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر تک وہ سیٹ سے ٹیک لگائے برینڈا کے بارے میں سوچتا رہا پھر اس نے وِن کا نمبر ملایا اور بولا۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ اپنی کار چھوڑ دو... میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔"

میرون، وِن کے پاس پہنچ گیا۔

"میں نے برینڈا کو ملنے والی اسکالرشپ کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔" وِن نے اس کی کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس کے لیے فنڈز بیرونی ذرائع سے مہیا کیے گئے تھے۔ اس کا پتا چلانا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ اکاؤنٹ فرضی نام سے کھولا گیا تھا اور چار سال پہلے بند کیا جا چکا ہے۔"

"چار سال پہلے!" میرون نے دُہراتے ہوئے کہا۔ "یعنی اس وقت جب برینڈا نے میڈیکل اسکول جوائن کرنے سے پہلے آخری وظیفہ وصول کیا تھا۔ اور کوئی خاص بات؟"

"مستحقین کا انتخاب اسکول کے بجائے وکیل کو دیا گیا تھا اور اس کی شرائط بھی کچھ مبہم سی تھیں۔"

"دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ برینڈا کے لیے کیا گیا تھا۔" میرون نے کہا۔

"مجھے ہال نے فون کیا تھا۔" وِن نے اسے اطلاع دی۔ ہال الیکٹرونک انجینئر تھا اور میرون نے اسے ٹیلی فون ٹیپ کرنے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا تھا۔

"میبل، ہوریک اور برینڈا... تینوں کے گھر میں ٹیلی فون سننے کے آلات لگے ہوئے ہیں۔ میبل اور ہوریک کے گھروں میں لگے ہوئے آلات تین سال پرانے ہیں جبکہ برینڈا کے کمرے میں حال ہی میں لگائے گئے تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی شخص کافی عرصے سے اس فیملی کی نگرانی کر رہا ہے اور اس کے پاس ذرائع بھی ہیں۔ یہ بریڈفورڈز ہی ہو سکتے ہیں۔ وہی لوگ بیس سال سے انیتا کو تلاش کر رہے ہیں۔ اسی لیے آرتھر نے میرے ساتھ مبہم رویہ اختیار کیا ہوا ہے۔ وہ میرے ساتھ اسی لیے تعاون کر رہا ہے کہ میں انیتا کو تلاش کروں اور وہ اسے مار ڈالے۔"

کلے جیکسن ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ وہ غریبوں کی بستی تھی۔ کلے جیکسن کی گلی کے سامنے ایک پارک تھا جہاں لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کچھ بچے کھیلنے میں مصروف تھے۔ جب میرون اور وِن کار سے باہر آئے تو سب کی نگاہیں ان پر جم کر رہ گئیں۔ میرون نے ایک دروازے پر دستک دی۔ ایک عورت باہر آئی، میرون نے اپنا اور وِن کا تعارف کروایا اور کہا کہ وہ کلے جیکسن سے ملنا چاہتے ہیں۔

وہ عورت مسکرائی اور بولی۔ "میں کلے کی ماں ہوں۔ اندر آجاؤ۔"

وہ دونوں اس کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئے۔ کمرے میں ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا لیکن وہ اس کی ٹھنڈک سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ وہ عورت انہیں ایک تنگ راہداری کے راستے پچھلے صحن میں لے گئی اور بولی۔

"میں کلے کو لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

انہیں کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد آٹھ لحیم شحیم افراد تین اطراف سے وہاں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بیس بال کے بلے تھے۔ میرون کو اپنی نبض ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تم لوگوں کا کھیل ختم ہو گیا؟"

ان میں سب سے بڑا شخص آگے بڑھا اور بولا۔ "بے وقوف! کھیل تو اب شروع ہوگا۔ تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"ہمیں کلے جیکسن سے ملنا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟"

ان کا لیڈر جس کا نام نائیک تھا، آگے بڑھا اور بولا۔ "تم دوبارہ اسے مارنے کے لیے آئے ہو لیکن ہمیں اس کی حفاظت کا پورا اختیار ہے۔"

عین اسی وقت وِن نے ایک غیر معمولی حرکت کی۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور اس نے نائیک کے ہاتھ سے بلّا چھین کر صحن کے کونے میں پھینک دیا۔ نائیک کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ وہ غصے میں آگے بڑھا۔ اس دوران وِن نے کوئی حرکت نہیں کی۔ جب وہ بالکل قریب آگیا تو وِن تیزی سے جھکا اور اپنی انگلیاں اس کی گردن میں پیوست کر دیں۔ نائیک کے منہ سے عجیب و غریب آواز نکلی۔ وِن ایک بار پھر جھکا اور اس کی ٹانگ پر زوردار لات ماری۔ نائیک اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سر کے بل زمین پر گر گیا۔ وِن نے اسے نشانے پر لے لیا۔ اس دوران میرون بھی اپنی گن نکال چکا تھا۔ اس نے بقیہ لوگوں سے بلے زمین پر پھینکنے کے لیے کہا۔ ان کے پاس میرون کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ وہ سب پیٹ کے بل لیٹ جائیں اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے لے جائیں۔ نائیک نے بھی ایسا ہی کیا اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "ہم تم سے درخواست کرتے ہیں... اس لڑکے کو دوبارہ مت مارنا۔"

وِن نے زوردار قہقہہ لگایا اور میرون کی طرف دیکھا۔ میرون بولا۔ "ہم کسی کو مارنا نہیں چاہتے۔ صرف یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کلے پر حملہ کس نے کیا تھا؟"

"کیوں؟" ایک آواز آئی۔ میرون نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک لڑکا لاٹھی کے سہارے لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"کیونکہ سب یہی سمجھتے ہیں کہ ہوریک سلاٹر نے ایسا کیا تھا لیکن اس کا قتل ہو گیا ہے اور اب تم ہی بتا سکتے ہو کہ وہ کون لوگ تھے؟"

"میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا کیونکہ انہوں نے مجھے منع کیا تھا۔"

ان دونوں کو باتوں میں مشغول دیکھ کر نائیک نے موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ کہنی کے بل کھڑا ہونا چاہ رہا تھا کہ وِن نے اسے ایک بار پھر زوردار لات ماری اور اس کی کمر پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"رک جاؤ!" کلے نے میرون کی طرف دیکھ کر مدد چاہی اور بولا۔ "یہ میرا انکل ہے اور صرف میری حفاظت کے لیے یہاں آیا ہے۔"

وِن نے کہا۔ "میں پانچ تک گنتی گنوں گا لیکن شاید اس سے پہلے ہی اس کی ہڈی توڑ دوں۔"

"وہ دو سفید فام تھے۔" کلے جیکسن نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "طویل قامت شخص نے ہمیں رسیوں سے باندھا جبکہ عمر رسیدہ شخص نے ہماری رگیں کاٹ دیں۔"

وِن نے میرون کی طرف دیکھا اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "کیا اب ہم جا سکتے ہیں؟"

☆☆☆

واپسی پر انہوں نے کار کا رخ میبل کے گھر کی طرف موڑ دیا۔

وِن کار میں ہی بیٹھا رہا۔ اس نے میرون کو بھی جلد واپس آنے کی تاکید کی۔ میبل اسے دیکھ کر تھوڑا سا حیران ہوئی لیکن اس نے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں کیا۔ میرون نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ برینڈا کبھی ہالی ڈے اِن گئی تھی؟"

میبل نے اپنا سر ہلایا اور بولی۔ "یہ بہت پرانی بات ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہوٹل گئی تھی جس رات انیتا غائب ہوئی۔"

"لیکن برینڈا نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ ہی تم نے بتایا؟"

"وہ اس وقت صرف پانچ سال کی تھی۔ اسے کہاں یاد ہوگا اور ہوریک بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات اس کے علم میں آئے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ انیتا اسے اپنے ساتھ کیوں لے گئی تھی؟"

"انیتا نے گھر سے فرار ہوتے وقت ہوریک کو ایک خط لکھا، ساری رقم اکٹھی کی اور برینڈا کو لے کر چلی گئی۔ پہلے اس کا ارادہ برینڈا کو بھی ساتھ لے جانے کا تھا مگر بعد میں

تبدیل ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہوٹل میں کیا واقعہ پیش آیا۔ شاید وہ خوف زدہ ہوگئی تھی اور سوچ رہی ہوگی کہ ایک پانچ سالہ بچی کو لے کر کہاں جائے گی۔ اس نے ہوریک کو فون کیا کہ وہ آکر برینڈا کو لے جائے لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو انیتا بچی کو چھوڑ کر جا چکی تھی۔''

''انیتا نے اپنا ذہن کیوں تبدیل کیا؟ کس بات نے اسے مجبور کیا کہ وہ اتنی جلدی برینڈا کو چھوڑ کر چلی گئی؟''

میبل اپنی جگہ سے اٹھی اور ٹی وی پر رکھی ہوئی ایک تصویر اٹھا کر لائی۔ ''یہ میرا شوہر رولینڈ ہے۔ وہ کام سے واپس آرہا تھا کہ کسی نے اسے گولی ماردی، صرف بارہ ڈالرز کی خاطر۔ میں اس صدمے سے نہ سنبھل سکی۔ ٹیرینس بہت چھوٹا تھا۔ میں شراب اور نشہ آور دواؤں کی عادی ہوگئی اور ٹیرینس کا خیال رکھنا چھوڑ دیا۔ اس وقت انیتا نے میری بہت مدد کی لیکن جب وہ مشکل میں تھی تو میں اس کے کسی کام نہ آسکی۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے وہ اتنی خوف زدہ ہوگئی کہ بچی کو بھی چھوڑ کر چلی گئی اور بیس سال گزرنے کے بعد بھی واپس نہیں آئی۔ میں نے ایک بار انیتا سے بھی یہ جاننے کی کوشش کی تھی۔''

''کب؟'' میرون نے چونکتے ہوئے کہا۔

''پندرہ سال پہلے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ اگر وہ واپس آئی تو برینڈا مرجائے گی۔''

''اس بات سے اس کا کیا مطلب تھا؟''

''میں نے اس سے دوبارہ نہیں پوچھا۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے۔''

☆☆☆

نیویارک سٹی واپس آتے ہوئے میرون اور وِن نے الگ الگ کاریں استعمال کیں۔ برینڈا کا میچ شروع ہونے میں پینتالیس منٹ باقی تھے۔ میرون کپڑے بدلنے اپنے گھر چلا گیا۔ وِن اپنی جیگوار میں بیٹھا اس کا انتظار کرنے لگا۔ میرون نے دروازہ کھولا تو جیسیکا کو اپنے سامنے پایا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جیسیکا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آئندہ تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

میرون نے آگے بڑھنا چاہا لیکن اس کی ٹانگوں نے ساتھ نہ دیا۔ جیسیکا بولی۔ ''کیا ہوا؟''

''ہوریک کا قتل ہوگیا... وہ میرا دوست تھا۔''

''اوہ! یہ سن کر افسوس ہوا۔'' جیسیکا نے کہا پھر بولی۔ ''کیا بات ہے، تم میری طرف ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں رہے؟''

میرون نے اسے ٹالنے کی غرض سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کردیں پھر بولا۔ ''کیا تم شادی کرنا چاہو گی؟''

جیسیکا حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ اچانک تمہیں شادی کا خیال کیسے آگیا؟''

''کیونکہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہمارا گھر ہو... بچے ہوں۔''

''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن زندگی اب بھی اچھی گزر رہی ہے۔ ہم اسے کیوں تباہ کریں؟ ان باتوں کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔''

دروازے پر دستک ہوئی اور وِن اندر داخل ہوا۔ اس نے جیسیکا کو دیکھ کر سر خم کیا اور اپنا سیل فون میرون کو دیتے ہوئے بولا۔ ''نارم تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

جیسیکا کمرے سے باہر چلی گئی۔ میرون نے فون لیا اور بولا۔ ''نارم!''

نارم گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''برینڈا کہاں ہے؟ میچ شروع ہونے والا ہے۔''

میرون کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بولا۔ ''اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ٹیم بس میں سوار ہورہی ہے۔''

''وہ اس بس میں نہیں آئی۔''

میرون کو لگا کہ اس کے گھٹنے جواب دے گئے ہیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا تو وِن نے کہا۔ ''گاڑی میں چلاؤں گا۔''

وِن تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا کورٹ تک پہنچا۔ گارڈ نے بتایا کہ نارم پریس روم میں ہے۔ تماشائیوں کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی۔ لوگ بے چینی سے کھیل شروع ہونے کا انتظار کررہے تھے اور برینڈا کے حق میں نعرے لگارہے تھے۔ میرون تقریباً دوڑتا ہوا پریس روم تک پہنچا۔ وِن بھی اس کے پیچھے آرہا تھا۔ نارم کے ساتھ سراغ رساں مورین میکلالین اور ڈان ٹائلز بھی وہاں موجود تھے۔

میرون نے پوچھا۔ ''برینڈا کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔'' نارم نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ لوگ یہاں کیا کررہے ہیں؟'' میرون کا اشارہ پولیس والوں کی طرف تھا۔

''بیٹھ جاؤ میرون!'' میکلالین بولی۔ ''ہم تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میرون نے وِن کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلاتا ہوا آگے بڑھا اور نارم کو ایک کونے میں لے گیا۔ میرون ایک کرسی پر

بیٹھ گیا۔ میکلالین نے بھی اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔ میرون نے اپنا سوال دُہرایا۔

''تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟''

''ہم برینڈا اسلاٹر کی تلاش میں آئے ہیں۔ اس سے کچھ پوچھنا ہے۔''

میرون کو غصہ آگیا۔ وہ بولا۔ ''تم نے اس کام کے لیے بڑے مناسب وقت کا انتخاب کیا ہے، جب وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا میچ کھیلنے جارہی ہے۔''

ٹائلز آگے بڑھا اور بولا۔ ''تم نے برینڈا کو آخری بار کب دیکھا تھا؟''

''آج۔''

''کہاں؟''

''مجھے تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا اور نہ ہی برینڈا ایسا کرے گی۔ یاد رکھو، میں اس کا وکیل ہوں۔ اگر تمہارے پاس کوئی اطلاع ہے تو مجھے بتاؤ ورنہ وقت ضائع مت کرو۔''

میکلالین آگے کو جھکی اور بولی۔ ''ہم نے آج صبح برینڈا کے کمرے کی تلاشی لی تھی۔ وہاں سے اعشاریہ 38 کا ہتھیار برآمد ہوا ہے... بالکل ویسا ہی جس سے ہوریک کو قتل کیا گیا تھا۔ اب ہم رپورٹ کا انتظار کررہے ہیں۔''

''اس پر انگلیوں کے نشانات تھے؟''

''نہیں۔''

''اگر یہ آلۂ قتل ہے، تب بھی برینڈا کو پھنسانے کے لیے اسے وہاں رکھا گیا ہوگا۔'' میرون نے کہا۔ ''وہ اتنی بے وقوف نہیں ہوسکتی کہ قتل کرنے کے بعد انگلیوں کے نشان صاف کرے اور ہتھیار کو اپنے کمرے میں رکھ دے تاکہ تم... بہ آسانی اسے برآمد کرسکو۔''

''اس نے اسے بستر کے گدّے کے نیچے چھپایا تھا۔'' میکلالین نے جواب دیا۔

میرون نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''بس... تم یہی کچھ معلوم کرسکے ہو؟''

ٹائلز برہم ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہمارے پاس اس کے خلاف بہت کچھ ہے۔ پہلے اس نے اپنے باپ کو خوف زدہ کرنے کے لیے کورٹ آرڈر لیا پھر اس کے گدّے کے نیچے سے آلۂ قتل برآمد ہوا اور اب وہ غائب ہے۔ کیا اسے گرفتار کرنے کے لیے یہ سب کچھ کافی نہیں ہے؟''

''پھر تم یہاں کیا کررہے ہو؟ جاؤ اور اسے گرفتار کرو۔''

اس دوران وِن کسی سے فون پر باتیں کرتا رہا پھر وہ میرون کے پاس آیا اور اسے ایک کونے میں لے گیا۔

''نارم کے کہنے کے مطابق برینڈا کو پریکٹس کے دوران ایک کال موصول ہوئی جسے سنتے ہی وہ وہاں سے چلی گئی اور روانگی کے وقت تک واپس نہیں آئی۔ بس والوں نے اس کا بہت انتظار کیا پھر ایک معاون کوچ کو کار سمیت وہاں چھوڑ دیا۔ وہ ابھی تک وہیں ہے۔ نارم بس اتنا ہی بتا سکا پھر میں نے آرتھر کو فون کیا۔ اسے سرچ وارنٹ کے بارے میں معلوم ہے۔ اس نے اعلیٰ حلقوں میں بات کی ہے اور وہ اس پر متفق ہیں کہ برینڈا کے معاملے میں آہستہ آہستہ پیش قدمی کی جائے گی۔ آرتھر، برینڈا کے لیے بہت پریشان ہے اور وہ تم سے فوراً بات کرنا چاہتا ہے۔''

میرون نے دونوں سراغ رسانوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، پہلے میں ان سے نمٹ لوں۔''

''کیا تم کچھ سوچ رہے ہو؟''

''مجھے لگتا ہے کہ وکٹر اس بارے میں کچھ بتا سکتا ہے۔''

''کیا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟'' وِن نے پوچھا۔

''نہیں۔ تم ان دونوں کو سنبھالو، میں نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور ہاں، ہوسکے تو اس شخص کے بارے میں معلوم کرو جس نے برینڈا کو فون کیا تھا۔''

''میں دیکھ لوں گا۔'' وِن نے کہا۔ ''اپنا سیل فون آن رکھنا تاکہ مجھے تمہاری پوزیشن کا پتا چلتا رہے۔''

میرون دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹائلز نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن وِن درمیان میں آگیا۔ میرون تیزی سے دوڑتا ہوا کار کی طرف بڑھا۔ اس نے وکٹر کا نمبر ملایا۔ ''برینڈا اسلاٹر غائب ہے۔''

جواب میں خاموشی رہی۔ میرون نے پھر کہا۔ ''میں تم سے ملنے آرہا ہوں۔''

''آجاؤ۔'' وکٹر نے جواب دیا۔

☆☆☆

میرون کو وکٹر کی رہائش گاہ تک پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ اسٹریٹ لائٹ نہ ہونے کی وجہ سے اسے گاڑی کی رفتار کم رکھنی پڑی کیونکہ سڑک کافی تنگ تھی۔ وکٹر کا گھر جھیل کے کنارے واقع تھا۔ میرون نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا، تب اسے اپنی پشت پر شارٹ گن کی نالی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''پیچھے مت مڑنا۔'' اسے وکٹر کی آواز سنائی دی۔ ''کیا تم مسلح ہو؟''

”ہاں۔“ میرون نے جواب دیا۔

”اسی پوزیشن میں کھڑے رہو ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔“

وِن اپنے سیل فون کے ذریعے سب سن رہا تھا۔ میرون نے دل ہی دل میں حساب لگایا، اسے یہاں پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔ وِن اس سے آدھے وقت میں آسکتا تھا، تب تک اسے وکنز کو باتوں میں الجھانا ہوتا۔

وکنز نے اس کی تلاشی لی اور گن برآمد کر کے اس کی گولیاں پھینک دیں اور کہا۔ ”دروازہ کھولو۔“

میرون نے حکم کی تعمیل کی اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے کا ماحول دیکھ کر اس پر خوف طاری ہو گیا۔ اس نے فرش پر خون آلود جوتوں کے نشان دیکھے تو وہ لرز کر رہ گیا۔ اس نے مڑ کر وکنز کو دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر گن تانے کھڑا تھا۔ میرون نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ”ایلی! یہ سب کیا ہے؟“

”پیچھے والے کمرے میں چلو۔“ وکنز نے اسے حکم دیا۔

شاید اس کمرے کو وہ دفتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ دیواروں پر اس کی مختلف تصاویر آویزاں تھیں۔ کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر میرون کی کپکپی چھوٹ گئی۔ ایک کونے میں چیف ڈیٹیکٹو رائے پامیرنز کی لاش پڑی تھی۔

”تم نے اپنے پارٹنر کو مار ڈالا؟“

”اسے مرے ہوئے صرف دس منٹ ہوئے ہیں۔“

”کیوں؟“

”بیٹھ جاؤ میرون!“ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا پھر دراز کھول کر اس میں میرون کی گن رکھی اور اس کی طرف ہتھکڑی بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنے ہاتھ کو کرسی سے باندھ لو۔“

شارٹ گن کی نال کا رخ اس کی جانب تھا۔ میرون نے اس کی بات پر عمل کیا۔ اس نے اپنی بائیں کلائی میں ہتھکڑی پہنی اور اس کا دوسرا سرا کرسی کے بازو سے باندھ دیا۔

وکنز کو اطمینان ہو گیا تو وہ بولا۔ ”میری اجازت کے بغیر کوئی بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے یہاں حساس آلات نصب کر رکھے ہیں۔ جیسے ہی کوئی یہاں قدم رکھتا ہے، پورے گھر کی بتیاں روشن ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے میرے پرانے پارٹنر کو یہاں بھیجا جس پر میں بھروسا کر سکوں۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ پامیرنز تمہیں قتل کرنے کے لیے یہاں آیا تھا؟“

”کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بتاتا ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد...“ وکنز نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر میرون کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”پہلی بار میں نے انیتا سلاٹر کو نارتھ فیلڈ ایونیو کے بس اسٹاپ پر دیکھا۔ ہمیں کسی نے فون پر اطلاع دی کہ ایک سیاہ فام عورت زخمی حالت میں پڑی ہے۔ میں وہاں پہنچا تو اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ کسی نے اسے بری طرح مارا تھا۔ میں نے اس سے جاننا چاہا لیکن وہ کچھ نہ بتا سکی۔ شاید کوئی گھریلو تنازع ہو۔ میں نے اسے سینٹ بارنا باس پہنچایا اور انہوں نے اس کی مرہم پٹی کر کے اسے رخصت کر دیا۔ میں بھی اس واقعے کو بھول گیا پھر تین ہفتے بعد مجھے ایلزبتھ بریڈفورڈ کے بارے میں اطلاع ملی۔“

”کیا اس کی موت حادثاتی تھی؟“ میرون نے پوچھا۔

”نہیں۔ اس نے خودکشی کی تھی اور سب سے پہلے اس کی لاش ایک ملازمہ نے دیکھی، وہ انیتا سلاٹر تھی۔ میں اور رائے اس معاملے کی تفتیش کر رہے تھے کہ ہمیں بوڑھے بریڈفورڈ نے لائبریری میں بلایا۔ وہاں آرتھر اور چانس بھی تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم اس موت کو حادثہ قرار دیں۔ ہم دونوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ کون پروا کرتا ہے کہ یہ حادثہ تھا یا خودکشی۔“

”اور تم نے یقین کر لیا کہ اس نے خودکشی کی تھی؟“

”انیتا نے یہی بیان دیا تھا کہ جب وہ وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایلزبتھ اکیلی بالکونی میں کھڑی تھی، اس نے اسے چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔“

”ممکن ہے کہ یہ بیان اس نے بریڈفورڈ کے کہنے پر دیا ہو؟“

”نہیں، وہ یہ بیان پہلے ہی دے چکی تھی۔ اس کے بعد میں نے نو ماہ بعد اسے ہالی ڈے اِن میں دیکھا۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں یہ سب تمہیں کیوں بتا رہا ہوں؟ اس رات میں اور رائے ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ رائے نے مجھے فون کر کے کہا کہ بریڈفورڈ ہماری مدد چاہتے ہیں، لہٰذا یونیفارم پہن کر ہالی ڈے اِن پہنچ جاؤں۔ رائے نے مجھے بتایا کہ بریڈفورڈ کا بیٹا کسی مشکل میں ہے۔ وہ کسی لڑکی کے چکر میں پھنس گیا ہے اور اب وہ چاہتے ہیں کہ ہم کسی کو اس طرف نہ جانے دیں۔ کچھ دیر بعد بریڈفورڈ کا محافظ سام ایک لڑکی کو لے کر باہر آیا۔ وہ لڑکی چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور سام اسے اپنے کندھوں پر لے جا رہا تھا۔ میری نظر اس لڑکی کے چہرے پر گئی، وہ انیتا سلاٹر تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کسی بوری کی طرح

اس کے کندھے پر جھول رہی تھی۔ میں رائے کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ ہمیں اسے روکنا چاہیے لیکن رائے نے کہا کہ ہم یہاں اپنی موجودگی کا کیا جواز پیش کریں گے؟ واقعی، ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے لہٰذا میں واپس کوریڈور کے دوسرے سرے پر چلا گیا۔ اس وقت تک سام کمرے میں واپس آچکا تھا اور ویکیوم کلینر سے کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ پھر وہ کار میں بیٹھا اور چانس کے ساتھ چلا گیا۔“

”کیا چانس بھی وہاں موجود تھا؟“

”ہاں، چانس ہی اس معاملے میں ملوث تھا۔“ وکنز نے کہا اور اپنی گن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور یہی میری کہانی کا انجام ہے۔“

”ایک منٹ...! انیتا اس ہوٹل میں اپنی بیٹی کے ساتھ گئی تھی، کیا تم نے اسے وہاں دیکھا تھا؟“

”نہیں۔“

”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ برینڈا اس وقت کہاں ہو گی؟“

”لگتا ہے کہ وہ بھی اپنی ماں کی طرح بریڈفورڈز کے چکر میں پھنس گئی ہے۔“

”میری مدد کرو ایلی... اسے بچا لو۔“ میرون گڑگڑایا۔

وکنز نے اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ”میرون! میں تھک چکا ہوں اور میرے پاس کہنے کے لیے مزید کچھ نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی شارٹ گن اوپر اٹھائی۔ میرون دہشت زدہ انداز میں چلّایا۔ ”اگر تم نے مجھے مار دیا، تب بھی تم نہیں بچ سکو گے۔ میرا ٹیلی فون آن ہے اور وِن ہماری گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ہتھکڑی کھولنے کے لیے چابی اس کی طرف اچھالی اور شارٹ گن کی نال اپنے منہ میں رکھ لی۔

میرون نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہتھکڑی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ زور سے چلّایا۔ ”نہیں!“ اس کی آواز گولی چلنے کے دھماکے میں دب کر رہ گئی۔

☆☆☆

وِن کی آمد چند منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے دونوں لاشوں پر ایک نگاہ ڈالی اور میرون کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔ میرون نے اپنی کار قریبی سپر مارکیٹ میں پارک کی اور وِن کی جیگوار میں سوار ہو گیا۔ اب ان کی منزل بریڈفورڈ فارم تھی۔ راستے میں میرون نے کہا۔

”اب تک جو کہانی سامنے آئی، وہ کچھ یوں ہے کہ ایلزبتھ بریڈفورڈ کی خودکشی سے تین ہفتے پہلے انیتا سلاٹر پر حملہ ہوتا ہے۔ اس کے نو مہینے بعد وہ غائب ہو جاتی ہے اور بیٹی کو لے کر ہوٹل ہالی ڈے اِن چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد کا منظر واضح نہیں ہے۔ اتنا تو معلوم ہو گیا کہ چانس اور سام وہاں پہنچے تھے اور سام زخمی انیتا کو کندھے پر اٹھا کر وہاں سے لے گیا تھا اور اس سے کچھ دیر پہلے انیتا نے فون کر کے ہوریک سے کہا تھا کہ وہ برینڈا کو لے جائے۔ یہ بات ہوریک نے میبل کو بتائی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ ایک طرف تو وہ اس کا سارا پیسا اور بیٹی کو لے کر بھاگ رہی تھی اور دوسری جانب فون کر کے اسے اپنی لوکیشن بھی بتا رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہوریک نے میبل سے جھوٹ بولا تھا۔

”یہ بھی... ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی انیتا کا پیچھا کرتا ہوا ہوٹل تک پہنچ گیا ہو اور انیتا پر تشدد کر کے اپنے پیسے اور برینڈا کو لے کر وہاں سے فرار ہو گیا ہو اور بعد میں اس نے اپنی بہن سے کہا ہو کہ انیتا نے اسے فون کر کے برینڈا کو لے جانے کے لیے بلایا تھا۔“

وِن نے اسے گھورا اور بولا۔ ”اس کے بعد وہ بیس سال تک چھپی رہی اور پھر اچانک ہی اسے یاد آیا کہ ہوریک اس کی تلاش میں ہے... تو کیا اسی نے ہوریک کو قتل کیا ہو گا؟ پھر برینڈا کو دھمکیاں دینے والا کون تھا؟ اس رات چانس بریڈفورڈ ہوٹل میں کیا کرنے گیا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔“

”واقعی، اس کہانی میں کئی جھول ہیں۔“ میرون نے اعتراف کیا۔ ”ایک بات اور سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر اس تمام عرصے میں بریڈفورڈ نے میبل کا فون ٹیپ کیا تو کیا وہ انیتا کی کال ٹریس نہیں کر سکتے تھے؟“

وہ بریڈفورڈ فارم کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میرون نے آرتھر کا پرائیویٹ نمبر ملایا اور کہا۔ ”میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔“

”کیا برینڈا کا کچھ پتا چلا؟“

”میں پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا... اپنے گارڈز کو بتا دینا۔“

پھر اچانک ہی اسے کچھ خیال آیا، اس نے ایک اور نمبر ملایا۔ ”نارم پلیز... ہاں، میں جانتا ہوں کہ وہ میچ دیکھ رہے ہیں لیکن میرا ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے اور انہیں یہ بھی بتا دو کہ میں میکلا لین اور ٹائلز سے بھی بات کرنا چاہتا ہوں۔“

☆☆☆

بریڈفورڈ فارم کے گارڈ نے ٹارچ روشن کی اور کار میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر میرون! تم اکیلے ہی آئے ہو؟''

میرون نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے مین گیٹ کھول دیا۔ میرون کار کو سیدھا اندر لے گیا اور ایک موڑ پر اس کی رفتار انتہائی کم کر دی۔ وِن کار کی ڈکی میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے فون پر بتایا کہ وہ باہر نکل آیا ہے۔ پروگرام کے مطابق اسے برینڈا کو تلاش کرنا تھا جبکہ میرون اس دوران آرتھر...... کو باتوں میں الجھائے رکھتا۔ مکان کے داخلی دروازے پر بٹلر موجود تھا۔ اس نے میرون کو بتایا کہ آرتھر لائبریری میں ہے۔ میرون نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ کسی نے عقب سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑایا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''وِن!''

کسی نے اس کے کندھے پر لات ماری اور وہ زمین پر گر گیا پھر اسے لگا کہ اس کی تلاشی لی جا رہی ہو۔ ایک بار پھر وہ بولا۔ ''وِن!''

''اچھی کوشش تھی۔'' سام کی آواز آئی۔ اس کے ہاتھ میں میرون کا فون تھا۔ دو آدمیوں نے اسے اٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے راہداری میں لے گئے۔ میرون نے ادھ کھلی آنکھوں سے گردوپیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس کا پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ سام نے دروازہ کھولا اور دونوں آدمیوں نے اسے اندر دھکیل دیا۔ میرون سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا لیکن زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ کوئی تہ خانہ تھا۔ سام نے اسے بتایا کہ اس تہ خانے میں کوئی کھڑکی نہیں ہے اور باہر جانے کا یہی ایک راستہ ہے جس پر دو آدمی پہرا دے رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی اطلاع دی کہ انہوں نے وِن کو ڈکی سے باہر نکلتے دیکھا ہے۔ اگر اس نے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کی تو اسے گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔

وہ اسے اس گودام میں لے کر آیا جہاں شراب کا ذخیرہ موجود تھا۔ آرتھر اور چانس وہیں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک میز تھی جس پر ایک چمک دار قینچی رکھی ہوئی تھی۔ آرتھر اسے دیکھتے ہی بولا۔

''برینڈا کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میرون نے جواب دیا۔

''اور انیتا... وہ کہاں ہے؟''

''تم چانس سے کیوں نہیں پوچھتے؟'' میرون جھلاتے ہوئے بولا۔

آرتھر نے کہا۔ ''تم اس وقت تک یہاں سے نہیں جا سکتے جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے کہ تم مجھ پر شک نہیں کر رہے۔''

''میں مجبور ہوں۔'' میرون نے کہا۔ ''ایسے اشارے مل رہے ہیں جن سے تمہاری طرف شبہ جاتا ہے۔ مثلاً ٹیلی فون ٹیپ کرنا، ایلزبتھ کی موت سے پہلے انیتا پر حملہ ہونا، ہوریک کے گھر کی تلاشی اور انیتا کے خطوط غائب ہونا... برینڈا کو فون پر دھمکیاں اور سب سے بڑھ کر ایلزبتھ کی خودکشی کا وقت!''

''میں سمجھا نہیں۔''

''اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم نے اسے تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایلزبتھ نے خودکشی کے لیے صبح چھ بجے کا وقت کیوں منتخب کیا؟ اگر اسے اتفاق سمجھ لیا جائے تو پھر تم لوگ اسے تبدیل کیوں کرنا چاہ رہے تھے؟ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ صبح خودکشی کرے یا رات کو... لیکن اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تاکہ انیتا اسے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ سکے۔ وہ بہت افسردہ تھی۔ تین ہفتے پہلے اسی نے انیتا پر حملہ کیا تھا کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ انیتا کے تمہارے ساتھ تعلقات تھے۔ اس صدمے نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور وہ خودکشی پر مجبور ہو گئی۔''

''لیکن ان باتوں کا موجودہ واقعات سے کیا تعلق ہے؟'' آرتھر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟'' میرون نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ممکن ہے کہ انیتا اپنے شوہر کو چھوڑنا چاہتی ہو یا تم نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انیتا گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا پلان کیا تھا؟ یقیناً تم ایک سیاہ فام عورت سے شادی نہیں کر سکتے تھے؟ کیا تم نے اس کے لیے کسی دوسرے شہر میں رہائش کا بندوبست کیا تھا؟''

''یہ درست ہے۔'' آرتھر نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ ''انیتا میری آخری امید تھی۔ ہاں، میں اس سے محبت کرتا تھا۔ ہم دونوں یہاں سے نکل کر ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتے تھے لیکن عین وقت پر اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ مجھے بتائے بغیر ہی غائب ہو گئی۔ اس نے مجھے ایک خط لکھا کہ وہ میرے بغیر ہی نئی زندگی شروع کرنا چاہتی ہے اور وہ انگوٹھی بھی بھیج دی جو میں نے اسے دی تھی۔''

میرون نے چانس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اس کے باوجود تم نے اس کی تلاش جاری رکھی اور ہر اس جگہ کے فون

ٹیپ کیے جہاں وہ بات کر سکتی تھی۔ تمہارا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے خاندان کے کسی فرد سے ضرور رابطہ کرے گی۔ تم نے برینڈا کے کمرے میں مائیکروفون لگوایا۔ اس کے لیے اسکالرشپ کا بندوبست کیا۔ ان بچوں پر تشدد کروایا جنہوں نے برینڈا کو چھیڑا تھا۔''

آرتھر کچھ نہ بولا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''میں نے کچھ دیر پہلے نارم کو فون کر کے برینڈا کا بلڈ گروپ اور ٹائپ معلوم کی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق پولیس کو ہوریک کے خون کے بارے میں جو معلومات ملی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ دونوں کے خون میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تم برینڈا میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے تھے۔ تم اسے جیل کی سلاخوں کے باہر کیوں رکھنا چاہتے تھے اور ابھی تک اس کے بارے میں فکرمند ہو۔ صرف اس لیے کہ برینڈا اسلاٹر تمہاری بیٹی ہے اور ہوریک یہ بات نہیں جانتا تھا۔''

آرتھر نے سر ہلایا اور بولا۔ ''انیتا شروع میں ہی حاملہ ہو گئی تھی لیکن اس نے بدنامی سے بچنے کی خاطر کسی پر اس تعلق کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچی اس گھر میں پروان چڑھے۔''

''ہوریک کا مسئلہ کیا تھا؟ اس نے بیس سال بعد تمہیں فون کیوں کیا؟''

''میرے مخالفین کو اسکالرشپ کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے ہوریک کو بتا دیا تھا۔ اس نے مجھے کئی فون کیے اور جب وہ باز نہ آیا تو میں نے سام سے کہا کہ اسے سبق سکھا دے۔''

میرون کو وہ خون آلود قمیص یاد آ گئی جو ہوریک کے لاکر سے ملی تھی۔ ''کیا اس کی پٹائی ہوئی تھی؟''

''زیادہ نہیں۔'' آرتھر نے جواب دیا۔ ''میں اسے مارنا نہیں، صرف خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ بہت عرصہ پہلے انیتا نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ہوریک کو کبھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''اس کے باوجود تم نے ہوریک پر نظر رکھی اور موقع ملتے ہی اسے مار ڈالا۔''

''نہیں، وہ خوف زدہ ہو کر کہیں چلا گیا اور پھر نظر نہیں آیا۔''

''برینڈا کو فون پر دھمکیاں دینے کا مقصد کیا تھا؟''

''ہم صرف یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ شاید اسے انیتا کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ دوسری کال اسپیڈز کی تھی۔ وہ ہوریک کو تلاش کر رہے تھے تاکہ لیگ شروع ہونے سے پہلے برینڈا کے ساتھ معاہدے کو حتمی شکل دے سکیں۔''

میرون نے چانس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم کچھ بتانا چاہو گے؟''

''نہیں۔'' وہ میز پر پڑی ہوئی قینچی کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔''

میرون تھوڑا سا پیچھے ہٹا اور چانس کی ناک کا نشانہ لے کر سر سے ٹکر ماری۔ چانس پیچھے کی جانب گرا اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ کوئی بھی اس کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا۔

میرون نے آرتھر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''چانس اور سام تم سے بیس سال تک جھوٹ بولتے رہے۔ میری کچھ دیر پہلے وکنز سے بات ہوئی تھی۔ وہ بھی اس رات وہاں تھا اور اس نے سام کو انیتا کو کندھے پر ڈال کر ہوٹل سے باہر لے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد وہ چانس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔''

آرتھر نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''چانس!''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' چانس چلایا۔

آرتھر نے گن اٹھائی اور چانس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے سچ سچ بتاؤ۔''

چانس ابھی تک خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''تم دونوں میں سے کس کی بات پر یقین کرو گے؟''

آرتھر نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی چانس کے گھٹنے پر لگی۔ وہ دردناک آواز میں چلایا۔

آرتھر نے دوسرے گھٹنے کا نشانہ لیا اور بولا۔ ''مجھے سچ سچ بتاؤ۔''

چانس درد کی شدت سے چلاتے ہوئے بولا۔ ''تم اس کے لیے پاگل ہو گئے تھے۔ میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن تم کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔ پھر میں انیتا کو سمجھانے گیا۔ میرا مقصد اسے نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ میں نے اس کے کمرے کا نمبر معلوم کیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا لیکن وہ جس حالت میں تھی، میں اسے دیکھ کر ڈر گیا۔ اگر معاملہ باہر نکل جاتا تو ہمارے لیے مشکلات ہو سکتی تھیں۔ میں نے ڈیڈی کو فون کیا، باقی انتظامات انہوں نے ہی کیے۔ سام وہاں آیا۔ اس نے وہ جگہ صاف کی۔ ہم نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی اتاری اور تمہارے نام جعلی خط لکھ دیا تاکہ تم اس کی تلاش

ترک کردو۔"

میرون نے پوچھا۔ "اب انیتا کہاں ہے؟"

"انیتا مر چکی تھی۔"

آرتھر کے منہ سے زوردار کراہ نکلی اور وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ "جب میں وہاں پہنچا تو وہ مر چکی تھی۔ میں قسم کھاتا ہوں آرتھر!"

میرون کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے سام کی طرف دیکھا تو اس نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

"اس کی لاش کا کیا ہوا؟" میرون نے پوچھا۔

"میں نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ اسی میں سب کی بہتری تھی۔" سام نے کہا۔

"برینڈا کہاں ہے؟" میرون نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔" چانس بولا۔ "آرتھر! ہمیں اسے ختم کرنا ہوگا۔ یہ بہت کچھ جان گیا ہے۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔"

سام نے تائید کی۔ "یہ ٹھیک کہہ رہا ہے مسٹر آرتھر!"

اچانک ہی سام کے واکی ٹاکی پر ایک آواز ابھری۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسا کبھی نہ کرتا۔" یہ آواز وِن کی تھی۔

سام نے واکی ٹاکی کی ناب گھمائی اور بولا۔ "کسی نے فورسٹر کو قابو کر لیا ہے، اسے تلاش کرو۔"

جواب میں وِن کا قہقہہ سنائی دیا اور بولا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہارے چاروں سیٹ میرے قبضے میں ہیں۔"

اس سے پہلے کہ سام کچھ کہتا، آرتھر نے اس پر فائر کھول دیا۔ دو گولیاں اس کے سینے میں اتر گئیں۔ آرتھر نے میرون کی طرف دیکھا۔ "میری بیٹی کو تلاش کرو۔"

وِن اور میرون جیگوار کی طرف دوڑے۔ راستے میں وِن نے کہا۔ "میں نے پوری جگہ چھان ماری ہے، برینڈا یہاں نہیں ہے۔"

میرون نے فون کی گھنٹی کی آواز سنی تو اسے اپنے سیل فون کا خیال آیا لیکن وہ تو سام نے لے لیا تھا۔ یہ آواز وِن کے کار فون کی تھی۔ وِن نے فون اٹھایا اور ایک منٹ تک سنتا رہا پھر اس نے شکریہ کہہ کر فون رکھ دیا۔ اس نے کار کی رفتار آہستہ کی اور سڑک کے کنارے پارک کر دی۔ وہ میرون کی طرف مڑا۔ اس نے غور سے میرون کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھی الجھ کر رہ گیا۔ اس کا سر ایک طرف کو جھک گیا۔

☆☆☆

پیٹر فرینکل نامی چھ سالہ لڑکا گزشتہ آٹھ گھنٹے سے غائب تھا۔ پولیس اور پڑوسی سبھی اسے تلاش کر رہے تھے۔ پولیس نے سراغ رساں کتوں کی مدد بھی حاصل کر لی تھی۔ وہ لڑکا کچھ دیر بعد پڑوسی کے گودام سے مل گیا، اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اس کے ملنے پر سب نے سکھ کا سانس لیا اور تلاش روکنے کے لیے سائرن بجا دیے گئے لیکن ایک کتا جنگل کی جانب بڑھتا گیا اور اس کے بھونکنے میں شدت آتی گئی۔ آفیسر کریگ ریڈ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کتا کیوں بھونک رہا ہے۔ جب وہ اس جگہ پہنچا تو اسے وہاں ایک لاش نظر آئی۔ میڈیکل آفیسر کو بلایا گیا جس نے بتایا کہ مقتولہ کو مرے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں اور اسے سر میں دو گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا، وہ لاش برینڈا اسلاٹر کی تھی۔

☆☆☆

کار ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ میرون نے کہا۔ "میں اکیلے ڈرائیو کرنا چاہتا ہوں۔"

وِن نے اپنے آنسو صاف کیے اور کچھ کہے بغیر کار سے اتر گیا۔ میرون ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ اس کا رخ اسپیریتزا کے اپارٹمنٹ کی طرف تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا لیکن وہ اکیلی بیٹھی ہوئی تھی... جیسے اسے اسی کا انتظار ہو۔ وہ اس کی طرف بڑھی۔ میرون نے دیکھ لیا کہ وہ رو رہی تھی۔

"اندر آجاؤ۔" اس نے کہا۔

"میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ ہماری پارٹنر شپ نہیں چلے گی لیکن جب تمہیں دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ تم سے زیادہ اچھی کوئی ہستی میری زندگی میں نہیں آئی۔ تم میری بہترین دوست ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس رہو۔"

"میں کہیں نہیں جا رہی۔ اندر آجاؤ۔"

میرون نے سر ہلایا اور بولا۔ "میں وِن کے پاس جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

☆☆☆

جب میرون، میبل کے گھر پہنچا تو اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ اس نے ڈور بیل بجائی تو میبل نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر وہ رونے لگی اور گلے لگنے کے لیے اس کی طرف بڑھی۔ میرون پیچھے ہٹا اور بولا۔

"تم نے سب کو مار ڈالا۔ پہلے انیتا پھر ہوریک اور اب برینڈا۔"

میبل کا منہ کھلا رہ گیا اور وہ بولی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میرون نے اپنی گن نکالی اور اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر مجھ سے جھوٹ بولا تو گولی مار دوں گا۔"

"اپنے آپ کو روکو میرون۔"

"نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہارے ہاتھ میں گن ہے۔ اس لیے میں وہی کہوں گی جو تم چاہتے ہو۔"

میرون نے اسے اندر دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا پھر میبل کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "تم شروع سے ہی جھوٹ بولتی رہی ہو۔ انیتا نے تمہیں کبھی فون نہیں کیا۔ وہ بیس سال پہلے ہی مر چکی تھی۔ تمہارا فون ٹیپ ہو رہا تھا۔ اگر انیتا یا ہوریک تمہیں فون کرتے تو آرتھر کو پتا چل جاتا۔ میں یہ بھی معلوم کر چکا ہوں کہ کسی اور نے نہیں بلکہ ہوریک نے تمہاری آنکھ پر مکا مارا تھا۔ تمہارا کہنا ہے کہ انیتا کے غائب ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد تم اس مکان میں شفٹ ہو گئی تھیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک غریب بیوہ اس مکان میں رہائش اختیار کر سکے؟ تم شروع سے ہی جانتی تھیں کہ ہوریک، برینڈا کا باپ نہیں ہے۔ وہ تمہاری قریبی دوست تھی اور تم بھی اس زمانے میں بریڈفورڈ کے گھر ملازمت کر رہی تھیں۔ تم جانتی تھیں کہ انیتا بھاگ گئی ہے۔ اس نے تم پر بھروسا کیا ہوگا اور اسی لیے اس نے تمہیں ہوٹل سے فون کیا۔"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" میبل بولی۔ "تم مفروضوں پر بات کر رہے ہو اس لیے سب کچھ ممکن ہے۔"

میرون نے اس کے ماتھے پر گن کا دباؤ بڑھایا اور اسے کاؤچ پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے پیسوں کی خاطر انیتا کو قتل کیا؟"

میبل مسکرائی۔ "اگر ہم مفروضوں پر بات کریں تو کئی محرکات ہو سکتے ہیں۔ چودہ ہزار ڈالرز کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ بھائی کی محبت بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ میرے بھائی کا دل توڑ کر جا رہی تھی۔ وہ اس بچی کو ساتھ لے کر جا رہی تھی جسے وہ اپنی بیٹی سمجھتا تھا۔"

"تم نے اسے کس طرح مارا؟"

"میرون! گھر جاؤ۔"

میرون نے گن کی نال اس کے ماتھے پر چبھوئی اور دباؤ بڑھا دیا۔

میبل نے تھوک نگلا اور بولی۔ "میں نے انیتا کو گن دکھا کر ڈرایا کہ اگر وہ میرے کہنے پر عمل نہیں کرے گی تو میں اس کی بیٹی کو مار ڈالوں گی۔ انیتا نے اپنی بیٹی کو گلے لگایا اور اسے لابی میں انتظار کرنے کے لیے کہا۔ میں نے اس کے منہ پر تکیہ رکھ دیا تاکہ فائر کی آواز دور تک نہ جائے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

میبل کچھ ہچکچائی۔ میرون نے ایک بار پھر اس کے ماتھے پر گن کا دباؤ بڑھا دیا، تب اس نے بولنا شروع کیا۔

"میں برینڈا کو واپس اس کے گھر لے آئی۔ انیتا کا وہ خط پھاڑ دیا جس میں اس نے ہوریک کو لکھا تھا کہ برینڈا اس کی بیٹی نہیں ہے اور اس کی جگہ دوسرا خط لکھ دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میرون نے پوچھا۔

"اس کے بعد کی کہانی تم جانتے ہو۔ اس تمام عرصے میں ہوریک اپنی بیوی کو تلاش کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ کامیاب ہو جائے گا۔"

"وہ اس کی تلاش میں ہالی ڈے اِن بھی گیا تھا؟" میرون نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہاں اس کی ملاقات کیرولین گنڈیک نامی ایک عورت سے ہوئی۔ وہ وہاں میڈ تھی اور انیتا کو جانتی تھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ انیتا اس رات ہوٹل میں مہمان کے طور پر آئی۔ اس کے ہمراہ اس کی بیٹی بھی تھی اور اسے یہ بھی یاد ہے کہ اس کی بیٹی ایک اور عورت کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ہوریک کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ تمہارے پاس آیا۔ وہ چھپتا پھر رہا تھا اور اس کی جیب میں گیارہ ہزار ڈالرز تھے۔ اس نے غصے میں آکر تمہاری آنکھ پر مکا مارا اور تم نے اسے بھی مار دیا۔"

"مجھے اپنے دفاع میں کچھ بھی کرنے کا حق ہے۔" میبل نے کندھے اچکائے۔

"تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ وہ تو پہلے ہی چھپتا پھر رہا تھا۔ تمہیں صرف یہ کرنا تھا کہ اسے گم شدہ ظاہر کرتی رہو جس طرح تم نے انیتا کے ساتھ کیا۔ اسے مارنے کے بعد بھی اس کی طرف سے جعلی خط اور فون کالز کرتی رہیں۔ تم نے یہ سب پیسوں کی خاطر کیا۔"

"تمہاری بات ختم ہو گئی؟" میبل نے پوچھا۔

"نہیں، ابھی برینڈا کا ذکر باقی ہے۔ جب تک برینڈا کو ہالی ڈے اِن یاد نہیں آیا، اسے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن جب میں نے تمہیں بتایا کہ برینڈا میرے ساتھ وہاں گئی تھی اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو تم نے اسے بھی مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہوریک کے مرنے کے بعد برینڈا پر اسے قتل کرنے کا شبہ ظاہر کیا گیا تو تمہارا کام اور بھی آسان ہو گیا۔ تم نے ایک

تیر سے دو شکار کیے۔ تم نے برینڈا کے گدّے کے نیچے گن چھپا دی۔ تم سے غلطی یہ ہوئی کہ برینڈا کی لاش جنگل میں پھینک دی۔ شاید تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ پولیس پارٹی اسے اتنی جلدی تلاش کر لے گی۔"

"تم واقعی بہت اچھی کہانی گھڑ لیتے ہو۔"

میبل نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "یہ کہانی نہیں ہے۔ ہم دونوں ہی یہ بات جانتے ہیں۔"

"اور یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں۔" میبل نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تم نے برینڈا کو کس طرح بلایا جبکہ وہ میچ کھیلنے جارہی تھی؟"

"میں نے اسے کہا کہ تمہاری ماں مل گئی ہے۔"

میرون نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور کوشش کی کہ اس کی گن سیدھی رہے۔ میبل بولی۔

"تم مجھے شوٹ نہیں کر سکتے۔" اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اپنے چہرے سے نال ہٹا دی پھر وہ اٹھی اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "میں سونے کے لیے جارہی ہوں۔ باہر جاتے وقت دروازہ بند کر دینا۔"

میرون نے دروازہ بند کر دیا۔

وہ واپس مین ہٹن آیا۔ وِن اور اسپیریزا اس کا انتظار کررہے تھے۔ انہوں نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ اتنی دیر کہاں رہا اور نہ ہی اس نے کچھ بتایا۔ پھر اس نے جیسیکا کا نمبر ملایا اور پیغام ریکارڈ کروا دیا کہ وہ فی الحال کچھ عرصہ وِن کے ساتھ رہے گا۔

رائے پامیرز اور ایلی وکنز کی لاشیں دو دن بعد برآمد ہوئیں۔ اسپیریزا نے دوبارہ ایم بی اسپورٹس کے لیے کام کرنا شروع کر دیا لیکن پولیس ہوریک سلاٹر اور برینڈا سلاٹر کے قتل کا معمّا حل نہ کر سکی۔ چانس بریڈفورڈ کے گھٹنے کا آپریشن ہوا۔ جیسیکا نے میرون کے پیغام کا جواب نہیں دیا۔ میرون نے صرف ایک شخص کو میبل ایڈورڈ کے ساتھ اپنی آخری ملاقات کے بارے میں بتایا تھا۔

دو ہفتے بعد...

قبرستان بلندی پر واقع تھا جہاں سے اسکول کا میدان صاف نظر آتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت یہیں گزر رہا تھا۔ وہ بچھڑنے والوں کا غم سینے سے لگائے بیٹھا تھا کہ اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے اپنی آنکھیں بلند کرلیں۔ قدموں کی آواز اور قریب آ گئی۔ میرون نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔

"تم نے اسے مار دیا؟"

"ہاں۔"

"کیا اب تم بہتر محسوس کررہے ہو؟"

آرتھر نے سرد لہجے میں کہا۔ "سوال یہ ہے کہ تم کیسا محسوس کررہے ہو؟"

میرون کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"اگر یہ بات تمہارے لیے کچھ اہم ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میبل دھیرے دھیرے موت کی آغوش میں گئی تھی۔" آرتھر نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

میبل کی موت کے بعد میرون کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کیسے مری مگر وہ ایک بات ضرور جانتا تھا کہ اس رات میبل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اور وہ خود ایسا سرد مزاج نہیں تھا کہ ٹھنڈے ماتھے کے ساتھ کسی عورت کو گولی مار دے... لیکن اس رات وہ بدترین خلفشار کا شکار ضرور تھا۔

"میں نے اس الیکشن سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں انیتا کی یادوں کے سہارے زندگی گزاروں گا۔" آرتھر کہہ رہا تھا۔

میرون کو اندازہ تھا کہ آرتھر ایسا نہیں کرے گا لیکن اسے اب ..... کسی بات کی پروا نہیں رہی تھی۔

آرتھر چلا گیا۔ بادل آئے اور ہلکی برسات شروع ہو گئی۔ وہ پہاڑی سے اترا اور اپنی کار کی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں جیسیکا موجود تھی۔ گزشتہ دو ہفتوں کے دوران اس نے جیسیکا کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی بات ہوئی۔ اس کا خوب صورت چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ یہ بارش کی بوندیں تھیں یا جیسیکا کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو! وہ اس سے کچھ فاصلے پر رک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔

"میں تمہارا دل نہیں دُکھانا چاہتا۔" میرون نے دھیرے سے کہا۔

جیسیکا نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ "میں جانتی ہوں۔"

پھر وہ اس سے دور جانے لگا۔ جیسیکا خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ کار میں بیٹھا اور اگنیشن آن کر دیا۔ جیسیکا نے پھر بھی حرکت نہیں کی۔ میرون نے گاڑی چلا دی لیکن اس کی نظریں عقب نما آئینے پر مرکوز تھیں۔ جیسیکا کا عکس چھوٹا... اور چھوٹا... بہت ہی چھوٹا ہوتا چلا گیا لیکن مکمل طور پر میرون کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہو سکا۔

❄

اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ اکیلا خطرے کا سامنا کرنے جا رہا تھا... اس پر خوف مسلط تھا... وہ آہستگی سے چلتا ہوا کار تک پہنچا۔ ڈرتے ڈرتے کار کی ڈکی کھولی اور فلیش لائٹ کی روشنی سے اس کا جائزہ لیا۔ ڈکی کے اندر کا منظر دیکھ کر وہ حیرت اور صدمے سے گنگ رہ گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک سیاہ اور لمبے بالوں والی عورت کی مڑی تڑی لاش پڑی تھی۔ لاش کے اوپر ٹوٹی ہوئی عینک اور اس کے شیشے بھی پڑے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس کے ساتھ سسکی بھری اور جلدی سے ڈکی کو بند کر دیا۔ اس نے ہیجان خیز انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا... اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اس کے راز سے آگاہ تو نہیں ہو گیا!

☆☆☆

وہ بے یقینی اور خوف کے عالم میں نیند سے جاگا... تھکاوٹ اور تکلیف کے عالم میں... کئی کمبل اوڑھنے کے باوجود وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلیں۔ وہ اس خواب یا تصور کا پیچھا کرنا چاہتا تھا جو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اسے دکھائی دیا تھا۔

وہ خواب جس کی تعبیر نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا تھا

شاکر منعم

تعبیر

خواب دیکھنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی ...... ہر عمر میں انسان کا واحد سہارا خواب ہی ہوتے ہیں ...... لیکن کبھی کبھار خواب وبالِ جان بھی بن جاتے ہیں ...... ایسے ہی ایک خواب پرست کا احوال ایک خواب نے اس کی زندگی کو مشکل بنا دیا تھا

اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے... یہ مسلسل پانچویں رات تھی کہ وہ اس وقت جاگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ پریشانی اور گھبراہٹ کا شکار تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کا فرائیڈ کی تحقیق کے متعلق ”خواب انسانی خواہشوں کا عکس“ ہوتے ہیں، بالکل بے سود ثابت ہوا تھا... اور وہ اس بات یا نکتے کو بالکل ہی نہیں سمجھ سکا تھا کہ ایک اجنبی عورت کے قتل سے اس کی کون سی آرزوؤں اور خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے؟

اس نے خیالات کو جھٹکتے ہوئے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ اسے اپنے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کی ہر چیز کے بارے میں بخوبی علم تھا۔ وہ اندھیرے میں بھی اپنے اپارٹمنٹ میں آسانی سے نقل و حرکت کر سکتا تھا۔ اس نے لائٹیں بند کیں اور دروازہ لاک کر کے سیڑھیاں اتر کر نیچے لابی میں آ گیا۔ اس نے عمارت کا بیرونی دروازہ کھولا۔ رات انتہائی سرد تھی اور باہر مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پوری گلی میں صرف چند ایک اپارٹمنٹ کی لائٹیں جلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ جب تک وہ اپنی کار تک پہنچتا، سردی کی شدت سے اس کے دانت بجنے لگے۔ اس کی سانس رک رہی تھی اور گلے اور سینے میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے گلو کمپارٹمنٹ سے فلیش لائٹ نکالی اور ڈرتے ڈرتے کار کی ڈکی کھولی۔ اس نے گہری سانسیں لیتے ہوئے پھیپھڑوں میں ہوا کو بھرا۔ اسے اپنی یہ حرکت عجیب سی لگ رہی تھی پھر بھی وہ ڈکی کا جائزہ لینے پر مجبور تھا۔ وہ اس معمے کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اس تصور کو جھٹلانا چاہتا تھا کہ یہ سب محض ایک خواب ہے۔

ڈکی کھولتے ہی اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ ڈکی خالی تھی۔ ایک دفعہ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا ذہن بار بار اس بات کی تکرار کر رہا تھا کہ وہ یہ خواب کیوں دیکھ رہا ہے؟ اس بات یا خواب کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ وہ اپنی ماں کے متعلق خواب کیوں نہیں دیکھتا؟ جو کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی۔ دو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود اس کی یادیں ہنوز تازہ تھیں... جو اسے کسی پل چین نہیں لینے دے رہی تھیں۔

مطمئن ہونے کے بعد اس نے اپنے اپارٹمنٹ کا رخ کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس خواب کے بارے میں سوچنے لگا جو اسے کئی مہینوں سے وقتاً فوقتاً دکھائی دے رہا تھا۔ قابلِ غور بات یہ تھی کہ مقتولہ عورت کا چہرہ اس کے تصور کی حد سے دور تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ سیاہ لمبے بالوں والی ایک عورت تھی... وہ عورت جو اپنے کالے بالوں کی وجہ سے اس کے لیے بے پناہ کشش رکھتی تھی...

خواب میں کار کا عکس دھندلا نظر آتا تھا لیکن ڈکی کے اندر کا منظر بالکل واضح دکھائی دیتا تھا۔ اسے علم تھا کہ کچھ بھی ہو خواب میں نظر آنے والی وہ کار اس کی اپنی تھی۔

کیا وہ صرف عورت کی لاش دریافت کرنا چاہتا تھا؟

ہو سکتا ہے اس نے وہ قتل نہ کیا ہو... یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس عورت کو قتل کرنا چاہتا ہو۔

پچھلے دو سالوں سے مسلسل تنہا رہنے کی وجہ سے اس کے دل میں کچھ خواہشیں پیدا ہوئی تھیں، وہ انہیں پورا نہیں کر سکا تھا۔ کیا یہ تلخی اور تنہائی کا زہر اسے قتل پر آمادہ کر لے گا؟ یا پھر اس نے پہلے ہی نیند کے دوران چلتے پھرتے کسی کو قتل کر دیا تھا؟ اس کا جی ایک بار پھر متلانے لگا۔ الارم اس وقت بجنا شروع ہوا جب وہ گہری نیند میں تھا۔

صبح اٹھنے کے بعد اس نے خود کو قدرے تر و تازہ محسوس کیا... فریش ہونے کے بعد اس نے ناشتا کیا۔ اس کا ناشتا بلیک کافی کی کئی پیالیوں پر مشتمل ہوتا تھا جس میں چینی کافی مقدار میں ہوتی تھی۔ اس طرح کا ناشتا اس کی ماں بھی پسند کرتی تھی... وہ کافی کے گھونٹ لے رہا تھا کہ ایک کاکروچ میز کے ساتھ رینگتے ہوئے گزرا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اپنے مکے کے ایک ہی وار سے اسے مار دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ اس نے کیڑے مار دوا کے کافی اسپرے کیے تھے لیکن ان حشرات الارض سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اپنے کاموں کی تکمیل سے پہلے ہی کینسر کا شکار ہو جائے گا۔

آج وہ کلاس روم میں کچھ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ اس کا جسم اور ذہن بے حد تھکے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ اسٹوڈنٹس کو افلاطون کے بارے میں اپنے لیکچر کی جانب راغب نہ کر سکا۔ اسٹوڈنٹس اس کی جانب خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ اتنے بور ہو چکے تھے کہ انہوں نے اس کے ساتھ کسی بدتہذیبی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ اس نے خود سے سوال کیا، کیا وہ ایک اچھا استاد ہے؟ خوفناک خوابوں کے تسلسل نے اس کی کارکردگی اور پڑھائی کے معیار کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔

کلاس لینے کے بعد وہ لائبریری میں چلا گیا تا کہ آئندہ ہفتے کے دوران میں ہونے والے کام اور لیکچرز کے متعلق تحقیقی کام کی تیاری کر سکے۔ وہ اپنے کام میں اتنا مشغول ہوا

کہ اسے رات ہونے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ اسے طویل راتوں سے سخت نفرت تھی۔ اسے بہار اور گرمی کے موسم اچھے لگتے تھے اور لمبے دنوں کی روشنی دل کو بھاتی تھی۔ سردیوں میں وہ جلد گھر جانا پسند کرتا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ساری لائٹیں آن کر دیتا تا کہ ہر طرف تیز روشنی ہو جائے۔ وقت کو دیکھتے ہوئے اس نے جلدی سے اپنا کام سمیٹا اور گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

ابھی وہ باہر نکلنے کے لیے مین گیٹ تک ہی پہنچ پایا تھا کہ اس کی سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔ ”معاف کیجیے گا۔“ ایک پُرکشش کالے بالوں والی لڑکی اس کے نزدیک کھڑی اسے پکار رہی تھی۔ ”میرا نام باربرا کوہن ہے اور میں نئی ڈانس ٹیچر ہوں۔ میں آپ کی مشکور ہوں گی اگر آپ مجھے میری کار تک چھوڑ دیں۔“

”نہیں...“ اس نے کہنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی اور وہ لڑکی کی مدد کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ لڑکی انتہائی باتونی تھی۔ ان کی گفتگو کے درمیان کوئی لمبا وقفہ نہیں آیا۔ اس نے کسی بھی عورت کے ساتھ راہ و رسم نہ بڑھانے کا قطعی فیصلہ کیا تھا کیونکہ اب تک کئی عورتوں سے تعلقات بڑھانے کی اس کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پُرکشش شخصیت کا مالک ہے لیکن شاید اس میں ان صلاحیتوں کی کمی تھی جو جنسِ مخالف کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ وہ پینتیس... سال کا ہو چکا تھا اور اسے شک تھا کہ وہ شاید ہی کبھی شادی کر سکے۔ اسے یقین تھا کہ خواتین کی نظر میں وہ 'عجیب' سا انسان تھا۔ معلوم نہیں ان عورتوں کا یہ خیال درست تھا؟ کیا وہ ساری عورتیں غلطی پر تھیں؟

”شکریہ!“ باربرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جیسے ہی وہ کار کے نزدیک پہنچے تو اس نے پوچھا۔ ”سوری! میں تمہارا نام پوچھنا تو بھول ہی گئی؟“

”جارج سپائروس۔“

”تمہارا بہت بہت شکریہ مسٹر جارج! شب بخیر۔ مجھے امید ہے کہ ہماری دوبارہ ملاقات ہو گی۔“ اس نے ایک بار پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اس کی بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک یہ ایک رسمی بات تھی۔ جارج نے ماضی میں خود کو کئی مرتبہ دھوکا دیا تھا۔ اس نے باربرا کے انڈر روے تک پہنچ جانے کا انتظار کیا، اگرچہ اسکول ایریا میں تشدد کے واقعات نہ ہونے کے برابر تھے۔ جارج سپائروس اس اسکول میں ٹرانسفر ہونے پر خود کو خوش قسمت تصور کرتا تھا۔ پرانے اسکول میں

ہر شمارہ خاص شمارہ

سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ مئی 2010ء ہر بک اسٹال پر موجود ہے

صرف ایک بار پڑھنے کی ضرورت ہے

پھر آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے

مجسم دیوانگی

ایک ایسے شہنشاہ کا احوال، جسے آپ بھلا نہیں پائیں گے

خوراک کے اسرار

انسان نے سب سے پہلے کون سی غذا استعمال کی تھی؟

تماشۂ قدرت

خدا کی مصلحت، اسی لیے ان کی شکلیں ایک جیسی تھیں

ان کے علاوہ

فلمی الف لیلہ جیسی معرکتہ الآرا داستان، بہت ساری سچ بیانیاں، تاریخی واقعات اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنے کے تمنائی ہیں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں

اسے کافی تشدد کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کی وجہ سے اسے نوکری چھوڑنی پڑی۔ یہاں وہ اپنی ڈیوٹی کے فائدے اور اہمیت سے اچھی طرح واقف تھا۔

جیسے ہی وہ اس سڑک کی طرف مڑا، اسے ایک جوان عورت کار سمیت سڑک کے کنارے کھڑی دکھائی دی... کار کی ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ جارج کے دل کی رفتار اچانک تیز ہوگئی۔

''اوہ خدایا!'' اس کے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا تو اسے باربرا کھڑی دکھائی دی۔ ''اوہو! یہ تو باربرا ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔ وہ کار کے بونٹ کے نیچے کھڑی اینٹی فریز ڈال رہی تھی۔ اس نے خدا سے دعا کی کہ وہ اس سے پھر کوئی مدد نہ طلب کرلے۔

جارج کو آتے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ''گاڑی کا ریڈی ایٹر کچھ لیک ہے۔'' اس نے کچھ پوچھے بنا ہی بتانا شروع کردیا۔ ''مجھے بار بار اس میں اینٹی فریز ڈالنا پڑتا ہے۔ کسی دن میں بھی اس قابل ہو جاؤں گی کہ ایک نئی اور اچھی کار خرید سکوں۔ آپ کے رکنے کا بہت شکریہ... آپ بہت اچھے ہیں۔''

جارج نے نوٹ کیا کہ باربرا نے انگلی میں ڈائمنڈ کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جو یقیناً منگنی کی تھی۔ اگرچہ وہ زیادہ حیرت زدہ نہ تھا لیکن وہ اس کے گرم جوش اور محبت بھرے انداز پر معترض تھا۔ ایک اور آدمی کو غلط راستے اور غلط فہمی میں مبتلا کیا جارہا تھا۔ اس نے دیکھا اس کی گاڑی غلط جگہ پارک تھی۔ کیا وہ اتنی معصوم تھی... کہ اسے احساس نہ ہوا کہ اس نے اپنی گاڑی کتنی خطرناک جگہ پارک کی ہے؟

جارج نے اسے بتایا کہ وہ آئندہ گاڑی کہاں کھڑی کرے۔ وہ جگہ اسکول سے تھوڑے فاصلے پر تھی اور ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔

جیسے ہی وہ ڈکی کی طرف گئی، جارج نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور اپنی کنپٹیوں کو زور سے دبایا۔ باربرا نے ہاتھ ہلا کر اسے خدا حافظ کہا اور مسکرائی۔ جارج نے بھی اس کی پیروی کی اور الوداع کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اس کے ذہن میں انتہائی خوفناک تصورات کلبلا رہے تھے اور تصوراتی عکس کی چیک اس کے ذہن اور دماغ پر عجیب اثرات مرتب کررہی تھی۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے غصہ آنے لگا۔ حالانکہ اس کی گاڑی میں گیس کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ شیشے کھولنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ سردی کی تیز لہر کی نسبت اس بُو کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ تھا۔

گھر پہنچتے ہی وہ کاؤچ پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور ٹی وی دیکھنے لگا۔ اس کے ذہن میں انتہائی باغیانہ خیالات آرہے تھے۔ اس نے اپنے مالکِ مکان کو کوسا جس نے گھر میں ہیٹنگ کا مناسب نظام مہیا نہیں کیا تھا۔ بالآخر ٹی وی دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

اچانک ہی وہ ایک چیخ کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ خواب پہلے سے بھی زیادہ واضح اور بھرپور تھا۔ اس دفعہ اس لاش کا ایک چہرہ بھی تھا... اور... وہ چہرہ... باربرا کوہن کا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ پر زور سے کاٹا...

خواب میں کوئی آدمی ایک عورت کے جسم کو کار کی ڈکی میں ڈال رہا تھا۔ اس طرح کا ڈراما اس نے کچھ عرصے پہلے دیکھا تھا۔ کیا وہ کہانی اب اسے خوف زدہ کررہی تھی؟ یا پھر اس کے تحت الشعور میں دبی ہوئی کوئی چیز ابھر کر سامنے آرہی تھی؟ کیا وہ قتل کسی اور جنم میں ہوا تھا جو اب دوبارہ مجسم ہوگیا تھا۔ اس کا خواب اور اس سے متعلق غیر معمولی مثالیں جو کہ اس کے تجربے میں آئی تھیں، اسے یہ یقین دلانے پر مجبور کررہی تھیں کہ آئندہ بھی اس قسم کے مسلسل حادثات یا واقعات پیش آئیں گے۔ یہ خیال کہ اس نے شاید کسی کو قتل کردیا ہے، یقیناً پریشان کن تھا۔ چند ساعتوں کے بعد وہ خود کو زمانہ قدیم کا انسان تصور کرنے لگا جو اپنی بقا کے لیے قتل کرتا ہے... نہ کہ اپنی لذت اور کج روی کی آگ بجھانے کے لیے جیسا کہ یہ خواب اشارہ کررہا تھا... اپنی ماں کی بیماری کے دوران اس کی خدمت اور پھر تعلیم کا مقدس پیشہ اختیار کرنا، اس کے ماضی میں کیے گئے جرائم کا کفارہ تو نہیں تھا؟

وہ محسوس کررہا تھا کہ یہ قتل ماضیِ قریب میں ہوا ہوگا۔ کیا یہ اس کے پہلے جنم میں ہوا تھا یا پھر اس کی زندگی کے ابتدائی دور میں وقوع پذیر ہوا تھا؟ وہ گاڑی میں جس عورت کی لاش دیکھتا تھا، وہ چند عشروں سے زیادہ پرانی نہیں تھی۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ خواب میں دکھائی دینے والا منظر پرانے زمانے میں چلنے والی گھوڑا گاڑی یا کسی ٹرین کا حصہ نہیں تھا۔ کیا وہ اس کار کے پرانے مالک کو اس قتل کا قصوروار ٹھہرائے؟ کیا واقعی یہ کار جو اس نے ایک ڈیلر سے خریدی تھی، اس کا مالک اس قتل میں ملوث تھا؟

اگلے دن وہ اسکول کی چھٹی کے بعد ایک سپر مارکیٹ گیا۔ سپر مارکیٹ میں کافی رش اور شور تھا اور وہ اس قسم کی افراتفری اور شور وغل والی جگہ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے گھر میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں ختم ہوگئی تھیں جن میں بنیادی اہمیت کی حامل... کافی اور سگریٹ تھے۔ وہ دن میں ایک دفعہ کھانا کھا کر گزارہ کرسکتا تھا لیکن کافی اس کا شوق اور مجبوری تھی۔ وہ دن میں کافی کی کئی پیالیاں پی جایا کرتا تھا۔

ایکسپریس لائن لمبی اور سست تھی۔ کیشئر بھی آہستہ اور احتیاط سے کام کررہا تھا تاکہ کیش گننے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ جارج کا دماغ گرم ہونے لگا کیونکہ رات کی تاریکی پھیلنا شروع ہوگئی تھی جو کہ وقت سے کافی پہلے تھی۔ موسم نے جون بدلی اور آسمان پر گہرے بادل چھا گئے۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ ایک کالے بالوں والی عورت کے گلے پر جمے ہوئے ہیں۔ اپنے غصے اور نفرت کی انتہا دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ مختلف چیزوں کو واپس شیلف میں رکھتے ہوئے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے کافی کا ایک بیگ اپنی جیب میں ڈال لیا اور اپنی جگہ سے ہٹ گیا... ''تم ایک چور نہیں ہو۔'' اس نے خود سے کہا۔

اب کیش کاؤنٹر پر دوسری لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے بعد اس نے جارج کی خریدی ہوئی چیزوں کی قیمت لگانی شروع کی۔ وہ کھڑکی سے باہر کسی نامعلوم چیز کو گھور رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ وہ سستی اشیا کے اسٹور میں کیوں نہیں چلا گیا؟ چند ڈالرز کی بچت ہی ہو جاتی... اس نے سوچا۔

وہ اسٹور سے باہر نکلا تو ہلکی سی روشنی تھی۔ وسیع و عریض کار پارکنگ میں ہیڈ لائٹیں چمک رہی تھیں۔ وہ تیزی سے اپنی کار تک پہنچا جو کہ اس نے کافی فاصلے پر کھڑی کی تھی۔ جیسے جیسے وہ کاروں کے درمیان سے گزرتا گیا، اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی عورت ڈکی پر ڈکی کھولتی جارہی ہے۔ اس کے سر پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ اچانک ہی کسی کار کے ٹائر زور سے چرچرائے۔ ایک عورت نے ہارن بجایا اور اسے بُرا بھلا کہا۔ آخرکار جلتے ہوئے پھیپھڑوں اور تیز سانسوں کے ساتھ وہ اپنی سیڈان کی پُرحفاظت چھت تلے پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اپنی حالت کے پیشِ نظر اس کو کسی ماہر کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس نے سب سے پہلے ایک ڈاکٹر سے رجوع کیا۔

ڈاکٹر نے اس کی بات سنی۔ جارج اس کے سامنے جلد ہی کھل گیا تھا۔ اپنی تکلیف اور ماضی کا حال سنا کر وہ اپنے آپ کو پُرسکون اور آرام دہ محسوس کررہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے چند ہی دوست تھے اور وہ تقریباً چودہ سال کی عمر سے کام کررہا تھا... دوسرے تارکِ وطن کی طرح۔ اس کا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔ اس نے اپنی گریجویشن آنرز کے ساتھ مکمل کی۔ اس کے دونوں بھائی جو کہ اس سے بڑے تھے، ایک ریسٹورنٹ میں اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ اب جبکہ اس کی ماں مر چکی تھی، وہ ان کو صرف چھٹیوں کے دوران ہی دیکھتا تھا۔ اس کا پرانا اسکول جہاں اس نے دس سال نوکری کی تھی، اس کا ماحول بے حد خراب تھا۔ جس اسکول میں وہ پڑھا رہا تھا اس کا ماحول قدرے بہتر تھا لیکن وہاں پر بھی وہ کوئی حقیقی دوست نہ بنا سکا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی تنہائی پسندی اور شرمیلی طبیعت اسے باہر کی دنیا سے کاٹ کر رکھ دے گی۔

''مجھے ڈر ہے کہ میں کسی کو نقصان پہنچا بیٹھوں گا۔'' اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ وہ اس قدر ذہنی تناؤ کا شکار تھا کہ کاؤچ پر لیٹنے کے بجائے اس کے ایک کنارے پر ٹکا ہوا تھا۔ ''یہ بہت پریشان کن اور ایک ہی دورانیے کا خواب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اس میں مزید کوئی چیز دیکھوں تاکہ کوئی سرا یا سراغ ہاتھ آسکے۔ حالانکہ اس خواب کے دیکھنے کا تصور ہی میرے لیے خوفناک ہے۔ شاید میں نے پہلے ہی کسی کو قتل کردیا ہے اور میرا تحت الشعور اسے میری یادداشت تک پہنچنے سے روک رہا ہے۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی بات مکمل کی۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں، تمہیں کیا کرنا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''میرے پاس کچھ غیر حل شدہ قتل کے کیسوں کی فائلیں ہیں۔ تمہیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ انہیں پڑھو اور ان میں سے کسی کیس کی اپنے خواب کے ساتھ مشابہت ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ اس طرح تمہیں خود کو اطمینان دلانے میں کامیابی ہوگی کہ پرابلم کی جڑ یہ نہیں ہے... یعنی تم سے پہلے کوئی قتل سرزد نہیں ہوا ہے۔ جیسا کہ میں تمہارے بتائے ہوئے حالات و واقعات سے نتیجہ اخذ کرسکا ہوں... اور اگلی میٹنگ میں مجھے امید ہے کہ میں تمہاری تکلیف کا مزید بہتر طریقے سے تجزیہ کرسکوں گا۔''

''میں جانتا ہوں کہ یہ پاگل پن ہے لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے کہ مجھے اپنے خواب کی تکمیل کرنی پڑے گی... اگر میں اس کی تکمیل پہلے نہیں کرچکا ہوں۔'' جارج نے کراہتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ''میں اپنے کارڈ کے پیچھے نمبر لکھ رہا ہوں۔ جس وقت بھی تمہیں میری ضرورت پڑے، مجھے کال کردینا۔''

فائلوں کے مطابق شہر کا کوئی غیر حل شدہ کیس اس کے خواب سے مماثلت نہیں رکھتا تھا۔ جارج کا خیال تھا کہ یہ ڈاکٹر کی اسے اطمینان دلانے کی ایک معمولی کوشش تھی تاکہ ڈاکٹر اس کا زیادہ سے زیادہ نفسیاتی تجزیہ کرسکے اور اس سے ہزاروں ڈالرز کما سکے۔ اس نے خودکشی کے متعلق سوچا لیکن اس کے بارے میں وہ کوئی حتمی رائے نہیں رکھتا تھا۔ وہ حیران

تھا کہ انسان کی تقدیر میں کیسے کیسے پیچ وخم ہوتے ہیں اور ہر انسان کو اپنی تسلی اور مقصد کی تکمیل کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن تقدیر سے کسی طرح بھی مفر نہیں۔ وہ اپنے دل میں ماتم... اور افسوس کررہا تھا کہ اس کی کیسی قسمت تھی؟ اسے تعجب تھا کہ اگر وہ ایک کالے بالوں والی لڑکی کو قتل کرے گا تو کیا اسے اس بھیانک خواب سے نجات مل جائے گی؟ وہ محسوس کررہا تھا کہ اس کا جوش وخروش اتنی آسانی سے ٹھنڈا نہیں ہوگا... اور اسے پھر قتل کرنا پڑے گا... حالانکہ وہ صرف ایک قتل کرنا چاہ رہا تھا۔

ڈاکٹر کی تھراپی کے باوجود اسے خواب اکثر و بیشتر نظر آرہا تھا۔ وہ جیسے ہی سوتا، اسے خواب نظر آنا شروع ہوجاتا۔ اس کے اعصاب بالکل تباہ ہوچکے تھے۔ اس نے ڈاکٹر کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ اس امر کے باوجود کہ ڈاکٹر نے اسے کئی مرتبہ بلایا تھا اور اس پر تھراپی کرانے کے لیے زور دیا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کے سبب اس کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئے۔ اس نے خود پر توجہ دینی چھوڑ دی۔ اس کی ظاہری شکل وصورت خراب ہوتی چلی گئی۔ اس کے بال کافی بڑھ گئے تھے جیسے وہ کالج کے زمانے میں رکھا کرتا تھا۔ اس کی ڈاڑھی بے ترتیب ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ نہانے سے بھی کترانے لگا تھا۔ اس نے خود کو اسکول تک محدود کرلیا اور کئی مرتبہ غصے کی زیادتی سے پھٹ پڑا۔ اس کے اسٹوڈنٹس اس کے رویّے سے پریشان وخوف زدہ تھے۔

"میں کلاس ختم ہونے کے بعد تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے ایک دن ایک کالے بالوں والی لڑکی سے کہا۔

"لیکن میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔" وہ منمنائی۔

کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ صرف گھورتا رہا مگر کچھ بولا نہیں۔ اس لڑکی کی خوب صورت آنکھیں خوف سے پھیل گئیں اور اسے دیکھ کر جارج کے جارحانہ جذبات یک دم ہی سرد پڑ گئے۔

"مجھے افسوس ہے۔" اس نے سر جھکا کر نرمی سے کہا۔ "میں شاید اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ مجھے بے خوابی کا مرض ہے۔ تم جاسکتی ہو۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ لڑکی اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ اس بات پر مایوس تھا کہ اس لڑکی نے اس سے بات کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن ساتھ ساتھ اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ اس نے لڑکی کے ساتھ کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس پر اسے بعد میں پچھتانا پڑتا۔

کچھ دیر بعد اس کے خیالات کی رو پھر بہک گئی... اس کے انتشار زدہ دماغ میں تشدد آمیز منظرنامے ایک تصویر کی طرح گھومنے لگے۔ جلد یا بہ دیر یہ سب کچھ عیاں ہونے والا تھا۔ حالات اس طرف اشارہ کررہے تھے کہ یہ واقعہ اسی طرح رونما ہوگا جس طرح اس کے مقدر میں لکھا یا پھر جیسا کہ ماضی میں رونما ہوچکا تھا۔

اپارٹمنٹ کی قید اب اس کی برداشت سے باہر ہوچکی تھی۔ وہ اسکول کی لائبریری میں چلا گیا اور خود کو مطالعے میں مصروف کرلیا۔ اب تو رات کی آمد کا خوف بھی اسے نہیں ڈرا رہا تھا بلکہ وہ اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

حسبِ معمول وہ پارکنگ لاٹ کی طرف جارہا تھا۔ اسے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ باربرا کوہن اپنی کار کے ساتھ کھڑی تھی اور اس نے کار کا بونٹ کھولا ہوا تھا۔ "اگر تمہارے پاس جمپر کی تاریں ہوں تو دے دو... تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

'جب تک تم میرے نزدیک نہیں آؤ گی۔' اس نے سوچا... اندر ہی اندر ایک خیال اسے خوف زدہ کررہا تھا۔ وہ باربرا کو کار کی ڈکی میں ٹھونسنا چاہتا تھا؟ "خدایا... کتنی ٹھنڈ ہے۔" جارج نے اپنی کپکپاہٹ کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ جب تک وہ تار نہ لے آیا، باربرا کار کا بونٹ کھولے معائنہ کرتی رہی لیکن اس کی کار اسٹارٹ نہ ہوئی...

"اب میں کیا کروں؟" اس نے کہا اور اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "مجھے آدھے گھنٹے میں اپنی کلاس اٹینڈ کرنی ہے۔ میں گاڑی کی سروس کا انتظار نہیں کرسکتی۔"

"تمہیں کہاں جانا ہے؟" جارج نے پوچھا۔

"بروکلین کالج۔" باربرا نے جواباً کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ یہ میرے راستے میں پڑتا ہے۔"

وہ اس بات پر حیران نہیں تھا کہ اس نے کتنی آسانی سے جھوٹ بولا تھا۔ کالج اس کے راستے میں نہیں پڑتا تھا۔ باربرا نے اس کی پیشکش خوشی کے ساتھ قبول کرلی... اس کے بگڑے ہوئے اور خراب حلیے کے باوجود... ایسا لگتا تھا کہ سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہورہا ہے۔

اس نے ایک مہنگے اسٹور کے قریب گاڑی روکی۔ "میں ایک منٹ میں واپس آتا ہوں۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ کیا میں تمہارے لیے بھی کوئی چیز لاؤں؟" اس نے کار سے اترتے ہوئے اخلاقاً پوچھا۔

باربرا نے انکار کردیا۔ کچھ دیر بعد جارج مشروب کی بڑی بوتل کے ساتھ واپس آگیا۔

دورانِ سفر باربرا اسے اپنے کورس کے متعلق بتاتی رہی اور وہ بڑے اطمینان کے ساتھ مشروب کے گھونٹ لیتا رہا۔

"میں کورس سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔" باربرا نے اسے بتایا۔ جارج نے مشروب کا آخری گھونٹ بھرا۔ وہ موقع کی تاک میں تھا اور درست لمحے کا بے چینی سے انتظار کررہا تھا... سامنے سے آتی ہوئی کار کی تیز چمک اس کی آنکھوں پر پڑی جس نے اسے اپنا کام کرنے پر اکسادیا۔ اس نے اپنا بازو گھمایا اور باربرا کے ماتھے پر ایک زوردار پنچ مارا جیسے اس کی سزا سنادی گئی ہو... باربرا بُری طرح تڑپی۔ حملہ اتنا اچانک اور فوری تھا کہ وہ چلّا بھی نہ سکی۔ وہ متواتر اپنے گھونسوں اور مکّوں سے اس کے چہرے اور پیشانی پر حملے کرتا رہا۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کوئی اسے دیکھ لے گا۔ کچھ بھی ہو... کسی بھی طرح ہو، اسے اپنا کام کرنا تھا۔ روحانی اذیت ختم ہوچکی تھی... "تو بس اتنا ہی تھا۔" اس نے بے حس وحرکت جسم کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے ایک اور زوردار گھونسا بے حس وحرکت جسم کی پیشانی پر رسید کیا... مشروب کی بوتل زور سے ہلی۔ "نہیں... نہیں۔" اس نے کہا اور بوتل اٹھا کر باہر پھینک دی اور باربرا کی عینک کے شیشے کے ٹکڑے اس سے علیحدہ کیے۔ اپنی تسلی کے لیے وہ اسے زخمی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے جسم پر مزید کوئی نشان ڈالے بغیر اسے ڈکی میں منتقل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے سروس روڈ پر کچھ دیر گاڑی چلائی پھر اس نے ایک ڈرائیو وے پر اپنی گاڑی موڑ دی۔ وہاں رکاوٹوں کی دوڑ میں ٹریننگ دینے والا اسکول واقع تھا۔ اس اسکول میں اس کا ایک کزن بھی کام کرتا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی اس اسکول کے عقب میں روکی۔ وہاں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

اس نے باربرا کو ڈکی میں ڈالا اور اس کے جسم پر اس کی ٹوٹی ہوئی عینک کے ٹکڑے بکھیر دیے اور ڈکی بند کردی۔ پھر اس نے گلو کمپارٹمنٹ سے فلیش لائٹ نکالی۔ ڈکی کو کھولا اس کے اندر لائٹ ڈالی... "شان دار!" اس نے کہا... اس نے مکمل طور پر ویسا ہی کام سرانجام دیا تھا جیسا کہ وہ خواب میں دیکھتا رہا تھا۔

وہ باربرا کے جسم کو اٹھا کر اسکول کے پیچھے واقع ایک ڈمپنگ گراؤنڈ میں لے گیا جو کہ ایک قبرستان کی طرح پُراسرار اور ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں اتنا زیادہ تعفن اور بدبو تھی کہ جب لاش گلے سڑے گی تو اس کی معمولی بدبو اس عظیم الشان گندگی کی بُو میں شامل ہوجائے گی۔ جارج نے اس کے جسم کو ملبے سے ڈھک دیا... اور اس کے بیگ اور کتابوں کو گندے پانی کے تالاب میں پھینک دیا۔

اس نے واپسی کا راستہ آہستہ آہستہ طے کیا۔ وہ راستے میں ایک شرارتی شکل کے بچے کو جو کہ اسکیٹنگ کررہا تھا، دیکھ کر محتاط ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بچہ اس کے لیے خطرے کا باعث نہیں بن سکتا تھا۔

اس نے شاور لیا اور شیو کی... اس نے غور کیا کہ اس کا وزن کافی کم ہوچکا ہے اور سر کے بال کافی بڑھ چکے ہیں جو کسی عورت کے بالوں سے مماثلت رکھتے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ اپنا خیال رکھے گا۔

وہ کاؤچ پر دراز ہوگیا۔ کئی مہینوں کے بعد وہ پہلی بار سونے سے خوف زدہ نہیں تھا۔

قسمت کا لکھا پورا ہوچکا تھا۔ رات کو سوتے ہوئے پھر اس نے خواب دیکھا کہ وہ اسکیٹنگ بورڈ پر سوار گلی میں لڑھکتا پھر رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک بے وقوفانہ سی ہنسی ہے اور اس کے پڑوسی انگلیاں اٹھا اٹھا کر الزام دینے والے انداز میں اشارہ کررہے ہیں۔ اس کے بازو باہر کی طرف پھیلے ہوئے تھے اور اس کی انگلیاں نیزوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں جیسے وہ کسی کا گلا دبوچنے کے لیے بالکل تیار ہو۔

وہ اچانک گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ بے ترتیب اور تیز سانسوں کے ساتھ... چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ خواب کا پیغام بالکل واضح تھا کہ اس کے مقدر کا لکھا بالکل پورا نہیں ہوا تھا۔ کیا تلخ مذاق تھا؟ وہ اندر ہی اندر رو رہا تھا، ماتم کررہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بے چینی سے اپنے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتا جارہا تھا۔ وہ تصور کررہا تھا کہ مصیبت کا وہ دور ختم ہوچکا ہے... لیکن یہ سب صرف اسے سبق سکھانے کے لیے تھا۔ اب کیا وہ کئی لوگوں کو قتل کرنے والا یا سیریل کلر بن جائے گا؟ وہ اس بات پر خوش تھا کہ اس کی ماں یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ نہیں تھی۔ یہ سب کچھ اسے جیتے جاگتے مارنے کے لیے کافی تھا۔

باربرا کوہن کا خیال آتے ہی وہ اپنے آپ کو بیمار بیمار سا محسوس کرنے لگا۔ کیا وہ صرف ایک خواب تھا؟ اس نے حیرانی سے سوچا۔

یہ خیال آتے ہی اس نے جلدی سے اپنا کوٹ پہنا اور اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔

اس نے غور کیا کہ پسنجر سیٹ پر کچھ توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔ شاید یہ خود اس سے ہوئی ہو؟ یہ سب سوچتے ہوئے اس نے کار اسٹارٹ کی۔ وہ سیدھا ڈمپنگ گراؤنڈ پہنچا۔ وہاں پہنچ کر

ناہموار قطعۂ زمین پر اسے زبردست دھچکا لگا۔ وہاں کی بُو ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے منہ پر کپڑا لپیٹا۔ ہر چیز بہت خراب حالت میں نظر آرہی تھی... اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن اسے باربرا کوہن کا وجود کہیں نظر نہیں آیا۔ کیا لاش گلنے کا عمل اتنی تیزی کے ساتھ ہوا تھا؟ اس نے اچھی طرح اس جگہ کی تلاشی لی لیکن باربرا کے جسم کو تلاش نہ کر سکا۔ اس نے سسکی لی اور گھٹنوں کے بل گر کر رونے لگا۔ اس کے ہاتھ دعائیہ انداز میں جڑ گئے۔

اب وہ واپس جا رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اسے خواب بار بار کیوں دکھائی دے رہا تھا؟ وہ نئے خواب پر غالب تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے مقدر کا لکھا پورا نہیں ہوا تھا۔ اس نے گاڑی کو سائڈ میں روکا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ گاڑی کا انجن اس نے چلتے رہنے دیا تاکہ حرارت برقرار رہے۔ چند لمحوں میں وہ نیند کی آغوش میں تھا اور خواب دیکھ رہا تھا۔ اسی طرح تناؤ سے بھرپور جیسا کہ پہلے تھا۔ کیا اس نے عورت کو ڈکی سے نکالا تھا یا پھر وہ بھی خواب کا کوئی حصہ تھا؟

وہ لڑکھڑاتے ہوئے کار سے باہر نکلا۔ اسے اپنے معدے میں گرانی محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک ہی ایک چوہا اس کے پاس سے گزرا۔ وہ زور سے اچھلا اور فلیش لائٹ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گئی۔ اب لائٹ نہیں جل سکے گی اور وہ اندھیری جگہ منور نہیں ہو سکے گی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اپنی تفتیش مکمل کرنے سے پہلے ہی چکرا کر گر پڑے گا۔ حالانکہ اس جگہ سے کچھ دور ایک اسٹریٹ لائٹ موجود تھی۔ اس نے ڈکی کے اندر اچھی طرح ہاتھ پھیرا تاکہ اس کے خالی پن کو محسوس کر سکے۔ اسے ڈکی میں صرف ٹوٹے ہوئے شیشے کے چھوٹے سے ٹکڑے ملے جو کہ اس کی انگلیوں میں چبھ گئے...... اس نے اپنا منہ ڈکی کے فرش کے قریب کیا اور کونوں کھدروں کا جائزہ لیا۔

اچانک ہی... جب وہ پورا جھکا ہوا تھا، ڈکی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ اس کی پشت پر بند ہوئی... وہ تکلیف کی شدت سے زور سے چلّایا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر زوردار چوٹ لگی تھی اور وقتی طور پر اس کا نچلا دھڑ مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ ڈکی کئی بار کھلی اور زوردار دھماکے کے ساتھ اس کی پشت سے ٹکرائی... وہ بے ہوش ہو چکا تھا... اس کے بعد کسی ٹھوس چیز سے اس کے بے ہوش جسم پر وار ہوئے... باربرا کوہن اب اس کے بے جان جسم کو پوری طاقت کے ساتھ اٹھا کر ڈکی میں ٹھونسنے اور اسے بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

ہوش میں آنے کے بعد باربرا کوہن نے خود..... کو ڈمپنگ گراؤنڈ میں پایا۔ وہ حیران و پریشان تھی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے وہاں سے اٹھی اور ڈمپنگ گراؤنڈ کے تعفن زدہ ماحول سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ وہ سروس روڈ پر پہنچی ہی تھی کہ جارج اپنی گاڑی کی ڈکی کھولتا ہوا نظر آیا۔

وہ جارج کی کار کے ساتھ خاموشی سے لگ گئی اور ٹٹول کر دروازہ کھولا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور ڈرائیونگ ...... سائڈ کا شیشہ تقریباً نصف کھول دیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے کچھ راحت پہنچائی۔ گاڑی تھوڑی آگے بڑھی تھی کہ اسے شدید چکر آنے شروع ہو گئے۔ اس نے دوسری جانب سے آتی ہوئی گاڑی کے ڈرائیور کو پکارا اور بے ہوش ہو گئی۔

چند گھنٹوں کے بعد پولیس کی ایک پیٹرول کار اس کی گاڑی کے نزدیک آ کر رکی جس کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔

اس نے فلیش لائٹ جلا کر اندر فرنٹ سیٹ پر روشنی ڈالی۔ اندر ایک عورت ڈرائیونگ سیٹ پر آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ وہ کار سے ذرا دور آیا اور اپنے ساتھی اہلکار سے کہا۔ ”ایمبولینس کے لیے کال کرو۔“ اس کے بعد وہ حرکت میں آیا اور کار کا چلتا ہوا انجن بند کیا۔ اب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود عورت سے مکالمہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں باربرا نے حرکت کی۔

”میڈم! تمہیں اس طرح آدھا شیشہ کھول کر اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں سونا چاہیے تھا۔ یہ بہت خطرناک ہو سکتا تھا۔“ بات کرتے ہوئے پولیس آفیسر کی نگاہ اچانک اس کے پھٹے ہونٹ اور ماتھے پر موجود سخت ضربوں کے نیلے نشانات اور سوجن زدہ حصے پر پڑی۔

”یہ کیا ہے؟... تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ پولیس آفیسر نے اس سے پوچھا۔

وہ منمنائی۔ اس نے اپنے کان اس کے ہونٹوں کے نزدیک کیے۔

”ڈکی میں... آفیسر... ڈکی کو چیک کرو...“

سیکنڈ آفیسر نے ڈکی کو کھولا اور فلیش لائٹ کی روشنی اس میں ڈالی... اس میں ایک مڑا تڑا بے جان وجود پڑا تھا۔ جس کے اوپر ٹوٹی ہوئی عینک اور اس کے شیشے پڑے تھے۔ اس بے جان وجود کے لمبے لمبے بال اس کے منہ پر پڑے ہوئے تھے۔

پولیس آفیسر کا پہلا تاثر یہی تھا کہ وہ کوئی عورت ہے...!

زندگی، محبت اور شکم کی آگ کے درمیان بقا کا کھیل

پیٹ بھرا ہو تو مال و زر ہر بھوک کا علاج محسوس ہوتے ہیں لیکن جب دولت تو ہو لیکن پیٹ بھرنے کے لیے خوراک نہ ملے تو صرف زندگی کی بقا ہر شے اور جذبوں پر بالادستی اختیار کرلیتی ہے۔

بھوک

کاشف زبیر

ایلس نے اپنے بھائی کو محبت سے دیکھا۔ جان اس سے صرف دو سال بڑا تھا اسی وجہ سے دونوں میں دوستوں جیسی بے تکلفی تھی۔ دونوں بہن بھائیوں کے شوق بھی مشترک تھے۔ دونوں کو گھومنے پھرنے اور دنیا دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ سال میں ایک مہینا انہوں نے سیاحت کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس سال وہ سرما میں سائبیریا جا رہے تھے جہاں وہ سائبیرین آئی بیکس کا شکار کرتے اور اس علاقے میں گھومتے پھرتے۔

ایلس اور جان والٹن دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کے خاندان کا شمار برطانیہ کے چند دولت مند ترین گھرانوں میں ہوتا تھا اور ان کے لیے مالی لحاظ سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ وقت کا تھا۔ ان کا بیشتر وقت کاروباری مصروفیات میں گزرتا۔ اس وجہ سے وہ سال میں صرف ایک بار ہی سیاحت کے لیے نکل پاتے تھے۔ ورنہ ان کی تو خواہش تھی کہ سال میں کئی بار سیاحت کے لیے نکلیں۔

سفر کرنے کے لیے ان کے پاس ذاتی جیٹ طیارہ تھا۔ وہ عام طور سے اسی میں سفر کرتے تھے۔ روس کے دور دراز علاقوں میں ان کا یہ جیٹ طیارہ بہت کام آتا اور انہیں کئی کئی دن پرواز کے لیے انتظار کی زحمت سے نجات مل جاتی۔ سارے انتظامات ہو گئے تھے۔ اس بار ان کے ساتھ چار دوست بھی سفر کر رہے تھے۔ ان میں جان کی گرل فرینڈ بیٹیکا لارا، جان کا ایک اور دوست روزن اور ایلس کے دوست میاں بیوی اسٹیو اور کیتھی تھے۔ یہ چھ افراد جیٹ طیارے میں سفر کرتے۔ ایلس اور جان نے ساری تیاری مکمل کر کے اپنے دوستوں سے رابطہ کیا تو وہ بھی تیار تھے۔ انہوں نے سب کو ائرپورٹ پہنچنے کو کہا۔ ان کا طیارہ گلاسگو کے قریب ایک پرائیویٹ ائرپورٹ پر موجود تھا۔

اس روز موسم خراب تھا لیکن برف باری نہیں ہو رہی تھی۔ اگر برف باری ہوتی تو ان کے لیے مشکل ہو جاتی۔ ویسے تو یورپ بھر کا موسم خراب تھا اور اس موسم میں لوگ سفر کرنے سے گریز کرتے تھے لیکن ان کی مجبوری تھی کہ آئی بیکس کا شکار صرف سرما میں ہی ممکن تھا کیونکہ گرمیوں میں آئی بیکس سائبیریا کے ان خطوں کی طرف نکل جاتے تھے جہاں انسانی رسائی بہت دشوار تھی۔ البتہ سرما میں یہ ہجرت کر کے جنوبی

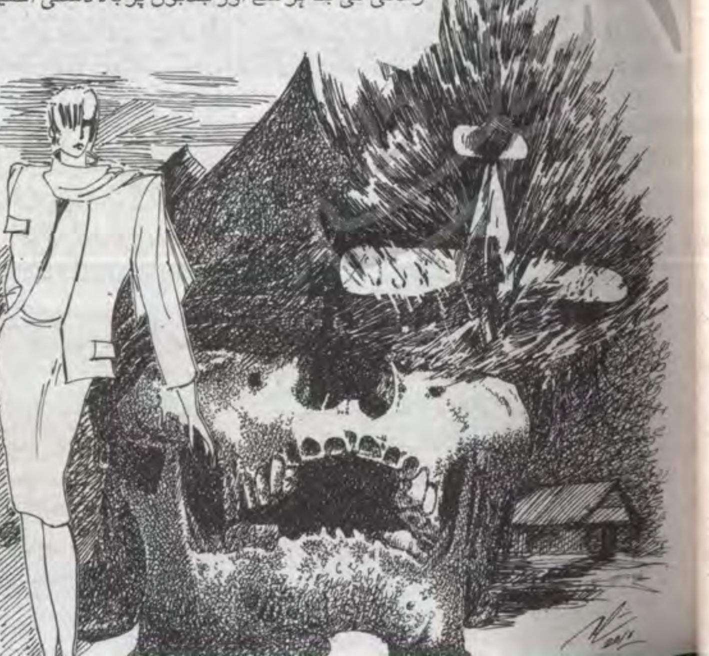

سائبیریا آجاتے تھے جہاں انہیں کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ سبزہ مل جاتا اور یہ اس خوراک اور اپنے جسم میں موجود چربی کے سہارے سرما گزار لیتے تھے۔ ان کا شکار صرف اسی موسم میں ممکن تھا جب یہ جنوب کی طرف آتے تھے۔

ایلس اور جان جیٹ طیارے کے ہینگر میں اپنی کار سے اترے تو ان کے چاروں دوست وہاں پہلے سے موجود تھے اور ان کا سامان طیارے پر بار کیا جارہا تھا۔ انہوں نے آپس میں ہاتھ ملائے۔ کیتھی نے کہا۔ ”موسم بہت خراب ہے۔“

طیارے کا پائلٹ پال آئیوان ان کی طرف آیا۔ ”ممکن ہے ہمیں راستے میں کسی جگہ رک کر موسم صحیح ہونے کا انتظار کرنا پڑے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ ایلس نے کہا۔ ”ہمارے پاس کافی دن ہیں۔“

”لیکن بہتر ہے کہ راستے میں وقت ضائع نہ کریں۔“ جان نے سوچ کر کہا۔ ”اس طرح ہمیں شکار کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے گا۔“ اس نے پال کی طرف دیکھا۔ ”فلائٹ پلان کیا ہے؟“

پال نے اس کے سامنے ایک چھوٹا سا نقشہ طیارے کی باڈی سے لگایا اور انگلی سے سمجھانے لگا۔ ”پلان یہاں سے جرمنی، پولینڈ اور بیلا روس سے ہوتے ہوئے براہِ راست رشین فیڈریشن جانے کا ہے۔ ہم سینٹ پیٹرز برگ میں لینڈ کریں گے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس سارے علاقے کا موسم بہت خراب ہے اور سینٹ پیٹرز برگ کے بارے میں پیش گوئی ہے کہ وہاں برفانی طوفان متوقع ہے۔“

”اگر یہ روٹ مشکوک ہے تو ہمارے پاس متبادل راستہ کون سا ہے؟“ ایلس نے پوچھا۔

”دوسرا روٹ اٹلی کا ہے۔ یہاں سے ہم فرانس اور سوئٹزرلینڈ... کراس کر کے اٹلی میں لینڈ کریں گے اور پھر وہاں سے شمال کی طرف مڑ کر کروشیا، ہنگری اور یوکرائن سے ہوتے ہوئے رشین فیڈریشن میں داخل ہوں گے اور پھر ماسکو پر لینڈ کریں گے۔“

”کیا خیال ہے؟“ جان نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ دوسرا روٹ ٹھیک ہے۔“ ایلس بولی تو کیتھی نے بھی اس کی تائید کی۔ ”اس طرح سفر ضرور طویل ہوگا لیکن ہم خراب موسم کا سامنا کیے بغیر روس تک پہنچ سکتے ہیں۔“

سب کی رضامندی کے بعد جان نے دوسرے روٹ کی اجازت دے دی اور پال اے ٹی ایف سے بات کرنے چلا گیا تاکہ روٹ کنفرم کر لے۔ انہوں نے بھی اپنا سامان اٹھایا اور طیارے میں بار کرنے لگے۔ ان چھ کے علاوہ پال اور اس کا نائب آڈرے بھی تھا۔ آڈرے نائب پائلٹ ہونے کے ساتھ اسٹیوارڈ کا کام بھی کرتا اور دورانِ سفر ان لوگوں کو کھانا اور مشروبات سرو کرنا اس کی ذمے داری تھی۔ جب وہ طیارے میں داخل ہوئے تو آڈرے کھانے پینے کا سامان کچن میں اس کے لیے مخصوص جگہ پر رکھ رہا تھا۔ اس نے کام کے دوران ان سے ہیلو ہائے کر لی۔

کچھ دیر بعد پال نے اپنے کیبن سے جھانک کر کہا۔ ”سب سیٹ بیلٹ باندھ لیں، میں ٹیک آف کی اجازت لے رہا ہوں۔“

انہوں نے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ کر سیٹ بیلٹس باندھ لیں اور چند منٹ بعد جیٹ طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ وہ زمین سے بلند ہوا اور تیس ہزار فٹ کے فلائٹ لیول پر آنے کے بعد پال نے ان سب کو سیٹ بیلٹ کھولنے کی اجازت دے دی۔ آڈرے کاک پٹ سے نکل کر کیبن میں آیا اور سب کو ان کی پسند کی ڈرنک دینے لگا۔ وہ سب ناشتا کر کے آئے تھے اس لیے کسی کو کھانے کی خواہش نہیں تھی۔

”آئی بیکس شان دار جانور ہے۔“ روزن نے کہا۔ ”میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔“

”سائبیرین آئی بیکس کے مقابلے میں ہمالیہ میں پائے جانے والے آئی بیکس کہیں شان دار ہوتے ہیں۔“ اسٹیو بولا۔ ”میں اسے سامنے سے دیکھ چکا ہوں۔“

وہ سب ہی سیر و سیاحت اور شکار کے شوقین تھے۔ پھر وہ شکار کے طریقوں پر بحث کرنے لگے۔ ایلس کو شکار سے اتنی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ خاموشی سے ڈرنک کرتے ہوئے ان کی بحث سن رہی تھی۔ البتہ جان دیوانہ تھا۔ اس نے آئی بیکس کے شکار کے لیے خاص طور سے ونچسٹر رائفل کا نیا شکاری ماڈل لیا تھا۔ ایلس طیارے سے باہر دیکھنے لگی۔ اس وقت تک وہ ردبار انگلستان عبور کر کے فرانس کی حدود میں داخل ہورہے تھے۔ یہاں بھی بادل تھے لیکن یہ ہلکے اور... پُرسکون تھے۔ ایلس کو اونگھ آگئی، وہ رات کو دیر سے سوئی تھی اور صبح جلدی اٹھنا پڑا تھا۔

اچانک طیارے کو جھٹکا لگا تو وہ ہڑبڑا گئی۔ ”کک... کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔ طیارہ لرز رہا تھا۔ سب ہی متوحش نظر آرہے تھے۔ جان نے انٹرکام کا بٹن دبایا اور پال سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے... طیارے کو جھٹکے کیوں لگ رہے ہیں؟“

”پتا نہیں... شاید انجنوں میں کوئی مسئلہ ہورہا ہے۔“ پال بولا۔ اس کی آواز سے تشویش جھلک رہی تھی۔

”اس وقت ہم کہاں ہیں؟“

”سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں کے اوپر ہیں۔ قریب ترین

ائرپورٹ بھی سو میل دور ہے۔“

جان نے بہتر سمجھا کہ وہ پال کو اس کا کام کرنے دے اور مداخلت سے گریز کرے۔ اس نے کہا۔ ”اوکے! اس ائرپورٹ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔“

مگر طیارے کو لگنے والے جھٹکے کم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے گئے۔ اب طیارہ اس طرح جھٹکے لے رہا تھا جیسے فضا میں اس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ لارا، ایلس اور کیتھی چیخ رہی تھی اور مرد انہیں چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جھٹکوں کے دوران طیارے کی بلندی بھی مسلسل کم ہورہی تھی کیونکہ اب آس پاس انہیں پہاڑ نظر آرہے تھے۔ اب طیارہ پہاڑوں کے درمیان .... اڑ رہا تھا۔ روزن خوف سے چلّایا۔

”میرے خدا! طیارہ کریش ہونے جارہا ہے۔“

”فضول باتیں مت کرو۔“ کیتھی نے چلّا کر کہا۔

”پلیز! آپس میں لڑنے کے بجائے یہ دیکھو کہ ہمارے ساتھ کیا ہورہا ہے۔“ جان نے انہیں ٹھنڈا کیا۔

پال مسلسل طیارے کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ اس کی یہ کوشش ناکام جارہی ہے۔ اچانک ہی طیارے کا ایک انجن بند ہوگیا اور اب وہ ایک ہی انجن کے سہارے پرواز کر رہا تھا۔ پال نے مائیکروفون پر کہا۔ ”شاید ہمیں کریش لینڈنگ کرنا پڑے... سب اس کے لیے تیار رہیں۔“

”کریش لینڈنگ... یہاں ان پہاڑوں میں؟“ اسٹیو چیخ کر بولا۔ ”تمہارا دماغ درست ہے؟“

جان نے سب کو دیکھا اور بولا۔ ”دوستو! اس کے سوا شاید کوئی راستہ نہیں ہے۔ سب تیار ہو جاؤ۔“

جان آگے کی طرف جھک گیا۔ ایلس لرزنے لگی۔ اس سے پہلے بھی انہیں کئی بار ہنگامی صورتِ حال سے واسطہ پڑا تھا لیکن اس طرح کا موقع نہیں آیا تھا جب موت سامنے نظر آنے لگے۔ طیارہ تیزی سے ایک پہاڑی کی طرف جارہا تھا۔ پال کچھ چلاتے ہوئے اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سب چلّا رہے تھے اور طیارے میں ایک قیامت کا سا سماں تھا۔ پھر ایک دھماکا ہوا اور ایلس کو ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

ایلس میز کے ایک طرف بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے تین افراد تھے جو بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ”مس والٹن! کیا تمہیں سب یاد ہے؟“

ایلس نے منہ سے جواب نہیں دیا لیکن اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیا تم ہمیں بتانا پسند کرو گی؟“ دوسرے آدمی نے نرم لہجے اور پُرکشش آواز میں کہا۔ ایلس کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی اور دوبارہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ایلس کو ہوش آیا تو پہلا احساس بے پناہ سردی کا تھا جو رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں تھی؟ پھر اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سیٹ بیلٹ بندھی ہونے کے باعث وہ اٹھ نہ سکی۔ وہ طیارے کے کیبن میں تھی مگر یہ کیبن کہاں تھا۔ یہ تو ایک ٹوٹا پھوٹا سا ملبے کا ڈھیر تھا۔ ہر طرف سامان بکھرا ہوا تھا... اس کی ساتھ والی سیٹ پر جہاں پہلے جان تھا، اب کوئی نہیں تھا اس نے گھبرا کر آواز دی۔

”جان! تم کہاں ہو؟“

کوئی جواب نہیں آیا لیکن دوسری نشستوں سے حرکت کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ایلس کا جسم دکھ رہا تھا اور اس کے سر پر کوئی چیز لگی تھی، خون نکل کر جم گیا تھا لیکن وہ حرکت کے قابل تھی۔ اس نے سیٹ بیلٹ کھولی اور اٹھ گئی۔ برابر میں کیتھی بے ہوش نظر آرہی تھی اور اس کے ساتھ اسٹیو تھا۔ وہ بھی ہوش میں آگیا۔ اس نے ایلس کو دیکھ کر کہا۔ ”طیارہ کریش ہوگیا ہے۔“

”باقی سب کہاں ہیں؟“ ایلس بولی۔ اس کی نظریں بے چینی سے جان کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے بکھرا سامان الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اسٹیو بھی اٹھ کر آگیا۔ ذرا دیر میں واضح ہوگیا کہ طیارے کے کیبن کا صرف وہی حصہ بچا تھا جس میں وہ سب بیٹھے تھے۔ اس کا کاک پٹ اور دُم والا حصہ غائب تھا۔ کیبن میں وہ سب تھے اور زندہ تھے البتہ جان نہیں ملا۔ ایلس چیخ چیخ کر اسے آوازیں دینے لگی۔

”شور مت کرو۔“ روزن نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ یہاں نہیں ہے۔“

”یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟“

”ہم اسے تلاش کرتے ہیں۔“ اسٹیو نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن پہلے ہمیں اپنے گرم کپڑے تلاش کرنا ہوں گے۔“

سردی سے سب کا بُرا حال تھا۔ ان میں سے کسی کو شدید چوٹ نہیں آئی تھی لیکن وہ سب ہی زخمی تھے۔ انہوں نے کپڑوں کی تلاش میں سامان الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ بڑی مشکل سے انہیں چند سوٹ کیس ملے۔ یہ لارا، اسٹیو اور روزن کے تھے۔ انہوں نے سوٹ کیسز میں موجود گرم کپڑے نکال کر پہن لیے۔ لارا کے کپڑے کسی نہ کسی طرح ایلس اور کیتھی کو بھی آگئے۔ روزن اور اسٹیو کو اپنے کپڑے مل گئے۔ خوش قسمتی سے وہ ساری تیاری کر کے نکلے تھے اس لیے ان کے پاس ایسے گرم لباس تھے جو منفی درجۂ حرارت میں بھی

انسانی جسم کو گرم رکھتے۔

ایلس، جان کے لیے فکرمند تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ''پلیز! جان کو تلاش کرو۔''

طیارے کا سامنے والا حصہ برف میں دھنسا ہوا تھا اور کاک پٹ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا البتہ دم والا حصہ غائب تھا اور اس طرف سے باہر نکلنے کا راستہ موجود تھا۔ وہ سامان ہٹاتے ہوئے اس طرف سے باہر آئے۔ باہر سردی کی شدت بہت زیادہ تھی اور جہاں تک نظر جاتی تھی، سوائے برف کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ عقب میں دور تک طیارے سے نکل جانے والا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ایلس جان کو تلاش کرنے لگی۔ لارا اور کیتھی بھی اس کے ساتھ تھیں جبکہ اسٹیو اور روزن طیارے کے سامنے والے حصے میں آئے جہاں کبھی کاک پٹ ہوتا تھا۔

''کاک پٹ کہاں گیا؟'' اسٹیو نے تشویش سے کہا۔ ''اس میں ریڈیو تھا۔ اگر وہ مل جائے تو ہم مدد کے لیے پیغام بھیج سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ کریش لینڈنگ کے دوران کاک پٹ تباہ ہو گیا۔''

''لیکن وہ گیا کہاں؟'' اسٹیو نے آس پاس نظریں دوڑائیں۔

لارا اور ایلس جان کو آوازیں دے رہی تھیں۔ دونوں کا بُرا حال تھا۔ ایک جان کی بہن تھی اور دوسری گرل فرینڈ! کیتھی کے پاؤں میں تکلیف ہونے لگی تھی اس لیے وہ پیچھے رہ گئی اور اسی نے سب سے پہلے وہ کیبن دیکھا تھا برف کی وجہ سے وہ بالکل سفید ہو رہا تھا اور غور سے دیکھے بغیر نظر نہیں آتا تھا۔ کیتھی نے اسٹیو کو آواز دی۔

''اسٹیو! دیکھنا یہ کیا ہے؟''

اسٹیو اور روزن اس طرف آئے۔ کیتھی نے کیبن کے بارے میں بتایا۔ کیتھی نے ایلس اور لارا کو بھی آواز دی لیکن وہ جان کو تلاش کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ تینوں کیبن کی طرف آئے۔ یہ لکڑی سے بنا ایک کمرے پر مشتمل چھوٹا سا کیبن تھا۔ دروازہ کھلا تھا، وہ آرام سے اندر آ گئے۔ یہاں معمولی سا فرنیچر تھا اور ایک بیڈ پڑا تھا لیکن اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ موسم گرما میں استعمال ہونے والا کیبن ہے۔ اس موسم میں کوئی یہاں آنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہاں کھانے کو کچھ نہیں تھا لیکن ایک طرف آتش دان تھا اور جلانے کے لیے لکڑیاں بھی موجود تھیں۔

''تم آگ جلاؤ، میں جا کر ان لوگوں کو لاتا ہوں۔'' روزن نے اسٹیو سے کہا۔

''سامان دیکھو، ہمیں مدد آنے تک کھانے پینے کی ضرورت ہو گی۔'' اسٹیو نے کہا اور آتش دان میں لکڑیاں ڈالنے لگا۔ روزن اور کیتھی پھر باہر آئے۔ ایلس اور لارا جان کی تلاش میں ناکامی کے بعد ایک طرف بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کیبن ملنے کی اطلاع پر بھی کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ روزن بڑی مشکل سے انہیں کیبن کے اندر آنے پر راضی کر سکا۔ ایلس جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ''میں جان کو تلاش کروں گی، اسے مدد کی ضرورت ہے۔''

''جان کو ہم سب مل کر تلاش کریں گے۔'' روزن نے اسے سمجھایا۔ ''لیکن پہلے ہمیں اپنی حالت کا جائزہ لینا چاہیے۔''

روزن انہیں کیبن میں لایا جہاں اسٹیو آگ جلا چکا تھا اور کیبن اندر سے کسی قدر گرم ہو چکا تھا۔ وہ سب آتش دان کے پاس جمع ہو گئے۔ لارا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ کسی پہاڑی کا اوپری حصہ ہے۔ ذرا آگے مجھے نشیب نظر آ رہا تھا۔''

''طیارے کا کاک پٹ اور دُم والا حصہ غائب ہے۔'' اسٹیو نے بتایا۔ ''اس کا مطلب ہے، یہ حصے طیارے سے الگ ہو کر نیچے گر چکے ہیں۔''

''لیکن جان کہاں ہے... وہ تو ہمارے ساتھ کیبن میں تھا؟'' ایلس بولی۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''شاید کریش لینڈنگ کے دوران وہ طیارے سے باہر جا گرا ہو۔'' روزن نے خیال پیش کیا۔ یہ بڑا خوفناک خیال تھا کیونکہ اس صورت میں جان کے بچنے کا امکان بہت کم تھا۔ انہوں نے اپنا اپنا جائزہ لیا۔ سب کو زخم آئے تھے لیکن یہ معمولی تھے۔ لینڈنگ کے دوران چیزیں ان سے ٹکرائی تھیں لیکن وہ کسی بڑی چوٹ سے محفوظ رہے تھے۔ اتنے شدید حادثے میں ان کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اپنے زخموں کی ممکنہ حد تک مرہم پٹی کر کے انہوں نے اس پر غور کیا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

اسٹیو بولا۔ ''میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے پال کو مے ڈے کا پیغام دیتے سنا تھا۔ اس کا مطلب ہے ائر ٹریفک کنٹرولر کو اس حادثے کی اطلاع مل چکی ہو گی اور ہماری تلاش شروع کی جا چکی ہو گی۔ اب جب تک مدد نہیں آ جاتی، ہمیں زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''وہ کیسے؟'' لارا نے سوال کیا۔

''سب سے پہلے ہمیں کھانے کی چیزیں تلاش کرنی چاہئیں۔'' اسٹیو بولا تو ایلس نے اسے غصے سے گھورا۔

''جان غائب ہے اور تمہیں اس کے بجائے کھانے کی پڑی ہوئی ہے۔''

''تم میری بات تو سنو۔'' اسٹیو نے نرمی سے جواب دیا۔ ''ہم دو ٹیمیں بنا کر نکلتے ہیں اور الگ الگ جگہوں پر بیک وقت جان اور کھانے کا سامان تلاش کرتے ہیں۔ ابھی دن کی روشنی ہو رہی ہے اندھیرا پھیلنے میں کافی وقت ہے۔''

انہوں نے طے کیا کہ اسٹیو کے ساتھ کیتھی اور ایلس ہوں گی جبکہ روزن اور لارا ان سے الگ ہو کر جان اور کھانے پینے کا سامان تلاش کریں گے۔ وہ باہر نکلے۔ اس وقت ہلکی برف باری ہونے لگی تھی۔ آنے والے تین گھنٹوں تک وہ برف میں دبے سامان کو کھنگالتے رہے لیکن ان کو نہ تو کھانے کو کچھ ملا اور نہ ہی جان ملا۔ بدقسمتی سے طیارے کا کچن اس کی دُم والے حصے میں تھا اور دم والا حصہ اس پہاڑی پر نہیں تھا جہاں طیارے نے کریش لینڈنگ کی تھی۔ نہ ہی یہاں اس کا کاک پٹ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دونوں حصے لینڈنگ کے دوران طیارے سے الگ ہو کر پہاڑی سے نیچے جا گرے تھے۔ جان کے نہ ملنے پر سب کے ذہن میں یہی خدشہ تھا کہ وہ بھی پہاڑی سے نیچے گر چکا ہے اور اس صورت میں اس کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسٹیو نے ہمت کر کے یہ خیال ظاہر کیا تو ایلس بپھر گئی۔ اس نے اسٹیو کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔

''تم بکواس کرتے ہو... میرا بھائی زندہ ہے۔''

کیتھی کو بھی غصہ آ گیا۔ ''اگر وہ تمہارے کہنے کے مطابق زندہ ہے تو کہاں ہے؟''

''وہ یہیں کہیں ہے، اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔'' ایلس رونے لگی تو کیتھی کا غصہ ہمدردی میں بدل گیا۔ اس نے ایلس کو گلے سے لگایا۔

''ہم نے پہاڑی کا ایک ایک حصہ دیکھ لیا ہے... اگر جان یہاں ہوتا تو ہمیں مل جاتا۔''

''ایک بات اور ہے۔'' روزن بولا۔ ''اگر جان پہاڑی پر ہوتا اور ہوش میں ہوتا تو کیا ہماری آواز کا جواب نہیں دیتا؟''

خود ایلس کو بھی لگ رہا تھا کہ جان اب زندہ نہیں ہے۔ لیکن تلاش کے دوران وہ خود کو بہلاتی رہی تھی کہ جان مل جائے گا۔ وہ زخمی ہو گا لیکن مرا نہیں ہو گا۔ جب کیبن کے باہر رات کی تاریکی چھا گئی تو ایلس کی آس بھی ٹوٹ گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لارا اور کیتھی اسے چپ کرانے کی کوشش میں خود بھی رو دیں۔ اسٹیو اور روزن بھی آتش دان کے پاس خاموش بیٹھے تھے۔ اسٹیو کو چاکلیٹ کا ایک پیکٹ ملا تھا۔ اس نے اس میں سے ٹکڑے کر کے سب کو چاکلیٹ دے دی۔ فی الحال ان کے پاس کھانے کے لیے یہی چیز تھی۔ رات گہری ہوئی تو سب پر نیند طاری ہونے لگی۔ جو جہاں تھا، وہیں سو گیا۔

صبح سب سے پہلے لارا کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا، ایلس کیبن میں نہیں ہے۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے باقیوں کو جگایا۔ ''ایلس نہیں ہے۔''

سب چونک گئے۔ روزن نے کہا۔ ''کہیں وہ رات کو نہ نکل گئی ہو۔''

''اسے تلاش کرنا ہو گا۔'' اسٹیو اٹھتے ہوئے بولا۔

باہر روشنی ہو گئی تھی اور انہیں ایلس کو تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ کیبن سے کچھ دور برف پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی اور جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انہیں برف سے جھانکتا جان کا مردہ چہرہ نظر آ گیا۔ نہ جانے ایلس نے اسے کس طرح تلاش کر لیا تھا۔ ایلس کے پاس وہ چوبی بکس تھا جس میں جان کی نئی شکاری رائفل تھی۔ ایلس نے انہیں دیکھ کر کہا۔ ''مجھے برف میں یہ بکس نظر آیا تھا اور جب میں نے اسے نکالنے کی کوشش کی تو جان کی لاش نکل آئی۔''

لارا اور کیتھی رونے لگیں۔ اسٹیو اور روزن بھی دکھی تھے لیکن ایلس چپ تھی۔ وہ جان کی لاش دیکھ کر شاک کی کیفیت میں آ گئی تھی۔ انہوں نے جان کی لاش کو ایسے ہی رہنے دیا اور ایلس کو اندر لے آئے۔ کیبن میں آنے کے بعد ایلس چونکی۔ اس نے وحشت سے دیکھا۔ ''جان کو کیوں چھوڑ آئے؟ اسے بھی لے کر آؤ۔''

روزن نے ایلس کا ہاتھ تھاما۔ ''ہم اسے نہیں لا سکتے۔''

''کیوں نہیں لا سکتے؟'' ایلس نے مزاحمت کی۔ ''باہر بہت سردی ہے، اسے اندر لاؤ۔''

اس بار روزن نے ایلس کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ ''وہ نہیں آ سکتا... وہ مر چکا ہے... سنا تم نے... وہ مر چکا ہے۔''

ایلس جیسے خواب سے چونکی اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ لارا اور کیتھی بھی رونے لگیں۔ کیبن کا ماحول سوگوار ہو گیا تھا۔ اس حادثے نے جان سمیت تین افراد کی جان لے لی تھی اور وہ بھی خطرے میں تھے کیونکہ مدد آنے میں دیر ہوتی تو وہ بھوک سے مر جاتے۔ کل سے اب تک انہیں کھانے کے لیے سوائے چاکلیٹ کے چند ٹکڑوں کے اور کچھ نہیں ملا تھا اور سب ہی بھوک محسوس کر رہے تھے۔ روزن اور اسٹیو نے طے کیا کہ خواتین کو کیبن میں چھوڑ کر وہ کھانے کی چیزوں کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

باہر روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی لیکن آسمان پر بادل

تھے۔ رات ہلکی برف باری ہوئی تھی۔ روزن نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”لگتا ہے برف باری ہونے والی ہے اور ممکن ہے طوفان بھی آجائے۔“

اسٹیو کا چہرہ زرد ہوگیا۔ ”اس صورت میں ہماری تلاش کا کام رک جائے گا۔“

”بس ہم امید کرسکتے ہیں کہ ایسا نہ ہو۔“ روزن بولا۔

وہ پہاڑی پر بکھرا سامان الٹنے پلٹنے لگے۔ شاید اس میں سے کھانے کی کوئی چیز نکل آتی۔ مگر کئی گھنٹی کی کوشش کے باوجود انہیں کچھ نہیں ملا... کوئی ایک چیز بھی نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے قدرت نے انہیں بھوک سے مارنے کا فیصلہ کرلیا تھا ورنہ کوئی ایک چیز تو مل جاتی۔ انہوں نے سامان اٹھا کر کیبن تک پہنچانا شروع کردیا کیونکہ کیبن میں موجود لکڑی اتنی نہیں تھی کہ وہ اسے مسلسل جلا سکتے۔ اس لیے جب لکڑی ختم ہوجاتی تو وہ یہ سامان جلا کر حرارت حاصل کرسکتے تھے۔ یہ جگہ اتنی بلندی پر تھی کہ یہاں درخت تو کیا جھاڑیاں بھی نہیں تھیں۔ وہ جلانے کے لیے مزید لکڑی حاصل نہیں کرسکتے تھے۔

اس دن انہوں نے کئی بار باہر کا چکر لگایا اور پہاڑی پر بکھرا اور طیارے کے کیبن میں موجود سارا سامان نکال لائے۔ اس کے بعد برف باری شروع ہوگئی۔ جان کی لاش کی پوزیشن یاد رکھنے کے لیے انہوں نے لوہے کی ایک سلاخ اس جگہ گاڑ دی تھی۔ شام ہوتے ہوتے برف باری شدید قسم کے طوفان میں بدل گئی۔ یخ بستہ ہوائیں رہ رہ کر کیبن کے در و دیوار کو جھنجوڑ رہی تھیں۔ سردی کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا اور وہ سب آتش دان کے پاس سمٹ آئے تھے۔ سب کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ وہ بچ سکیں گے یا جان اور پائلٹس کی طرح جان ہار جائیں گے؟

”میرا خیال ہے کہ اگر دو دن میں مدد نہ آئی تو بھوک سے ہماری حالت غیر ہوجائے گی۔“ اسٹیو بولا۔

”یہاں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔“ روزن نے کہا۔

”کیا ہم یہاں سے نیچے نہیں جاسکتے؟“ لارا نے سوال کیا۔

روزن سوچ کر بولا۔ ”جہاں تک میں نے دیکھا ہے، یہ کام بہت مشکل ہے لیکن ہم کرسکتے ہیں... اگر موسم بہتر ہو۔“

کیتھی نے روزن کی تائید کی۔ ”اس موسم میں باہر جانا موت کو گلے لگانے کے برابر ہے۔“ ایلس، جان کا سوگ منا رہی تھی اس لیے فی الحال اسے اس بات سے دلچسپی نہیں تھی کہ ان کا کیا ہوگا؟ وہ بچتے ہیں یا اسی پہاڑ پر بھوک سے مرجاتے ہیں؟

برف کا طوفان ساری رات جاری رہا اور صبح جب نمودار ہوئی، تب بھی اس کی تندی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس رات سب ہی اچٹتی نیند سو رہے تھے کیونکہ ایک تو طوفان کا شور اور اوپر سے پیٹ میں بل ڈالتی بھوک نے ان کی نیند اڑا دی تھی۔ صبح تک سب کا بھوک سے برا حال ہوگیا۔ وہ سب دولت مند گھرانوں کے لوگ تھے جو دنیا کے اعلیٰ ترین کھانے بھی اپنی پسند سے کھاتے تھے۔ لیکن اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ اگر انہیں دنیا کی بدترین اور ناپسندیدہ ترین چیز بھی کھانے کو مل جاتی تو وہ اسے بھی بلا تکلف کھا جاتے۔ کیتھی سے کمزوری کے مارے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ باقیوں کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ ایک دو دن اسی طرح بھوکے رہے تو موت کسی بھی وقت انہیں اچک کر لے جائے گی۔ ان کو بھوک برداشت کرنے کی عادت بھی نہیں تھی۔

کھانے کو کچھ نہیں تھا، البتہ پانی کی کمی نہیں تھی۔ ان کے پاس ایک اسٹیل کا مگ تھا۔ وہ اس میں برف بھر کر آتش دان کی آگ پر رکھتے تو ذرا دیر میں گرم پانی مل جاتا۔ لیکن اس روز انہوں نے پانی بھی نہیں پیا کیونکہ پانی خالی پیٹ میں بری طرح لگ رہا تھا۔ شام کو اسٹیو نے روزن سے کہا۔ ”اگر جلد ہمیں کھانے کو کچھ نہ ملا تو ہم مر بھی سکتے ہیں۔“

روزن لرز اٹھا۔ ابھی سے بھوک اتنی اذیت ناک ہوگئی تھی تو مرنے سے پہلے یہ کتنی اذیت دیتی؟ اس کا تصور بھی لرزا دینے والا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں اتنی اذیت برداشت نہیں کرسکتا... میں خودکشی کرلوں گا۔“

اسٹیو امید پرست آدمی تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں خودکشی نہیں کرسکتا کیونکہ میں آخری لمحے تک لڑنے کا قائل ہوں۔“

”تمہاری مرضی... لیکن کم سے کم میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔“

روزن نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جب بھوک اس کی برداشت سے باہر ہوجائے گی تو وہ کیبن سے باہر جا کر برف میں لیٹ جائے گا اور کچھ ہی لمحوں میں وہ سردی کے باعث مر جائے گا۔ جب اس نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا تو سب کے چہرے زرد پڑ گئے کیونکہ یہی حالات انہیں بھی درپیش تھے۔ ایلس بولی۔

”خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو، ابھی تو جان کا دکھ بھی کم نہیں ہوا ہے۔“

”جلد یا بہ دیر ہمیں اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ روزن بولا۔ ”اس لیے ابھی سے طے کرلو کہ کس نے کیا کرنا ہے۔“

”میں خودکشی نہیں کرسکتی۔“ ایلس بولی۔

”میں بھی۔“ لارا نے کہا۔ کیتھی سے کمزوری کی وجہ سے بولا نہیں جا رہا تھا، اس نے کوئی رائے نہیں دی۔ اسٹیو اس کے پاس جا بیٹھا۔ کیتھی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔

”مجھے بھوک لگی ہے... مجھے کھانے کو دو۔“

اسٹیو نے جھک کر اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ ”ڈیئر! اگر میرے پاس کچھ ہوتا تو میں ضرور کھلاتا۔“

”تب میں مرجاؤں گی۔“

”نہیں، ہم نہیں مریں گے۔“ اسٹیو نے پختہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“

اسٹیو نے کیتھی کو تو تسلی دے دی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کچھ کھانے کے لیے کہاں سے لائے؟ انہوں نے پہاڑی پر ہر جگہ دیکھ لی تھی۔ ان کا کھانے کا سارا سامان غائب تھا، اگر وہ پہاڑی پر کہیں برف تلے دب گیا تھا، تب بھی اسے تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس موسم میں برف لوہے کی طرح سخت ہورہی تھی اور ان کے پاس کھدائی کے لیے کچھ نہیں تھا۔ پھر تازہ برف باری اور طوفان نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی۔ اگر ان کے پاس اوزار ہوتے، تب بھی وہ توانائی کہاں سے لاتے؟ ان میں تو اب چلنے پھرنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔

طوفان اس دن بھی جاری رہا اور تند ہواؤں میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ کیبن کے دروازے کے سامنے دو فٹ برف جمع ہوگئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ برفانی طوفان کس شدت کا ہے۔ ان کی یہ امید بھی دم توڑ گئی کہ ان کی تلاش جاری ہوگی۔ اس موسم میں تلاش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آنے والی رات کسی وقت طوفان تھما۔ باہر سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ اپنی اپنی جگہ پڑے تھے۔ بھوک کے عالم میں نیند نہیں آرہی تھی۔ صبح ہوئی تو انہیں مسلسل فاقے سے تیسرا دن تھا۔ مردوں نے پھر بھی خود کو سنبھال رکھا تھا لیکن عورتوں کی حالت زیادہ خراب تھی۔ خاص طور سے کیتھی تو نیم غشی میں تھی۔

ان تین دنوں میں وہ گھل کر رہ گئے تھے۔ عورتوں میں کیتھی سب سے صحت مند تھی اور سب سے زیادہ وزن اسی کا کم ہوا تھا۔ روزن بے چین تھا۔ اس نے اسٹیو سے کہا۔

”اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہورہا ہے۔“

”ہمیں صبر کرنا ہوگا دوست!“ اسٹیو نے کہا۔

”صبر...!“ روزن تلخی سے بولا۔ ”کیا صبر ہمیں بھوک کی اذیت سے بچا لے گا؟“

”نہیں لیکن دیکھو طوفان رک گیا ہے اور اب ہماری تلاش شروع ہوجائے گی۔“

”یہ برف کا بہت بڑا ویرانہ ہے۔“ روزن مایوسی سے بولا۔ ”اس میں کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔“

”مگر مجھے امید ہے کہ ہمیں تلاش کرلیا جائے گا۔“

”ہمیں باہر نکل کر دیکھنا چاہیے۔“ لارا بولی۔ ”اور اگر کوئی ہیلی کاپٹر یا طیارہ اس طرف آنکلا تو اسے اشارہ کرنا ہوگا۔“

اس پر وہ چونکے۔ انہیں اپنی اس جگہ پر موجودگی کا پتا دینے کے لیے کوئی اشارہ تیار رکھنا چاہیے تھا کیونکہ طوفان اور برف باری رک گئی تھی اس لیے یہ کام کیا جاسکتا تھا۔ وہ سامان لے کر باہر نکلے اور انہوں نے سوٹ کیسز اور دوسری چیزوں کی مدد سے برف پر بڑا سا "HELP" لکھا۔ لیکن فضا میں ابھی بھی بادل تھے اور اگر کوئی طیارہ یا ہیلی کاپٹر بلندی پر پرواز کررہا ہوتا تو اسے یہ الفاظ مشکل سے ہی دکھائی دیتے۔ جان کی قبر پر لوہے کا پائپ بدستور موجود تھا۔ البتہ اس کا چند انچ کا ٹکڑا برف سے باہر نظر آرہا تھا۔ روزن نے کچھ برف ہٹا دی۔ اسٹیو خاموش کھڑا تھا۔ روزن نے سرد آہ بھری اور بولا۔ ”جب ہم نے سفر کا آغاز کیا تھا تو کیا معلوم تھا، یہ حادثہ ہمارا انتظار کررہا ہے اور جان کی موت یہاں اس کی منتظر تھی۔“

اسٹیو، روزن کی بات سن کر چونکا۔ ”ہاں، یہ تو ہے۔“ وہ بولا پھر اس نے کسی قدر عجیب لہجے میں کہا۔ ”ممکن ہے قدرت نے جان کے لیے موت اور ہمارے لیے زندگی کا انتخاب کیا ہو۔“

روزن نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“

اسٹیو نے ہچکچا کر جواب دیا۔ ”دیکھو نا، اگر قدرت کو ہماری موت منظور ہوتی تو جان کی طرح ہم بھی مرجاتے۔ اس کے برعکس قدرت ہمیں بچانا چاہتی تھی تبھی ہم اس قدر شدید حادثے کے بعد بھی بچ گئے۔“

روزن تلخی سے ہنسا۔ ”ہاں، قدرت نے ہمیں اس لیے بچا لیا کہ ہمارے مقدر میں بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا لکھا ہے۔“

”نہیں، اس کے برعکس قدرت نے جان کے لیے موت منتخب کر کے ہمیں زندہ رہنے کا ایک موقع دیا ہے۔“ اسٹیو نے دھیمے لہجے میں کہا۔

روزن نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے اسٹیو کے پاگل ہونے کا شبہ ہورہا ہو۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو؟ اگر ایلس نے یہ بات سن لی تو اسے کتنا دکھ ہوگا۔“

''اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم خاموشی سے بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔''

روزن اب بھی نہیں سمجھا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''احمق! میں کوئی بہت مشکل بات نہیں کر رہا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ صرف خوراک ہمیں زندہ رکھ سکتی ہے اور یہاں کھانے کے لائق ایک ہی چیز ہے۔''

اس بار روزن اس کی بات سمجھ گیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تت... تمہارا مطلب ہے؟''

اسٹیو نے سر ہلایا۔ ''ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔''

''میرے خدا... اسٹیو یہ ہمارا دوست ہے۔''

''دوست تھا... اب جان صرف ایک لاش ہے۔'' اسٹیو نے تردید کی۔ ''اگر وہ زندہ ہوتا تو کیا ہم میں سے کوئی ایسی بات سوچ سکتا تھا؟ لیکن اب وہ مر چکا ہے اور مرنے کے بعد ہمارے کام آسکتا ہے۔''

''نہیں۔'' روزن لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔

''جان ہمیں مدد آنے تک زندہ رکھ سکتا ہے۔''

''نہیں۔''

''یہ پانچ زندگیوں کا سوال ہے۔'' اسٹیو نے التجا کی۔ ''کیتھی مرنے والی ہے، ہم سب مرنے والے ہیں۔''

''میں یہ نہیں کر سکتا۔'' روزن پیچھے ہٹا اور پھر اس نے کیبن کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے اسٹیو نہیں بلکہ کوئی آدم خور درندہ آ کھڑا ہوا ہو۔ اسٹیو بھی تھکے تھکے قدموں سے کیبن میں لوٹ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ روزن نے سب کو بتا دیا ہوگا لیکن وہ خاموشی سے آتش دان کے پاس بیٹھا تھا۔ اگر اس نے یہ بات بتا دی ہوتی تو اس وقت کیبن میں بھونچال آگیا ہوتا۔ اسٹیو، کیتھی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بستر پر لیٹی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن وہ جاگ رہی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کھانے کو کچھ ملا؟''

اسٹیو اور روزن بیک وقت چونک گئے۔ پھر اسٹیو نے کہا۔ ''نہیں، کچھ نہیں ملا۔''

کیتھی اذیت سے کراہی۔ ''مجھے لگ رہا ہے جیسے میرے پیٹ کو کوئی اپنے نکیلے ناخنوں سے کھرچ رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔''

اسٹیو کا منہ اتر گیا۔ وہ اٹھ کر روزن کے پاس آیا۔ ''تم نے دیکھا، کیتھی کیا کہہ رہی ہے؟ وہ مر جائے گی۔''

''تب ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' روزن نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ہم اپنی جان بچا سکتے ہیں۔''

''یہ جرم ہوگا۔'' روزن نے نفی میں سر ہلایا۔

''جرم نہیں ہے، کم سے کم قانونی جرم نہیں ہے... ہاں اخلاقی لحاظ سے تم کہہ سکتے ہو۔ مگر ایک لاش کے مقابلے میں پانچ زندہ یقیناً اہمیت رکھتے ہیں۔''

''جرم نہ بھی ہو تو میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' روزن نے کہا۔ ''اس کے مقابلے میں، میں بھوک سے مر جانا پسند کروں گا۔''

''تم اپنی بات کر رہے ہو۔ ہم سب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' اسٹیو نے تلخی سے کہا۔ ''کیا ہمیں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے؟''

وہ سرگوشی میں بات کر رہے تھے لیکن ان کے انداز نے لارا کو ان کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ وہ ان کے پاس چلی آئی۔ ایلس، کیتھی کے پاؤں کی طرف ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ''تم لوگ کیا بات کر رہے ہو؟'' لارا نے پوچھا۔ اس نے جان کی موت کے بعد خود کو جلد سنبھال لیا تھا۔

اسٹیو اور روزن کچھ دیر کے لیے چپ ہوئے پھر روزن نے کہا۔ ''کچھ نہیں۔ ہم آپس کی بات کر...''

''چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اسٹیو نے اس کی بات کاٹی پھر اس نے لارا سے کہا۔ ''ایک ترکیب ہے جس سے ہم مدد آنے تک زندہ رہ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں دل پر جبر کرنا پڑے گا۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''سنو، ہمارے پاس کھانے کے لیے ایک چیز ہے۔'' اسٹیو کا لہجہ سرگوشی آمیز ہو گیا۔ ''جان کی لاش!''

''کیا!'' لارا چلّائی۔ ''تم جان کو کھانے کی بات کر رہے ہو؟''

لارا کے چلانے سے بات کھل گئی اور سب سے پہلے ایلس ان کی طرف جھپٹی۔ اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا... کس نے جان کی بات کی ہے۔''

لارا پریشان ہو گئی۔ اس نے جلدی سے بات بنانے کی کوشش کی۔ ''میں یہ کہہ رہی تھی کہ جان کی لاش کو بھیڑیے نہ کھا جائیں۔''

''بکواس مت کرو۔ میں نے خود سنا ہے کہ تم جان کی لاش کو کھانے کی بات کر رہی تھیں۔ بھیڑیے کا نام بھی نہیں لیا تھا۔'' ایلس چلّائی۔

اسٹیو نے اس بار بھی سچ بتا دیا۔ ''ہاں، ہم جان کی لاش سے اپنی زندگی بچانے کا سوچ رہے ہیں۔''

''اگر کسی نے اس کو ہاتھ بھی لگایا تو...'' ایلس خوں خوار

لہجے میں بولی۔

''ہم میں سے کوئی ایسا نہیں سوچ رہا۔'' روزن نے جلدی سے وضاحت کی۔ ''یہ صرف اسٹیو کا خیال ہے۔''

''ہاں، یہ میرا خیال ہے کیونکہ میری بیوی مر رہی ہے۔'' اسٹیو بولا۔

ایلس پلٹی اور اس نے کونے میں رکھے لکڑی کے بکس سے جان کی شکاری رائفل نکال لی۔ اس نے رائفل کا رخ اسٹیو کی طرف کر دیا۔ ''اگر تم نے جان کی لاش کو ہاتھ بھی لگایا تو میں تمہیں قتل کر دوں گی۔''

''کر دو...'' اسٹیو تلخی سے بولا۔ ''موت تو ویسے بھی ہمارا مقدر ہے۔ کل تک ورنہ پرسوں تک ہم بھی لاشوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔''

''کچھ بھی ہو، جان کے بارے میں سوچنا بھی مت۔'' ایلس نے کہا اور پیچھے ہو کر بستر پر بیٹھ گئی۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ باقی سب بھی خاموش ہو گئے۔ لارا اور روزن آتش دان کے نزدیک تھے اور وہ آپس میں آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے۔ اسٹیو، کیتھی کے سرہانے آگیا۔ ایلس کا چہرہ ستا گیا تھا۔ بھوک سے اس کا بھی برا حال تھا۔ پھر بھائی کا غم الگ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ دن بھی گزر گیا۔ باہر ہوا کی سرسراہٹ ہوتی تو وہ جلدی سے کیبن سے نکل کر دیکھتے کہ شاید انہیں .... تلاش کرتا کوئی طیارہ یا ہیلی کاپٹر یہاں آگیا ہے لیکن کوئی نہیں ہوتا تھا۔

''لگتا ہے ہماری تلاش ختم کر دی گئی ہے۔'' روزن نے مایوسی سے کہا۔ ''ہمیں مردہ تصور کر لیا گیا ہے۔''

اسٹیو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اتنی جلدی تلاش بند نہیں کی جاتی۔ وہ ہمیں ممکنہ حد تک تلاش کریں گے۔ ابھی تک کوئی امدادی ٹیم اس پہاڑ تک نہیں آئی ہے۔''

شام ہوئی اور پھر رات آئی تو امید کی کرن کم سے کم چودہ گھنٹے کے لیے ان سے دور ہو گئی کیونکہ رات میں نہ تو تلاش کی جاتی تھی اور نہ اس کا کوئی امکان تھا کہ کوئی ان تک آسکتا۔ سردی کی وجہ سے... دن چھوٹے ہو رہے تھے۔ ان کی تلاش میں ایک دشواری یہ بھی ہو سکتی تھی۔ ان کی بھوک مزید تیز ہو گئی تھی اور اب سب کی حالت کیتھی جیسی ہو رہی تھی۔ جو جس جگہ تھا، نڈھال بیٹھا تھا۔ کیبن میں مٹی کے تیل سے جلنے والا ایک لیمپ تھا۔ رات ہونے پر وہ اسے جلا لیا کرتے لیکن اس کا تیل بھی کم رہ گیا تھا، شاید ایک دو راتوں تک اور چلتا۔ لیکن مدد نہیں آئی تو انہیں ایک دو راتوں کے بعد روشنی کی ضرورت بھی نہیں رہ جاتی۔

رات کو ایک بار پھر ہوائیں چلنے لگیں جو رہ رہ کر کیبن کو جھنجوڑ رہی تھیں۔ اس کی وجہ سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جلانے والی لکڑی بھی ختم ہونے والی تھی لیکن جلانے کے لیے کیبن میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ اصل مسئلہ خوراک کا تھا۔ ایلس ان کی طرف سے بدستور چوکنا تھی۔ اس نے حکم دیا کہ روزن، لارا اور اسٹیو اس سے دور آتش دان کے پاس سوئیں۔ ان کے پاس اس کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسٹیو کے ساتھ روزن تھا اور اس کے برابر میں لارا سو رہی تھی۔ انہوں نے چراغ کی لو ہلکی کر دی تھی۔ بارہ بجے کے قریب روزن نے اچانک اسٹیو کا ہاتھ دبایا۔ اس نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا اور کچھ کہنا چاہا لیکن روزن نے پھر ہاتھ دبایا۔ اس نے آنکھ سے ایلس کی طرف اشارہ کیا جو رائفل کو سینے اور دونوں گھٹنوں کے درمیان رکھے سو رہی تھی۔ کم سے کم اس کے انداز سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ روزن کروٹ لینے... کے انداز میں اسٹیو کے پاس آیا اور بہت دھیمی آواز میں بولا۔

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ جان اب مر چکا ہے۔''

اسٹیو خوش ہو گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے متفق ہو؟''

''ہاں!'' روزن نے سرد آہ بھری۔ ''میں اذیت سے نہیں مر سکتا۔''

''تم تو خودکشی کی بات کر رہے تھے؟'' اسٹیو نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں لیکن اب میں سوچتا ہوں تو خودکشی کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔'' روزن نے اعتراف کیا۔

''لیکن اسے کیسے قابو کریں؟'' اسٹیو نے ایلس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ پاگل ہو رہی ہے۔ اگر ہم نے جان کی لاش کو ہاتھ بھی لگایا تو یہ سچ مچ ہمیں گولی مار دے گی۔''

''ہم اسے قابو کر سکتے ہیں۔'' روزن کے عقب سے لارا بولی۔ وہ ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسٹیو نے حیران ہو کر کہا۔

''کیا تم بھی ہم سے متفق ہو؟''

''ہاں، اب میں بھوک نہیں برداشت کر سکتی۔ اگر جان کی لاش نہ ہوتی تو میں اپنی ہی بوٹیاں نوچ کر کھانے کو تیار ہو جاتی۔''

''اسے کیسے قابو کر سکتے ہیں؟'' روزن نے ایلس کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ سو رہی ہے... اگر ہم تینوں اچانک اس سے

رائفل چھین لیں تو وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔"

"رائفل لے لی، تب بھی وہ پاگل ہو کر کچھ بھی کر سکتی ہے۔" اسٹیو نے سوچ کر کہا۔

"ہم اسے باندھ دیں گے۔"

لارا نے کہا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس بارے میں غور کرتی رہی ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ایلس تک جائیں کیسے؟ ذرا دیر کی بحث کے بعد طے ہوا کہ وہ سب ایک ساتھ دبے قدموں اس کے پاس جا کر اچانک اس سے رائفل چھین لیں گے۔ وہ اٹھے اور آہستہ سے ایلس کے قریب آئے۔ پھر اسٹیو نے ہمت کر کے رائفل کی نال پکڑی اور ایک جھٹکے سے کھینچ لی۔ ایلس سچ مچ گہری نیند میں تھی۔ جب تک وہ صورتِ حال سمجھتی، رائفل اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو بھوکی شیرنی کی طرح ان کی طرف جھپٹی۔ اس کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں اور وہ اسٹیو سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسٹیو نے رائفل ایک طرف پھینک کر بہ مشکل روزن کی مدد سے اسے قابو کیا۔ اس دوران میں لارا ایک مفلر کے ٹکڑے کر کے لے آئی اور ان کی مدد سے ایلس کو باندھ دیا لیکن اس کا منہ کھلا چھوڑ دیا وہ انہیں گالیوں کے ساتھ دھمکیاں دے رہی تھی... اور کہہ رہی تھی، اگر انہوں نے اس کے بھائی کی لاش کو ہاتھ لگایا تو وہ ان سب کو مار دے گی۔ ایلس نے اتنا شور مچایا کہ تنگ آ کر انہوں نے کپڑا ٹھونس کر اس کا منہ بھی بند کر دیا۔

کیتھی اس ہنگامے میں جاگ گئی تھی اور حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ "اسٹیو! یہ کیا ہے؟ تم نے اسے کیوں باندھا ہے؟"

اسٹیو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے کیتھی کا ہاتھ تھاما۔ "میں تمہیں اور سب کو مرتے نہیں دیکھ سکتا۔"

کیتھی موت کے ذکر پر سہم گئی۔ "میں بھی نہیں مرنا چاہتی لیکن اس کا ایلس سے کیا تعلق ہے؟ پلیز! اسے کھول دو۔"

"کیتھی! بات یہ ہے کہ ہمیں زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہے اور یہاں کھانے کے قابل ایک ہی چیز ہے۔"

کیتھی یہ سنتے ہی بے تاب ہو گئی۔ "کھانے کی چیز... کیا ہے؟"

"جان کی لاش!" اسٹیو نے آہستہ سے کہا۔

کیتھی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تم مذاق کر رہے ہو نا؟"

"نہیں، یہ سچ ہے... بہت برا سہی لیکن سچ ہے۔ صرف جان کی لاش ہی ہماری جان بچا سکتی ہے۔"

"لیکن اسٹیو... آدم خوری... میرے خدا!" کیتھی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اسٹیو نے اس کا ہاتھ چھوڑا۔

"مجبوری ہے ڈیئر... اور ہم طے کر چکے ہیں۔ ہمیں اپنی جان بچانے کا حق ہے۔ جان کی لاش نے کچھ عرصے بعد ویسے ہی مٹی میں مل جانا ہے تو کیوں نہ یہ ہماری جان بچانے کے کام آئے۔"

کیتھی نے ان سب کو دیکھا۔ "تم لوگوں نے طے کر لیا ہے؟"

"ہاں، یہ ہم سب کا فیصلہ ہے اور ہم نے بہت مجبوری میں کیا ہے۔" لارا نے کہا۔ بھوک نے سب کی حالت خراب کر دی تھی۔ سرد موسم میں ویسے بھی جسم کو زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیتھی نے دیکھا کہ جب سب راضی ہیں... اور اس سے بھی زیادہ اس کے پیٹ کو کھرچتی بھوک نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ بھی ان کے فیصلے کو تسلیم کر لے۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔"

یہ سن کر ایلس نے مچلنا شروع کر دیا۔ وہ اس کے بھائی کو کھانے جا رہے تھے اور یہ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا لیکن بندھے ہونے کی وجہ سے وہ بے بس تھی۔ صبح ہوتے ہی اسٹیو اور روزن باہر چلے گئے۔ ان کے پاس ایک چاقو تھا۔ پہلے انہوں نے لاش پر جمع ہونے والی برف ہٹائی۔ برف نے جان کے جسم کو محفوظ رکھا تھا اور وہ چار دن پہلے کی طرح تھا لیکن نہایت سخت اور منجمد تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اس کی لاش برف سے نکالی۔ اب مرحلہ لاش سے گوشت اتارنے کا تھا۔ چاقو روزن کے ہاتھ میں تھا اور وہ بہت دیر ایسے ہی بیٹھا رہا پھر اس نے چاقو اسٹیو کی طرف بڑھا دیا۔

"میری ہمت نہیں ہو رہی ہے... یہ تمہاری تجویز تھی اس لیے تم ہی اس کام کو کرو۔"

اسٹیو نے چاقو لے لیا۔ ہمت تو اس کی بھی نہیں ہو رہی تھی لیکن اسے ذمے داری تو لینی تھی۔ اس نے دل کڑا کیا اور چاقو جان کے بازو میں اتار دیا۔ کچھ دیر بعد وہ گوشت کے پارچے لے کر کیبن میں آ گئے۔ جب انہوں نے آتش دان پر گوشت بھوننے کے لیے اسٹیل کی ایک پلیٹ رکھی تو ایلس پھر مچلنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ناک سے آوازیں نکال کر ان سے التجا کر رہی تھی کہ وہ ایسا نہ کریں۔ اس کی حالت دیکھ کر لارا بھی رونے لگی اور کیتھی بھی روہانسی ہو گئی۔

لیکن جب گوشت بھننے کی بو کیبن میں پھیلی تو سب سے زیادہ خراب حالت لارا اور کیتھی کی ہو گئی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گوشت کے پارچے ادھ گلے کھا جائیں۔ انہوں نے

گوشت پکنے سے پہلے ہی اچک لیا۔ وہ بے صبری سے کھا رہی تھیں۔ ذرا سی دیر میں سارے پارچے انہوں نے کھا لیے۔ اسٹیو اور روزن کے حصے میں چند ایک ہی آئے تھے۔ اس وقت لارا اور کیتھی بالکل بھول گئی تھیں کہ یہ انسانی گوشت ہے اور جان کا ہے جو لارا کا بوائے فرینڈ اور کیتھی کی دوست کا بھائی تھا۔ جب سارا گوشت ختم ہو گیا تو انہوں نے ملتجی نظروں سے روزن اور اسٹیو کی طرف دیکھا۔ پیٹ تو ان کا بھی نہیں بھرا تھا... بلکہ بھرنا تو ایک طرف رہا صحیح سے ڈاڑھ بھی گیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے انہوں نے پھر گوشت لانے کا سوچا۔ وہ باہر جانے لگے تو ایلس انہیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ شاید اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے سامنے اس کے اور جان کے بہترین دوست جان کا گوشت کھائیں گے۔

روزن اور اسٹیو دوبارہ باہر گئے اور وہ اتنا گوشت لے کر آئے جس سے ان چاروں کا پیٹ بھر گیا۔ ایلس مسلسل رو رہی تھی لیکن اب کسی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ سب پیٹ بھر جانے پر خوش تھے۔ ہاں ایک بار لارا نے ایلس کو بھی ایک بوٹی کھلانے کی کوشش کی تھی لیکن جیسے ہی اس نے ایلس کے منہ سے کپڑا نکالا اس کے منہ سے گالیاں ابل پڑیں۔ عام حالات میں ایلس بہت نفیس طبع تھی اور گالی تو ایک طرف اس کے منہ سے ناشائستہ بات بھی کسی نے نہیں سنی تھی... مگر اس وقت وہ جیسے گالیاں اگلنے والی مشین بنی ہوئی تھی۔ اس نے تھوڑے سے وقت میں ان لوگوں کو اتنا سنا دیا کہ لارا نے گھبرا کر اس کا منہ پھر سے بند کر دیا اور اس دوران میں بڑی مشکل سے اپنی انگلی ایلس کے دانتوں سے بچائی۔

"یہ تو پاگل ہو گئی ہے۔"

"ظاہر ہے۔" روزن نے کہا۔ "اس کے سامنے ہم نے اس کے بھائی کا گوشت کھایا ہے... اس کا دماغ تو خراب ہو گا۔"

اسٹیو فکر مند تھا۔ "اگر اس نے کچھ کھایا نہیں تو یہ مر جائے گی۔"

"تم کھلانے کی کوشش کرو۔" روزن نے صاف جواب دے دیا۔ "میں تو اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔"

"میں بھی۔" لارا نے کہا۔

اسٹیو، ایلس کے پاس آیا۔ اس کا منہ بند تھا لیکن وہ اس کا کام آنکھوں سے لے رہی تھی۔ اسٹیو نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور بولا۔ "اگر تم نے کچھ کھایا نہیں تو بھوک سے مر بھی سکتی ہو۔"

ایلس اسے کوئی جواب دیے بغیر گھورتی رہی۔ کیتھی نے کہا۔ "بے کار ہے، یہ نہیں مانے گی۔"

"لیکن یہ مر گئی تو اس کا الزام کہیں ہم پر نہ آ جائے۔"

"ہم پر کیوں آئے گا؟ بھوکے رہنے کا فیصلہ اس کا اپنا ہے۔" لارا نے کہا۔ وہ ایلس سے دل برداشتہ لگ رہی تھی، شاید اس لیے کہ ایلس نے اسے ہی سب سے زیادہ گالیاں دی تھیں مگر اسٹیو فکر مند تھا۔۔۔ وہ وقفے وقفے سے ایلس کو سمجھاتا رہا اور ایک بار اس نے بھی ایلس کا منہ کھولنے کی غلطی تو اسے بھی بے شمار گالیاں سننی پڑیں۔

پیٹ بھر کر کھانے کے بعد سب کو نیند آنے لگی اور وہ سو گئے۔ انہیں فکر نہیں تھی کہ ایلس ان کے خلاف کچھ کر سکے گی۔ وہ بندھی ہوئی تھی۔ اسٹیو نے سونے سے پہلے اس کا معائنہ کیا، وہ مضبوطی سے بندھی تھی۔ وہ لوگ شام کو اٹھے اور اس بار انہوں نے جان بچانے کے لیے نہیں بلکہ پیٹ بھرنے کے لیے جان کا گوشت کھایا۔ چار دن تک مسلسل بھوکے رہنے کے بعد ان کا پیٹ مستقل خوراک کا طلب گار تھا۔ پہلی بار وہ جھجکے تھے لیکن ایک بار انسانی گوشت کھا لینے کے بعد ان کی جھجک ختم ہو گئی تھی۔ ایلس یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ جب پکانے کے لیے جان کا گوشت لاتے، اس کی حالت کسی بپھری شیرنی جیسی ہو جاتی۔ اگر اس کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوتے تو شاید وہ انہیں کچا چبا جاتی۔

کیتھی کی طبیعت بہتر ہو گئی تھی۔ رات کو روزن اور اسٹیو تھک کر لیٹ گئے تھے کیونکہ باہر جانا اور پتھر جیسا گوشت اتارنا آسان کام نہیں تھا۔ تب کیتھی اور لارا نے آپس میں آہستہ سے کچھ کہا اور وہ باہر نکل گئیں۔ خاصی دیر بعد ان کی واپسی ہوئی تو انہوں نے ایک تھیلی میں خاصا گوشت اٹھا رکھا تھا۔ مستقل بھوکے رہنے اور بھوک کی اذیت سہنے کے بعد وہ اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ ذرا دیر کی بھوک بھی ان سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر انہیں یہ خوف بھی تھا کہ جب جان کا گوشت ختم ہو جائے گا تو وہ کیا کھائیں گے؟ اس خوف کی وجہ سے بھی وہ مسلسل کھا رہے تھے۔ لارا اور کیتھی نے ایلس کے سامنے ہی گوشت کھایا۔

ایلس کو بھوکے رہتے ہوئے آج چھٹا دن تھا اور اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی لیکن اس کی ضد برقرار تھی۔ جب وہ ان لوگوں کو گوشت کھاتے دیکھتی تو ہر ممکن طریقے سے ردِ عمل ظاہر کرتی۔ اس وقت بھی وہ شور مچا رہی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس کی ناک سے نکلنے والی آوازیں اتنی کمزور تھیں کہ ان کی سماعتوں تک پہنچ ہی نہیں پاتی تھیں۔ ان دونوں نے دل بھر کر کھایا اور سارا گوشت ختم کر کے انہیں جہاں جگہ ملی، لیٹ گئیں۔ اسٹیو اور روزن پہلے ہی خراٹے لے رہے تھے۔

جب ایلس کو یقین ہو گیا کہ سب گہری نیند میں جا چکے

ہیں تو اس نے اپنی جدوجہد شروع کی۔ اس نے اپنے ہاتھ آزاد کرانے کے لیے زور لگانا شروع کردیا لیکن وہ اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ ذرا سا زور لگانے سے اس کا سانس پھول جاتا اور اسے رک کر بہت دیر تک سانس درست ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔ مگر وہ رکی نہیں جب اس کا سانس درست ہوتا تو وہ پھر سے کوشش شروع کردیتی۔ جیسے ہی ان چاروں میں سے کوئی حرکت کرتا، وہ ساکت ہوجاتی اور یوں ظاہر کرتی جیسے بے ہوش ہے۔ اس کی کوشش کا نتیجہ بہت آہستہ آہستہ نکلا۔ مفلر کا ٹکڑا ڈھیلا ہوتا جارہا تھا۔

صبح نمودار ہونے لگی تھی جب ایلس نے کسی طرح اپنے ہاتھوں کو آزاد کرالیا۔ بہت دیر تک تو وہ پڑی ہانپتی رہی اور اٹھنے کی ہمت کرتی رہی پھر وہ اٹھی اور اس نے اپنے پاؤں کھولے اور منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا۔ وہ آہستہ سے حرکت کررہی تھی۔ اٹھنے کے بعد اس نے ایک کونے میں رکھی رائفل اٹھائی اور اسے چیک کیا۔ رائفل لوڈ تھی۔ ایلس اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ رائفل بھی مشکل سے اٹھا پائی تھی۔ کھڑے ہونے پر اسے چکر آرہے تھے۔

باہر ہوا رک گئی تھی اور دن نمودار ہوگیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اسے آہستہ سے بند کرکے باہر آئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان لوگوں میں سے کوئی جاگ جائے۔ وہ مشکل سے قدم اٹھاتے ہوئے وہاں تک آئی جہاں جان کی لاش برف میں تھی لیکن اب وہ برف کے باہر اس حالت میں پڑی تھی کہ وہ لاش کہلانے کی مستحق بھی نہیں تھی۔ وہ صرف ایک ڈھانچا تھا جس پر سے گوشت کا ایک ایک ریشہ اتار لیا گیا تھا۔ حد یہ کہ اس کی کھوپڑی کاٹ کر اندر سے مغز تک نکال لیا گیا تھا۔ دو دن میں یہ چار افراد مل کر ایک جوان آدمی کی پوری لاش کھا گئے تھے۔

"نہیں!" ایلس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ اندھا دھند کیبن کی طرف لپکی۔ راستے میں وہ کئی جگہ گری اور جب کیبن کے سامنے پہنچی تو گھبرایا ہوا اسٹیو باہر نکل رہا تھا۔ ایلس کو رائفل بدست اور دیوانہ وار آتے دیکھ کر اس نے واپس کیبن میں گھسنے کی کوشش کی لیکن ایلس نے اس سے پہلے ہی اسے شوٹ کردیا۔ اسٹیو اس کی چیخ سن کر باہر آیا تھا۔ رائفل کے دھماکے نے باقیوں کو بھی بیدار کردیا۔ کیتھی کی نظر اسٹیو کی لاش پر گئی جو آدھی دروازے کے اندر تھی۔ اس نے ہذیانی انداز میں چیخنا شروع کردیا۔ روزن اور لارا بھی گھبرا کر اٹھ گئے تھے۔ اسی لمحے ایلس کیبن میں داخل ہوئی۔

"خدا کے لیے..." روزن نے کہنا چاہا لیکن ایلس نے اسے بھی گولی ماردی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے آتش دان میں جا گرا اور اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی لیکن وہ اس بات سے بے نیاز تھا کیونکہ گرنے سے پہلے وہ مرچکا تھا۔ کیتھی پہلے ہی چلا رہی تھی۔ اب لارا نے بھی چیخنا شروع کردیا تھا۔ ایلس نے ان دونوں کو دیکھا۔

"کتیائیں۔" اس نے نفرت سے کہا اور پہلے لارا کو گولی ماری۔ وہ چیختے چیختے اچانک خاموش ہوئی تو کیتھی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ ایلس کے سامنے گھگیانے لگی۔

"مجھے مت مارو۔"

"ضرور!" ایلس نے کہا اور ایک گولی اس کے سینے میں بھی اتاردی۔ اب وہاں چار لاشیں تھیں اور صرف ایلس زندہ تھی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بستر پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ روزن کی لاش کو لگی آگ اب کیبن میں بھی پھیل رہی ہے۔ ایک طرف کی دیوار نے آگ پکڑلی تھی اور فرش کا ایک حصہ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ ایلس اٹھ کر کیبن سے باہر آگئی۔ ایک گھنٹے بعد کیبن پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آگیا تھا اور اس سے اٹھتا دھواں میلوں دور سے صاف نظر آرہا تھا۔ گم شدہ طیارے اور اس کے مسافروں کو تلاش کرتا ایک ہیلی کاپٹر اس دھوئیں کو دیکھ کر آگیا۔ اس نے ایک ہموار جگہ لینڈ کیا اور رضاکار اتر کر ایلس کے پاس آئے جو جان کی ہڈیوں کے پاس سر جھکائے بیٹھی تھی۔

☆☆☆

تینوں غور سے اس کی کہانی سن رہے تھے۔ وہ چپ ہوئی تو نرم لہجے والے شخص نے کہا۔ "تو تم نے اس وجہ سے ان سب کو قتل کیا؟"

"وہ اسی قابل تھے۔" ایلس کے لہجے میں ابھی تک غصہ اور نفرت تھی۔

"کیا اس لیے کہ انہوں نے تمہارے بھائی کی لاش کھا کر اپنی جان بچانے کی کوشش کی تھی؟" دوسرے آدمی نے پوچھا۔ اس پر نرم لہجے والے نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا... جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ بات تو ظاہر ہے۔

ایلس نے ان تینوں کو دیکھا۔ "نہیں... میں نے اس لیے انہیں قتل نہیں کیا۔"

نرم لہجے والا ایلس کے جواب پر چونک گیا؟ اس نے سوال کیا۔ "پھر تم نے انہیں کیوں مارا؟"

"اس لیے کہ ان لوگوں نے جان کی لاش پر میرے لیے ایک بوٹی بھی نہیں چھوڑی تھی۔" یہ کہتے ہوئے ایلس کی آواز بھرا گئی۔

تنہا سفر

ثمر عباس

سنا ہے کہ جہاں حسن کے جلوے ہوں... وہاں ذہانت کی کرشمہ سازیاں نہیں ہوتیں... لیکن ایسا ہر دفعہ نہیں ہوتا... ایک خوب صورت لڑکی کو پیش آنے والا سانحہ جس کی ذہانت نے اسے زندگی بچانے کا راستہ سجھا دیا تھا...

مجرمانہ ذہنیت اور مغربی معاشرے کے سیاہ چہرے کی عبرت ناک تصویر کشی

میلسی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا ایسی صورت حال سے واسطہ پڑے گا۔ چوبیس سالہ جوان اور حسین میلسی شارٹ کے آگے پیچھے پھرنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہ کسی کو کم ہی لفٹ کراتی تھی۔ میلسی کا باپ ایڈ شارٹ ایک پولیس افسر تھا اور اسے ہمہ وقت یہ فکر لگی رہتی تھی کہ ملک میں عورتوں کے خلاف جرائم بڑھتے جارہے ہیں۔ کہیں میلسی بھی ان کی لپیٹ میں نہ آجائے کیونکہ میلسی غیر معمولی حد تک خوب صورت تھی۔ سانچے میں ڈھلا ہوا جسم اور حسین نقوش... اس پر مزید گلابی رنگت! جھیل جیسی گہری اور نیلی آنکھیں دیکھنے والے کو سحر زدہ کردیتی تھیں۔

لیکن مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میلسی کا حسن دیکھنے والوں کو شاعری پر اکساتا۔ ایڈ جانتا تھا کہ آج کل کے نوجوانوں میں بے راہ روی کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ انہیں حسن شاعری پر نہیں بلکہ اسے پامال کرنے پر اکساتا تھا۔ آئے دن اس قسم کے کیسز سامنے آتے رہتے تھے۔ نو عمر اور حسین لڑکیاں درندگی کا شکار ہوکر اسپتال اور بعض اوقات مردہ خانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ ایڈ جب انہیں دیکھتا تو اسے لگتا کہ کہیں میلسی بھی کسی دن ایسے انجام سے نہ دوچار ہوجائے۔ یہ خیال ہی اسے خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا تھا۔

جب میلسی چودہ سال کی ہوئی اور اس نے ابھی سے رنگ و روپ نکال لیا تو ایڈ کی نیندیں حرام ہوگئیں اور اس نے

ابھی سے میلسی کو سمجھانا بجھانا شروع کر دیا۔ میلسی کی ماں نے شوہر کو ٹوکا۔ ”تم اسے کیا سمجھا رہے ہو؟ یہ سب اسکول میں بچیوں کو سکھایا جاتا ہے۔ تم باپ ہو، تمہیں اس کے ساتھ اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”مجھے ہی کرنی چاہئیں کیونکہ اسکول میں جو سکھایا جاتا ہے اسے لڑکے اور لڑکیاں معمول کے مطابق لیتے ہیں... لیکن اگر میں بتاؤں گا کہ اسے کس قسم کا خطرہ ہے تو وہ اسے زیادہ سنجیدگی سے لے گی۔“

میلسی باپ کی باتوں کو سنجیدہ لیتی تھی کیونکہ وہ بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس کے خیال میں اس کا باپ جو بھی کہتا، بالکل درست کہتا تھا۔ باپ کے کہنے پر اس نے لڑکوں سے محتاط رویہ اپناتے ہوئے ایک خاص حد کا فاصلہ رکھا۔ وہ کسی کو بھی خود سے زیادہ بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسکول میں مغرور مشہور ہوگئی۔ حالانکہ یہ بات غلط تھی کیونکہ وہ سب سے ہنستی بولتی تھی۔ البتہ اس نے لڑکوں پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اسے بگڑی ہوئی لڑکی سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اس سے خائف لڑکے اس کے خلاف الٹی سیدھی باتیں مشہور کرتے رہتے۔ میلسی کو اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔

پھر وہ کالج میں آگئی۔ یہاں بھی اس کا لڑکوں سے یہی رویہ رہا۔ لڑکے اس سے چڑتے تھے۔ کئی بار اسے دھمکی آمیز فون آئے لیکن جب ایڈ نے ان لڑکوں کا سراغ لگا کر ان کی ٹھیک طریقے سے گوشمالی کی تو اس کے بعد سے وہ محتاط ہو گئے اور انہوں نے میلسی کو تنگ کرنا بند کر دیا۔ لیکن کالج میں وہ اس پر فقرے ضرور کستے۔ میلسی انہیں نظر انداز کر دیتی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔

پھر ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا لیکن میلسی اس واقعے سے خوف زدہ ہوگئی..... میلسی روزانہ صبح جوگنگ کرنے جاتی تھی۔ وہ سورج نکلنے سے ذرا پہلے گھر سے نکلتی کیونکہ پھر اسے واپس آکر کالج کے لیے تیار بھی ہونا ہوتا۔ اس روز وہ نکلی تو آسمان پر بادل تھے اور ماحول نیم تاریک ہو رہا تھا۔ وہ جوگنگ کرتے ہوئے جنگل کے پاس سے گزر رہی تھی۔ یہ جنگل ایک پارک کا حصہ تھا اور ان کی کالونی کے ساتھ ہی تھا۔ صبح کے وقت یہاں سناٹا رہتا۔ وہ آرام سے میوزک سنتے ہوئے جا رہی تھی کہ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے ایک شخص نکلا اور اس نے میلسی کو دبوچ لیا۔ وہ اسے کھینچ کر جنگل میں لے جانے لگا۔ میلسی اس افتاد پر بوکھلا گئی۔ اس نے مزاحمت کی اور چیخنا شروع کر دیا۔ اسے لے جانے والا ہنس رہا تھا۔ اس کے جسم سے بدبو آرہی تھی ...... خوف سے میلسی کے ذہن پر غشی طاری ہونے لگی۔ اب وہ نیم دلی سے مزاحمت کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی یہ درندہ اسے جنگل کے اندر لے جا کر اس کی عزت تار تار کر دے گا۔ وہ بہت طاقت ور تھا اور کچھ میلسی بھی حوصلہ ہار گئی تھی۔ لیکن خلاف توقع اس شخص نے میلسی کو لے جا کر ایک جگہ زمین پر گرا دیا اور اس کے گرد ناچ ناچ کر امریکا کا قومی ترانہ گانے لگا۔

میلسی کے حواس بحال ہوئے اور اس نے تعجب سے اس شخص کو دیکھا جو حلیے سے پاگل لگ رہا تھا۔ یہاں لانے کے بعد وہ میلسی پر بالکل توجہ نہیں دے رہا تھا لیکن میلسی کو ڈر تھا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ اسے پکڑ لے گا اور شاید مار دے گا۔ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور وہ رونے لگی۔ پاگل ناچتے ناچتے رک گیا۔ میلسی نے رونے کے ساتھ اس سے پانی کی فرمائش کی۔ ویسے وہ اچھی اداکاری کر رہی تھی۔

”پانی!“ وہ اچھل کر بولا۔ ”ابھی لایا... پانی چاہیے نا، ابھی لاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میلسی اٹھی اور اس نے سڑک کی طرف دوڑ لگا دی۔ بعد میں پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ پانی لے کر میلسی کو تلاش کر رہا تھا۔ اسے ایک سرکاری پاگل خانے میں داخل کرا دیا گیا۔ یوں اس خوفناک نظر آنے والے واقعے کا انجام ہوا۔

اس واقعے نے ایڈ کے خدشات کو مہمیز کیا۔ ایک دن اس نے ڈنر کے بعد میلسی سے کہا۔ ”فرض کرو، اس دن تمہیں سچ مچ کوئی جنونی آدمی لے جاتا تو؟“

میلسی سے پہلے کلارا بولی۔ ”کیسی بات کر رہے ہو؟“

”نہیں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ذرا سوچو اگر اس دن اس پاگل کی جگہ کوئی سچ مچ کا جنونی ہوتا تو... میلسی کا کیا ہوتا؟“

”بہت برا ہوتا۔“ میلسی وہ وقت یاد کر کے کانپ گئی۔ ”لیکن ڈیڈی! انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ آنے والے وقت میں ہمارے ساتھ کیا واقعہ پیش آسکتا ہے؟“

”یہ تو ہے... لیکن ہمیں آنے والے وقت کی تیاری تو کرنی چاہیے۔“ ایڈ نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں ڈیڈی؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم سیلف ڈیفنس کا کوئی کورس کرو۔“ ایڈ نے جواب دیا۔ ”اس طرح اگر تمہیں مستقبل میں ایسی کوئی صورت حال پیش آئے گی تو تم اپنا دفاع کر سکتی ہو۔“

یہ خیال میلسی کو اچھا لگا۔ وہ راضی ہوگئی۔ ایڈ کا ایک سابق پولیس افسر دوست ایک سیلف ڈیفنس ٹریننگ سینٹر چلا

رہا تھا جہاں خاص طور سے خواتین کو اپنی حفاظت کے طریقے سکھائے جاتے تھے۔ ایڈ کی وجہ سے اس نے میلسی پر خاص توجہ دی اور اس نے بھی شوق سے سیکھا۔ اس لیے چند مہینوں میں اس نے کامیابی سے کورس مکمل کر لیا۔ اس وقت وہ کالج کے دوسرے سال میں تھی۔ ایک سال بعد اس نے گریجویشن مکمل کر لیا اور پھر ایک انسٹی ٹیوٹ سے اکاؤنٹس کا کورس کر کے جاب کرنے لگی۔ اسے اٹلانٹا سٹی میں اچھی جاب کی پیش کش ہوئی تو وہ وہاں چلی گئی۔ اس کے ماں باپ ریاست ٹینیسی کے شہر ناش ویلی میں رہتے تھے۔ دونوں شہروں میں کوئی تین سو میل کا فاصلہ تھا۔

ہائی وے کے ذریعے یہ راستہ تین گھنٹے میں طے ہوتا۔ میلسی کے پاس تیز رفتار اسپورٹس کار تھی۔ ہفتے کی شام میلسی دفتر سے پانچ بجے نکلتی اور سیدھا ناش ویلی کا رخ کرتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے تک اپنے گھر پہنچ جاتی۔ اس کے والدین اس کا بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔ اتوار کا دن ان لوگوں کے ساتھ گزار کر وہ اتوار کی رات آٹھ بجے وہاں سے روانہ ہو جاتی کیونکہ صبح اتنی لمبی ڈرائیونگ کرنے کے بعد وہ دفتر میں کام پر توجہ مرکوز نہیں کر سکتی تھی۔ اتوار کی رات کا کھانا کلارا سات بجے لگا دیا کرتی اور وہ ڈنر کے بعد کافی پیتے ہی روانہ ہو جاتی۔ بارہ بجے تک وہ اٹلانٹا سٹی میں واقع اپنے اپارٹمنٹ پہنچ جاتی اور چھ گھنٹے کی نیند اسے اگلے دن کے لیے تازہ دم کر دیا کر دیتی۔

تین سال سے اس کا یہی معمول تھا۔ یہ ایک مصروف ہائی وے تھی اور کسی مشکل کی صورت میں ون ون نائن کو کال کی جاتی تو کچھ دیر میں پولیس کار پہنچ جاتی۔ تین بار ایسا ہوا کہ اس کی کار خراب ہوئی تو اسے پولیس نے ایک ورک شاپ پر اس کی کار سمیت چھوڑا۔ یوں کبھی زیادہ مسئلہ نہیں ہوا۔ بس یہ ہوا کہ اسے ماں باپ کے گھر یا اٹلانٹا سٹی میں اپنے فلیٹ تک پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی۔

اس روز وہ گھر جا رہی تھی کہ اس نے راستے میں آنے والی سڑک پر مرمت کا کام ہوتے دیکھا۔ وہ پریشان ہوگئی کیونکہ اس سڑک پر آنے والا ٹریفک بہت کم تھا لیکن پھر وہ مطمئن ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ ان دنوں اس کی ملاقات سام سے ہوئی تھی۔ سام اسی عمارت کے ایک دفتر میں کام کرتا تھا جہاں میلسی کا دفتر تھا۔ سام سینئر پوسٹ پر تھا اور اس کی عمر تیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ میلسی کی اس سے پہلی ملاقات کیفے ٹیریا میں ہوئی تھی۔ لنچ کرنے والوں کے ہجوم میں میلسی کو جگہ نہیں مل رہی تھی، ایسے میں سام نے اسے اپنی میز پر بلا لیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے میلسی کے لیے لنچ بھی منگوا لیا۔ اگرچہ اس نے منع کیا۔ بل کی ادائیگی کے موقع پر میلسی نے خفگی سے کہا۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

سام مسکرایا۔ ”کوئی بات نہیں، اگلی بار تم بل دے دینا۔“

اتفاق سے یہ موقع دو دن بعد ہی آگیا۔ اس روز سام کو دیر ہوگئی اور کیفے ٹیریا میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔ میلسی نے اسے پریشان دیکھا تو اشارے سے اپنی طرف بلا لیا۔ وہ اس کی میز پر آگیا۔ اس روز میلسی نے بل ادا کر دیا۔ اس کے بعد اکثر دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور پھر سام نے اسے پروپوز کر دیا۔ اس نے فوری جواب نہیں دیا اور اس سے تھوڑا وقت مانگا۔ وہ اس موضوع پر اپنے ماں باپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ فیصلہ اسے کرنا تھا لیکن پھر بھی وہ شادی میں ماں باپ کی رضامندی بھی چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ مان جائیں گے کیونکہ سام ہر لحاظ سے ایک اچھا آدمی تھا۔ وہ ایک کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا اور اس کے پاس ذاتی رہائش تھی۔ مالی لحاظ سے وہ مضبوط آدمی تھا۔

جب ڈنر کے بعد اس نے ایڈ اور کلارا کو سام کے بارے میں بتایا اور اس کی تصویر دکھائی تو وہ خوش ہو گئے۔ سام دونوں کو پسند آیا تھا۔ ایڈ نے کہا کہ وہ اس کے بارے میں معلومات کروا لے گا کہ اس کا کوئی پولیس ریکارڈ تو نہیں ہے۔ میلسی کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی لیکن اس نے مخالفت نہیں کی۔ اگر اس کی انکوائری ہو جاتی تو یہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔ کلارا نے اس سے کہا کہ ہو سکے تو وہ اگلی بار اسے ساتھ لے کر آئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ سام کو لانے کی پوری کوشش کرے گی۔

اتوار کے روز ڈنر کے بعد وہ اٹلانٹا سٹی کے لیے روانہ ہوگئی۔ جب وہ ہائی وے کے اس حصے تک پہنچی جو مرمت کی وجہ سے بند تھا تب اسے ہوش آیا۔ اب اسے متبادل راستے پر سفر کرنا تھا جو ظاہر ہے، اس ہائی وے کی طرح پر رونق اور... باسہولت نہیں تھا۔ وہ متبادل راستے کی طرف جانے سے پہلے کچھ دیر سوچتی رہی۔ اب واپس جانے کا وقت نہیں تھا کیونکہ وہ نصف راستہ طے کر چکی تھی۔ کسی قدر ہچکچاتے ہوئے اس نے کار اس راستے پر موڑ دی۔ یہ سڑک تنگ اور کافی خراب تھی۔ اس کے دونوں طرف گھنا جنگل تھا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے اسے اپنے علاقے والا جنگل یاد آگیا جہاں وہ پاگل اسے کھینچ کر لے گیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ گئی۔

رات ہو چکی تھی اور گھنے جنگل کی وجہ سے اسے صرف کار کی ہیڈ لائٹس پر اعتماد کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ درختوں کی وجہ

سے چاند کی روشنی نہیں تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ کئی بار اندھیرے کی وجہ سے وہ سڑک سے اترتے اترتے بچی۔ وہ جھنجلانے لگی کیونکہ یہاں رفتار پچاس میل فی گھنٹا کرنے پر بھی حادثے کا خطرہ تھا۔ وہ آہستہ ڈرائیونگ کرنے پر مجبور تھی۔ لیکن اسے حادثہ اندھیرے کی وجہ سے پیش نہیں آیا۔ یہ ایک ہرن تھا جو جنگل سے نکل کر سڑک پر آگیا تھا۔ جب تک کار کی روشنی اس پر پڑتی' وہ بہت نزدیک آچکا تھا۔ میلسی نے بے ساختہ کار گھمائی اور وہ سڑک سے اتر کر کچے میں آگئی۔ اس نے کار قابو کرنے کی کوشش کی لیکن رفتار تیز ہونے کی وجہ سے وہ قابو نہیں کر پائی۔ پھر یہ جگہ نشیب میں تھی اور کار ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ میلسی سیٹ بیلٹ باندھنا بھول گئی تھی۔ اس لیے تصادم ہوتے ہی اس کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے سامنے سے روشنی سی نمودار ہوتے دیکھی تھی۔

☆☆☆

میلسی کو ہوش آیا تو کچھ دیر تو اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو گھورتی رہی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ کار میں تھی اور کار کو حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی لیکن ہوش اسے ایک کمرے میں آیا تھا۔ وہ اس کے فرش پر چت پڑی تھی۔ چھت کے ساتھ ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا جس کی پیلی روشنی میں ہر چیز دھندلی لگ رہی تھی۔ کمرا گندہ تھا اور بے ترتیب فرنیچر اور چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔ میلسی اٹھی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کے سر میں ہلکا سا درد تھا لیکن یہ ناقابلِ برداشت نہیں تھا۔ اس نے کمرے کا اکلوتا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ باہر سے بند تھا۔

میلسی کے جسم میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ کسی نے اسے یہاں بند کر دیا تھا... لیکن کیوں؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن آنے والے خیالات بہت خوفناک تھے۔ اس نے گھبرا کر دروازہ بجایا اور آواز دی۔ ''کوئی ہے؟ مجھے کیوں بند کیا ہے... کوئی ہے؟'' وہ بار بار دروازہ پیٹ کر اپنا سوال دہرا رہی تھی۔

اچانک باہر سے کوئی غرّایا۔ ''آرام سے بیٹھو، شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔''

میلسی کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''تم کون ہو اور مجھے کیوں بند کر رکھا ہے؟''

دروازہ اچانک اور جھٹکے سے کھلا۔ وہ اس کی زد سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹی۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا شخص ڈانگری پہنے کھڑا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور مجموعی طور پر وہ بہت خوفناک لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر میلسی کو گھورتا رہا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں ہوس نمایاں تھی۔ میلسی خوف سے لرز اٹھی۔ وہ اندر آیا اور اس نے بازو سے پکڑ کر میلسی کو اٹھا لیا۔

''چھوڑو مجھے۔'' میلسی نے مزاحمت کی لیکن اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

''شور مت کرنا۔'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''مجھے شور بالکل پسند نہیں ہے۔''

''پلیز! مجھے جانے دو۔''

''تم یہاں سے نہیں جا سکتیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس لیے خاموش رہو۔'' اس نے میلسی کا بازو چھوڑ دیا اور باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ میلسی کی جان میں جان آئی ورنہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ابھی اپنی من مانی پر اتر آئے گا اور وہ اسے کسی طرح نہیں روک سکتی تھی۔ وہ بہت جسیم اور طاقت ور... آدمی تھا۔ جب اس نے میلسی کا بازو پکڑا تو اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ وہ اٹھی اور اس نے کمرے کا معائنہ کیا۔ یہ مکان لکڑی کا بنا ہوا تھا اور ظاہر ہے یہ کمرا بھی لکڑی کا تھا۔ اس نے دیواروں میں کوئی ایسی درز... کی تلاش شروع کی جس سے وہ باہر دیکھ سکے کیونکہ اس کمرے میں کھڑکی تھی اور نہ ہی روشن دان۔ تلاش کے بعد اسے ایک درز مل گئی لیکن اس سے جھانکنے پر اسے باہر تاریکی نظر آئی۔ میلسی کو احساس ہوا کہ مکان کسی ویرانے میں ہے کیونکہ جھینگروں کے بولنے کی آواز آرہی تھی اور کبھی کبھی کوئی پرندہ بھی بول اٹھتا۔

اگر وہ چیختی، تب بھی کسی کے کانوں تک اس کی آواز نہیں جا سکتی تھی۔ کمرے میں ایک لیدر کا خستہ حال صوفہ سیٹ تھا اور اس کے سامنے ایک لکڑی کی میز تھی۔ ایک طرف درازوں میں... کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے درازوں کی تلاشی لی کہ شاید ان میں اسے کوئی ہتھیار مل جائے لیکن ان میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ باقی کمرے میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا اور اس میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے اس دیوزاد کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا۔ میلسی تھک ہار کر صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔

وہ غنودگی میں تھی۔ اچانک کسی عورت کی لرزہ خیز چیخ نے اسے چونکا دیا۔ وہ صوفے سے اچھل پڑی۔ وہ عورت مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس کی چیخوں کے ساتھ دیوزاد کی غراہٹیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میلسی کا خوف کے مارے بُرا حال ہوگیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ شخص عورت کے

ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ عورت کی آواز میں تکلیف کے ساتھ اپنی عزت کے تار تار ہونے کا کرب بھی شامل تھا۔ میلسی نے سوچا نہیں تھا کہ یہاں اس کے علاوہ بھی کوئی عورت قید ہو گی۔ اب اسے دیوزاد کے عزائم کے بارے میں ذرہ برابر شک نہیں رہا تھا۔ وہ جو اس عورت کے ساتھ کر رہا تھا، وہی سلوک اس کے ساتھ کرنے والا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ اس کے ہاتھ لگی؟ وہ اسی جگہ رہتا تھا جہاں اس کی کار کو حادثہ پیش آیا تھا... یا وہاں سے گزر رہا تھا اور وہ اس کے ہاتھ لگ گئی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس دیوزاد کے ہاتھ آگئی تھی۔

عورت کوئی نصف گھنٹے تک چیختی رہی۔ اس دوران میں دیوزاد نے اس کی چیخوں پر مشتعل ہو کر اس پر تشدد بھی کیا۔ اس کے بعد عورت میں سکت نہیں رہی یا پھر دیوزاد نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ میلسی کا رُواں رُواں لرزنے لگا کہ شاید اب اس کی باری ہے لیکن وہ شخص کہیں چلا گیا کیونکہ میلسی نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔ وہ بے ساختہ سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کی کلائی پر بندھی گھڑی بتا رہی تھی کہ اسے یہاں آئے ہوئے کم سے کم تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میلسی کو ایک خیال آیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بجایا اور آواز دی۔ ''اے! تم میری آواز سن رہی ہو... کیا تم آزاد ہو؟ پلیز! مجھے اس کمرے سے نکال دو۔''

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا لیکن میلسی مستقل مزاجی سے آوازیں دیتی رہی۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ آزاد ہوئی' تو اس کمرے کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ خاصی دیر بعد جب وہ ناامید ہو کر واپس جانے لگی تو دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور وہ کھل گیا۔ میلسی پہلے ڈر کر پیچھے ہٹی۔ اسے خیال آیا کہ شاید وہ شخص واپس آگیا ہے لیکن جب دروازہ کھلنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوا تو اس نے ہمت کر کے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ جوان اور خوب صورت تھی لیکن اس کی حالت دیکھ کر میلسی لرز گئی۔ وہ صرف ایک ٹی شرٹ میں تھی اور اس کے جسم پر جا بہ جا لہو کے داغ تھے۔ وہ یوں جھول رہی تھی جیسے بے ہوش ہو کر گرنے والی ہو۔ میلسی نے بے ساختہ اسے تھام لیا۔ وہ سچ مچ بے ہوش ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ میلسی اسے سنبھالنے کی کوشش میں خود بھی زمین پر ڈھیر ہوگئی۔ اس نے اٹھ کر مشکل سے اسے اس کمرے میں موجود ایک کاؤچ پر لٹایا۔ اس کے ہاتھ پیروں اور جسم کے دوسرے حصوں پر نوچے کھسوٹے جانے کے نشانات تھے۔ نازک حصوں کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ میلسی کانپ گئی۔

لڑکی بے ہوش تھی اور فی الحال وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے پہلے یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کمرے میں بھی ایک ہی دروازہ تھا اور یہ اس مکان سے باہر کھلتا تھا لیکن دروازہ باہر سے بند تھا اور یہ اتنا مضبوط تھا کہ وہ کسی صورت اسے نہیں توڑ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں نہ تو کوئی روشن دان تھا اور نہ کوئی کھڑکی۔ یہاں صرف ایک کاؤچ تھا اور ایک طرف کچھ پرانا کاٹھ کباڑ پڑا تھا جس میں ایک خراب فریج بھی تھا کیونکہ میلسی نے اسے کھولا تو اس میں بھی فالتو سامان بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس سے وہ خود کو یہاں سے آزاد کرا سکتی یا اس دیوزاد کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی۔

میلسی واپس اس لڑکی کے پاس آئی۔ وہ زخمی تھی لیکن اس کا کوئی زخم جان لیوا نہیں تھا پھر بھی اسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میلسی نے ایک کونے میں لگے واش بیسن سے پانی لے کر اس کے زخم صاف کیے اور پھر کچھ پانی اس کے منہ میں بھی ڈالا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور لڑکی ہوش میں آنے لگی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ کچھ دیر اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''وہ باہر گیا ہے۔'' میلسی نے کہا اور پھر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟''

لڑکی رونے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے بتایا کہ اس دیوزاد نے اسے چار دن سے یہاں قید کر رکھا ہے اور اس کے ساتھ مسلسل زیادتی کر رہا ہے۔ وہ انتہا درجے کا اذیت پسند تھا۔ لڑکی کے اکثر زخم پرانے تھے اور اس کے بیان کی گواہی دے رہے تھے۔ لڑکی کا نام ٹینا تھا۔ اس نے میلسی کو خوف زدہ لہجے میں بتایا۔ ''یہ شخص یہاں کم سے کم ایک درجن لڑکیوں کو لا کر ان کے ساتھ زیادتی کر چکا ہے۔''

''میرے خدا! پھر پولیس نے اس درندے کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟''

''اس کا کہنا ہے کہ اس کا شکار کوئی لڑکی کبھی پولیس کو شکایت نہیں کر سکتی۔''

میلسی کو اس کی بات کا مطلب سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔

''یہ... یہ ان لڑکیوں کو مار دیتا ہے؟''

''یہی بات ہو سکتی ہے ورنہ تم سوچو کہ کون لڑکی ہو گی جو اس کی شکایت نہ کرے۔''

”یہاں سے نکلنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے؟“

ٹینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ناممکن حد تک مشکل ہے... اس نے بہت مضبوط دروازہ لگایا ہوا ہے اور ہر وقت خود یہاں رہتا ہے، کہیں نہیں جاتا۔“

”لیکن ابھی تو وہ باہر گیا ہے۔“ میلسی نے سرگوشی کی۔

”ہاں لیکن وہ دور نہیں گیا ہوگا... آس پاس ہی ہوگا۔“ ٹینا کا چہرہ خوف سے بگڑ گیا۔ ”وہ بہت ظالم ہے اور تشدد سے لطف اندوز ہوتا ہے۔“

میلسی نے بھی اس کے بارے میں یہی اندازہ لگایا تھا اور اب اس کے ظلم کا عملی نمونہ بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ کسی صورت اس حال کو نہیں پہنچنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دروازے پر زور آزمائی کی لیکن وہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تھک ہار کر فرش پر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ ٹینا اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں یہ سب کر کے دیکھ چکی ہوں۔“

اسی لمحے باہر سے آہٹ ہوئی۔ میلسی جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ ”وہ آرہا ہے۔“

”تم کمرے میں چلی جاؤ، میں باہر سے دروازہ بند کر دوں گی۔ اس نے دیکھ لیا تو ہم دونوں کی شامت آئے گی۔“ ٹینا بولی۔ میلسی جلدی سے کمرے میں چلی گئی اور ٹینا نے باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے چند لمحے بعد ہی باہر کا دروازہ کھلا اور دیوزاد اندر آیا پھر میلسی والے کمرے کا دروازہ کھلا تو اس کا رُواں رُواں لرزنے لگا کہ اب اس کی باری ہے۔ لیکن دیوزاد نے اندر آنے کے بجائے ایک پیالہ اندر کر دیا جس میں دلیا نما کوئی چیز تھی پھر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ صبح کے چار بج رہے تھے اور یہ کوئی کھانے کا وقت نہیں تھا پھر اس ماحول میں بھوک لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میلسی صوفے پر سکڑ سمٹ کر لیٹ گئی۔ اسے نیند تو نہیں آئی لیکن غنودگی سی طاری تھی۔ اچانک وہ چونکی تو اسے احساس ہوا کہ صبح ہو چکی ہے۔ باہر سے پرندوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے اٹھ کر دیوار کے رخنوں سے باہر دیکھا۔ ہلکی روشنی میں اسے جنگل نظر آیا۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی اور یہاں شاید یہی دیوزاد رہتا تھا۔ میلسی کو بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن اس کا دلیا کھانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ دیوقامت شخص اس وقت کہاں ہے اور ٹینا کیا کر رہی ہے۔ وہ اسے آواز دیتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہاں بجلی تھی، اس کا مطلب تھا کہ یہ جگہ بالکل ہی ویرانے میں نہیں ہے ورنہ یہاں بجلی کہاں سے آتی۔ اس نے سامان الٹ پلٹ کر دیکھا کہ شاید کوئی کام کی چیز مل جائے مگر اس میں بجلی کے پرانے تاروں اور اسی طرح کے کاٹھ کباڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسے جو سب سے بڑی لکڑی ملی، وہ صرف چھ سات انچ کی تھی اور اسے ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہاں کوئی بڑی دھاتی چیز بھی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اور وزنی چیز تھی۔ صرف ایک صوفہ تھا۔ اس کا پایہ بھی صرف دس انچ کا تھا اور اسے صوفے سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کم سے کم میلسی الگ نہیں کر سکتی تھی۔ خاصی دیر تک وہ جستجو کرتی رہی پھر تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ اب اسے بھوک ..... لگ رہی تھی۔ مجبوراً اس نے دلیے کا پیالہ اٹھا لیا۔ یہ پلاسٹک کا تھا اور اس میں ایک پتلا سا دھاتی چمچ تھا۔ دلیا بہت گاڑھا تھا۔ اس سے بہ مشکل کھایا گیا۔ تھوڑا کھانے کے بعد اس نے چھوڑ دیا۔

دن کی روشنی تیز ہوئی تو کمرے میں بھی اس کی جھلک آنے لگی۔ دیوار کے رخنوں سے جتنا حصہ نظر آرہا تھا، یہ سب کسی قدرتی جنگل کا حصہ تھا۔ وہ معائنے کے بعد دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ اچانک ہی ٹینا کی لرزہ خیز چیخ نے اسے چونکا دیا۔ وہ اچھل پڑی پھر ٹینا لگاتار چیخنے لگی۔ دیوزاد کی غراتی سانسیں بتا رہی تھیں کہ اس نے اپنی وحشت کا مکروہ کھیل پھر سے شروع کر دیا ہے۔ ایسی آوازیں بھی آرہی تھیں جن سے لگ رہا تھا کہ وہ ٹینا پر تشدد بھی کر رہا ہے۔ میلسی کا خوف سے بُرا حال تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ابھی دیوزاد یہاں آجائے گا اور اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرے گا۔ جیسے جیسے ٹینا کی چیخیں تیز ہو رہی تھیں، اس کے جسم پر بھی لرزہ طاری ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک ہی دیوزاد کی دہاڑتی آواز آئی اور اس کے فوراً بعد ایسی آواز آئی جیسے کسی نے سوکھی لکڑی توڑ دی ہو۔ فوراً ہی ٹینا کی چیخیں بند ہو گئیں۔ میلسی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دوسرے کمرے میں کیا ہوا تھا؟ دیوزاد کیوں چلایا تھا اور ٹینا کیوں اچانک خاموش ہو گئی تھی؟ پھر ایک دھپ کی آواز آئی۔ میلسی نے ہمت کی اور اٹھ کر دروازے کے کی ہول سے باہر جھانکا۔ دیوزاد اپنے بازو پر کپڑا لپیٹ رہا تھا جیسے کوئی زخم آگیا ہو اور پھر اس نے جھک کر کسی چیز کو پکڑا اور اسے باہر لے جانے لگا۔ وہ چیز میلسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ دیوزاد جس چیز کو کھینچ کر لے جا رہا ہے، وہ ٹینا ہے اور پتا نہیں کس صورت میں ہے۔ وہ زندہ تھی یا دیوزاد نے اسے مار دیا تھا؟ جیسے ہی دیوزاد دروازہ بند کر کے باہر نکلا، میلسی تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس نے دلیا والا چمچ لیا اور اسے دروازے کے رخنے سے گزار کر باہر لگی کنڈی کو سرکانے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ دروازہ شاید دیوزاد نے خود

بنایا تھا اس لیے اس میں خاصی خلا تھا۔ اس کے باوجود کنڈی کو کھسکانا آسان کام نہیں تھا۔ وہ لگاتار جدوجہد کرتی رہی۔ اس کی انگلیاں دُکھ گئی تھیں۔ چمچ صرف انگلیوں سے تھام کر ہی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جب خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی کنڈی کھلنے کے آثار نظر نہیں آئے تو وہ مایوس ہو کر کوشش ترک کرنے والی تھی مگر اچانک ہی کنڈی سرک گئی اور دروازہ کھل گیا۔ اسے یقین نہیں آیا لیکن دھکا دینے پر دروازہ کھل گیا۔ وہ کمرے میں آئی اور باہر والے دروازے کی طرف لپکی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اسے کھولنے کی کوشش کی اور جب اسے بھی کھلا پایا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ قدرت اس کی مدد پر آمادہ تھی۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ ٹینا کے ساتھ کچھ ہو گیا ہے اور دیوزاد اس کی لاش ٹھکانے لگانے لے گیا ہے۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ سامنے اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

اس نے سن گن لی اور پھر باہر آگئی۔ یہ ایک برآمدہ تھا اور اس کے سامنے دور تک جنگل تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ دیوزاد کہاں ہے۔ اس نے اچانک ہی دوڑ لگائی اور جنگل کی طرف بھاگی۔ اسے امید تھی کہ ایک بار وہ جنگل میں گھس گئی تو دیوزاد پھر اسے نہیں پکڑ سکے گا۔ لیکن جب وہ درختوں کے پاس تھی تو اچانک ہی اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ بہت زور سے منہ کے بل زمین پر گری۔ اس کی ناک زمین سے ٹکرائی اور تصادم نے اس کے حواس مختل کر دیے...... اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا لیکن خطرے کے احساس نے اسے زیادہ دیر غافل رہنے نہیں دیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ گرتے ہوئے اس کے منہ سے چیخ نکلی ہے یا نہیں۔ اسے ناک میں سرسراہٹ کا احساس ہوا اور جب اس نے سر اٹھایا تو اسے زمین پر خون گرا نظر آیا۔ اس نے اٹھ کر شرٹ کے دامن سے ناک صاف کی لیکن خون مسلسل نکلے جا رہا تھا۔ اس نے اس چیز کو دیکھا جس میں اس کا پاؤں الجھا ہوا تھا۔ یہ ایک خاردار تار تھا جس میں جا بہ جا پھندے لگے تھے اور اس کا پاؤں ایک ایسے ہی پھندے میں الجھ گیا تھا۔ اس نے پاؤں نکالنے کی کوشش کی لیکن جھٹکا لگنے سے پھندا سخت ہو گیا تھا اور اسے کھول کر پاؤں سے نکالنا آسان نہیں تھا۔ تار میں لگے کانٹے اس کے پاؤں میں گھس کر اسے زخمی کر رہے تھے۔ وہ ضبط کرتے ہوئے ان کو پاؤں سے الگ کرنے کی کوشش کرتی رہی اور کسی نہ کسی طرح اس نے پھندا الگ کر ہی دیا لیکن اس کوشش میں اس کا پاؤں لہولہان ہو گیا تھا۔ وہ کراہتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

اسی لمحے مکان کے عقب سے دیوزاد نمودار ہوا۔ اس نے میلسی کو دیکھا تو غراتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ میلسی بے ساختہ تکلیف بھول کر بھاگی لیکن تکلیف کے باعث اس سے بھاگا نہیں جا رہا تھا۔ ناک کی ضرب نے بھی اس کے حواس کو متاثر کیا تھا۔ اس لیے وہ ایک اور پھندے کو نہیں دیکھ سکی۔ اس قسم کے پھندے یقیناً اس دیوزاد نے ہی لگا رکھے تھے تاکہ اس کا کوئی قیدی مکان سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو ان پھندوں کا شکار ہو جائے۔ اس بار وہ گری تو اسے اٹھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ دیوزاد اس کے سر پر پہنچ گیا تھا اور اس نے بالوں سے کھینچ کر اسے کھڑا کر دیا۔ وہ اسے کھینچ کر وہاں سے لے جانے لگا۔ خوش قسمتی سے پھندا اس کے پاؤں میں سخت نہیں ہوا تھا ورنہ دیوزاد نے اس کی پروا بھی نہیں کی تھی اور پھندا سخت ہونے کی صورت میں اس کا پاؤں مزید لہولہان ہو جاتا۔

دیوزاد اسے کھینچتا ہوا اور گالیاں دیتا ہوا مکان تک لایا اور اسے اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ جب تک میلسی اٹھ کر دروازے تک آتی، وہ اسے باہر سے بند کر کے جا چکا تھا۔ میلسی کا صدمے سے بُرا حال ہو گیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ بچنے میں کامیاب رہی ہے مگر اسی وقت وہ پکڑی گئی۔ وہ کاؤچ پر گر کر رونے لگی۔ اس کی قسمت میں اس دیوزاد سے بچنا نہیں تھا ورنہ وہ اس طرح نہ پکڑی جاتی۔ دیوزاد نہ جانے باہر کیا کر رہا تھا۔ میلسی نے دیکھا تھا، یہ مکان دو کمروں پر ہی مشتمل تھا۔ ہاں، اس کے پیچھے کچھ اور بھی بنا ہو تو اسے نہیں معلوم تھا۔

ٹینا کے ساتھ نہ جانے کیا ہوا تھا، وہ زندہ تھی یا مر گئی؟ میلسی کو محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی بات ہو، اس کی شامت آنے والی ہے۔ وہ اب تک محفوظ تھی لیکن دیوزاد شاید اب اسے نہیں بخشے گا۔ اس نے فرار کی کوشش کر کے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ اس کے کان باہر آہٹوں پر مرکوز تھے۔ ساتھ ہی وہ اپنی بچت کی ترکیب بھی سوچ رہی تھی۔ اچانک ہی اسے اپنے انسٹرکٹر کی ہدایات یاد آئیں۔ اسے سیلف ڈیفنس کا کورس کیے کئی سال گزر چکے تھے اور پریکٹس نہ کرنے کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر چاق و چوبند نہیں رہی تھی۔ انسٹرکٹر نے اس سے کہا تھا۔ ”اگر تمہارا حریف جسمانی طور پر تم سے بہت چاق و چوبند ہو تو اسے جسم کے بجائے ذہن سے زیر کرنے کی کوشش کرو۔“

میلسی کو یہ بات یاد آئی تو اسے اپنے اندر ایک نیا حوصلہ محسوس ہوا۔ اس نے اٹھ کر ایک بار پھر اس جگہ کا معائنہ

کیا پھر وہ دوسرے کمرے میں آئی۔ اس نے ایک بار پھر کاٹھ کباڑ کھنگالا تو اسے اس میں سے ریگ مال کا ٹکڑا ملا۔ اس نے اسے لیا اور دلیے والا چمچ اٹھایا۔ یہ بہت ہلکی دھات کا تھا۔ اس نے اس کا نوک والا سرا ریگ مال سے رگڑ رگڑ کر اسے مزید نکیلا بنانے کی کوشش شروع کی۔ اتنا نکیلا کہ وہ آدمی کے جسم میں اتر سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تار وغیرہ بھی الگ کر لیے۔ آنے والے ایک گھنٹے تک وہ بہت مصروف رہی۔

اچانک ہی بیرونی دروازہ کھلا تو اس نے سب چیزیں عجلت میں صوفے کے نیچے کر دیں اور اسی لمحے دیو قامت شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے عزائم اس کے چہرے پر لکھے تھے۔ اس نے آتے ہی میلسی کو بالوں سے پکڑ کر فرش پر پٹخ دیا اور غرایا۔ ”کتیا! بھاگ رہی تھی۔ ابھی تجھے بتاتا ہوں۔“

میلسی نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کی طاقت کے سامنے وہ بالکل بے بس تھی۔ اس نے دو تھپڑ مارے تو میلسی کا سر چکرانے لگا اور پھر اس میں مزاحمت کی ہمت ہی نہیں رہی۔ دیوزاد اس کا لباس اتارنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں کامیاب بھی ہوتا جا رہا تھا۔ میلسی رونے لگی۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گی لیکن اس سے پہلے کہ دیوزاد اپنے مکروہ کھیل کا آغاز کرتا، اچانک کہیں سے گھنٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں اور دیوزاد چونک گیا۔ اس نے میلسی کو چھوڑ دیا اور باہر کی طرف بڑھا۔

میلسی حیران تھی کہ گھنٹیاں کہاں بج رہی تھیں اور ان کی آواز میں ایسی کیا بات تھی کہ دیوزاد اسے چھوڑ کر چلا گیا؟ ان گھنٹیوں کی وجہ سے وہ فی الحال بچ گئی تھی۔ وہ اٹھی اور اس نے اپنا لباس درست کیا۔ دیوزاد جاتے ہوئے بیرونی دروازہ بند کر گیا تھا۔ میلسی کے پاس یہ آخری موقع تھا۔ اس نے صوفے کے نیچے سے سامان نکالا اور پھر سے کام میں لگ گئی۔ اسے تیار کرنے کے بعد اس نے کمرے میں نظر دوڑائی، اسے دروازے کے پیچھے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے لیکن وہ تیزی سے کام کر رہی تھی۔

دوسرے کمرے سے وہ سامان اور چادر لے کر آئی اور صوفے پر رکھنے لگی۔ یہ سارا کام اس نے مشکل سے دس منٹ میں کر لیا تھا۔ اب اسے دیوزاد کا انتظار تھا۔ اسے گئے ہوئے پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ میلسی کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ جلد واپس آئے گا۔ اسے تو حیرت تھی کہ اس مرحلے پر وہ اسے چھوڑ کیسے گیا؟ میلسی کا اندازہ درست نکلا۔ دیوزاد بیس منٹ بعد واپس آ گیا۔

اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور اس کمرے میں آیا جہاں وہ میلسی کو چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا دروازہ بھی کھلا تھا اور اسے میلسی صوفے پر چادر اوڑھے لیٹی نظر آئی۔ وہ کسی بھیڑیے کی طرح غرانے کے انداز میں ہنسا اور صوفے کی طرف بڑھا۔ ”تم سمجھتی ہو اس طرح مجھ سے بچ جاؤ گی؟“ اس نے کہتے ہوئے چادر کھینچ لی لیکن اسے حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ چادر تلے میلسی نہیں تھی بلکہ کچھ چیزیں .... رکھی تھیں۔ وہ غرا کر پلٹنے لگا کہ دروازے کے پیچھے موجود میلسی نے نکل کر دبے قدموں اس کی پشت پر آ کر ہاتھ بلند کیا اور... چمچ کا نکیلا حصہ اس کی پشت میں اتار دیا۔ دیوزاد غصے میں پلٹا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ پشت پر گیا لیکن میلسی نے چمچ ایسی جگہ اتارا تھا جہاں اس کا ہاتھ نہیں جا سکتا تھا۔ پوری قوت استعمال کرنے کے باوجود چمچ کی نوک مشکل سے نصف انچ اندر گئی تھی۔

”کتیا!“ دیوزاد نے دہاڑ کر کہا۔ اس نے ہاتھ گھمایا لیکن میلسی اس سے پہلے ہی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ دیوزاد اسے دیکھ کر غرایا۔ ”تو کیا سمجھتی ہے، اس طرح بچ جائے گی؟“

”میں اس طرح نہیں بچوں گی۔“ میلسی نے دروازے کے ساتھ ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ دروازے کے عقب میں کیا اور بولی۔ ”اس طرح بچوں گی۔“

دیوزاد اس کی طرف بڑھا مگر اچانک اسے جھٹکا لگا اور پھر اس نے کھڑے کھڑے تھرتھرانا شروع کر دیا۔ اسے لگنے والے جھٹکے شدید ہوتے چلے گئے۔ اس کا منہ کھل گیا تھا جس سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں اور آنکھیں اوپر چڑھ گئی تھیں پھر وہ دھڑام سے منہ کے بل زمین پر گر گیا اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ اس کی پشت میں جہاں چمچ گڑا ہوا تھا، وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میلسی نے دروازے کے عقب میں موجود سوئچ بورڈ کا بٹن بند کر دیا اور تاروں کے ذریعے دیوزاد کے جسم میں دوڑتی برقی رو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بہ ظاہر تو دیوزاد... مر چکا تھا لیکن اس کی تصدیق کرنا تھی۔ میلسی نے ڈرتے ڈرتے اس کی نبض چیک کی۔ اس کی نبض چل رہی تھی لیکن بہت ہلکی... ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آخری دم پر ہے۔

میلسی باہر آئی۔ اس نے مکان سے نکل کر دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اب دیوزاد بچ جاتا اور ہوش میں آ جاتا، تب بھی وہ مکان سے باہر نہیں آ سکتا تھا۔ ویسے بھی بجلی کے شدید جھٹکوں کے بعد اس کا جلدی ہوش میں آنا ممکن نہیں تھا۔ اس بار میلسی نے جلد بازی کرنے کے بجائے پہلے مکان کے اردگرد کا جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مکان کے پیچھے ایک چھوٹا سا کاٹیج ہے۔ یہ ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا اور اس میں سلیقے سے فرنیچر اور دوسرا سامان سجا ہوا تھا۔ وہاں

کچن بھی تھا۔ میلسی نے فریج سے کولڈ ڈرنک کا ٹن نکال کر پیا۔ اس کا گلا پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ اسے کسی مواصلاتی آلے کی تلاش تھی لیکن اس کیبن میں نہ تو فون تھا اور نہ ہی اسے کہیں کوئی موبائل نظر آیا۔

وہ کیبن سے نکل کر عقب میں آئی تو وہاں اسے ایک پرانا سا پک اپ ٹرک کھڑا نظر آیا لیکن اس میں چابی نہیں تھی۔ ٹرک نظر آنے کی خوشی معدوم ہو گئی۔ پہلے اس نے کیبن میں جا کر چابی تلاش کی لیکن وہاں چابی نہیں تھی پھر اسے خیال آیا کہ چابی یقیناً دیوزاد کے پاس ہوگی۔ اس کے پاس جانے کا سوچ کر ہی اسے خوف آنے لگا مگر چابی تو چاہیے تھی ورنہ وہ یہاں سے کیسے نکلتی؟ ہمت کر کے اس نے مکان کا رخ کیا۔ یہ مکان دیوزاد نے یقیناً لڑکیوں کو قید کرنے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ اندر آئی۔ دیوزاد اسی انداز میں پڑا تھا۔ اس نے جھک کر اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اسے ایک جیب سے چابی مل گئی۔ اس نے سکون کا سانس لیا لیکن جیسے ہی وہ باہر جانے لگی، اچانک ہی دیوزاد نے اس کا پاؤں پکڑ لیا۔ میلسی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ دیوزاد زندہ تھا اور اس میں ابھی طاقت تھی لیکن جب میلسی نے جھٹکا دیا تو اس کا پاؤں بڑے آرام سے دیوزاد کی گرفت سے نکل آیا۔

”ذلیل شخص!“ میلسی نے نفرت سے کہا اور اس کے منہ پر تھوکر ماری پھر اس پر جنون سا طاری ہو گیا۔ وہ لگاتار اسے ٹھوکریں مارتی رہی۔ دیوزاد بالکل بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اس کی ٹھوکروں سے بچنے کی کوشش کرتا۔ نہ جانے کتنی ہمت کر کے اس نے میلسی کا پاؤں پکڑا تھا۔ جب میلسی تھک گئی اور اس کا پاؤں دکھنے لگا تو وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے دیوزاد کے چہرے پر تھوکا اور وہاں سے نکل آئی۔

دروازہ باہر سے بند کر کے اس نے کیبن کا رخ کیا۔ وہاں سے اس نے کولڈ ڈرنک کے کچھ ٹن اور لیے اور ٹرک میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ کچا راستہ نمایاں تھا۔ جیسے ہی ٹرک کچھ دور گیا، اسے گھنٹیاں بجنے کی آواز آئی۔ میلسی نے ٹرک روک دیا اور نیچے اتر کر دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ انہی گھنٹیوں کی آواز سن کر دیوزاد عین اس وقت اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا جب وہ اسے برباد کرنے کے بالکل قریب تھا اور اسی وجہ سے اسے یہ موقع ملا تھا۔ اس نے دیوزاد کے خلاف عقل سے کام لے کر جان بچالی تھی۔

میلسی نے نیچے اتر کر راستہ دیکھا تو ایک جگہ اسے زمین کے بالکل ساتھ باریک سا فولادی تار بندھا نظر آیا۔ یہ اس طرح بندھا تھا کہ اس طرف سے گزرنے والی گاڑی لازمی اس کے اوپر سے گزرتی۔

میلسی نے تار پر پاؤں رکھا تو کہیں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اب وہ سمجھی کہ اس تار کا تعلق کہیں موجود گھنٹیوں سے تھا۔ جب اس تار پر دباؤ آتا تو گھنٹیاں بجنے لگتیں اور دیوزاد کو پتا چل جاتا کہ کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ ظاہر ہے، اس طرف کوئی مشکل سے ہی آتا ہوگا۔ دوسرے دیوزاد کو اپنی حرکتوں کی وجہ سے خوف بھی لاحق رہتا ہوگا۔ اس لیے اس نے ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ کوئی اس طرف آئے تو اسے پتا چل جائے۔ وہ میلسی کو چھوڑ کر یہ دیکھنے آیا تھا کہ کون آ رہا ہے۔ میلسی نہیں جانتی تھی کہ کوئی آیا تھا یا پھر کسی جانور کا پاؤں اس پر پڑ گیا تھا اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بہرحال، میلسی کی جان بچ گئی۔

وہ دوبارہ ٹرک پر سوار ہوئی اور وہاں سے روانہ ہو گئی۔ نصف گھنٹے کے بعد وہ ایک سڑک پر تھی اور مزید نصف گھنٹے بعد اسے ہائی وے پر ایک فون بوتھ مل گیا جہاں سے اس نے پولیس کو کال کیا۔ اس دن کے خاتمے تک پولیس نے دیوزاد کو زندہ گرفتار کر کے اسپتال تک پہنچا دیا اور اس کے مکان کے آس پاس کھدائی کر کے تین لڑکیوں کی لاشیں دریافت کر لیں۔ جب ایڈ اسے لینے پہنچا تو ان لڑکیوں کی لاشیں ایمبولینس میں جا رہی تھیں۔ میلسی سوچ رہی تھی کہ اگر قسمت اس کا ساتھ نہ دیتی تو آج اس کی لاش بھی کہیں دبائی جا چکی ہوتی۔ ان میں ٹینا کی لاش بھی تھی۔ دیوزاد نے اسے گردن توڑ کر مار ڈالا تھا۔

دیوزاد پیٹرک مارکین اصل میں فاریسٹ گارڈ تھا اور اس علاقے میں اس کی ڈیوٹی تھی۔ یہاں تنہائی سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی شیطانیت کی تسکین کرتا۔ اس نے بیچ بیچ ایک درجن سے زیادہ لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا تھا۔ میلسی کو خوشی تھی کہ وہ ان لڑکیوں میں شامل نہیں ہوئی اور یہ شیطان پکڑا گیا لیکن اسے افسوس تھا کہ اس شخص کو سزائے موت نہیں ہوگی کیونکہ ریاستی قانون کے مطابق یہاں سزائے موت نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ ایک بات یقینی تھی کہ جیتے جی وہ جیل سے نہیں نکل سکے گا۔

جب میلسی واپس ڈیوٹی پر آئی تو سام نے اسے ڈنر پر مدعو کیا اور اس ڈنر میں اس نے خواہش ظاہر کی۔ ”میں چاہتا ہوں کہ اگلی بار جب تم اپنے ماں باپ سے ملنے جاؤ تو اکیلی نہ ہو۔“ میلسی مان گئی۔ اب اسے خود بھی اکیلے سفر کرنے کے خیال سے خوف آنے لگا تھا۔

اسماقادری

گیارہویں قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانوں کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزر نا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ...... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ...... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم ،افسرشاہی ،جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

رانی کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ فوری طور پر اشرف شاہ کے سوال کا جواب دے سکتی۔ وہ خوف زدہ سی کھڑی اس کی شکل دیکھتی رہی۔

''میں نے تجھ سے پوچھا ہے کہ اتنی رات گئے کسے فون کر رہی تھی؟'' اسے خاموش پا کر اشرف شاہ نے اپنا سوال دہرایا۔

''کسی کو نہیں شاہ جی! فون کی گھنٹی بجی تھی تو میں نے فون اٹھایا تھا، پر دوسری طرف سے کوئی کچھ بولا ہی نہیں۔'' رانی نے تھوک نگل کر اپنا خشک ہو جانے والا گلا تر کیا اور اشرف شاہ کی بات کا جواب دیا۔ اچانک نازل ہو جانے والے چودھری افتخار کے اس بڑے داماد کو ٹالنے کے لیے فی الحال یہی بہانہ اسے سوجھ سکا تھا۔ اشرف شاہ نے اس کا جواب سنا اور خود آگے بڑھ کر نیچے گرا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔ ریسیور کان سے لگانے پر اسے اندازہ ہوا کہ ابھی تک لائن پر کوئی موجود ہے۔

''ہیلو!'' اس نے غرانے کے انداز میں کہا۔ ردِعمل میں فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا اور ٹوں ٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اشرف شاہ نے رانی کو کھا جانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''کشور کہاں ہے؟'' یہ سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں شک سرسرا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس گمنام کال کا کشور سے تعلق تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''بی بی تو اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔'' تاجور اور اشرف شاہ کی کوٹھی میں آمد کے ساتھ ہی اس نے اس سوال کا جواب سوچنا شروع کر دیا تھا اس لیے اس بار پورے اعتماد سے اشرف شاہ کو جواب دیا۔

''بی بی کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ بڑی دیر تک مجھ سے سر دبواتی رہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دوا کھا کر سوئی ہیں۔ سونے سے پہلے انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ جب تک میں خود نہ جاگوں، مجھے سویرے اٹھانا نہیں۔'' حفظِ ماتقدم کے تحت اس نے آگے کے حالات کو سنبھالنے کے لیے بھی پیش بندی شروع کر دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔'' اشرف شاہ نے اسے اجازت دی اور خود بھی باہر نکل گیا۔ رانی نے فوری مصیبت کے ٹل جانے پر سکون کا گہرا سانس لیا اور باورچی خانے میں جا کر بے وقت چلے آنے والے اپنے ان مالکان کے لیے دودھ گرم کر کے گلاسوں میں نکالنے لگی۔ ہاتھوں کی طرح اس کا ذہن بھی بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے اس ساری صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے بہت کچھ کرنا تھا۔ کشور کو مطلع کرنا، تاجور اور اشرف شاہ کو کشور کے غیاب سے بے خبر رکھنا اور خواب آور دوا ملی چائے پی کر سو جانے والے ملازمین کو سنبھالنے کی تمام تر ذمے داریاں اس کے سر تھیں۔ صرف وہ تھی جو کشور کے رازِ محبت کی امین تھی اور اس امانت کا حق ادا کرنے کے لیے اسے بے حد مستعدی سے کام لینا تھا۔

☆☆☆

''آفتاب! مجھے یقین دلائیں کہ یہ سب خواب نہیں ہے۔ میں سچ مچ اس وقت آپ کی بیوی کی حیثیت سے آپ کے قریب، آپ کے ساتھ موجود ہوں۔'' کشور نے اپنا سر آفتاب کے سینے پر رکھتے ہوئے خوابیدہ سے لہجے میں اس سے فرمائش کی۔ اس کی فرمائش پر آفتاب نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اپنی نظروں کی گرفت میں لیا۔ کشور نے اپنی آنکھیں موند رکھی تھیں۔ شاید وہ واقعی اپنی زندگی کے ان انمول لمحات کو کوئی خواب تصور کر رہی تھی اور اس خوب صورت خواب کے ٹوٹ جانے کے ڈر سے آنکھیں نہیں کھول رہی تھی۔ آفتاب اس کی کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ وہ خود بھی انہی احساسات سے دوچار تھا۔ کبھی کبھی اچانک مل جانے والی خوشیاں انسان کو ایسی ہی بے یقینی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ وہ خواب جو بارہا دیکھے جائیں، تعبیر کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد بھی خواب ہی محسوس ہوتے ہیں۔ خوب صورت خوابوں کی خوب صورت تعبیر خواب دیکھنے والے کو ڈرا دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ تعبیر نہیں کانچ کا نازک بلوریں جام ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ جائے گا۔ وہ دونوں بھی اس وقت ایک دوسرے کے ساتھ ہونے اور بہت سے کیف آور لمحات گزر جانے کے بعد بھی اسی ڈر، اسی خوف میں مبتلا تھے۔

''اگر آپ کو یہ لمحے خواب لگتے ہیں تو بھی کیا حرج ہے کہ ہم یہ خواب دیکھتے رہیں۔ اتنے خوب صورت خواب تو قسمت والوں ہی کو نصیب ہوتے ہیں۔ رنگ برنگے خوابوں کے پھولوں سے بھری یہ فصل تو بس انہی دلوں کی سرزمین پر اگتی ہے جنہیں محبت کے پانی سے سیراب ہونے کا موقع ملا ہو۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ قدرت نے ہمارے دلوں کی زمین کو اتنا زرخیز بنایا ہے۔'' بہت دھیمی آواز میں اپنے لفظوں کا جادو جگاتے ہوئے اس نے نرمی سے کشور کی بند آنکھوں کو باری باری چوما۔ پھر گویا اسے اور خود کو یقین دلانے کے لیے پوری شدت سے اس کے ایک ایک نقش کو چومتا چلا گیا۔ کشور کے قرب نے اسے ایک ایسا بادل بنا دیا تھا جو برسنے کے بعد بھی خالی نہیں ہوا تھا۔ اس کی چاہت کی گھٹا اور بھی امڈ امڈ کر

آ رہی تھی۔ دھرتی بھی جل تھل ہو جانے کے باوجود مزید برسات کو قبول کرنے سے انکاری نہیں تھی۔ ان کے لیے اس وقت کائنات میں ایک دوجے کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ 'میں اور تو' کا فرق مٹائے ایک دوجے میں گم تھے۔ ایک دوجے کو چاہت سے لبریز جام پر جام پلاتے وہ بالکل مدہوش تھے۔ اچانک ہی ایک آواز نے اس فسوں کو توڑ دیا۔ دو چاہنے والوں کی تنہائی میں مخل ہونے والی یہ آواز کشور کے موبائل کی رنگ ٹون تھی جسے سن کر وہ بری طرح چونک گئی۔ اس کے موبائل پر صرف ایک شخص کال کرتا تھا اور وہ شخص اس کے ساتھ تھا۔ یہاں آنے سے قبل وہ رانی کو اپنا موبائل نمبر رٹوا کر آئی تھی اور گھنٹی بجنے کا مطلب تھا کہ کال کرنے والی رانی ہے۔ رانی کی طرف سے کال آنے کا یہی مطلب لیا جا سکتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے ورنہ وہ اس وقت اسے ہرگز بھی ڈسٹرب نہیں کرتی۔ اندیشوں اور خوف میں گھری کشور نے ہاتھ بڑھا کر اپنا موبائل اٹھایا۔ موبائل کی اسکرین پر کوٹھی کا فون نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے ''یس'' کا بٹن پش کرتے ہوئے کال ریسیو کی لیکن دوسری طرف سے توقع کے برخلاف رانی کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ کچھ بولتی اس سے قبل ہی ایک مردانہ آواز اس کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے اپنی سماعتوں کو پوری طرح دوسری طرف سے سنائی دینے والی آوازوں پر مرکوز کر دیا۔

''میں نے تجھ سے پوچھا ہے کہ اتنی رات گئے کسے فون کر رہی ہے؟'' اس بار وہ آواز سننے کے ساتھ ساتھ لفظوں کو سمجھنے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ اسے اس آواز اور لہجے کو پہچاننے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگا۔ نتیجتاً چاہت کے رنگوں سے سجا اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔ اس کے ساتھ موجود آفتاب خاموشی سے اس کی اس بدلتی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ فی الوقت وہ اسے بھی بھلائے رانی کی آواز سن رہی تھی۔ رانی کا وضاحتی جملہ ابھی اس کی سماعتوں سے گزرا ہی تھا کہ ایک غراتی ہوئی مردانہ ''ہیلو'' نے اس کے وجود کو ہلا ڈالا۔ اب شک وشبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سو فیصد اس کا بڑا بہنوئی اشرف شاہ تھا۔ اشرف شاہ کے کوٹھی میں موجود ہونے کا مطلب تھا کہ بہت بڑا خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اگر تاجور بھی تھی تو کشور کا کوٹھی سے غیاب چھپانا بہت مشکل تھا۔ بے حد خوف زدہ ہوتے ہوئے اس نے لائن کاٹ دی اور ہارے ہوئے انداز میں موبائل کان پر سے ہٹاتے ہوئے بیڈ پر ڈال دیا۔ حقیقت کی تلخی اسے خوابوں کی دنیا سے واپس لے آئی تھی۔

''کیا بات ہے کشور... کیا ہوا؟'' آفتاب نے پُرتشویش نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بھا اشرف کوٹھی پر آئے ہوئے ہیں۔'' اس نے مردہ سے لہجے میں بتایا۔

''یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔'' آفتاب اس کی دی ہوئی اطلاع کو سن کر پریشان ہو گیا۔

''مجھے فوری طور پر کوٹھی واپس جانا ہوگا۔'' کشور جو بالکل بے دم سی بیٹھی تھی، کوئی خیال آنے پر یک دم ہی متحرک ہوئی۔

''لیکن اس وقت آپ کا اس طرح سے جانا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔'' آفتاب نے تشویش کا اظہار کیا۔

''میرا نہ جانا رانی کے لیے بہت برا ثابت ہوگا۔ میں اسے اس کی وفاداری اور محبت کے بدلے میں اتنے بڑے خطرے سے دوچار نہیں کر سکتی۔'' کشور کا لہجہ اٹل اور دلیل جان دار تھی۔ واقعی انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ ایک وفادار و جاں نثار ملازمہ کو حالات کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے۔

''میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' اس نے جرأت مندی سے اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ اور کشور ایک دوسرے سے الگ نہیں تھے۔ وہ اس کی ذات سے اپنے لیے خوشیاں کشید کرتا تھا چنانچہ اب مصیبت کی گھڑی میں بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔ دوسری طرف کشور اسے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن آفتاب کے ساتھ جانا بھی اس کی مجبوری تھی۔ رات کے اس پہر وہ اکیلی کوٹھی تک واپس نہیں جا سکتی تھی۔ آفتاب کو کوٹھی کے گیٹ سے ہی واپس لوٹا دینے کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ آفتاب آسانی سے واپس لوٹنے کے لیے راضی نہیں ہوگا مگر وہ اسے اپنی قسم دے کر واپس ہونے پر مجبور کر سکتی تھی۔

''آپ تیار ہو کر باہر آئیں، میں افضل اور بھابی کو صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں۔'' آفتاب نے کہا اور شرٹ کے بٹن بند کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور بھی بجھے دل کے ساتھ حرکت میں آ گئی۔ زندگی کے اتنے خوب صورت لمحات اس طرح درہم برہم ہو جانے پر دل کا بجھ جانا ایک فطری سی بات تھی۔ اس نے کوٹھی سے پارلر جاتے ہوئے جو لباس پہنا تھا، وہی اب دوبارہ پہن لیا اور حسرت بھری نظروں سے اس سرخ عروسی لباس کو دیکھنے لگی جو اس نے بہ طور خاص بڑے ارمانوں سے اس موقع کے لیے خریدا تھا۔ آفتاب نے اسے اس لباس میں دیکھ کر خوب خوب سراہا تھا لیکن اتنا سراہے جانے کے بعد بھی وہ سیر نہیں ہوئی تھی۔ جو لمحے گزر گئے تھے وہ بے شک انمول تھے لیکن وقت نے،

خواہش سے بہت کم یہ انمول لمحات اس کی جھولی میں ڈالے تھے۔ اسے اپنا آپ ایک ایسے مے خوار کی طرح لگ رہا تھا جسے پوری طرح سے سُرور آنے سے قبل ہی مے خانے سے رخصت کا حکم سنا دیا گیا ہو۔

''تیار ہو کشور؟'' اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور افضل کی بیوی مہتاب اندر داخل ہوئی۔

''جی، بس یہ چیزیں سمیٹنی ہیں۔'' اس نے بیڈ پر بکھرے عروسی لباس اور زیورات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ میں سمیٹ لوں گی۔ تم ایسا کرو کہ اچھی طرح منہ دھولو۔ افضل گاڑی نکال رہے ہیں۔ وہ اور آفتاب دونوں تمہارے ساتھ جائیں گے۔'' گزرے لمحات کا فسانہ سناتے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مہتاب نے اسے مشورہ دیا اور خود اس کی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کشور نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور ملحقہ غسل خانے میں جا کر اچھی طرح منہ دھو آئی۔ منہ دھو لینے کے باوجود اس کے وجود پر کئی ایسی نشانیاں بچی تھیں جو اس کے نئی دلہن ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ مہندی کے نقش و نگار سے سجے ہاتھ پیر، بالوں کا خوب صورت سا اسٹائل جو تھوڑا سا بگڑا ضرور تھا لیکن بہر حال قائم تھا۔ بالوں میں کہیں کہیں چمکتی افشاں اور سب سے بڑھ کر اس کے وجود سی اٹھتیں خوشبو کی لپٹیں۔ ہر ہر شے گواہی دے رہی تھی کہ وہ ایک دلہن ہے۔ مہتاب نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ بے رحمانہ اور غیر منصفانہ رویوں کی شکار اس لڑکی نے اپنے بااختیار و عالی مرتبت باپ سے چھپ کر اپنے لیے خوشیوں کا ایک چور دروازہ کھولا تھا لیکن اسے خوشی کے بہت ہی مختصر لمحات میسر آ سکے تھے۔

''بھابی! میری یہ چیزیں آپ کے پاس امانت رہیں گی۔ انہیں بہت سنبھال کر رکھیے گا کیونکہ یہ صرف مادی اشیا نہیں ہیں۔ ان میں میرے جذبات اور زندگی کے انمول لمحوں کی مہک بھی بسی ہوئی ہے۔'' چادر کو ماتھے تک لا کر اوڑھتے ہوئے اس نے رندھی ہوئی آواز میں مہتاب سے درخواست کی۔

''تم فکر مت کرو۔ تمہاری ہر شے بالکل محفوظ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر عطا کرے اور تمہیں دوبارہ ان چیزوں کو برتنا نصیب ہو۔'' مہتاب نے بڑی بہنوں کے انداز میں اسے گلے لگاتے ہوئے دعا دی تو اس کی آنکھوں سے اور بھی تیزی سے آنسو بہنے لگے۔ بس یہی تو کمی تھی اس کی زندگی میں۔ اس کے خون کے رشتے اسے زندگی کی ہر آسائش فراہم کرنے کو تیار رہتے تھے لیکن ان کے لبوں پر اس کے لیے ایسی خوش کن دعائیں کبھی نہیں ہوتی تھیں۔

''چلو باہر چلتے ہیں۔ افضل اور آفتاب انتظار کر رہے ہوں گے۔'' مہتاب جس کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے تھے، خود کو سنبھالتے ہوئے بولی اور اسے خود سے الگ کر کے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کے رخساروں پر بہتے آنسو صاف کیے۔ کشور نے بھی وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خود کو تیزی سے سنبھال لیا اور چادر کے پلو کو نقاب کے انداز میں چہرے پر لینے کے بعد مہتاب کے ساتھ باہر نکل گئی۔ افضل اور آفتاب باہر منتظر کھڑے تھے۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔'' مہتاب نے ان کے نکلنے سے قبل بیویوں والی مخصوص فکر مندی کے ساتھ افضل کو تاکید کی۔

''میں تو کہتا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ ہی مت چلو۔ کشور کے ساتھ میرا اکیلے ہی جانا مناسب ہے۔ وہاں کچھ بھی حالات ہو سکتے ہیں۔'' مہتاب کی فکر مندی دیکھتے ہوئے آفتاب نے افضل سے کہا۔

''اس بات پر ہم پہلے ہی بہت بحث کر چکے ہیں اور میں تمہیں واضح طور پر بتا چکا ہوں کہ میں ان حالات میں تمہیں ہرگز بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔'' افضل نے حتمی لہجے میں کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔ آفتاب بے بس سا ہو کر مہتاب کو دیکھنے لگا۔

''افضل ٹھیک کہہ رہے ہیں آفتاب! تم ہمیں بھائیوں کی طرح عزیز ہو۔ ہم تمہیں کسی صورت بھی تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر بچوں کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں بھی اس وقت تمہارے ساتھ ہی چلتی۔'' وہ جو یہ خیال کر رہا تھا کہ مہتاب، افضل کے اس کے ساتھ جانے پر متوحش ہے، اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ گوری چٹی، لمبی چوڑی مہتاب نے اپنے الفاظ سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ پہاڑوں میں آباد ایک قبائلی خاندان کا خون ہے... ایک ایسے خاندان کا جہاں مردوں کی طرح عورتوں کے حوصلے بھی بہت بلند اور مضبوط ہوتے ہیں۔ وہ مہتاب پر ایک متشکرانہ سی نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔ کشور بھی اسی کے ساتھ تھی۔

''آپ نے دوبارہ کوٹھی فون کر کے صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش کی یا نہیں؟'' گاڑی کو روڈ پر لاتے ہوئے افضل نے کشور سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اگر آپ وہاں فون کر لیتیں تو ممکن تھا کہ آپ کو اپنی ملازمہ سے صحیح صورتِ حال معلوم ہو جاتی۔''

''مجھے ڈر تھا کہ فون رانی کے بجائے بھا اشرف سنیں گے اس لیے میں ڈر کر فون نہیں کر سکی۔'' کشور نے اپنے کوٹھی فون نہ کرنے کی وجہ بتائی۔

''فون کرنے کے مقابلے میں اس طرح براہِ راست کوٹھی واپس پہنچ جانا زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ نہیں معلوم کہ وہاں کیا صورتِ حال درپیش ہے۔ فون پر بات کر لینے کی صورت میں کچھ تو واضح ہو جائے گا۔'' افضل نے اسے سمجھایا۔

''صورتِ حال جو بھی ہو، مجھے ہر حال میں کوٹھی واپس پہنچنا ہے۔ میرا نہ پہنچنا رانی کی زندگی کو خطرے میں ڈال دے گا۔ میں بدترین حالات میں بھی اسے کسی زیادتی کا نشانہ بننے کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ لوگوں سے میری درخواست ہے کہ مجھے کوٹھی کے قریب اتار کر خود واپس چلے جایئے گا۔ آگے جو کچھ پیش آئے گا، اس سے میں خود نمٹ لوں گی۔''

کشور کا لہجہ اس بار بہت مضبوط تھا لیکن آفتاب کو اس کی بات نے تکلیف پہنچائی۔ کشور کا یہ کہنا کہ آپ لوگ واپس چلے جایئے گا میں خود نمٹ لوں گی... اس کو اپنی محبت کی توہین کرنا لگا تھا۔ آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کشور کو کسی خطرے میں گھرا چھوڑ کر خود واپس آجاتا؟ اس نے پلٹ کر عقبی سیٹ پر بیٹھی کشور پر ایک شکوہ کناں نظر ڈالی اور کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے قبل ہی کشور کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے تیزی سے موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ حسبِ توقع کوٹھی کا فون نمبر ہی وہاں جگمگا رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کر لی لیکن زبان سے کچھ نہ بولی کہ مبادا دوسری طرف اشرف شاہ ہی موجود نہ ہو۔

''بی بی! میں رانی بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے رانی نے کال ریسیو کیے جانے کو محسوس کر کے پیچی آواز میں بتایا۔ اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ سرگوشی سے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''وہاں کیا حال ہے رانی! تجھے کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟'' رانی کی آواز سن کر کشور نے بے تابی سے پوچھا۔ افضل اور آفتاب کے کان بھی رانی کا نام سن کر کھڑے ہوئے۔

''زیادہ مشکل نہیں ہوئی بی بی! تاجور بی بی اور اشرف شاہ جی نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا، میں نے کہہ دیا کہ آپ اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ پر سویرے میں کیا کروں گی جی؟ ابھی تو میں نے انہیں دودھ میں تھوڑی سی نیند کی دوا ملا کر دے دی تھی، وہ لوگ دودھ پی کر سو گئے ہیں۔ آپ بتائیں آپ کب واپس آئیں گی؟'' رانی کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھی کہ اگر کشور کے کوٹھی پر موجود نہ ہونے کی بات کھل گئی تو سب سے پہلے اسی کی شامت آئے گی۔

''فکر نہ کر رانی! میں کوٹھی واپس آ رہی ہوں۔ راستے میں ہی ہوں۔'' صورتِ حال قابو میں ہے، یہ جان کر کشور نے ایک سکون بھرا سانس لیا اور رانی کو بھی تسلی دی۔

''ٹھیک ہے بی بی! میں آپ کا انتظار کرتی ہوں۔ آپ دروازے کی گھنٹی مت بجانا۔ میں چھوٹے گیٹ کی کنڈی اندر سے کھول دوں گی اور خود قریب ہی رہوں گی۔ آپ چپکے سے اندر آ جانا۔'' رانی نے جلدی سے آگے کا منصوبہ ترتیب دیا جس سے اتفاق کرتے ہوئے اس نے کال منقطع کر دی اور متجسس سے بیٹھے آفتاب اور افضل کو تفصیلات بتانے لگی۔

☆☆☆

''کشور کہاں ہے رانی؟ اسے کہو کہ وہ بھی آ کر ناشتا کر لے۔'' رانی اور حاجرہ میز پر ناشتے کے لوازمات سجا رہی تھیں، تب تاجور نے رانی کو یہ حکم دیا۔

''بی بی نے تو سویرے جلدی ناشتا کر لیا تھا جی۔'' رانی نے اطلاع دی پھر مزید وضاحت دیتے ہوئے بولی۔ ''اصل میں بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا، اس لیے میں نے ان کے کمرے میں ہی ناشتا پہنچا دیا تھا۔''

''چل ٹھیک ہے۔ ویسے بھی رات جانے کیوں اتنی گہری نیند آئی کہ سویرے جلدی آنکھ نہیں کھل سکی۔ اب بھی طبیعت مندی مندی سی ہے۔ اچھا ہے تو نے کشور کو ناشتا کروا دیا۔ بے چاری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کب تک ہمارا انتظار کرتی۔'' کشور کے کمرے سے باہر نہ آنے پر تاجور دل ہی دل میں بے حد برہم تھی لیکن اشرف کے سامنے اظہار کرنے سے گریز کیا اور فی الحال بہن کی حمایت کرنا ہی مناسب سمجھا۔ دوسری طرف رانی اس سے نظریں چرا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ تاجور اور اشرف کی صبح جلدی آنکھ کیوں نہیں کھل سکی۔ خود اسی نے تو اس احتیاط کے پیشِ نظر کہ کہیں کشور کا رات کے آخری پہر کوٹھی واپس آنا کسی کے علم میں نہ آ جائے ان کی نیند کے گہرے ہونے کا بندوبست کیا تھا۔ کوٹھی پر موجود دوسرے ملازمین کو بھی وہ کسی نہ کسی طرح قابو کر چکی تھی۔ ویسے بھی وہ اس معاملے میں زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ کشور کے بارے میں کوئی ایسی ویسی اطلاع سن کر مالکان اس کا جو حشر کرتے سو کرتے لیکن اس سے بھی پہلے اطلاع دینے والا زیرِ عتاب آتا، سو انہوں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

ناشتے کا مرحلہ خاموشی سے تمام ہوا۔ تاجور اور اشرف شاہ، کشور کے خود کو نظر انداز کرنے پر کبیدۂ خاطر تھے تو رانی اور حاجرہ اندرونی خوف کے زیرِ اثر تھیں۔ ویسے بھی وہ خادمائیں تھیں جنہیں مالکان کے خود سے مخاطب کیے بغیر کم ہی زبان کھولنے کی جرأت ہو پاتی تھی۔ ناشتے کی میز پر اگر کوئی

رونق تھی تو وہ ننھے منور کی وجہ سے۔ وہی تھا جو چھوٹی موٹی فرمائشیں کرنے کے ساتھ ساتھ ماں باپ سے بات چیت کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

''میں ذرا کشور کی طبیعت پوچھ آؤں۔'' ناشتے سے فارغ ہوتے ہی تاجور نے اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے اشرف شاہ سے کہا۔

''جلدی آنا۔ پندرہ منٹ میں ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے حکم دیا۔ تاجور اثبات میں سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ منور بھی ماں کے ساتھ ہولیا۔

''بڑے نخرے ہو گئے ہیں تیرے کشور! یہ نہیں کہ آ کر بڑے بہنوئی کو سلام کر جاتی۔ اب وہ واپس گاؤں جا کر مہینے بھر تک اسی بات کا طعنہ دیتا رہے گا کہ تیری بہن مجھے سلام تک کرنے نہیں آئی۔'' کشور کے کمرے میں داخل ہوتے ہی تاجور نے اتنی دیر سے ضبط کیے...... غصے کا اظہار شروع کر دیا۔ کشور جواباً کچھ نہیں بولی اور اسی طرح بیڈ پر نیم دراز حالت میں بیٹھی رہی جس طرح تاجور کے کمرے میں آنے سے قبل بیٹھی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف متوجہ تھی اور اب تاجور کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''آہا... کشور خالہ نے کتنی پیاری مہندی لگائی ہے۔'' کشور کے پیر تو اس چادر کے نیچے چھپے ہوئے تھے جو اس نے پیروں سے لے کر سینے تک اوڑھ رکھی تھی لیکن کتاب کو گرفت میں لیے ہوئے ہاتھ واضح تھے۔ تاجور غصے میں ہونے کی وجہ سے اس طرف متوجہ نہیں ہو سکی تھی لیکن منور نہ صرف خود متوجہ ہوا تھا بلکہ ماں کی توجہ بھی مبذول کروا دی تھی۔

''خالہ تو دلہن لگ رہی ہیں۔'' تازہ شیمپو کیے ہوئے بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چٹیا، دو دن قبل پارلر سے کروائی گئی فیس سروسز اور اندرونی خوشی کی چمک... یہ سب چیزیں مل کر کشور کو ایسا روپ بخش گئی تھیں کہ معصوم بچہ بے ساختہ ہی ذہن میں ابھرنے والے تاثر کا زبان سے اظہار کر گیا۔ اس کی بات سن کر جہاں کشور گھبرائی، وہاں تاجور بھی ٹھٹک گئی۔

''یہ سب کیا ہے کشور؟'' وہ جو گلہ کرنے آئی تھی اسے بھول کر کشور کے چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ایسے ہی آپا! بس جی چاہ رہا تھا۔'' کشور نے جھکی نظروں کے ساتھ جواب دیا۔

''پر تجھے تو یہ سب اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ تو تو کبھی مہندی لگانے پر تیار نہیں ہوتی تھی۔ ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ مجھے کوئی ارمان نہیں ہے۔'' تاجور اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی اور جرح کرنے لگی۔

''کہنے سے کیا ہوتا ہے آپا! ہوں تو آخر میں بھی ایک جیتی جاگتی لڑکی۔ بندہ خود پر، اپنے ارمانوں پر بند باندھ کر ہر خواہش سے دست برداری اختیار کر لے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اندر سرے سے کوئی خواہش موجود ہی نہیں۔ خواہش اور احتیاج کو کتنا ہی کچلو، یہ سر اٹھانے سے باز نہیں آتیں... اپنی تکمیل کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتی ہیں۔ اب چاہے یہ راہ کوئی چور دروازہ کھول کر ہی نکالی جائے۔''

یاسیت سے یہ سب کہتی کشور کی باتوں کا کیا پس منظر ہے، تاجور نہیں جانتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اپنے ایک جائز حق کو چور راستے سے حاصل کر لینے والی کشور پر کیا بیت رہی ہے۔ ہر لڑکی کی طرح اس کے بھی دل میں ارمان تھا کہ اس کی برات پوری شان سے اس کے باپ کی چوکھٹ تک آئے۔ وہ سکھیوں کی چھیڑ چھاڑ، بہنوں کے پیار اور ماں باپ کی دعاؤں کے جلو میں اپنے پی کے نگر جائے لیکن زر و دولت کے پجاری اس کے باپ نے اس پر خوشی کا یہ در بند کر دیا تھا۔ وہ جو اپنی سیج پر ہر رات ایک نئی عورت کو دیکھنا چاہتا تھا، بیٹی کو اس کا جائز اور شرعی حق بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''تاجور بی بی! آپ کو چودھری اشرف شاہ بلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں جلدی کریں، انہیں دیر ہو رہی ہے۔'' حیران، پریشان سی تاجور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی، اس سے قبل ہی رانی کمرے میں چلی آئی اور اسے اشرف شاہ کا پیغام پہنچایا۔ اس پیغام کو سن کر تاجور کمرے سے باہر نکل گئی۔ البتہ اس نے رانی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

''یہ کشور کو کیا ہوا ہے رانی! بڑی بدلی بدلی سی لگ رہی ہے؟'' باہر نکلتے ہی اس نے رانی سے پوچھا۔

''میں کیا کہوں بی بی! چھوٹا منہ بڑی بات والی گل ہو جائے گی۔ پر سچ تو یہی ہے کہ کشور بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لگتا ہے دماغ پر کچھ اثر ہوا ہے۔ میں نے اپنی اماں سے سنا ہے کہ جن لڑکیوں کی وقت پر شادی نہ ہو، ان کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے۔ کشور بی بی جانے کب سے اندر ہی اندر گھٹ رہی تھیں، اب پھٹی ہیں تو یہ حال ہو گیا ہے۔'' رانی اور کشور میں رات ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ تاجور کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے۔ ظاہر ہے اس سے کشور کا حلیہ پوشیدہ رکھنا تو ممکن نہیں تھا... اور بجائے یہ کہ اس کا ذہن کسی خاص رخ پر سوچے، اس کو بھٹکا کر اپنی مرضی کے رخ پر سوچنے پر مجبور کر دینے میں ہی بہتری تھی۔

''ہائے میرے ربا! یہ گل ہے۔ مجھے مالوم تو ہوا تھا کہ

کشور کا دماغ کچھ چل گیا ہے۔ ایک دن ابا جی کے سامنے بھی تو تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔'' رانی کی بات سن کر تاجور کو یاد آیا تو بولی۔ کشور کے کمرے سے نکل کر وہ دونوں بے حد سست قدموں سے چلتی اس کمرے کی طرف جا رہی تھیں جس میں رات تاجور اور اشرف شاہ ٹھہرے تھے۔ منور ان سے پہلے ہی بھاگتا ہوا وہاں پہنچ چکا تھا۔

''آپ کو ٹھیک مالوم ہوا تھا بی بی! وڈے چودھری صاحب نے غصے میں ہی تو کشور بی بی کو حویلی سے ادھر بھجوایا تھا کہ شہر میں رہ کر ان کا علاج ہو سکے۔'' رانی نے اس کے خیال کو مزید تقویت دی۔

''فیر دکھایا کسی ڈاکٹر کو؟'' تاجور نے پوچھا جس کے جواب میں رانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''دکھائے گا بھی کون؟ ادھر نوکروں کے اوپر اسے چھوڑ کر سارے ادھر حویلی میں بیٹھے ہیں۔ میں واپس جا کر اماں کو کہتی ہوں کہ چھوٹی اماں کو ادھر بھیجیں۔ ابا جی تو سنا ہے امریکا جانے والے ہیں۔ چھوٹی اماں ہی آ کر اپنی دھی کو سنبھالیں گی۔ کڑی کو ایسے آزاد چھوڑ کر ہم ساروں کو اپنی ناکیں تھوڑی کٹوانی ہیں۔'' اپنے لیے مخصوص کمرے کے دروازے تک پہنچنے کے بعد تاجور نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ سنایا اور اندر داخل ہو گئی۔ رانی بے بسی سے بند ہو جانے والے دروازے کو تکتی رہی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آنے والا وقت کشور کے لیے کوئی آسانی لائے گا یا وہ مزید حالات کے گرداب میں پھنستی چلی جائے گی۔

☆☆☆

''ماہ بانو بہن! یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے ہے۔'' وہ اپنے کپڑے رکھ کر بیگ کی زپ بند کر رہی تھی کہ گل مینا کمرے میں چلی آئی اور اپنی مٹھی میں دبی کوئی شے اس کی طرف بڑھائی۔

''دکھاؤ تو کیا ہے؟'' ماہ بانو نے مسکراتے ہوئے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔ آج وہ لوگ ہوشے سے واپس کاندے جانے والے تھے اور وہ اسی سلسلے میں اپنی تیاری میں مصروف تھی۔

''یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔'' شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ گل مینا نے اپنی مٹھی میں دبی شے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھی۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ پتھر کی بنی ایک بھدی سی انگوٹھی ہے۔

''شکریہ گل مینا! یہ تو بہت پیاری ہے۔'' ماہ بانو نے فوراً وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔ انگوٹھی بے شک بھدی اور بے کشش تھی لیکن جس خلوص سے اسے دی گئی تھی، اس نے اسے بہت خوب صورت بنا دیا تھا۔ ماہ بانو کے منہ سے انگوٹھی کی تعریف سن کر گل مینا کا چہرہ چمک اٹھا۔

''یہ بہت خاص انگوٹھی ہے۔ زہر موہرا پتھر سے بنا ہے۔ ہمارا بھائی شگر کی وادی سے خود زہر موہرا ڈھونڈ کر لایا تھا اور ہمیں یہ انگوٹھی بنا کر دیا تھا۔ یہاں لوگ زہر موہرا کے نام سے بہت چیزیں بیچتا ہے، پر وہ سب اصلی نہیں ہوتا۔ زہر موہرا کوئی اتنی آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ یہ پتھر بہت بلند علاقے میں ملتا ہے اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کس پہاڑ کے نیچے زہر موہرا ملے گا۔ ہمارے بھائی کو تو اس کے ایک دوست کی وجہ سے پتا معلوم ہو گیا تھا ورنہ جن لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر کدھر ملے گا، وہ دوسروں کو بتاتا نہیں ہے۔'' ماہ بانو کی تعریف سے حوصلہ پا کر گل مینا اسے جوش و خروش سے بتانے لگی۔

''ایسی کیا خاص بات ہے اس پتھر میں؟'' ماہ بانو نے تجسس سے پوچھا۔

''اس پتھر میں زہر کو جذب کر لینے کا صلاحیت ہوتا ہے۔ کہتے ہیں، بادشاہ لوگ اس پتھر سے اپنے لیے برتن بنواتے تھے تاکہ اگر کوئی دھوکے سے ان کے کھانے میں زہر ملا دے تو سارا زہر برتن میں ہی جذب ہو جائے اور بادشاہ کی جان بچ جائے۔'' گل مینا نے بتایا۔

''پھر تو یہ واقعی بڑے کام کی چیز ہوئی۔ میں ہمیشہ اسے سنبھال کر رکھوں گی تاکہ کبھی ضرورت پڑے تو کام آئے۔ ویسے کام کی چیز نہیں ہوتی تو بھی تمہارا تحفہ ہونے کی وجہ سے تو مجھے اسے سنبھال کر ہی رکھنا تھا۔ تم اتنی پیاری لڑکی ہو، تم سے یہ ملاقات تو مجھے ویسے بھی ساری زندگی یاد رہے گی۔ میں کوشش کروں گی کہ دوبارہ بھی تم سے ملنے آسکوں... بلکہ ایسا کرتی ہوں کہ بھائی اکرم کی ماں سے بات کرتی ہوں کہ تمہاری اور اس کی جلدی سے شادی کر دے۔ شادی کے بعد تم وہاں کاندے آجاؤ گی۔ پھر جب تک میں کاندے میں ہوں، ہم دونوں مزے سے رہیں گے۔'' ماہ بانو کو اچانک ہی آئیڈیا سوجھا اور وہ آگے کا منصوبہ ترتیب دینے لگی جسے سن کر گل مینا کا چہرہ گل گوں ہو گیا۔ سرخ چہرے کے ساتھ اس طرح شرمائی ہوئی وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ ماہ بانو نے بے ساختہ ہی اسے کھینچ کر گلے سے لگا لیا۔

''تم تو سچ مچ بڑی پیاری ہو۔''

''تم ایسے ہی ہمیں بناتا ہے۔'' گل مینا اس کی بات سن کر جھینپے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بالکل نہیں بناتا... اگر کہو تو اکرم خان کو بلا کر اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔" ماہ بانو نے اسے مزید چھیڑا۔

"مجھ سے کیا پوچھنا ہے؟" اچانک ہی دروازے کی طرف سے اکرم خان کی آواز سنائی دی۔

"ماہ بانو بہن پوچھ رہا تھا کہ کب تک واپس جائے گا؟" ماہ بانو سے الگ ہوتے ہوئے گل مینا نے جلدی سے بات بنائی۔ اس کے اس طرح بات بنانے پر ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تاہم اس نے تردید کی کوشش نہیں کی۔

"میں یہی بتانے آیا تھا کہ جیپ آ گیا ہے۔ اگر تیاری پورا ہے تو چل کر جیپ میں بیٹھ جاؤ۔" اکرم خان نے جواب دیا۔

"تیاری تو ہو گئی ہے بھائی اکرم! تم میرا یہ بیگ جیپ میں رکھو، میں سب گھر والوں سے مل کر ابھی آتی ہوں۔" ماہ بانو نے جواب دیا تو اکرم خان گل مینا پر ایک بھرپور نظر ڈال کر حسبِ ہدایت بیگ لے کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی وہ دونوں بھی کمرے سے باہر آ گئیں۔ اکرم خان کی ماں اپنے عزیزوں سے رخصت لے رہی تھی۔ ماہ بانو بھی ان سب سے ملنے لگی پھر وہ اور اکرم خان کی ماں گھر سے باہر نکل گئیں۔ اکرم خان ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ان کا منتظر تھا۔ وہ دونوں پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئیں۔ عقبی حصے میں ان کے سامان کے علاوہ دیگر سامان بھی رکھا تھا جس کا تعلق یقیناً کسی نہ کسی ایکسپی ڈیشن ٹیم سے ہی ہوگا۔ ان کے بیٹھتے ہی جیپ اسٹارٹ ہو کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ ماہ بانو نے پیچھے مڑ کر دروازے کے باہر آ کھڑے ہونے والے اپنے میزبانوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ سوائے گل مینا کے تقریباً سب ہی لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔ گل مینا بھی لحہ بہ لحہ آگے بڑھتی جیپ کی طرف ہی دیکھ رہی تھی لیکن اس کی توجہ کا مرکز اکرم خان تھا جس کو رخصت کرتے ہوئے جدائی کے پہلے ہی لمحے میں گل مینا کی آنکھوں میں انتظار کے دیپ جل گئے تھے۔ ماہ بانو کو اکرم خان پر رشک آیا۔ وہ کتنا خوش قسمت انسان تھا کہ کسی کی آنکھوں میں اس کے لیے انتظار کے دیپ جلتے تھے۔ دوسری طرف وہ خود تھی جو اس کے ساتھ اس جیپ میں سفر کرنے کے باوجود اس جیسی قسمت نہیں رکھتی تھی۔ اسے قطعی امید نہیں تھی کہ اس کے لیے کہیں کسی کی آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلتے ہوں گے۔ وہ تو وہ حرماں نصیب تھی جسے وقت کے طوفانوں نے اپنے پیاروں سے جدا کر کے اس اجنبی علاقے میں پہنچا دیا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ حالات کے اس گرداب سے کب نکلے گی... اور نکل بھی سکے گی یا نہیں؟

لایعنی خیالات اور اداسیوں میں گھرے ہونے کے باعث اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ وہ لوگ کب ہوشے سے باہر نکل آئے۔ اس کے علاوہ جیپ میں موجود باقی تین نفوس بھی بالکل خاموش تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھی اکرم خان کی ماں اونگھ رہی تھی۔ خود اکرم خان بھی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا لیکن ماہ بانو کو اندازہ تھا کہ وہ سونے کے بجائے اپنی بند آنکھوں کے پیچھے موجود گل مینا کے تصور میں گم ہے۔ جیپ ڈرائیور شاید مزاجاً کم گو آدمی تھا یا پھر اپنے ہم سفروں کی خاموشی میں مخل ہونے کو مناسب نہ جانتے ہوئے خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں موجود مایوس کن سوچوں کو جھٹکتی ہوئی بیرونی مناظر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جیپ گرد اڑاتی ہوئی بڑی بڑی چٹانوں والے ایک نہایت خشک صحرائی علاقے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اس علاقے میں پتھروں سے تعمیر کردہ چند گھر موجود تھے۔ ماہ بانو کو یاد آیا، ہوشے جاتے ہوئے اکرم خان نے اس علاقے کو کینداس تھنگ کے نام سے متعارف کروایا تھا۔ وہی کینداس تھنگ جہاں کاندے کے سیلاب زدگان نے اپنے لیے نئے گھر بنائے تھے۔ چٹانوں کو توڑ توڑ کر بنائے گئے ان گھروں کے مکین اس علاقے میں پانی جیسی بنیادی ضرورت سے محروم تھے مگر وہ یہاں رہنے پر مجبور تھے...

ان لوگوں کے حالات پر ...... دکھ محسوس کرتے ہوئے وہ اتنی بری طرح ان کے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں کھڑی جیپ کب حرکت میں آئی اور دندناتی ہوئی ان کے سروں پر آ پہنچی۔ اس جیپ کے اچانک سامنے آ جانے کے باعث ان کی جیپ کے ڈرائیور نے ایمرجنسی بریک لگائے جس کے نتیجے میں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لوگ اس جھٹکے سے سنبھلے تو چار عدد مسلح افراد ان کی جیپ کو گھیر چکے تھے۔

"کون لوگ ہے تم؟" اکرم خان ذرا سا سنبھلا تو اپنی جانب کھڑے ہوئے مسلح نقاب پوش سے بلند آواز میں پوچھا اور جیپ سے اترنے کی کوشش کی۔ نقاب پوش نے اپنی رائفل کی نال اس کی گردن پر رکھتے ہوئے اسے اس کوشش سے باز رکھا۔ اکرم خان کو رائفل کے زور پر قابو میں رکھنے والے نقاب پوش کے علاوہ باقی تینوں نقاب پوشوں نے جیپ کا ایک ایک دروازہ سنبھال رکھا تھا لیکن ابھی تک ان تینوں کو کسی حرکت کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ جیپ ڈرائیور نے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ انہیں گھیرنے والوں نے جس کسی

مقصد سے انہیں روکا ہے، اس کا تعلق بہر حال اس کی ذات سے نہیں ہے۔ وہ برسوں سے اس علاقے میں جیپ چلا رہا تھا اور کبھی ایسی کسی صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اب جو صورت ..... پیش آئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ حملہ آوروں کا نشانہ اس کے بجائے اس کی جیپ میں سوار دیگر افراد ہیں۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کیے رکھنے میں ہی عافیت جانی تھی یا پھر شاید وہ صورت حال کے واضح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ بہر حال، جو بھی بات تھی، اس کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ اکرم خان کی ماں بے حد گھبرا جانے کے باعث کچھ کہنے یا کرنے کے لائق نہیں رہی تھی جبکہ ماہ بانو دھک دھک کرتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی کہ کیا شکاری کتوں کی طرح اس کے تعاقب میں لگے ہوئے چودھری کے کارندوں نے اس جگہ بھی اس کی بو پالی ہے... اور اب اسے دبوچ کر اپنے مالک کے قدموں میں پہنچانے والے ہیں؟

''لڑکی کو نیچے اتارو۔'' اکرم خان کی گردن سے رائفل کی نال لگائے کھڑے شخص نے حکم صادر کیا تو ذہن میں سرسراتے اس خدشے کی تصدیق ہو گئی کہ یوں اس ویرانے میں انہیں گھیرنے والے ماہ بانو کے ہی دشمن ہیں جو ایک بار پھر اس کی زندگی کا سکون درہم برہم کر دینے کے درپے ہیں۔

''نیچے اترو لڑکی!'' حکم ملتے ہی ماہ بانو والی جانب کھڑا نقاب پوش اس کے شانے پر رائفل کی ٹھکی دیتے ہوئے غرایا اور پھر اپنے کہے جملے کا ردِعمل ظاہر ہونے سے قبل خود ہی ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جیپ سے باہر کھینچا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم نے ہاتھ کیسے لگایا لڑکی کو؟'' اپنی گردن سے لگی رائفل کی نال کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اکرم خان بھڑکا۔ عورت کا احترام یوں بھی اس کی گھٹی میں پڑا تھا اور ماہ بانو تو تھی بھی اس کی مہمان... جسے پناہ کے لیے ہی اس کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس کے ساتھ کسی بدسلوکی پر اس کا بھڑکنا لازم تھا۔ ماہ بانو جو نقاب پوش کے خود کو کھینچنے کی وجہ سے جیپ سے باہر پہنچ گئی تھی، اکرم خان کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا چہرہ شدید غصے کے باعث تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ اس حالت میں وہ مشابرم خان سے بہت زیادہ مشابہ لگ رہا تھا۔ سگے بھائی ہونے کی وجہ سے یوں بھی ان کی شکلوں میں تھوڑی سی مشابہت تھی اور اب غصے کی کیفیت میں ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ پُرجوش و مہم جو مشابرم خان سے مشابہ لگ رہا تھا۔

''آرام سے بیٹھو۔ زیادہ جوش دکھایا تو اپنی جان سے جاؤ گے۔'' اکرم خان کی گردن سے رائفل کی نال لگا کر کھڑے نقاب پوش نے نال سے ہی اس کے جبڑے پر زوردار ضرب لگائی لیکن اب اکرم خان بری طرح بپھر چکا تھا۔ اس نے جبڑے کی چوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے رائفل کی نال کو پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ رائفل بردار اس جھٹکے سے پیچھے کی طرف لڑھکا۔ اکرم خان دندناتا ہوا جیپ سے نیچے اترا اور نیچے گرے ہوئے شخص کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ عالمِ جوش میں تھا اور اس حقیقت کو فراموش کر چکا تھا کہ اس کے مقابل صرف یہی ایک شخص نہیں ہے جسے زیر کر کے وہ حالات پر قابو پا سکتا ہے۔ وہاں تین مسلح افراد اور بھی موجود تھے۔ اکرم خان کی زور آوری دیکھتے ہوئے اس کی ماں کو کور کیے کھڑے نقاب پوش نے اپنی رائفل سیدھی کی اور پھر دھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ اکرم خان لہراتا ہوا نیچے آ گرا اور تڑپنے لگا۔ اس کے پہلو سے نکلتا خون بہت تیزی سے اس کے کپڑوں کو گل رنگ کرتا جا رہا تھا۔ اس ساری کارروائی کے دوران خوف زدہ سی منہ کھولے بیٹھی اس کی ماں نے یہ منظر دیکھ کر ایک دل دوز چیخ ماری اور جیپ سے اتر کر اس کی طرف دوڑی۔ نقاب پوشوں میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ماہ بانو اور جیپ کا ڈرائیور بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور نے شروع سے ہی ایسا طرزِ عمل اختیار کیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی جھگڑے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہے اور اب جو کچھ وہاں ہوا تھا، اس کے بعد تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا سی جنبش بھی کرتا... کہ مبادا کسی مشکل میں پڑ جائے۔ ماہ بانو خود کو جیپ سے اتارنے والے نقاب پوش کی گرفت میں جکڑی شاک کے سے عالم میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اکرم خان جس کے گھر میں وہ پناہ گزین تھی... جسے دولہا بنا کر گل مینا کے دروازے تک لے جانے کا وہ اس سے وعدہ کر کے آئی تھی... جسے اس کی ماں صرف اس لیے بلند و بالا پہاڑوں کا سفر نہیں کرنے دیتی تھی کہ کہیں پہاڑ اس کے ایک اور پیارے کو نہ نگل لے... اپنے ہی خون میں نہایا خشک زمین پر پڑا تھا۔ پیاسی زمین اس کے جوان خون سے سیراب ہو رہی تھی جبکہ غم سے نڈھال کرلاتی ماں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس طرح اسے اپنے بازوؤں میں دبوچ رکھا تھا جیسے فرشتۂ اجل سے اسے چھپا لینا چاہتی ہو۔ ماہ بانو پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ آج پھر ایک انسانی جان اس پر قربان ہوئی تھی۔ آج پھر کوئی اسے بچانے کے لیے اپنے خون میں نہا گیا تھا۔ آج پھر اس کے گرداب میں پھنسے وجود کو گرداب سے نکالنے کی کوشش کرنے والا خود اس گرداب کا شکار ہو گیا

تھا۔

''لڑکی کو جیپ میں بٹھاؤ۔'' اکرم خان کے دھکے سے نیچے... گرنے والا نقاب پوش جو یقیناً ان حملہ آوروں کا لیڈر تھا، کب کا سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے وہاں بپا قیامت پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور ماہ بانو کے عقب میں اسے جکڑے کھڑے شخص کو حکم دیا۔ وہ شخص حکم کی تعمیل میں اسے کھینچتا ہوا اپنی جیپ کی طرف لے گیا۔ ماہ بانو کے صدمے سے ساکت ہو جانے والے وجود میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں کو حرکت دے سکتی۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ اپنے ساتھ کیے جانے والے سلوک پر مزاحمت کر پاتی۔ وہ کاٹھ کی کسی گڑیا کی طرح خود کو کھینچنے والے کے ساتھ ساتھ کھنچتی جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اسے جیپ میں ڈالنے کے بعد اس کی ناک پر کلوروفام میں ڈوبا ہوا رومال رکھا، تب بھی اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے بے ہوشی کے اندھیروں میں اتر گئی۔ ان اندھیروں میں سفر کرتے اسے علم نہیں تھا کہ کچھ دیر قبل وہ جس جیپ میں سفر کر رہی تھی، اس کے چاروں ٹائرز رائفل کی گولیوں سے ناکارہ کر دیے گئے ہیں اور اب وہ اپنے دوستوں کے بجائے دشمنوں کی ہم رکابی میں ایک انجان و اجنبی دنیا میں لے جائی جا رہی ہے۔

☆☆☆

''رانی! ذرا ایک کپ گرما گرم چائے تو لے آ۔'' گیلے چہرے کو تولیے...... سے تھپتھپا کر صاف کرتے ہوئے کشور نے حکم دیا۔ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ رات کے آخری پہر کوٹھی واپس لوٹنے کے بعد باقی کا وقت نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کرنے اور رانی سے مشاورت میں گزرا تھا۔ تاجور کی کوٹھی میں موجودگی اس کے لیے اتنی اعصابی کشیدگی کا باعث تھی کہ جو تھوڑا بہت وقت بچا، اس میں بھی نیند نہیں آ سکی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اشرف شاہ جلدی میں تھا اس لیے تاجور کو زیادہ دیر وہاں رکنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اس نے بے حد ذہنی سکون محسوس کیا اور لمبی تان کر سو گئی۔ رت جگے اور اعصابی کشیدگی کے بعد آنے والی یہ نیند کافی گہری تھی اور وہ کئی گھنٹوں بعد دوبارہ جاگی تھی۔ جاگنے کے بعد اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اب بھی کچھ کچھ نیند کے خمار میں ڈوبے ذہن کو فریش کرنے کے لیے چائے پینے کی فرمائش کی۔

''آپ کہیں تو کھانا لگوا دوں بی بی! آپ نے صبح بھی بہت تھوڑا سا ناشتا کیا تھا۔ اب تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ خالی پیٹ چائے پینے کے بجائے اگر پہلے کچھ کھا لیتیں تو اچھا ہوتا۔'' ہر دم اس کی بھلائی کے لیے فکرمند رہنے والی رانی نے مشورہ دیا تو وہ مسکرا دی۔ واقعی صبح رانی کے بے حد اصرار کے باوجود وہ ایک کپ چائے کے ساتھ ایک سلائس کے سوا کچھ نہیں کھا سکی تھی۔ رات افضل کی بیوی مہتاب نے کھانے پر اچھا خاصا اہتمام کیا تھا لیکن وہ بے حد اہتمام سے تیار کیا گیا کھانا جذبات کی شوریدہ سری کے باعث اس کی اور آفتاب کی بہت زیادہ توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کروا سکا تھا۔ ان دونوں ہی نے بہت کم کھانا کھایا تھا چنانچہ اصولاً اسے اس وقت بھوک لگنی چاہیے تھی اور لگ بھی رہی تھی... پھر بھی وہ رانی کو ٹال گئی۔

''ابھی تو تم چائے لے آؤ۔ کھانے کا میں تمہیں بعد میں بتاتی ہوں۔'' وہ اپنا پرس کھول کر موبائل تلاش کرنے لگی۔ کوٹھی میں داخل ہوتے وقت اس نے موبائل آف کر دیا تھا جواب تک بند ہی تھا۔ موبائل کی اپنے پاس موجودگی کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ عموماً اسے بند ہی رکھتی تھی کہ مبادا اچانک کسی کی موجودگی میں گھنٹی بج اٹھے اور اس کا راز فاش ہو جائے۔ موبائل پرس سے نکال کر آن کرنے کے بعد اس نے آفتاب کا نمبر ملایا۔ پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

''کہاں تھیں آپ؟ میں کب سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔'' فوراً ہی دوسری طرف سے آفتاب کی خفا سی آواز سنائی دی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر چکی ہے۔ پہلے حالات کو اپنے کنٹرول میں لینے کے چکر میں الجھے ہونے کے باعث اسے خیال ہی نہیں آیا کہ آفتاب کو کال کر لے اور بعد میں ریلیکس ہونے کے بعد اسے نیند نے دبوچ لیا۔ وہ بے چارہ رات سے اب تک یقیناً اس کی طرف سے کال کیے جانے کے انتظار میں بیٹھا خوار ہو رہا تھا۔

''سوری آفتاب! میں آپ کو کال بھی نہیں کر سکی۔ پہلے آپا کی موجودگی کی وجہ سے اتنی ٹینشن تھی، بعد میں سو گئی۔ ابھی ابھی اٹھی ہوں اور سب سے پہلے آپ کو فون کیا ہے۔'' اس نے نہایت شرمندگی کے عالم میں سچائی کا اعتراف کیا۔

''کیا کہنے ہیں آپ کی بے نیازی کے۔ شاید اللہ نے عورتوں کو دنیا میں بھیجا ہی اس لیے ہے کہ ہم بے چارے شریف مردوں کو خوار کر سکیں۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''میں نے آپ سے سوری کہا تو ہے۔ بس غلطی ہو گئی، اب کیا کان پکڑوں... تب معاف کریں گے؟'' اس نے فوراً ناز و ادا کا ہتھیار سنبھال لیا۔ اسی وقت رانی ٹرے میں چائے رکھے اندر داخل ہوئی اور اس کے اشارے پر ٹرے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ کر باہر نکل گئی۔ کشور نے ایک نظر میں ہی دیکھ

لیا کہ ٹرے، چائے کی پیالی کے علاوہ اور بھی بہت سے لوازمات سے بھری ہوئی ہے۔ ان لوازمات میں نمکین بسکٹ، شامی کباب اور سینڈوچز نمایاں تھے۔

"کان پکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر کچھ پکڑنا ہی ہے تو ہمارے پاس آکر ہمارا ہاتھ پکڑیں۔" اس بار آفتاب کا لہجہ خاصا شوخ تھا۔

"اچھی فرمائش کی ہے۔ یہ تو پوچھا نہیں کہ یہاں کے حالات کیسے ہیں؟ ہم جیتے ہیں کہ مرتے ہیں... بس فوراً اپنے مطلب کی بات کہہ ڈالی۔" اس نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا اور ٹرے میں سے چائے کی پیالی اٹھا کر اس کا ایک گھونٹ بھرا۔

"اجی ایسے بے خبر بھی نہیں ہیں۔ رات سے آپ کی کوٹھی کے باہر میرے یار نے پہرا بٹھایا ہوا تھا۔ سب معلوم ہے کہ آپ کے بہن بہنوئی اپنے سپوت کے ساتھ صبح کتنے بج کر کتنے منٹ پر روانہ ہوئے تھے۔ باقی کی اطلاعات کوٹھی کے فون پر کال کر کے ان خاتون سے حاصل کرلیں جن کا نام تو رانی ہے لیکن فرائض وہ آپ کی کنیز کے انجام دیتی ہیں۔ ویسے آپ کی کیا بات ہے۔ آپ چاہیں تو سچ مچ کے رانی راجاؤں کو اپنی خدمت پر مامور کر ڈالیں۔ وہ بے چاری تو خیر ہے ہی صرف نام کی رانی۔" آفتاب آج اپنے مزاج کے برخلاف بہت زیادہ شوخی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

شاید ہر انسان کے اندر چاہے وہ کتنا ہی سنجیدہ و بردبار ہو، ایک شوخ وشنگ اور شریر سا گوشہ ہوتا ہے... لیکن بعض لوگ بس کسی کسی کو ہی اس تک رسائی حاصل کرنے دیتے ہیں۔ کشور، آفتاب کے مسندِ دل پر براجمان تھی اور اس پر حکومت کرتی تھی، اس سے بھلا وہ اپنی ذات کا کوئی گوشہ کیونکر پوشیدہ رکھتا؟ کشور بے ساختہ ہی اس کی باتوں پر ہنستی چلی گئی پھر بولی۔ "لکھاری ہیں نا... لفظوں سے کھیلنا آپ سے بڑھ کر بھلا کس کو آسکتا ہے؟"

"لفظوں کے کھلونوں سے بہت کھیل چکے، اب تو بس آپ کی زلفوں سے کھیلنا چاہتے ہیں۔" اسے واقعی لفظوں کا استعمال خوب آتا تھا۔ کشور کے جملے سے لفظ پکڑتے ہوئے اپنی مطلب کی بات کہہ گیا۔

"میں کوشش کرتی ہوں آفتاب! سچ پوچھیں تو میں بھی آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں... بلکہ میں تو چاہتی ہی یہ ہوں کہ ہر دم، ہر پل آپ کے پاس رہوں لیکن حالات آپ کے سامنے ہی ہیں۔ میری بہت زیادہ بے احتیاطی آپ کے لیے بھی پریشانی کا سبب بن سکتی ہے۔ رات میں نے حالات سنبھال لیے تھے۔ ملازمین کو بھی کسی نہ کسی طرح خاموش رکھنے میں کامیاب رہی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کب اباجی کا جاسوس بن جائے۔ ان ملازمین کو جل دے کر ہی مجھے آپ تک پہنچنا ہوگا۔" کشور نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اس کو حالات سے آگاہ کیا۔

"میں آپ کی مجبوری کو اچھی طرح سمجھتا ہوں اور آپ کو بہت زیادہ مشکل میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔ اس وقت یہ فرمائش اس لیے کی ہے کہ آج رات مجھے پیر آباد واپس جانا ہے۔ دوبارہ چھٹی کے دن سے پہلے لاہور نہیں آسکوں گا۔ آپ جانتی ہیں کہ پیر آباد کا اسکول میرے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے اور میں اس سے غیر حاضر رہ کر اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اسی لیے چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کرلوں ورنہ ہم دونوں کو ہی تشنگی رہے گی۔ جہاں تک میرا خیال ہے، دن کے وقت کوٹھی سے نکلنے میں آپ کو بہت زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔" جواباً آفتاب نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد فون کر کے آپ کو آگے کا پروگرام بتاتی ہوں۔ آپ مہتاب بھابی سے کہیں کہ کھانا تیار رکھیں۔ میں نے رات سے اب تک کچھ نہیں کھایا۔" اس نے شعوری طور پر اپنے لہجے میں خوش گواری پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا۔ چلیں، آپ آجائیں تو ساتھ مل کر ہی کھائیں گے۔" آفتاب نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے فون بند کردیا۔ فون بند ہونے کے بعد کشور سوچ میں پڑ گئی۔ کوٹھی سے باہر نکل کر کہیں جانے کے لیے ڈرائیور کو ساتھ لے جانا پڑتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایسی کون سی جگہ جائے جہاں چند گھنٹے گزارنے کا بہانہ بنا کر ڈرائیور کو واپس بھیجا جاسکے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ایک جگہ اس کے ذہن میں آگئی لیکن اس دوران پیالی میں بچ جانے والی چائے ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ پیالی ٹرے میں واپس رکھ کر اس نے رانی کو کمرے میں بلایا۔ "آپ نے تو کچھ نہیں کھایا بی بی! چائے بھی آدھی چھوڑ دی۔" رانی نے اس سے شکوہ کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر بعد میں بڑا مزیدار سا کھانا کھانے والی ہوں۔ تم ذرا میرا وہ فیروزی والا سوٹ تو نکال دو جو میں دو دن پہلے خرید کر لائی تھی۔ اور ہاں، ڈرائیور سے بھی کہہ دینا کہ گاڑی تیار رکھے۔ ہم تھوڑی دیر میں سینٹرل لائبریری تک چلیں گے۔" کشور نے احکامات جاری کیے جنہیں سن کر رانی کو اندازہ ہوگیا کہ کشور ایک بار پھر آفتاب سے ملنے جانے والی ہے۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی

رہی۔ مالکن کو روک بھی نہیں سکتی تھی لیکن کل جو کچھ پیش آیا تھا، اس کے بعد فوری طور پر یہ دوسرا خطرہ مول لینا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

"بس آج کی بات ہے رانی! پھر ہفتے بھر تک میں کوٹھی سے باہر قدم بھی نہیں نکالوں گی۔" کشور نے اس کا تذبذب بھانپ کر خود ہی اسے تسلی دی تو وہ احکامات پر عمل کرنے کے لیے متحرک ہوگئی۔ پندرہ منٹ کے وقفے کے بعد وہ دونوں ڈرائیور کے ساتھ لائبریری کی طرف جا رہی تھیں۔

"لائبریری پانچ بجے تک کھلی رہتی ہے۔ ہم اس وقت تک اندر ہی رہیں گے، تم چاہو تو واپس چلے جاؤ یا باہر ہی رکے رہو۔ میری طرف سے پانچ بجے تک تم آزاد ہو۔" لائبریری کے سامنے اترنے سے قبل اس نے ڈرائیور سے کہا۔ اس بار اسے شک میں پڑنے سے بچانے کے لیے اس نے ایسا رویہ اختیار کیا تھا۔

"میں یہیں رک کر آپ لوگوں کا انتظار کروں گا بی بی!" ڈرائیور نے اپنا فیصلہ سنایا جس پر کوئی بھی ردِعمل ظاہر کیے بغیر وہ رانی کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے چند مخصوص لوگوں کے علاوہ دیگر افراد کو گاڑی لائبریری کی عمارت کے اندر لے جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ وہ دونوں لائبریری کے احاطے میں پہنچیں تو افضل کی گاڑی کو وہاں کھڑے دیکھ کر کشور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آفتاب اور افضل دونوں پرنٹ میڈیا سے تعلق رکھتے تھے۔ افضل چونکہ لاہور میں رہ کر اس میدان میں زیادہ سرگرمِ عمل تھا، اس لیے اس کے تعلقات بھی زیادہ تھے۔ اس کے تعلقات کا ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے آفتاب اس کی گاڑی کو لائبریری کے احاطے کے اندر لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"تم جا کر پانچ بجے تک مزے سے اپنی پسند کی کتابیں پڑھو۔ ہم اتنی دیر میں زندگی کو پڑھ کر آتے ہیں۔" رانی کو اشارے سے لائبریری کی مرکزی عمارت کا دروازہ دکھاتے ہوئے وہ خود گاڑی میں منتظر بیٹھے آفتاب کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اس کے قریب پہنچنے سے قبل ہی کار کا دروازہ کھول چکا تھا۔

"کیا قسمت ہے افضل کی گاڑی اور اس کے گھر کی... جہاں آپ قدم رنجہ فرماتی ہیں۔" اس کے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہی آفتاب نے سرد سی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"گاڑی اور گھر تو آپ کے دم سے اہم ہیں۔ آپ کی خاطر ہی تو ہم آئے ہیں۔" اس نے دل ربا لہجے میں جواب دیا تو آفتاب مسکرا دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے لائبریری سے باہر نکالی۔ لائبریری کے مین گیٹ سے باہر عام پبلک کے لیے مختص پارکنگ ایریا میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا کشور کا ڈرائیور گمان بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ابھی جو گاڑی تیزی سے گیٹ سے باہر نکل کر ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہوئی ہے، اس میں اس کی مالکن بھی سوار ہے۔ احتیاط کے پیشِ نظر کشور نے اپنے چہرے کو چادر کے پلو کی مدد سے مزید چھپا لیا تھا۔

"آپ کے دوست اور ان کی بیگم پتا نہیں میرے بارے میں کیا گمان کرتے ہوں گے۔ اس طرح چوری چھپے نکاح کرنے اور ملنے ملانے والی لڑکیوں کو عموماً لوگ پسند نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں ایسی ہر لڑکی کو کرپٹ سمجھا جاتا ہے۔" گاڑی ذرا آگے بڑھی تو کشور نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اندیشے کو آفتاب سے شیئر کیا۔

"کل آپ کو ان دونوں کے رویے میں ایسی کوئی بات نظر آئی تھی جو آپ یہ سب سوچ رہی ہیں؟" آفتاب نے پل بھر کے لیے اس کے چہرے پر نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ ڈرائیونگ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں لیکن شاید ایسا تو انہوں نے آپ سے دوستی کے احترام میں کیا ہو، دل میں تو وہ کچھ بھی سوچ سکتے ہیں۔" وہ نروس تھی۔

"اس بات کی میں آپ کو گارنٹی دے سکتا ہوں کہ ان کے دلوں میں بھی آپ کے لیے احترام ہے۔ وہ دونوں پڑھے لکھے، سمجھ دار اور روشن خیال لوگ ہیں جو ہر معاملے کو ایک ہی عینک سے نہیں دیکھتے۔ کسی لڑکی کا اپنے گھر والوں سے چھپ کر نکاح کر لینا یقیناً کوئی پسندیدہ فعل نہیں لیکن جہاں بنیادی انسانی حقوق کا استحصال کیا جا رہا ہو، وہاں ایسے ہی رویے اور ردِعمل ظاہر ہوتے ہیں۔ قانون و شریعت دونوں کی رو سے آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ اپنے دل کی رضامندی کے ساتھ کسی بھی شخص کو اپنا رفیقِ حیات منتخب کرسکتی ہیں لیکن یہ حق تسلیم کرنا تو دور کی بات، آپ کے والد محترم نے تو اپنے خود ساختہ اور جاہلانہ رواجوں کی پابندی کرتے ہوئے آپ کو ایک نارمل زندگی سے بھی دور کر رکھا تھا۔ جو لوگ اپنی زیرِ کفالت عورتوں کے ساتھ ایسی زیادتی کرتے ہیں وہ اللہ کی نظر میں بھی یقیناً معتوب ہی ہیں... تو آپ یہ کیسے سوچ سکتی ہیں کہ ایک غلط شخص کے ظلم کے خلاف احتجاج کرنے پر میرا دوست یا اس کی بیوی آپ کو برا سمجھ سکتے ہیں؟"

"بس یونہی ذہن میں خیال آگیا تھا۔ اصل میں ہمارے ہاں عورت کی ضروریات و خواہشات کو سمجھنے کا رواج ہی نہیں ہے نا اس لیے میں ڈر جاتی ہوں۔" آفتاب کا جواب سن کر کشور اداسی بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”مت ڈرا کریں۔ ہمارے درمیان جو رشتہ ہے، اس کا سب سے زیادہ احترام میرے دل میں ہے اور آپ کو بس میرے دل کی پروا ہونی چاہیے۔“ دائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے آفتاب نے اس کا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ کی گرفت میں لیا اور ہونٹوں کے قریب لے جاکر ہاتھ کی پشت پر ایک نرم سا بوسہ لیا۔ کشور کے چہرے پر اس کے اس عمل کے باعث سرخی سی دوڑ گئی۔

”ویسے میں آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں؟ یہ جو افضل اور مہتاب بھابی ہیں، ان کا کیس بھی کچھ ہماری ہی طرح کا ہے اس لیے ان دونوں سے ایک فیصد بھی امید نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ مجھے یا آپ کو غلط سمجھ سکیں۔“ اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت ختم کیے بغیر آفتاب نے انکشاف کیا۔

”مطلب؟“

”مطلب کچھ یوں ہے کہ یہ جو ہماری مہتاب بھابی ہیں، ان کا تعلق ایک پٹھان قبیلے سے ہے۔ بھابی کے والد آکسفورڈ سے ڈگری یافتہ ایک خاصے روشن خیال سردار تھے لیکن یہ روشن خیالی بس اس حد تک تھی کہ انہوں نے بیٹی پر تعلیم کا دروازہ بند نہیں کیا۔ بھابی نے نہ صرف گریجویشن کیا بلکہ ماسٹرز کے لیے بھی اپنے علاقے سے نکل کر اسلام آباد کی یونیورسٹی تک پہنچ گئیں مگر خاندانی رواج کے مطابق ان کی منگنی بچپن میں ہی ان کے چچازاد سے کردی گئی تھی۔ چچازاد ان سے عمر میں تین سال چھوٹا ہونے کے علاوہ تعلیمی میدان میں بھی بہت پیچھے تھا۔ اصل میں اس نالائق اور بگڑے ہوئے سردار زادے کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ظاہر ہے، مہتاب بھابی جیسی پڑھی لکھی اور نازک احساسات رکھنے والی خاتون ایسے شخص کو پسند نہیں کرسکتی تھیں لیکن اپنے والد کے احترام میں اس رشتے سے انکار بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان حالات میں ان کی ملاقات افضل سے ہوئی۔ افضل اپنے ایک اسائنمنٹ کی تیاری کے سلسلے میں قبائلی علاقوں کا دورہ کرتا پھر رہا تھا۔ مہتاب بھابی جو ان دنوں چھٹیوں پر اپنے گھر گئی ہوئی تھیں، افضل کے لیے بہت ہیلپ فل ثابت ہوئیں۔ وہیں دونوں کے دلوں میں پسندیدگی کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ لیکن بھابی نے ایسا کوئی موقع پیدا نہ ہونے دیا کہ اس جذبے کا اظہار ہو پاتا۔ افضل بنا اظہار کیے ہی واپس آگیا لیکن اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ بھابی اسلام آباد یونیورسٹی سے ماسٹرز کررہی ہیں۔ اس نے ان سے رابطہ کیا مگر بھابی نے اپنی منگنی اور روایات کے بارے میں بتاتے ہوئے انکار کردیا۔ افضل اپنی تمام تر کوشش کے باوجود انہیں قائل نہیں کرسکا اور یوں تقریباً سال بھر کا عرصہ گزر گیا۔ بھابی امتحانات سے فارغ ہوکر اپنے گھر واپس پہنچیں۔ ذہنی طور پر آمادہ بھی تھیں کہ کزن سے شادی کرلیں گی لیکن جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ ان کا منگیتر اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہے تو وہ برداشت نہیں کرسکیں۔ منگیتر صاحب کی اپنی ایک ملازمہ کے ساتھ زیادتی کا کیس ان کے سامنے ہی پیش آیا جسے سرداروں نے اپنے اثر رسوخ کے استعمال سے دبادیا... لیکن ظاہر ہے بھابی پر تو سچائی عیاں تھی۔ انہوں نے اپنے والد سے بات کی کہ بے شک ساری زندگی ان کی کسی سے شادی نہ کی جائے لیکن وہ اس بدکردار شخص سے شادی نہیں کریں گی۔ پڑھے لکھے، روشن خیال والد صاحب اس موقع پر روایتی سردار ثابت ہوئے جن کے مطابق مردوں کی ایسی غلطیاں قابلِ گرفت نہیں تھیں۔ بھابی نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے والد کو قائل نہیں کرسکیں گی۔ انہوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی اور جب اپنا رزلٹ معلوم کرنے اسلام آباد گئیں تو افضل سے رابطہ کرکے اس سے پوچھا کہ کیا تم فوری طور پر مجھ سے نکاح کرسکتے ہو؟ افضل صاحب، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق فوراً راضی ہوگئے۔ دونوں کا خاموشی سے نکاح ہوا اور پھر وہ لوگ اسلام آباد سے لاہور شفٹ ہوگئے۔ سرداروں میں سے کوئی گمان نہیں کرسکتا تھا کہ سال بھر پہلے ان کے علاقے میں آنے والا اخباری رپورٹر ان کی لڑکی کو لے اڑا ہے۔ وہ انکل پچو سے کام لیتے ہوئے اپنی لڑکی تلاش کرتے رہے۔ اب تو کافی سال گزر گئے ہیں لیکن مہتاب بھابی کو یقین ہے کہ آج بھی انہیں تلاش کیا جارہا ہوگا۔ اس خوف کی وجہ سے وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتی ہیں۔ نکلتی بھی ہیں تو مکمل پردے میں۔“ آفتاب کے یہ ساری داستان سنانے کے دوران راستہ کٹ بھی گیا اور کشور کو خبر نہیں ہوسکی۔ وہ تو اس وقت چونکی جب گاڑی افضل کے دو منزلہ مکان کے سامنے رکی اور آفتاب نے ہارن دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ کل رات کی طرح اس وقت بھی مہتاب نے مسکراتے ہوئے گرم جوشی کے ساتھ ان دونوں کا استقبال کیا لیکن آج اس کے ساتھ افضل اور بچے موجود نہیں تھے۔

”افضل بھائی اور بچے گھر پر نہیں ہیں کیا؟“ کشور نے اپنائیت کے گہرے احساس کے ساتھ اس سے گلے ملتے ہوئے سوال کیا۔

”افضل اپنے دفتر گئے ہوئے ہیں اور بچے ابھی اسکول سے آئے نہیں ہیں۔ بس آنے ہی والے ہوں گے۔“ مہتاب کا جواب ابھی اس کے منہ میں ہی تھا کہ باہر سے ہارن سنائی دیا۔

”لو آگئے بچے بھی۔ نام لیتے کے ساتھ ہی شیطان حاضر ہیں۔“ مہتاب ممتا بھری محبت کے ساتھ کہتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ پل بھر کے وقفے کے بعد ہی دونوں گول گوتھنے سے بچے کشور کے سامنے موجود تھے۔

”آہا... دلہن آئی ہے۔“ اسے دیکھ کر وہ دونوں خوش ہوگئے۔

”یار! تم لوگ انہیں چچی کہہ لیا کرو، دلہن تو یہ میری ہیں۔ خوامخواہ تمہارے دلہن کہنے سے مجھے جیلسی ہونے لگتی ہے۔“ آفتاب نے چھوٹے والے کو گود میں اٹھاتے ہوئے شوشہ چھوڑا۔

”ٹھیک ہے، ہم انہیں دلہن چچی کہیں گے۔“ بڑے آصف نے مدبرانہ انداز میں فیصلہ سنایا۔

”یعنی دلہن سے دست بردار بہرحال صاحبزادے نہیں ہوں گے۔ آخر اولاد کس شخص کی ہیں۔“ آفتاب نے ہنس کر کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ باقی سب بھی اس کے پیچھے تھے۔ مہتاب نے حسبِ فرمائش مزیدار کھانا تیار کررکھا تھا۔ ہنستے مسکراتے ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کشور کو زندگی میں پہلی بار ایک مکمل گھرانے کا یہ ماحول میسر آیا تھا۔ وہ مستقل مہتاب کے آصف اور واصف نامی دونوں سپوتوں کے ساتھ لگی رہی۔ کھانے کے بعد بچوں کا موڈ نہ ہونے کے باوجود مہتاب نے انہیں آرام کے لیے ان کے کمرے میں بھیج دیا اور خود کچن کی مصروفیت کا بہانہ کرکے منظر سے ہٹ گئی۔ مہتاب کی سمجھ داری کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے وہ دونوں اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں کل رات انہوں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے اولین لمحات بتائے تھے۔ اس کمرے کا فسوں آج بھی اسی طرح قائم تھا۔ اس فسوں خیزی کے حصار میں گھرے وہ پھر ایک دوسرے کو حکایتِ دل سنانے لگے۔ کل اگر پہلی شب عروسی کی بے تابیاں تھیں تو آج جدائی کی دہلیز پر کھڑے دو پیار کے متوالوں کی الوداعی ملاقات کی بے قراری! آفتاب آج پیر آباد واپس چلا جاتا تو ہفتہ بھر بعد ہی آپاتا اور یہ طے نہیں تھا کہ ہفتے بھر بعد وہ دوبارہ ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔ محبت میں اندیشے اور خدشات یوں بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور ان کا تو معاملہ ہی ایسا تھا کہ جب ملتے تھے، چاہتے تھے کہ عمر بھر کا پیار اس ایک ملاقات میں ہی ایک دوجے پر لٹا دیں۔ محبت کی اس رم جھم سے سیراب ہوکر مقررہ وقت پر طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق جب کشور واپس کوٹھی پہنچی تو اس کے دل میں ایک ہی سوال تھا۔ ’خوشی میں بھیگے لمحے اتنی جلدی کیوں گزر جاتے ہیں؟‘

☆☆☆

”تم نے پیک اپ کرلیا سنتھیا؟“

”یس سر!“ لائن کی دوسری طرف موجود ورما کے سوال کا سنتھیا نے مستعدی اور اختصار کے ساتھ جواب دیا۔

”گڈ! پھر کب تک تم لوگ منظر سے ہٹ جاؤ گے؟ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اور تمہاری ٹیم کے انڈر گراؤنڈ ہونے سے پہلے کوئی کارروائی ہو۔ رانا تم لوگوں کی بو سونگھتا پھر رہا ہے۔ اس کے ماتحتوں میں سے بھی ایک آدھ لازماً صورتِ حال سے واقف ہوگا۔ ہماری کارروائی کے جواب میں ایسا کوئی شخص ایکٹیو ہو کہ تم تک نہ پہنچے، اس لیے احتیاط ضروری ہے۔“

”ڈونٹ وری سر! آپ کو جو ایکشن لینا ہے لے لیں۔ ہم لوگ بالکل محفوظ ہیں۔ ارمیلا اور گیتا اپنی ماتا کے ساتھ پہلے ہی ناردرن ایریاز کی طرف نکل چکی ہیں اور میں بھی آج ٹھکانا بدلنے والی ہوں۔“ ورما کی تشویش کے جواب میں اس نے پُرسکون اور سنجیدہ رویہ اختیار کیا۔

”او کے! مجھے بس تمہاری طرف سے ہی گرین سگنل چاہیے تھا۔ میرا کلنگ سیکشن ایکشن کے لیے بالکل تیار ہے۔ رانا کی تمام ایکٹیویٹیز ہماری نظروں میں ہیں۔ میں صرف تم لوگوں کی طرف سے خاموش تھا۔ پہلے ہی ہمارے چند اہم ورکرز مارے جاچکے ہیں اس لیے میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اب تم نے اطمینان دلا دیا ہے تو بس سمجھو کام ہوگیا۔ بہت جلد تمہیں خود بھی نیوز سننے کو مل جائے گی۔“

”بیسٹ آف لک سر!“ ورما کی بات سن کر سنتھیا نے اس کے ارادوں کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ درحقیقت اس خواہش میں نیک نیتی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بس اقتدار و اختیار کی وہ ہوس تھی جو دوسروں کو بے امنی اور خوف میں مبتلا کرکے ہی تسکین پاتی تھی۔

”تھینکس!“ ورما نے سپاٹ سے لہجے میں سنتھیا سے کہتے ہوئے کال منقطع کردی۔ اس کے فون بند کرتے ہی سنتھیا نے بھی ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور میز پر رکھا اپنا ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ میز پر اب ٹیلی فون سیٹ کے علاوہ کوئی شے موجود نہیں تھی بلکہ پورے دفتر میں فرنیچر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ لوگ اپنا تمام ضروری اور غیر ضروری سامان بہت خاموشی سے یہاں سے ہٹا چکے تھے۔ دفتر کی بہت باریک بینی کے ساتھ صفائی بھی کردی گئی تھی کہ اگر کوئی کھوج لگاتا ہوا یہاں تک پہنچ بھی جائے تو اسے کوئی کلیو نہ مل سکے۔ خصوصاً فنگر پرنٹس کے معاملے میں انہوں نے بے

حد احتیاط برتی تھی۔ سنتھیا تو اس معاملے میں اتنی محتاط تھی کہ ہمہ وقت ہاتھوں کے لیے باریک دستانوں کا استعمال کرتی تھی۔ لباس کی میچنگ سے تیار کیے جانے والے یہ دستانے کسی کو شک میں مبتلا کرنے کے بجائے اس کی شخصیت کو دلکش تاثر دیتے تھے۔ عمر کے کئی سنہری سال گزارنے کے بعد ادھیڑ عمری کی دہلیز پر قدم رکھ چکنے والی سنتھیا کی شخصیت میں ایسا وقار تھا جو لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھارتا تھا۔ اس تاثر کو قائم رکھنے میں اس کے لباس اور رکھ رکھاؤ کا بڑا دخل تھا۔ اس وقت بھی اس نے فان کلر کا ایک خوب صورت لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ پر گولڈن کلر کی نہایت نازک سی بیل کڑھی ہوئی تھی۔ لباس کی مناسبت سے اس نے فان کلر کے ہی گولڈن بیچ والے خوب صورت دستانے پہن رکھے تھے۔ کانوں میں موجود سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس اور گلے میں پڑی نازک سی چین بھی اس کے لباس سے ہم آہنگ تھی۔ اپنی شخصیت کے اس گریس سے واقف سنتھیا نپے تلے قدموں سے چلتی ہوئی دفتر سے باہر نکلی اور بیرونی دروازہ لاک کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ جس عمارت میں اس کا دفتر موجود تھا، وہ علاقے میں موجود دیگر کمرشل بلڈنگز کی طرح کچھ ایسے طرز پر تعمیر کی گئی تھی کہ دن کے وقت بھی وہاں اچھا خاصا اندھیرا رہتا تھا اور مصنوعی روشنیوں کے بغیر گزارہ ممکن نہیں تھا۔ آج سیڑھیوں کو روشن رکھنے والے بلبس کی سپلائی لائن میں شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے سیڑھیاں تاریک پڑی تھیں۔ اس تاریکی نے سیڑھیاں طے کرتے سنتھیا کے قدموں میں کسی قسم کی ڈگمگاہٹ پیدا نہ ہونے دی۔ وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھی جس کا ذہن ہر شے کا حساب کتاب رکھنے کا عادی تھا۔ اسے سیڑھیوں پر آنے والا ہر موڑ اور اس کے قدمچوں کی تعداد ازبر تھی چنانچہ وہ تاریکی میں بھی پورے اطمینان سے چلتی ہوئی گراؤنڈ فلور تک پہنچ گئی اور وہاں موجود ایک اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر کا رخ کیا۔ اس دفتر کا مالک درحقیقت اس پوری بلڈنگ ہی کا مالک تھا جو اپنے کاروباری مزاج کی وجہ سے بلڈنگ میں قائم ڈھیروں دفاتر کے کرائے سے حاصل ہونے والی آمدنی کے باوجود مزید کمائی کے لیے یہ ایجنسی کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ سنتھیا کو اپنے دفتر میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے خوش گوار مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ قبل از وقت بغیر کسی مطالبے کے پابندی سے کرایہ ادا کرنے والی سنتھیا کو وہ کافی پسند کرتا تھا۔

''تشریف رکھیں میڈم! فرمائیے آپ نے آج کیسے یہاں آنے کی زحمت کی؟'' سنتھیا صرف کرائے کی ادائیگی کے لیے ہی اس کے دفتر کا رخ کرتی تھی اور کرایہ وہ دو دن پہلے ہی دے چکی تھی اس لیے اسے سامنے پا کر وہ کچھ تشویش محسوس کر رہا تھا۔

''میں بیٹھوں گی نہیں مسٹر رحمت! میں بس آپ کو آپ کے دفتر کی یہ چابیاں واپس کرنے آئی تھی۔ میں اپنا میرج بیورو بند کر رہی ہوں اس لیے مجھے مزید آپ کے آفس کی ضرورت نہیں ہے۔'' سنتھیا نے اپنے ہینڈ بیگ سے دفتر کی چابی نکال کر اس کے سامنے رکھی۔

''لیکن کیوں؟ اتنی اچانک آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا؟'' عمارت کا مالک حیران ہوا۔

''اصل میں بات یہ ہے کہ میرے ساتھ کام کرنے والی دونوں لڑکیاں ملازمت چھوڑ کر جا چکی ہیں اور اکیلے کام سنبھالنا میرے بس میں نہیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی کام سمیٹ کر ریٹائرمنٹ لے لوں۔ میرے بچے بہت عرصے سے اصرار کر رہے تھے کہ میں ان کے پاس آ کر رہوں۔ اب میں اپنے بچوں کے ساتھ رہ کر آرام سے لائف انجوائے کروں گی۔'' سنتھیا نے اسے تفصیلی جواب دیا اور مڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس بار عمارت کے مالک نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کا دفتر خالی ہو چکا تھا اور ایسی صورت میں کہ دفتر کا کرایہ بھی ادا کیا جا چکا تھا اور ایڈوانس کی رقم کے لیے بھی کوئی تقاضا نہیں ہوا تھا، وہ مکمل طور پر فائدے میں تھا۔ بس اب اسے خالی ہونے والے دفتر کے لیے نئی پارٹی تلاش کرنی تھی جو کہ ایسا خاص کام نہیں تھا۔

سنتھیا عمارت کے مالک کے تمام احساسات کو اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن اسے رقم کی پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ مشن اہم تھا جس پر وہ اتنے برسوں سے کام کر رہی تھی۔ اس وقت بھی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد اس نے ایک خالی ٹیکسی ہائر کی اور ٹیکسی والے کو دس منٹ کی مسافت پر واقع ایک علاقے کا نام بتا کر وہاں چلنے کا حکم دیا۔ اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچ کر اس نے ایک پبلک کال آفس کا رخ کیا۔ خود کو ٹریس ہونے سے بچانے کے لیے اہم کالز کے لیے ان پی سی اوز کا استعمال سب سے مناسب رہتا تھا۔

''ایس جے بول رہی ہوں۔ کام ہونے والا ہے۔ میں ہدایت کے مطابق کچھ عرصے کے لیے انڈر گراؤنڈ ہو رہی ہوں۔'' مطلوبہ نمبر پر رابطہ قائم ہونے پر اس نے رپورٹ پیش کی۔

''او کے! پی اے کے بارے میں رپورٹ کرو۔ وہاں کیا پچویشن ہے؟'' دوسری طرف سے حکم دیا گیا۔

''وہاں سب کنٹرول میں ہے۔ پی اے کا لارڈ تین دن بعد نیویارک کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔'' پی اے سے مراد پیر آباد اور لارڈ کا مطلب چودھری افتخار تھا۔ سوال کرنے والے کو اطلاع دیتے ہوئے اس نے چودھری افتخار کی روانگی کا وقت اور فلائٹ نمبر بھی بتا دیا۔

''او کے! ہم اسے سنبھال لیں گے۔ بس تم پی اے کے معاملات پر نظر رکھو۔'' دوسری طرف سے حکم صادر کیا گیا اور لائن کٹ گئی۔ سنتھیا اپنے مخصوص باوقار انداز میں چلتی ہوئی پی سی او سے باہر نکلی اور ایک دوسری ٹیکسی کو اشارے سے روک کر اس میں سوار ہو گئی۔ اس کے بتائے ہوئے پتے کی طرف منہ مانگے داموں پر ٹیکسی دوڑانے والے ٹیکسی ڈرائیور کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ اس وقت وہ موساد کی اسپیشل ایجنٹ سنتھیا کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ بے چارے ٹیکسی ڈرائیور کی تو خیر حیثیت ہی کیا تھی۔ خود کو بہت زیادہ ذہین اور قابل سمجھنے والے ''را'' کے سورما بھی کبھی اپنے درمیان موجود سنتھیا کی حقیقت نہیں جان سکے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کی بہ ظاہر وفادار ایجنٹ سنتھیا درحقیقت ڈبل ایجنٹ ہے جس کی اصل وفاداریاں ''موساد'' کے ساتھ وابستہ ہیں۔

☆☆☆

کال گرل جولی اور ویٹر کی موت نے سجاد رانا کو بری طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہ ظاہر حادثہ معلوم ہونے والی یہ اموات درحقیقت سوچے سمجھے قتل ہیں، وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ویٹر کی روڈ ایکسیڈنٹ میں موت کی اطلاع تو اسے فوری طور پر مل گئی تھی۔ بہ ظاہر یہ ایک حادثہ تھا جو کسی بھی شخص کے ساتھ پیش آ سکتا تھا لیکن جولی سے اپنی ملاقات کے چند گھنٹوں بعد ہی اس حادثے کی اطلاع سن کر وہ چونک گیا اور فوری طور پر اپنے دو ماتحتوں کو جولی کے اپارٹمنٹ کی طرف دوڑایا۔ وہاں جانے والوں نے پہلے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ جولی ہوٹل سے اپنے اپارٹمنٹ پہنچنے کے بعد دوبارہ باہر نہیں نکلی ہے اس بات کا اسے علم تھا۔ چنانچہ گھنٹی کا ردِعمل ظاہر نہ ہونے پر یہی خیال آیا کہ اندر موجود جولی یقیناً کسی حادثے سے دوچار ہو چکی ہے اور دروازہ کھولنے کے لیے آنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ دونوں ماتحتوں کو اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے دروازے کا لاک توڑ کر اندر جانا پڑا۔ جولی کا کشادہ اور خوب صورت اپارٹمنٹ مکمل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیڈ روم میں انہیں جولی اس احال میں نظر آئی کہ اس کے ہونٹوں پر ابدی خاموشی تھی۔ زندگی کی رمق سے عاری اس کا جسم موت کی اذیت سے گزرتے ہوئے کچھ بے ترتیب ضرور ہوا تھا لیکن اس کے بیڈ روم سمیت پورے اپارٹمنٹ میں کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آ رہی تھی۔ دودھ کا خالی گلاس اور جولی کے ہاتھ سے لکھا خودکشی کا خط فوراً ہی ان کی نظروں میں آ گیا تھا جسے اپنی کسٹڈی میں لینے کے بعد انہوں نے بعد میں سجاد رانا تک پہنچا دیا تھا۔ گلاس میں بچ جانے والے دودھ کے نمونے اور جولی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ظاہر کر دیا تھا کہ اس کی موت زہر خورانی کے باعث ہی ہوئی ہے۔ جولی کے پورے جسم پر ایسا کوئی نشان یا زخم وغیرہ نہیں ملا تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا کہ اسے زبردستی زہر ملا دودھ پینے پر مجبور کیا گیا ہے۔ دودھ کے گلاس پر ملنے والے فنگر پرنٹس بھی صرف جولی کے تھے۔ پولیس کے ایکسپرٹس پورے اپارٹمنٹ میں سے جولی کے سوا کسی دوسرے شخص کے فنگر پرنٹس حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ کسی قسم کی بے ترتیبی سے عاری اپارٹمنٹ، جولی کے بے داغ جسم اور خودکشی کے خط کی موجودگی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ واقعی خودکشی کا کیس ہے لیکن سجاد رانا جانتا تھا کہ اس نے جن لوگوں کی دُم پر پیر رکھنے کی کوشش کی ہے، وہ ایسے ہی بے داغ جرائم کے ماہر ہیں۔ جولی اور ویٹر کی موت نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ بالکل صحیح خطوط پر کام کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی جو بری بات ہوئی تھی، وہ یہ تھی کہ مجرم ہوشیار ہو گئے تھے اور انہوں نے وہ نشانات مٹا ڈالے تھے جن پر چل کر کوئی ان تک پہنچ سکتا۔ اس سے قبل گرو الماس اور ایک دوسرے مشکوک خواجہ سرا کو بھی پولیس کسٹڈی میں ہلاک کر کے اس کی راہیں مسدود کی گئی تھیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ جتنا آگے بڑھتا ہے، دشمن اسے اس سے دگنا پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ یہ ناکامی اس کے سینے میں بھڑکتی آگ پر تیل کے چھینٹوں کے مانند اثر کرتی تھی۔ ڈی آئی جی کی پوسٹ پر تعینات ہوتے ہوئے وہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام تھا۔ شینا کی سوختہ لاش ہر پل اس کی نظروں کے سامنے گھومتی رہتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی نوعمر بیٹی کی لاش اس سے اپنے قاتلوں کا مطالبہ کر رہی ہو۔ شینا کی دنیا سے جانے کی عمر تو نہیں تھی... ابھی تو اس پر پوری طرح شباب بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تو کچی کلی کے مانند تھی جسے کھلنے سے پہلے ہی توڑ کر مسل دیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کی انتہا پسندی اور جنون نے جیتی جاگتی شینا کو ایک پتھر کی مورتی کی بھینٹ

چڑھا کر زندگی سے محروم کر دیا تھا۔

شینا کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی خواہش میں وہ جنون کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا اور اس کا رویہ نارمل نہیں رہا تھا۔ اسے اپنی اس ایبنارملٹی کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس پر بھی ذمے داریوں کا ایک کوہ گراں تھا لیکن شینا کی موت کسی طور اسے بھولتی نہیں تھی۔ اس وقت بھی اسے ایک طے شدہ میٹنگ میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ روز بہ روز بڑھتی دہشت گردی اور امن و امان کی خراب صورتِ حال پر غور و فکر کے لیے وزیرِ اعلیٰ کی طرف سے بلائی گئی اس میٹنگ کے بعد حسب معمول عوام کے لیے ایک پریس نوٹ جاری کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جائے گا، یہ جاننے کے باوجود اسے میٹنگ میں شرکت تو کرنی ہی تھی۔ وہ مقررہ وقت پر اپنے دفتر سے نکلا۔ گاڑی ڈرائیور سمیت بالکل تیار تھی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک گن مین بیٹھا تھا۔ آج بھی وہ صرف ایک ڈرائیور اور گن مین کے ساتھ میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ اس کے گھٹنوں پر ایک فائل دھری تھی جس کے مندرجات کا وہ آنکھوں پر موجود سنہری کمانی کی عینک سے مطالعہ کر رہا تھا۔ سبک رفتاری سے چلتی گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رکی تو اس نے فائل پر سے نظر ہٹا کر باہر کے منظر پر دوڑائی۔ ٹریفک سگنل کے قریب کھڑا ایک نوعمر ہاکر لڑکا آواز لگا لگا کر اخبار بیچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کالعدم تنظیم کی طرف سے مزید اسکولوں کو بم سے اڑانے کی دھمکی!" اسکول کی دیوار سے ملحق کچرا کنڈی میں رکھے گئے بم ... دھماکے سے ہلاک ہونے والے معصوم بچوں کا ذکر ابھی اخباروں کی سرخیوں میں زندہ تھا۔ اس نے ہاکر کے ہاتھ میں موجود اخباروں کی طرف سے توجہ ہٹائی اور ایک بار پھر فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی لمحے سگنل گرین ہوا اور اس کی گاڑی حرکت میں آ گئی۔ اس سگنل سے آگے دائیں جانب مڑ کر اس کی گاڑی جس روڈ پر چلی، وہاں ٹریفک کا بہاؤ قدرے کم تھا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے ہی ایک سفید رنگ کی مارگلا اور سیونٹی موٹر سائیکل بھی اسی روڈ پر مڑی تھیں۔ سفید مارگلا میں تین افراد بیٹھے تھے جبکہ سیونٹی موٹر سائیکل پر دو افراد تھے۔ پہلے سیونٹی والے نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار بڑھائی اور درمیانی فاصلہ پاٹ کر سجاد رانا کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل گاڑی کے بائیں جانب رکھی ہوئی تھی۔ اس جانب بیٹھا ہوا گن مین ساتھ چلتی موٹر سائیکل کو دیکھ کر الرٹ ہوا۔ موٹر سائیکل سواروں کے ہاتھ خالی نظر آنے کے باوجود اس کا گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنا اسے کھٹک رہا تھا۔ اس نے اپنی گن پہلے کے مقابلے میں اور بھی نمایاں کی تاکہ موٹر سائیکل سوار ان کی گاڑی سے دور ہٹ جائیں۔ اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت نہیں ہوئی۔ کارگر تو ان کی ترکیب تھی جو گاڑی میں موجود اکلوتے گارڈ کی توجہ بٹانا چاہتے تھے۔ گارڈ موٹر سائیکل کی طرف متوجہ رہا اور اسے خبر بھی نہیں ہو سکی کہ کب سفید مارگلا نے اپنی رفتار بڑھائی اور سجاد رانا کی گاڑی کے دائیں پہلو میں پہنچ کر اس پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ سجاد رانا گاڑی میں دائیں جانب ہی بیٹھا تھا۔ پہلے برسٹ میں ہی اس کے جسم میں کئی گولیاں اتر گئیں۔ گولیوں کا نشانہ بننے والا وہ تنہا نہیں تھا۔ ڈرائیور اور گن مین بھی اس اندھا دھند فائرنگ کی زد میں آئے تھے۔ سفید مارگلا اور سیونٹی سیکنڈوں میں اس ساری کارروائی کو نمٹا کر آگے بڑھ چکی تھیں۔ متوجہ ہونے والے جب تک متوجہ ہوئے، منظر میں خون سے نہائے ہوئے تین بے جان انسانی جسموں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ زندگی سے محروم ان جسموں سے بہتے خون کی سرخی سے اخبارات کی تازہ خبروں کی سرخیاں لگنی تھیں۔

☆☆☆

"کیا خبریں ہیں عبدالمنان؟"

"باقی سب کچھ تو معمول کے مطابق ہی جا رہا ہے سر... بس پیر آباد میں لگنے والے سالانہ میلے کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ فی الحال اسے ملتوی کر دیا گیا ہے۔"

"وہ کیوں بھئی؟" اس اطلاع کو سن کر شہریار چونکا۔

پیر آباد کے میلے کے ذکر کے ساتھ ہی اسے چودھری کی وہ بھیانک سازش بھی یاد آ گئی تھی جب بہزاد شاہ کے ولیمے کے موقع پر چودھری نے اس کے کھانے میں کچھ شامل کروا دیا تھا اور پھر اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی ڈاکٹر ماریا کے ساتھ شرمناک تصویریں اتاری گئی تھیں۔ چودھری کا ارادہ تھا کہ تصویروں کو میلے کے موقع پر منظرِ عام پر لانے کی دھمکی دے کر اس سے اپنے مطالبات تسلیم کروا لے گا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی نکلی کہ وہ ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے چودھری کے ڈیرے کی خفیہ تجوری سے وہ تصویریں نکال لانے میں کامیاب ہو گیا اور چودھری کو منہ کی کھانی پڑی ورنہ شاید وہ چودھری کی اس سازش میں پھنس کر اس کے سامنے مجبور ہو ہی جاتا۔

"چودھری افتخار عالم شاہ صاحب اپنے برخوردار سے ملاقات کے لیے نیویارک تشریف لے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے، ان کی پیر آباد میں غیر موجودگی کے دوران کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ میلوں ٹھیلوں سے لطف اندوز ہو سکے، چنانچہ جب چودھری صاحب نیویارک سے شغل میلہ کر کے واپس

آئیں گے تو پیر آباد کے سالانہ میلے کے بارے میں غور و خوض کیا جائے گا۔"

عبدالمنان نے جس طنزیہ لہجے میں جواب دیا، اسے سن کر شہریار مسکرا دیا پھر مسکراہٹ چھپاتے ہوئے بولا۔ "ویسے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ چودھری صاحب آں جناب کو اتنی ایمرجنسی میں بیٹے سے ملاقات کی کیونکر سوجھی؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ویسے تو چودھری صاحب ٹھہرے پیروں کے خاندان کے چشم و چراغ... کیا خبر خواب میں انہیں بشارت ہوئی ہو کہ بیٹے سے ملنے نیویارک چلے جائیں، سو اب وہ بوریا بستر سمیٹ کر وہاں جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔" عبدالمنان کے جواب پر شہریار ایک بار پھر مسکرا اٹھا۔ یہ وہی عبدالمنان تھا جو اس کی یہاں آمد کے پہلے دن مکمل طور پر چودھری کے دباؤ میں نظر آتا تھا لیکن جوں جوں اسے یہ معلوم ہوتا گیا کہ نیا اے سی پچھلوں سے بہت مختلف ہے اور کسی چودھری وغیرہ کے دباؤ میں نہیں آنے والا، اس کی صلاحیتیں اور چودھری کے خلاف ناپسندیدگی کھل کر سامنے آنے لگی۔ اب وہ نہ صرف چودھری کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرتا تھا بلکہ شہریار کے لیے بھی اچھا معاون ثابت ہو رہا تھا۔

"چلو جانے دو اپنے چودھری صاحب کو نیویارک۔ وہ بھی وہاں کچھ دن عیش کر لیں گے اور یہاں بھی ذرا سکون رہے گا۔" شہریار نے تبصرہ کرتے ہوئے اپنے سامنے رکھی فائل کھول لی۔ یہ اس بات کا بھی اشارہ تھا کہ اب وہ مزید گپ شپ لگانے کے موڈ میں نہیں ہے۔

"سر! آج سے مشابرم خان نے دوبارہ ڈیوٹی جوائن کر لی ہے۔ باہر آیا بیٹھا ہے۔ آپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کر رہا تھا۔" اس کا انداز سمجھنے کے باوجود عبدالمنان نے یہ اطلاع دینا ضروری سمجھا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم فوراً اسے اندر بھیج دو۔ میں اس سے اس کا حال چال ہی پوچھ لوں گا۔" شہریار نے اس کے اندازے کے مطابق مشابرم خان کے لیے ملاقات کی اجازت دے دی۔ مشابرم خان بے شک ایک معمولی ڈرائیور تھا لیکن اس کی جاں نثاری کی ادا اسے اس بات کی مستحق بناتی تھی کہ اس کے ساتھ خصوصی سلوک روا رکھا جائے۔ عبدالمنان اس کی طرف سے رضامندی پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے دو منٹ بعد ہی مشابرم خان نے دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔

"آؤ بھئی مشابرم خان... بیٹھو۔ تمہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ معاف کرنا بھئی، میں مصروفیات کی وجہ

📢 قارئین متوجہ ہوں 📢
قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

سے دوبارہ تمہیں دیکھنے اسپتال نہیں آ سکا لیکن تمہاری کمی میں نے بہت محسوس کی۔" مشابرم خان کو اندر آنے کی اجازت دیتے ہوئے وہ خوش مزاجی سے بولا۔

"آپ نے مجھے یاد کیا، یہ کافی ہے سر! آپ کے اسپتال نہ آنے کا مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں۔ آپ فون پر میری خیریت پوچھ لیتے تھے تو ہی میں خوش ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھا، وہ تو آپ نے اجازت نہیں دی ورنہ میں بہت پہلے ہی ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا۔" مشابرم خان نے عاجزی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"اور سناؤ، وہاں کاندے میں کیا حال ہے؟ تمہاری بات تو ہوتی ہو گی نا اپنے بھائی اکرم خان سے؟" یہ سوال کرتے ہوئے شہریار نے بہ طور خاص کسی کا نام نہیں لیا تھا لیکن اس کی نظروں میں ماہ بانو کا سراپا ضرور گھوم گیا تھا۔ عام سے گھرانے سے تعلق رکھنے والی وہ چھوٹی سی لڑکی جانے کیوں اسے بھولتی نہیں تھی۔

"ادھر بات ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔ آپ نے مجھے موبائل خرید کر دیا ہے لیکن اکرم خان تو بس اسی وقت فون کر سکتا ہے جب اسکردو میں ہوتا ہے۔ ایک ہفتے پہلے جب اس نے مجھے فون کیا تھا تو بتایا تھا کہ ماموں کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیے وہ لوگ ہوشے جا رہے ہیں۔ وہ لڑکی ماہ بانو بھی ساتھ ہی جانے والی تھی۔ اکرم خان بہت تعریف کر رہا تھا ماہ بانو کی۔ کہتا تھا، ماہ بانو بالکل بیٹی کا موافق اماں کا خیال رکھتا ہے۔ گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا ہے اس نے۔" مشابرم خان نے اسے رپورٹ دی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے نہ جانے کب تک وہاں رہنا پڑے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ وہ وہاں اپنا دل لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ تمہاری اب اکرم خان سے بات ہو تو میری طرف سے پوچھ لینا کہ اگر ماہ بانو کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔ یہاں سے بھجوا دی جائے گی۔" اس نے ماہ بانو کی مصروفیات پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے پیغام بھی نوٹ کروایا۔

''ٹھیک ہے سر! میں کہہ دوں گا۔'' مشابرم خان نے جواب دیا اور پھر یوں حرکت کی جیسے کرسی سے اٹھنے والا ہو لیکن مزید کچھ کہنے کی خواہش میں اٹھ بھی نہ رہا ہو۔

''کیا بات ہے مشابرم خان... کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' شہریار نے اس کی کشمکش کو بھانپتے ہوئے سوال کیا۔

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا سر کہ آپ کی گاڑی تو میں ہی چلاؤں گا نا؟''

''بالکل بھئی، وہ تو مجبوری تھی ورنہ میں خود بھی تمہیں ساتھ رکھ کر زیادہ آرام محسوس کرتا ہوں۔'' شہریار نے اسے تسلی دی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مشابرم خان اپنی عدم موجودگی میں اس کی گاڑی چلانے والے ڈرائیور کی وجہ سے پریشان ہے۔ اس کے اور مشابرم خان کے درمیان جو ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی، اس کے باعث اب مشابرم خان مسلسل اسی کے ساتھ رہنے کا خواہش مند تھا۔

''بہت بہت شکر...'' مشابرم خان کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔

''سوری سر!'' وہ شہریار کے مقابل بیٹھ کر موبائل کے بج اٹھنے پر شرمندہ ہو گیا۔

''کوئی بات نہیں... کال اٹینڈ کر لو۔'' شہریار نے اجازت دی تو اس نے قمیص کی جیب میں رکھا موبائل نکالا۔

''یہ تو اسکردو کا نمبر ہے۔'' مشابرم خان آہستہ سے بولا اور کال اٹینڈ کر لی۔ شہریار اس دوران بہ ظاہر اپنے سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا لیکن لاشعوری طور پر اس کے کان مشابرم خان کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

''کون؟ گل خان بات کر رہا ہے؟ ہاں ہاں یارا! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم اکرم خان کے دوست ہو، پر یہ بتاؤ کہ اکرم خان کے بجائے تم نے کیوں فون کیا ہے؟'' وہ کال کرنے والے کو شناخت کر لینے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اب قدرے تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ دوسری طرف سے یقیناً اس کے سوال کا جواب دیا جانے لگا۔ شہریار کو دوسری طرف کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن مشابرم خان کی پُرتشویش ''کب'' اور ''کیسے'' ضرور سنائی دی تھی جسے سننے کے بعد اس نے مشابرم خان کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہاں بے تحاشا ضبط کے باوجود زلزلے کے سے آثار تھے۔ وہ بالکل خاموشی سے دوسری طرف موجود شخص کی بات سن رہا تھا لیکن اس کے بشرے سے ظاہر تھا کہ کوئی بہت بری خبر سنائی گئی ہے۔ اس کی اس کیفیت پر شہریار خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ فون کرنے والا اسکردو سے بول رہا تھا اور اکرم خان کا دوست تھا۔ مشابرم خان کی جو حالت تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اس کے گھر سے متعلق ہی کوئی بری خبر سنائی جا رہی ہے۔ اس کے گھر میں آج کل ماہ بانو بھی مقیم تھی۔ چنانچہ شہریار کا ذہن لامحالہ اس کی طرف بھی چلا گیا تھا کہ کہیں وہ کسی پریشانی میں نہ ہو۔ ماہ بانو کی پریشانی اور تکلیف کا خیال آتے ہی اس کا دل خودکار انداز میں تشویش میں مبتلا ہو جاتا تھا۔

''خیریت تو ہے خان؟ کیا کوئی پریشانی کی خبر ہے؟'' مشابرم خان کال سے فارغ ہوا تو اس نے دریافت کیا۔

''بہت بری خبر ہے سر! میرے بھائی اکرم خان کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

''وری سیڈ... یہ واقعہ کب اور کیسے پیش آیا؟'' شہریار نے دلی ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔

''یہ کل کی بات ہے سر! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرے گھر والے اور ماہ بانو شادی میں شرکت کے لیے ہوشے گئے تھے۔ ہوشے سے واپسی پر کچھ مسلح لوگوں نے ان کی جیپ کو گھیر کر ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ اکرم خان ان لوگوں سے مقابلہ کرنے کھڑا ہو گیا چنانچہ انہوں نے اکرم خان کو گولی مار دی اور ماہ بانو کو اپنے ساتھ لے گئے۔ جاتے جاتے وہ جیپ کے ٹائر بھی ناکارہ کر گئے تھے اس لیے ڈرائیور اکرم خان کو اسپتال بھی نہیں پہنچا سکا۔ دو گھنٹے بعد جب ایک دوسری جیپ وہاں سے گزری تو اس جیپ والوں نے مدد کی لیکن اس وقت تک اکرم خان مر چکا تھا۔ اس کی لاش اسکردو کے دوغانے اسپتال میں رکھی ہے۔ میری ماں جس کا صدمے سے دماغ الٹ گیا ہے، وہ بھی وہیں داخل ہے۔ اکرم خان کے دوست نے بڑی مشکل سے میرا نمبر تلاش کرنے کے بعد ابھی مجھے حادثے کی اطلاع دی ہے۔'' مشابرم خان نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس کا حوصلہ اور ضبط قابلِ رشک تھا۔ فرطِ غم سے چہرہ سرخ پڑ جانے کے باوجود یہ سب بتاتے ہوئے ایک بار بھی اس کی آواز بھرائی نہیں تھی۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ میں نے ماہ بانو کو حفاظت کے خیال سے اتنی دور بھجوایا تھا۔ اس کے دشمن اس کی بو سونگھتے ہوئے وہاں بھی پہنچ جائیں گے، مجھے بالکل امید نہیں تھی۔'' شہریار تاسف سے بڑبڑایا اور انٹرکام اٹھا کر عبدالمنان کو اپنے آفس میں آنے کا حکم دیا۔

''عبدالمنان! فوری طور پر اسکردو جانے والی پہلی فلائٹ میں دو سیٹیں بک کرواؤ۔ میں اور مشابرم خان ابھی یہاں سے نکل رہے ہیں۔ ہمیں یہاں سے لاہور اور لاہور سے بائی ائر اسلام آباد پہنچنے میں جتنا وقت لگے گا، اس

دوران یقیناً تم یہ سارا انتظام کرلو گے۔"

"او کے سر! میں ابھی ٹرائی کرتا ہوں۔" عبدالمنان مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ اس نے شہریار سے یہ پوچھنے کی قطعی جرأت نہیں کی تھی کہ اتنی اچانک اسکردو جانے کا پروگرام کیوں بن گیا؟ البتہ اسے یہ ضرور سمجھ آگیا تھا کہ جو بھی بات ہے، اس کا تعلق لازماً ماہ بانو سے ہی ہے۔

"صرف ٹرائی کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے ہنڈریڈ پرسنٹ شیورٹی چاہیے۔ ماہ بانو اغوا کرلی گئی ہے اور اکرم خان ہلاک ہو گیا ہے۔ ہمیں اس معاملے کو دیکھنے کے لیے فوراً اسکردو پہنچنا ہوگا۔ اکیلے مشابرم خان کے جانے سے بات نہیں بنے گی اس لیے میں ساتھ جانا چاہتا ہوں۔" شہریار کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ جذبات میں اس کی آواز کافی بلند ہوچکی ہے۔

"او کے سر! میں انتظام کرتا ہوں۔" اصل صورتِ حال جان کر مستعد سا عبدالمنان اور بھی پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا باہر کی طرف دوڑا۔

"تمہیں اپنی جو ضروری چیزیں وغیرہ ساتھ رکھنی ہوں، وہ لے لو خان! ہم دس پندرہ منٹ میں یہاں سے نکل جائیں گے۔" اس نے مشابرم خان کو ہدایت دی۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد خود وہ اپنے بنگلے کا نمبر ملا کر بیٹ مین کو اپنا سامان تیار کرنے کا حکم دینے لگا۔ حکم دینے کے بعد اس نے فون بند ہی کیا تھا کہ عبدالمنان کچھ گھبرایا ہوا سا اندر آیا۔

"ایک بیڈ نیوز ہے سر!" اس نے اپنی گھبراہٹ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے شہریار سے کہا۔

"کیا ہوا... سیٹ نہیں ملی یا موسم خراب ہونے کی وجہ سے آج اسکردو کے لیے کوئی فلائٹ نہیں جارہی؟" اس نے اسکردو جانے کے خواہش مندوں کو درپیش دو عمومی مسائل کے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے سوال کیا۔

"اس کام کے لیے تو میں ابھی فون کر ہی نہیں سکا سر! یہاں سے اپنے کمرے میں جاتے ہی میرے پاس لاہور سے ایک فون کال آگئی۔ اطلاع ملی ہے کہ ڈی آئی جی سجاد رانا کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں نے اس خبر کی تصدیق کرلی ہے۔ نیوز چینلز پر بھی اس وقت یہی بریکنگ نیوز چل رہی ہے۔" عبدالمنان نے جلدی جلدی بولتے ہوئے اسے بتایا تو وہ ایک پل کے لیے تو ساکت ہی رہ گیا۔ اعلیٰ افسران، سیاست دانوں اور ممتاز سماجی و دینی شخصیات کو دہشت گردی کا نشانہ بنانا کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ آئے دن نیوز چینلز دہشت گردی کی ایسی کسی نہ کسی کارروائی کی خبریں نشر کرتے ہی رہتے تھے لیکن اپنی اتنی قریبی ہستی کے بارے میں یہ خبر سن کر حواس کو قائم رکھنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ کہنے کو سجاد رانا اس کا کزن تھا لیکن ان کی حیثیت اس کے نزدیک بڑے بھائی جیسی تھی۔ بڑا بھائی بھی ایسا جس نے بھائی سے بڑھ کر باپ کا کردار نبھایا ہو۔ جب وہ یتیم ہوکر اپنے ماموں لیاقت رانا کی زیرِ نگرانی آیا تھا تو لیاقت رانا کے ساتھ ساتھ سجاد رانا نے بھی اس پر اپنی بے تحاشا محبت لٹائی تھی۔ قدم قدم پر وہ اس کے کام آیا تھا اور اب اسے اطلاع دی جارہی تھی کہ وہ سجاد رانا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

"آر یو او کے سر؟" اس کی بے پناہ خاموشی سے گھبرا کر عبدالمنان نے پوچھا۔

"یس!" وہ عبدالمنان کو مختصر جواب دے کر مریم کا نمبر ملانے لگا۔ شینا کے بعد سجاد رانا کی موت کا صدمہ ان کے لیے کتنا بڑا ثابت ہوگا، وہ اندازہ لگا سکتا تھا۔ دوسری طرف بیل جانے کی آواز سنائی دیتی رہی لیکن کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔

"میں لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ تم مشابرم خان کے اسکردو جانے کا بندوبست کردینا۔" دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر اس نے مایوسی کے عالم میں اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا اور خود کوئی اور نمبر ملاتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس بار اس نے لیاقت رانا کا نمبر ملایا تھا۔ کال ان کے سیکریٹری نے ریسیو کی۔

"رانا صاحب تو اس وقت بات نہیں کرسکتے۔ ان کی طبیعت کافی بگڑ گئی تھی اس لیے انہیں اسپتال شفٹ کرنا پڑا۔ اس وقت وہ آئی سی یو میں ہیں۔" یہ جاننے کے بعد کہ کال کرنے والا شہریار ہے، سیکریٹری نے مؤدبانہ انداز میں معلومات فراہم کیں جو ظاہر ہے اس کے لیے تشویش ناک تھیں۔ اسے شدت سے اپنی لاہور سے دوری کا احساس ستانے لگا۔ وہ پلک جھپکتے میں لاہور پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن بے بس تھا۔ اس کی جدید ماڈل کی طاقتور انجن والی مرسیڈیز بھی ایک حد تک ہی کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتی تھی اور مجبوری یہ تھی کہ اس سے بڑھ کر تیز رفتار کوئی دوسرا نقل و حمل کا ذریعہ یہاں موجود ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

ماہ بانو نے ہوش کی دنیا میں قدم رکھتے ہوئے اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر فوراً ہی بند کرلیں۔ سورج کی کسی برچھی کی طرح آنکھوں میں در آتی کرنوں سے بچنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ سورج کی کرنیں جو روشنی کی پیامبر بن کر کائنات کے ایک ایک ذرے کو دیدار کے لیے عیاں کردیتی ہیں... کبھی کبھی، کہیں کسی مقام پر ایسی ہی ظالم ثابت ہوتی ہیں کہ دیکھنے والی آنکھوں سے ان کی بینائی ہی اچک کرلے جائیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی پل بھر کے لیے اتنی روشنی بھر گئی تھی کہ اسے اپنی بصارت جانے کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ قدرت کے ودیعت کردہ خودکار نظام کے تحت اس نے فوری طور پر اپنی آنکھیں بند کیں اور دیگر حواس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے اردگرد کے ماحول کے بارے میں اندازہ کرنے لگی۔ سب سے پہلا احساس جو اس کے اندر جاگا، وہ یہ تھا کہ وہ کسی مسلسل ہلتی ہوئی شے پر دراز محوِ سفر ہے لیکن یہ ہلتی ہوئی شے کوئی انسانی ایجاد نہیں تھی۔ وہ کوئی جانور تھا جس کی پشت پر اسے باندھ کر آگے کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ جانور کی چال کے مخصوص ہچکولوں کے علاوہ جو دوسری چیز اس نے فوری طور پر محسوس کی، وہ شدید قسم کی سردی تھی۔ اس سردی سے اسے بچانے کے لیے اس پر کوئی ترپال نما شے ڈالی گئی تھی۔ وہ کہاں تھی اور کن لوگوں کے ساتھ تھی، اسے فوری طور پر اندازہ نہیں ہوسکا۔ البتہ اپنے اغوا کیے جانے کا سارا منظر کسی فلم کی طرح آنکھوں میں گھوم گیا۔ اس منظر کے یاد آتے ہی اسے اکرم خان کا بے جان وجود اور اس کی بوڑھی ماں کی ویران آنکھیں بھی یاد آگئیں۔ اس کے لبوں سے ایک سسکاری سی نکلی۔ عجیب نصیب تھا اس کا...! محبت کرنے والے لوگ ملتے تھے اور اچانک ہی چھوٹ جاتے تھے... وہ بھی اس عالم میں کہ وہ ان کی جان جانے کا بوجھ اپنی جان پر محسوس کرتی تھی۔ سب سے پہلے اسے پال پوس کر بڑا کرنے والی بے بے اور ابا نے اس کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ چودھری نے اس کے غائب ہوجانے پر سب سے پہلے انہیں ہی ظلم کا نشانہ بنایا تھا کہ کسی طرح ان سے ماہ بانو کا پتا حاصل کرسکے۔ دارالامان جہاں وہ پیرآباد سے نکلنے کے بعد پناہ گزین ہوئی تھی، اس کی منتظمہ اور چوکیدار بھی اسی کی وجہ سے مارے گئے تھے۔ موتی والا کے گھر میں پناہ لی تو چودھری کے گرگے کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے اور موتی والا اور اس کی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ موتی والا کے ڈرائیور سرمد نے اسے اپنے دوست عامر کے گھر پہنچایا تو وہاں عامر کی ماں اور اس کی پڑوسی لڑکی جمیلہ حادثے کا شکار ہوگئیں۔ جمیلہ کی لاش اس کے دھوکے میں دفنانے کے بعد کافی دنوں تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ وہ ختم ہوگئی ہے لیکن وہ تو جمیلہ کے دھوکے میں خواجہ سراؤں کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ وہاں بھی اس کی طرف لپکنے والی موت رخ موڑ کر سجاد رانا کی

منا: (باجی سے) "بارش کا پانی کہاں جاتا ہے؟"
باجی: (غصے سے) "میرے سر میں۔"
منا: تب ہی تو آپ کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے۔"

بیٹی شینا کی طرف چلی گئی۔ یہ قدرت کا اس پر احسان تھا کہ ہر قدم پر بے شمار مصائب کے باوجود اس کی حفاظت کی جارہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ نادم تھی کہ ایک اس کی زندگی پر اتنی جانیں نچھاور ہوگئی ہیں اور مصائب کا سلسلہ ہے کہ دراز ہوتا ہی چلا جاتا ہے... اور اب وہ جو پہلے ہی اپنے علاقے اور اپنے لوگوں سے دور تھی، ایک جانور کی پشت پر سوار نہ جانے کہاں لے جائی جارہی تھی؟ اور کون تھا جس کے اشارے پر یہ مذموم حرکت کی گئی تھی؟ اس کے ذہن میں تو اپنے دشمن کی حیثیت سے بس ایک چودھری افتخار کا نام ہی خطرے کی سرخ بتی کی طرح روشن رہتا تھا اور اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اتنی بھاگ دوڑ اور تگ و دو کے باوجود بھی بالآخر چودھری اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ چودھری کی گرفت میں آجانے کے خیال سے اس کا بندھا ہوا جسم کسمسایا اور اس بار اس نے چہرے کا رخ بدل کر ایسے زاویے پر لاتے ہوئے کہ سورج کی روشنی براہِ راست آنکھوں میں نہ گھسے، دھیرے سے اپنی آنکھوں کو کھولا۔ سب سے پہلے اس کی نگاہ نے اس جانور کو اپنی زد میں لیا جس کی پشت پر وہ سفر کررہی تھی۔ وہ گھٹے ہوئے بدن کا سیاہ گھنے کھردرے بالوں والا جانور تھا جس کے آگے اسی جیسا ایک دوسرا جانور حرکت کررہا تھا۔ آگے والے جانور کی خوب گھنی اور مورچھل نما دم دیکھ کر وہ اندازہ کرسکتی تھی کہ اس کی سواری کا کام انجام دینے والا جانور بھی ایسی ہی ایک دم کا مالک ہوگا۔ بس فرق تھا تو یہ کہ وہ جس جانور کی پشت پر سوار تھی، اس کے بال مکمل طور پر سیاہ تھے جبکہ آگے والا جانور چتکبرا تھا۔ "یاک..." اس کے ذہن میں جانور کا نام سرسرایا۔ اچھے اچھوں کو صرف اپنی دید اور سموں کی دھمک سے دہشت زدہ کردینے والا یہ جانور اس وقت اس کی سواری تھا۔ آگے والے یاک پر سوار گرم کپڑوں میں ملبوس انسان یقیناً اس وحشی جانور کو سدھانے اور اس قابل بنانے کے ذمے دار تھے۔ وحشی کو قابو میں کرلینے والے خود کیسے لوگ ہوں گے، اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

ان یاکوں کو دیکھ کر قدرتی طور پر اسے خیال آیا کہ اس وقت وہ کسی بہت ہی بلند مقام پر موجود ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے آکسیجن کی مقدار قدرے کم تھی اس کے چاروں

طرف برف ہی برف تھی جس سے ٹکرا کر سورج کی شعاعیں یوں منتشر ہو کر کہ سیدھی آنکھوں میں گھسی چلی آتیں اور اچھے بھلے انسان کو اسنو بلائنڈنیس کا خطرہ لاحق ہو جاتا۔ وہ بھی چند ساعتوں سے زیادہ اپنی آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ ہچکولے کھاتے جسم کے ساتھ آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ وہ اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ اگر اغوا کاروں کا تعلق چودھری افتخار سے ہے تو وہ اسے پہاڑوں سے میدانوں کی طرف لے...... جانے کے بجائے مزید بلندی کی طرف کیوں لے جا رہے ہیں؟ کیا چودھری کا ان برف زاروں میں بھی کوئی ٹھکانا تھا؟ شاید ایسا ہی ہو۔ ایسا بندہ جو تہذیب کے آخری گاؤں ہوشے تک رسائی رکھتا ہو... جس کے بندے اتنی دور پہنچ کر اسے اغوا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں، اس سے تو کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ دولت... اور بے تحاشا دولت کے بل بوتے پر تو دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنے لیے عیش کدہ خریدا یا بنایا جا سکتا تھا۔ اس عیش کدے میں اپنے من پسند جسم بھی خرید کر ڈالے جا سکتے تھے اور جو برائے فروخت نہ ہوں، ان کو کرائے کے ٹٹوؤں پر لاد کر لایا جا سکتا تھا۔ ماہ بانو کو چودھری نہ تو دھوکے سے حاصل کر سکا تھا، نہ دولت کی جھلک دکھا کر پرچا سکا تھا... چنانچہ اب طاقت کے استعمال پر تلا ہوا تھا۔ چودھری کے اختیارات اور عزائم اپنی جگہ لیکن اس نے بھی ٹھان لی کہ چاہے جان چلی جائے، چودھری کو اپنے وجود سے کچھ حاصل نہ کرنے دے گی۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ پُرسکون ہو گئی اور سفر کے اختتام کا انتظار کرنے لگی۔ سفر کچھ طویل تھا۔ راستے میں دو بار ایک آدمی نے اس کے منہ سے بوتل لگا کر کوئی مشروب اس کے حلق میں انڈیلا۔ ذائقے میں وہ مشروب نمکول کے مانند لگتا تھا۔ ڈی ہائیڈریشن سے بچنے کے لیے ان برف زاروں میں اکسیر کی سی حیثیت رکھنے والا مشروب، جو پہاڑوں کے عجیب و غریب موسم میں بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ ماہ بانو نے دونوں بار اس مشروب کے گھونٹ خاموشی سے حلق سے نیچے اتار لیے۔ جب تک جسم سے روح کا ناتا قائم تھا، اسے جسم کی توانائیاں برقرار رکھنی تھیں تاکہ وقتِ عمل، قوتِ عمل جواب نہ دے جائے۔

آخرکار سفر ختم ہو ہی گیا اور وہ لوگ ایک مقام پر ٹھہر گئے۔ یہاں رکنے کے بعد اس کے جسم کو بندشوں سے آزاد کر کے اسے نیچے اتارا گیا۔ زمین پر قدم جما کر کھڑے ہونے کے بعد اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ کافی کھلی جگہ تھی جس کے اردگرد چھوٹی بڑی برف پوش پہاڑیاں اس طرح کھڑی تھیں کہ اس جگہ سے ہٹ کر بہت دور تک کا منظر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ نظر کی حد ان پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس پلٹ آتی تھی۔ وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر رہنے کے خواہش مندوں کے لیے ایک آئیڈیل ٹھکانا تھا مگر ایسا ٹھکانا تو بس وہی لوگ حاصل کر سکتے تھے جو بے پناہ وسائل کے مالک و مختار ہوں۔ ماہ بانو کو اُلجھن سی محسوس ہونے لگی۔ چودھری افتخار کی دولت مندی میں کوئی کلام نہیں تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ چودھری کو ایسے کسی ٹھکانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس نے اپنا مال یہاں خرچ کیا تھا تو اس سے اسے حاصل کیا ہونے والا تھا؟ محض عیاشی کے لیے تو ایسی حماقت نہیں کی جا سکتی تھی۔

''اُدھر چلو۔'' وہ اپنی سوچوں کے تانے بانوں میں الجھی جانے کب تک یونہی کھڑی رہتی کہ ایک...... غراتی آواز والے شخص نے کھردرے لہجے میں حکم دیتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ یہ وہی شخص تھا جو راستے میں اسے نمکول پلاتا رہا تھا۔ اس شخص کی اپنے قریب آمد و رفت سے اسے اندازہ ہوا کہ آگے جانے والے یاک کے علاوہ ایک یاک اس کے پیچھے بھی موجود ہے۔ اب وہ تینوں یاک اس کی نظروں کے سامنے موجود تھے۔ ان کے جسم سے بندھے کپڑے کے بھرے ہوئے بڑے بڑے بورے نیچے اتارے جا رہے تھے اور انہیں مشقت کا صلہ دینے کے لیے تازہ گھاس ان کے سامنے ڈال دی گئی تھی۔ پہاڑوں پر اترتی شام پر ایک نظر ڈال کر وہ خود کو حکم دینے والے شخص کے اشارے کی سمت بڑھ گئی۔

چند قدم چلنے کے بعد اسے پہاڑ میں موجود وہ دہانہ نظر آ گیا جو آگے کسی غار کی موجودگی کا پتا دے رہا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ چلتے شخص کی حرکات و سکنات سے اس کے ارادوں کو پہچانتی، وہ غار کے کھلے دہانے سے اندر داخل ہو گئی۔ اندرونی طور پر بے حد ہیجان میں مبتلا ہونے کے باوجود اس نے ابھی تک کسی سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ اسے یہاں تک لانے والے محض مہرے ہیں جو بساط پر بازی کھیلنے والے کی مرضی سے ہی حرکت کر سکتے ہیں۔ ان بہ ظاہر متحرک لیکن درحقیقت قوتِ عمل سے محروم افراد سے کوئی سوال کرنے سے بہتر تھا کہ اس بازی گر کا سامنا ہونے کا انتظار کیا جائے جس نے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ وہ جو بہت آسانی سے اس بازی گر کے گرگوں کے ہاتھ لگ گئی تھی، اب اتنی بے تحاشا غصے میں بھری ہوئی تھی کہ خوف کا نام و نشان مٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ نئی چال چلنے والا اگر چودھری تھا تو وہ پوری طرح تیار تھی کہ اس کا سامنا ہوتے ہی اس کا منہ نوچ ڈالے لیکن جیسے ہی وہ دہانے سے گزر کر غار میں داخل ہوئی، بھونچکی رہ گئی۔ اندر سے کافی کشادہ

اس غار کی دنیا تو اس کے لیے بالکل ہی انوکھی تھی اور وہ ونڈر لینڈ میں اتفاقاً جا پہنچنے والی ایلس کی طرح کھڑی حیرت سے آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔

☆☆☆

لیاقت رانا کے خاندان پر قیامت ٹوٹی تھی۔ ابھی تو وہ لوگ شینا کی موت کے صدمے سے پوری طرح سنبھل نہیں پائے تھے کہ سجاد رانا کے قتل نے ایک اور قیامت ڈھا دی۔ پیرانہ سالی سے گزرتے لیاقت رانا نے پوتی کے بعد بیٹے کی موت کی خبر سنی تو بستر سے جا لگے۔ صدمے سے چور چور ان کے دل کی دھڑکنوں کو اعتدال پر لانے کے لیے اسپتال میں ملک کے بہترین ڈاکٹرز جمع کر دیے گئے تھے لیکن شہریار کی پریشانی قائم تھی۔ اس کا ایک پیر اسپتال میں تو دوسرا گھر پر ہوتا تھا۔ گھر میں مسز آفرین رانا اور مریم دونوں ہی کی حالت خراب تھی۔ ان کا رونا شہریار کے دل کو چیر ڈالتا تھا لیکن فی الحال اس کے پاس انہیں صبر کی تلقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ دونوں خواتین اس تلقین کو سن کر اور بھی شدومد سے روتیں اور اس کا دل جل جل کر ڈالتیں لیکن وہ مرد ہونے کے ناتے آنکھوں سے آنسو نہیں بہا سکتا تھا۔ کم از کم سب کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ یہ رعایت تو قدرت کی طرف سے خواتین کو ہی ملی ہے کہ وہ ہر دکھ پر دل کھول کر رو لیتی ہیں اور نتیجتاً دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ مرد بے چارے اس نعمت سے محروم اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے سب کچھ اندر ہی اندر سہتے رہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے دنیا میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں میں امراضِ قلب کا تناسب زیادہ ہے۔ مثال رانا ہاؤس میں ہی موجود تھی۔ خواتین غم سے زیادہ نڈھال نظر آتی تھیں لیکن اسپتال لیاقت رانا پہنچ گئے تھے۔ شہریار اس وقت ان کی خیریت معلوم کرنے اسپتال ہی پہنچا ہوا تھا۔ ڈاکٹرز نے اسے تسلی دی تھی کہ لیاقت رانا کی طبیعت اب سنبھلنے لگی ہے۔ وہ فون پر بھی اسے یہی تسلیاں دیتے رہے تھے اور اسے مجبوراً ان تسلیوں سے بہلنا بھی پڑا تھا۔ اس وقت ساری ذمے داریاں اسی کے شانوں پر تھیں۔ سجاد رانا کی تدفین، تعزیت کے لیے آنے والوں سے نمٹنے اور اخباری رپورٹرز کو بیانات دینے کے فرائض اسے ہی انجام دینے پڑے تھے۔ ان سارے فرائض کی انجام دہی میں وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزرا تھا۔ خصوصاً حکمرانوں کے مذمتی بیانات اسے بری طرح چڑانے کا سبب بنتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حکمرانوں کے یہ بیانات محض زبانی کلامی باتیں ہیں۔ دہشت گردوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کے ان کے

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مئی 2010ء......

موسم گرما کا تحفہ

راز

آخری صفحات پر ایک ایسے راز کی جستجو...... جو کتنے ہی انسانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا......

انیس مرزا کے قلم سے ایک چونکا دینے والی روداد

کرشمۂ نجوم

ابتدائی صفحات پر نجومیوں کی پیش گوئی کی بدولت ایک چھ سالہ بچے پر زندگی کے تنگ ہوتے دائرے کی دلگداز تاریخی داستان...... ہمایوں بلگرامی کا پُراثر انداز

حضرت شموئیلؑ

قدرت کی کرشمہ سازیاں...... ایمان اگر مضبوط ہو تو بنجر زمین بھی ہری بھری کھیتی میں ڈھل جاتی ہے......

ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے انبیائے کرام کا سلسلہ

واپسی

تحیر، تجسس اور عشق کے دلفریب لمحات پر مشتمل پل پل رنگ بدلتی طویل داستان...... محی الدین نواب کے قلم کا جادو

بے گناہ

بے کسی کی رات جب گہری ہو جائے تو صبح کے امکان روشن ہو جاتے ہیں۔ مرزا امجد بیگ کی یادداشت کا عکس

اس کے علاوہ اناڑی، محفلِ شعر و سخن، آپ کے خط

مزید کاشف زبیر - مریم کے خان - پرویز بلگرامی تنویر ریاض اور منظر امام کی دلچسپ تحریریں

سارے دعوے سراسر کھوکھلے ہیں۔ یہ آہنی ہاتھ نہ تو ماضی میں کبھی حرکت میں آیا تھا اور نہ ہی اب کوئی امید تھی۔ شاید بغیر استعمال کے یونہی صرف بیانات کا حصہ بننے والا یہ آہنی ہاتھ زنگ آلود ہو کر ناقابلِ استعمال ہو چکا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ملک کے طول و عرض میں دہشت گرد اس طرح راج کیسے کرتے پھرتے؟ عوام سے لے کر خواص تک کوئی بھی تو اس دہشت گردی سے محفوظ نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عوام ایک ہی ہلّے میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح بڑی تعداد میں بے دردی سے مارے جاتے اور خواص کو بڑا ناپ تول کر، حساب کتاب سے ملکِ عدم کی طرف روانہ کیا جاتا۔ اس بچے تلے قتال کو ”ٹارگٹ کلنگ“ کا نام دیا جاتا تھا۔ سجاد رانا کی موت بھی ٹارگٹ کلنگ تھی اور حسبِ معمول کلرز کا کوئی نام و نشان نہیں مل سکا تھا۔ خود ڈی آئی جی ہونے اور آئی جی کے داماد ہونے کے باوجود ان کے قتل کی رپورٹ نامعلوم قاتلوں کے نام درج کی گئی تھی۔ ان کے ایم این اے والد اپنی تمام تر پہنچ کے باوجود بیٹے کی موت کے صدمے سے نڈھال اسپتال کے ایک وی آئی پی روم میں بے دست و پا پڑے تھے۔ ان میں تو اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ بیٹے کے جنازے میں ہی شرکت کر سکتے۔ شہریار ان سے ملاقات کے لیے اسپتال آیا تو وہ تھوڑی دیر تک حسرت بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے اور پھر آنکھیں موند کر اپنا رخ بدل گئے۔ جس بچے کو انہوں نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا اور قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرتے ہوئے اسے اسسٹنٹ کمشنر کی کرسی تک پہنچا دیا تھا، اس کے سامنے وہ اپنے دل کا درد کیونکر آنکھوں سے بہا سکتے تھے؟ ان کی کیفیات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے ان کے ہاتھ کی پشت پر ایک عقیدت مندانہ بوسہ دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ عین اسی وقت مختار مراد وہاں پہنچ گئے۔ غم ان کا بھی کم نہیں تھا کہ ان کی اکلوتی بیٹی کی گود اور مانگ دونوں ہی اجڑ گئی تھیں لیکن بے پناہ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ غم کے اس طوفان سے گزرتے ہوئے شہریار کو ان کی ذات سے بڑا سہارا ملا تھا۔ اب بھی وہ نظر آئے تو اس کے دل کو ڈھارس سی ملی۔

”کیسی طبیعت ہے رانا صاحب کی؟“ شہریار کے قریب پہنچ کر انہوں نے اس سے سوال کیا۔ ان کی سیکیورٹی پر مامور عملہ ذرا فاصلے پر ہی رک گیا تھا۔

”طبیعت تو اب کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق وہ خطرے سے نکل آئے ہیں لیکن میرے اندازے کے مطابق شدید ڈپریسڈ ہیں۔“

”وہ تو ہونا ہی ہے۔ کسی بوڑھے باپ کے لیے اپنے بیٹے کا جنازہ دیکھنا کسی بھی صورت آسان نہیں ہو سکتا۔“ اس کی بات سن کر مختار مراد نے دھیمی آواز میں تبصرہ کیا پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے وزیٹنگ روم میں رکھی کرسیوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہ عام وزیٹنگ روم نہیں تھا۔ یہاں صرف لیاقت رانا جیسے وی آئی پیز سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے تیماردار ہی داخل ہو سکتے تھے۔

”کچھ معلوم ہوا سجاد بھائی کے قاتلوں کے بارے میں؟“ وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے تو شہریار نے ان سے پوچھا۔

”قاتلوں کی حتمی نشان دہی تو نہیں ہوئی لیکن ایسی بہت سی وجوہات سامنے آئی ہیں جن کو سجاد کے مرڈر کی وجہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل میں اس نے شینا کی موت کا بہت گہرا اثر لیا تھا اور اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے دیوانہ وار کوششیں کر رہا تھا لیکن اپنی ان کوششوں میں اس نے مجھے شامل کرنا یا آگاہ کرنا پسند نہیں کیا تھا۔ تحقیقات کے مطابق شینا کی موت کے بعد سجاد مسلسل خفیہ سرگرمیوں میں مصروف رہا لیکن اس نے ان سرگرمیوں میں اپنے ماتحتوں کو بھی ایک حد سے زیادہ ملوث نہیں کیا۔ جن لوگوں نے اس کے احکامات کی پیروی کی، وہ بھی حقائق سے واقف نہیں یا بہت کم جانتے ہیں۔ اس سارے عرصے میں کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اس نے گارڈز اور ڈرائیور کو بھی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کیا۔ میرے پاس جو اطلاعات پہنچی ہیں، ان کے مطابق کچھ دن قبل ہی وہ تنہا اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل پہنچا تھا اور وہاں اس نے جولی نامی ایک لڑکی کے ساتھ چند گھنٹے گزارے تھے۔ جولی ایک کال گرل تھی جسے سجاد نے ہوٹل کے ایک ویٹر کے ذریعے اپروچ کیا تھا۔ سجاد کے حکم پر اس کے ایک ماتحت نے جولی کا تعاقب کر کے اس کی رہائش گاہ کا پتا معلوم کر لیا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اسی رات ہوٹل کا ویٹر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مر گیا اور جولی نے اپنی غیر شریفانہ زندگی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے خودکشی کر لی۔“ مختار مراد کی باتیں سنتے ہوئے اسے یک دم ہی اپنی سجاد رانا سے آخری ٹیلی فونک گفتگو یاد آ گئی۔ اس گفتگو کے دوران انہوں نے اسے بتایا تھا کہ شینا کے قاتلوں کو تلاش کرتے ہوئے وہ کچھ ایسے سپلائرز تک پہنچ گئے ہیں جن کے روپ میں خطرناک ایجنٹس چھپے بیٹھے ہیں۔ یہ بات بتاتے ہوئے انہوں نے جسم فروشی کے دھندے کا بہ طور خاص ذکر کیا تھا لیکن پھر ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کو غیر محفوظ قرار دیتے

ہوئے تفصیلات ملاقات پر چھوڑ دی تھیں۔ شومیِ قسمت کہ ملاقات کی نوبت ہی نہ آ سکی۔

”مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں حادثات یقینی طور پر قتل کی وارداتیں تھیں۔ سجاد بھائی کے اس قسم کے افراد کے خلاف کام کرنے کا تو کسی حد تک مجھے بھی علم ہے۔ یقیناً جو بڑے مجرم ہیں انہوں نے اپنی طرف جانے والے راستوں کا نشان مٹانے کے لیے اپنے ہی بندوں کو بلی چڑھا دیا ہوگا۔“ وہ بے ساختہ ہی درمیان میں بول پڑا اور مختار مراد کو اپنی اور سجاد رانا کی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔

”تمہارا تجزیہ بالکل درست ہے۔ میرے سامنے کچھ ایسے شواہد آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سجاد کچھ خاص قسم کے مجرموں کی راہ پر لگ گیا تھا جس کے نتیجے میں اسے جان سے جانا پڑا۔ میرے بندے ایک ایسے میرج بیورو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ اس کی مالکن لڑکیوں کی سپلائر رہی ہے لیکن افسوس کہ ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ وہ میرج بیورو بند ہو چکا ہے اور مالکن سمیت اسٹاف کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ عمارت کے مالک کے ریکارڈ میں عورت کا جو پتا درج ہے، وہ بھی غلط ہے۔ میرے آدمیوں نے دفتر کی تلاشی لے کر کلیوز حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے پہلے ہی مکمل طور پر کلین کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہم کسی کے فنگر پرنٹس حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس صورتِ حال سے ظاہر ہے کہ مجرم کوئی عام لوگ نہیں بلکہ تربیت یافتہ اور بے حد ذہین تھے جنہوں نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔“ مختار مراد نے اسے آگے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور پھر یوں خاموش ہو گئے جیسے بتانے کے لیے مزید کچھ باقی نہ رہا ہو۔

شہریار خود بھی کچھ دیر خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھا رہا پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اچھا انکل! اب اجازت دیجیے۔ مجھے کچھ اور معاملات بھی دیکھنے ہیں۔ آپ البتہ ماموں جان سے مل لیں۔ آپ کی ہمت اور حوصلے کو دیکھ کر یقیناً انہیں بھی حوصلہ ملے گا۔“ وہ ان سے مصافحہ کر کے اسپتال سے رخصت ہو گیا۔ اسے یہاں سے لیاقت رانا کی رہائش گاہ کی طرف جانا تھا۔ مشابرم خان کی عدم موجودگی میں ڈرائیونگ کے فرائض انجام دینے والے ڈرائیور نے اس کی سبک رفتار مرسیڈیز ٹریفک کے بہاؤ میں شامل کی تو اس نے اپنا سیل فون نکال کر مشابرم خان کا نمبر ملایا۔ سجاد رانا کی آخری رسومات اور دیگر فرائض کی ادائیگی میں اسے موقع نہیں مل سکا تھا کہ مشابرم خان سے رابطہ کر پاتا، حالانکہ اس

مایوسی گناہ ہے
ہم چھین لیں گے آپ کی ہر پریشانی اللہ کے کرم سے
روحانی اسکالر پیرزادہ وسیم جعفری کا اعلان
وہ کام جو بڑے سے بڑا عامل و جادوگر نہ کر سکے وہ میرے بزرگوں کی دعا سے ہو جاتا ہے مثلاً شوہر کے دل سے شک و نفرت کی آگ، سنگدل محبوب نے نیند حرام کر دی ہو تجارت میں دن بدن نقصان، رشتوں میں بندش، عزیزوں سے لڑائی جھگڑا عزت و وقار میں کمی یا دشمن حاوی ہو، بیٹی کی سسرال میں عزت نہیں، امیگریشن کے مسائل، لاٹری نمبر غرضیکہ ہر مشکل کیسی ہی کیوں نہ ہو اپنی آخری امید سمجھ کر رابطہ کریں
پیرزادہ وسیم جعفری
گجرات پاکستان
0300-7462777
0333-8217808

بے تحاشا پریشانی کے عالم میں بھی وہ اس مسئلے کو بھولا نہیں تھا۔ ماہ بانو کو اس نے اپنی ذمّے داری پر ﷲلتستان بھیجا تھا تو اب اس کے اغوا کی خبر پر وہ خود سب سے بڑھ کر مضطرب تھا لیکن حالات ہی کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ پیر کٹے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ خواہش کہتی تھی کہ کسی طرح ﷲلتستان پہنچا جائے اور ماہ بانو کی بازیابی کے سلسلے میں ہاتھ پیر مارے جائیں لیکن فرائض اور خونی رشتوں کا حق راہ میں حائل تھا۔ وہ اپنے پیاروں کو ان حالات میں تنہا چھوڑ کر کسی لڑکی کی خاطر کہیں نہیں جا سکتا تھا، چاہے وہ لڑکی اسے اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر پیاری ہوتی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا لیکن عملی زندگی میں بہت سے مقامات ایسے آتے ہیں جب طاقتور سے طاقتور مرد خود کو مجبور محسوس کرتا ہے۔ خصوصاً اگر معاملہ فرض اور خواہش کی جنگ کا ہو تو اعلیٰ تربیت کے حامل افراد اپنی ذاتی خوشی قربان کر کے فرض کی ادائیگی کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا اور خود پر ضبط کر کے ماہ بانو کا معاملہ سپردِ تقدیر کر دیا تھا۔ البتہ تقدیر پر بھروسا کرنے کے باوجود وہ جتنی تدبیر یہاں بیٹھے بیٹھے کر سکتا تھا، وہ اس نے ضرور کی تھی اور اب اسی تدبیر کے نتائج جاننے کے لیے مشابرم خان کو کال ملائی تھی۔

''السلام علیکم سر!'' مشابرم خان نے کال ریسیو کر لی اور اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام! کیا حال ہے خان؟ آرام سے وہاں پہنچ تو گئے تھے نا؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں سر! آپ کی مہربانی سے سفر میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔'' مشابرم خان نے ترتیب وار اس کے سوالوں کا جواب دیا لیکن اس کا لہجہ کچھ بجھا ہوا اور تھکن زدہ تھا۔

''تمہاری والدہ کی کیسی طبیعت ہے؟'' وہ بے شک ماہ بانو کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا لیکن اخلاقی تقاضا تھا کہ پہلے مشابرم خان کے مسائل پر بات کی جائے۔

''اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ابھی وہ اسپتال میں ہی ہے اور بے ہوش ہے۔ مجبوری میں مجھے اکرم خان کی تدفین بھی اس کے بغیر ہی کرنی پڑی۔'' مشابرم خان نے اداسی سے بتایا۔

''ویری سیڈ! تمہیں میری کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ بلکہ ایسا کرو کہ اپنی ماں کو لے کر لاہور یا اسلام آباد کے کسی اسپتال پہنچ جاؤ۔ اسکردو کے مقابلے میں ان شہروں کے اسپتال زیادہ جدید اور باسہولت ہیں۔ تم کہو تو میں انتظامات کروا دوں؟'' اس نے ہمدردی کے ساتھ مشابرم خان سے پوچھا۔

''شکریہ سر! لیکن میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ماں کو کوئی جسمانی مسئلہ نہیں ہے، بس صدمہ ہے جس سے وہ آہستہ آہستہ ہی نکل سکے گی۔'' مشابرم خان نے جواب دیا تو وہ خاموش ہو گیا۔ اگر مشابرم خان خود مطمئن تھا تو مزید اصرار بے کار تھا۔

''حادثے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا کہ کیا ہوا تھا اور کون لوگ ہیں اس کے پیچھے؟'' اب اس نے اصل موضوع چھیڑا۔

''واقعہ ہوشے سے واپس کاندے جاتے ہوئے کینداس تھنگ کے قریب پیش آیا تھا۔ جیپ کے ڈرائیور کے مطابق اچانک ہی ایک جیپ میں سوار کچھ لوگوں نے انہیں گھیر لیا تھا اور ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی جس پر اکرم خان نے جوش میں ان سے بھڑنے کی کوشش کی اور جواباً اسے گولی مار کر وہ لوگ ماہ بانو کو لے گئے۔ یہاں کی پولیس نے اس واردات کے بارے میں تحقیقات کیں تو اس جیپ کا پتا چل گیا جس میں اغوا کار آئے تھے۔ وہ ایک ٹورسٹ کمپنی کی جیپ تھی۔ جیپ کا ڈرائیور خالی جیپ لے کر طے شدہ شیڈول کے مطابق پہاڑوں سے واپس آنے والی ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم کو لینے جا رہا تھا کہ راستے میں اس کی جیپ روک لی گئی اور اسے بے ہوش کر کے روکنے والے جیپ لے اڑے۔ ہوش میں آنے کے بعد جب تک اس نے تھانے میں رپورٹ کروائی اور جیپ تلاش کی گئی، تب تک مجرم اپنا کام کر چکے تھے۔ خالی جیپ پولیس کو ایک بالکل ویران پہاڑی کے قریب کھڑی مل گئی تھی۔ مجرم وہاں سے کہاں اور کیسے گئے، اس بات کا سراغ نہیں مل سکا... کیونکہ جس علاقے میں جیپ ملی، وہاں زمین کی ساخت ایسی ہے کہ کسی سواری یا انسانی قدموں کے نشانات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اب یہاں کی پولیس الجھی ہوئی ہے کہ آگے کی تفتیش کس بنیاد پر کریں؟ ماں کی بیماری اور اکرم خان کی آخری رسومات کی ادائیگی میں الجھے ہونے کی وجہ سے میں خود بھی اب تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں سر! اب میں کوشش کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح کچھ معلوم کر سکوں۔'' مشابرم خان نے تفصیلات سناتے ہوئے آخر میں اپنا عزم ظاہر کیا۔

''اپنی سہولت اور وسائل کے مطابق اگر تم کچھ کر سکو تو ضرور کرو خان... لیکن میری طرف سے تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ اس وقت کسی بھی

اور کام سے بڑھ کر تم پر اپنی ماں کی ذمّے داری عائد ہوتی ہے، اس لیے تمہیں سب سے زیادہ انہی کا دھیان رکھنا چاہیے۔'' وہ اور مشابرم خان کم و بیش ایک ہی جیسی صورتِ حال سے دوچار تھے، چنانچہ وہ مشابرم خان کے مسائل کو سمجھ سکتا تھا۔ ان مسائل کو سمجھتے ہوئے ہی اس نے مشابرم خان کو کسی بھی ذمّے داری کے بوجھ سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ماں کا خیال تو اسپتال والے رکھ رہے ہیں سر... لیکن مجھے اپنے بھائی کے قاتلوں کو تلاش کرنے کا کام خود کرنا ہوگا۔ اِدھر ہمارے علاقے میں ایسی واردات پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ یہاں کی پولیس کو تو یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا کہ اب کیا کریں؟ اس لیے مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' مشابرم خان کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ وہ جگہ جہاں کرائم ریٹ زیرو ہو، وہاں اس طرح کی کوئی واردات ہو جائے تو وہاں کی پولیس کا بوکھلانا سمجھ آتا تھا۔

''ٹھیک ہے خان... جیسا تم مناسب سمجھو۔ میں وہاں کی انتظامیہ سے ایک بار پھر درخواست کروں گا کہ تمہارے ساتھ تعاون کریں۔'' اس نے مشابرم خان کو اجازت دی اور کال منقطع کر کے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ گھر، اسپتال اور ماہ بانو سمیت ایک پورے ضلع کی ذمّے داریوں کا بوجھ تنہا اس کے شانوں پر تھا اور وہ بہ ظاہر آرام دہ انداز میں بیٹھا ہونے کے باوجود اندرونی طور پر ان ساری ذمّے داریوں سے احسن طور پر عہدہ برآ ہونے کی تدابیر سوچنے میں الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے غار کی دیوار سے پشت ٹکائے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے قدیم دیومالائی داستانوں میں مذکور کسی دیوی کا ضدی آنکھوں والا مجسمہ دیوار کے ساتھ ٹکا ہو لیکن یہ ایک ایسا مجسمہ تھا جس کے خطوط میں ایک آہنگ سے ہونے والی حرکت سانسوں کے تموج کو ظاہر کر رہی تھی۔ سانس جو زندگی کی علامت ہے اور جس کے دم سے ہی سارے جذبے اور خواہشیں قائم ہیں۔ سانس جسم کا ساتھ چھوڑ دے تو حسین سے حسین انسان بھی مٹی کے ڈھیر کے برابر ہو جاتا ہے۔ پتھروں سے تراشے مجسمے بھی اپنی تمام تر خوب صورتی کے باوجود صرف سانس کی عدم موجودگی کے باعث ادھورے رہ جاتے ہیں۔ ایسے مجسموں کے لیے دیکھنے والی آنکھ میں تحسین تو ہوتی ہے لیکن دل میں جذبات نہیں... اور اس کی خوبی یہی تھی کہ وہ ادھوری نہیں تھی، اس کے انگ انگ میں زندگی بھری تھی ...... جوانی اور شباب سے پُرزندگی جو دیکھنے والی آنکھ میں صرف تحسین نہیں بھرتی، پورے وجود کو اکساتی ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور بہ ظاہر اپنے اردگرد سے بے نیاز تھی لیکن اچانک ہی اسے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ اس کی زنانہ جبلت نے فوراً ہی اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجائی اور اس نے چونک کر ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پختہ عمر کا، الجھی ہوئی ڈاڑھی اور بالوں والا شخص کھڑا اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ ان عجیب و غریب لوگوں میں سے ایک تھا جنہیں وہ کینداس تھنگ سے اغوا ہو کر اس برف زار میں آنے کے بعد سے مسلسل اپنے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ وہ سارے لوگ بڑے عجیب تھے۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ایک زمانے سے تہذیب یافتہ دنیا کی شکل نہ دیکھی ہو۔ ان کے چہروں سے وحشت برستی تھی اور آنکھوں میں کسی جنگلی جانور کی سی درندگی تھی۔ ان کے اعضا کے تناؤ سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے شکار پر گھات لگائے بیٹھے ہوں اور کسی بھی پل اس پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ ان عجیب و غریب لوگوں کے ساتھ ان کی دنیا میں قیدی کی حیثیت سے رہ رہی تھی اور حیران تھی کہ یہ لوگ کون ہیں اور کس مقصد کے تحت دنیا سے کٹ کر اس ویرانے میں رہ رہے ہیں؟ اس بات کا تو اسے حتمی یقین تھا کہ بہرحال، وہ اس جگہ کے قدیمی باشندے نہیں ہیں۔ وہ سب باہر کی دنیا سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان کے رنگ روپ اور لہجے چغلی کھاتے تھے کہ وہ مختلف علاقوں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے حلیے بے شک یکساں تھے۔ ان کی بڑھی ہوئی ڈاڑھیاں اور الجھے ہوئے بالوں نے انہیں ایک دوسرے سے مشابہ ظاہر کرنے کی کوشش تھی یا پھر اس علاقے میں پانی اور دیگر سہولیات کی قلت کے باعث اُن کے لیے حجامت کروانا ممکن نہیں تھا، وہ ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ ان کے جسموں پر موجود لباس بھی ایک جیسے تھے۔ وہ بدرنگ اور گھسے ہوئے اونی پاجاموں کے ساتھ لمبی بش شرٹ نما قمیصیں پہنے ہوتے تھے۔ یہ مشترکہ حلیے اختیار کر لینے کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ شناخت کیے جا سکتے تھے۔ ان میں کوئی گورے رنگ اور سنہری بالوں کا مالک تھا تو کوئی لمبے قد اور کھڑے کھڑے نین نقش والا۔ سیاہ کور تال سے رنگ والوں کے ساتھ بوٹے قد اور سانولی رنگت والے چہرے بھی وہاں نظر آ رہے تھے۔ یہی حال زبان کا تھا۔ وہ جو زبان آپس میں بولتے تھے، اس میں سندھی، سرائیکی، پنجابی، پشتو اور انگریزی کے الفاظ آپس میں اس طرح مدغم ہو گئے

تھے کہ زبانوں کا ایک لشکر سا تشکیل پا گیا تھا۔ یقیناً ایسا مختلف علاقوں اور تہذیبوں کے لوگوں کے آپس میں مل کر رہنے کی وجہ سے ہوا تھا... لیکن سوال یہ تھا کہ وہ مختلف قسم کے لوگ آخر اس جگہ مل کر کیوں رہ رہے ہیں؟ ایسا کون سا مشترکہ مشن ہے جس نے انہیں اس جگہ جمع کر دیا ہے؟ برف میں گھری یہ جگہ اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے ہی مہذب دنیا کے افراد کی رہائش گاہ کے طور پر قابلِ قبول نہیں تھی، اوپر سے وہاں کی ہولناکی نے ماہ بانو کو پہلے قدم پر ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ خود کو یہاں تک لانے والوں میں سے ایک کے اشارے پر جب وہ اس غار میں داخل ہوئی تھی تو کئی لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا کہ وہ کسی غار میں نہیں بلکہ اسلحے کی ذخیرہ گاہ میں داخل ہو گئی ہو۔ غار کی پتھریلی دیواروں پر دنیا جہاں کا اسلحہ سجا ہوا تھا۔ رائفل، کلاشنکوف، ریپیٹر، ریوالور اور جانے کون کون سی قابلِ شناخت اور ناقابلِ شناخت چیزیں تھیں جو وہاں موجود تھیں۔

وہ راہداری کے اختتام پر موجود ایک چھوٹے سے قید خانے میں پہنچنے تک اس اسلحے کو دیکھتی رہی تھی اور اب اس قید خانے میں بند اپنے ناکردہ جرم کی سزا میں ملنے والی قید کو کاٹتے ہوئے بھی یہی منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے کھانا اور پانی پہنچانے کے لیے کوئی ایک شخص مخصوص نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی بھی یہ فرض انجام دے دیتا تھا لیکن ہر شخص کے جسم کے ساتھ کسی نہ کسی اسلحے کا جڑا ہونا لازمی ہوتا تھا۔ اسلحے کی موجودگی کے علاوہ ان کے درمیان جو قدرِ مشترک تھی، وہ تھی زبان کی عدم موجودگی۔ کم از کم ماہ بانو کو یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ سارے کے سارے قوتِ گویائی سے محروم ہوں۔ وہ ان میں سے کسی سے بھی کوئی سوال کرتی، جواب ہرگز نہیں ملتا۔ آخرکار اس نے جل کر انہیں گونگا بہرا تسلیم کر لیا تھا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ سچ نہیں ہے۔ ان لوگوں کی آوازیں اس قید خانے میں اس تک بھی پہنچتی تھیں اور اس گفتگو میں کئی لفظ ایسے ہوتے تھے جن کے معنی و مفہوم اس کے لیے اجنبی نہیں تھے... مگر وہ لوگ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود اس کے سامنے زبان کھولنے کے لیے تیار نہیں تھے ...... ان کی زبان بندی نے اس کی الجھن کو برقرار رکھا ہوا تھا، البتہ وہ اپنے اس خیال میں ڈانواں ڈول ہو گئی تھی کہ اسے چودھری کے حکم پر اغوا کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ وہ جن لوگوں کی قید میں تھی، وہ چودھری کے کارندوں سے بہت مختلف تھے۔ چودھری کے کارندے بے شک بے رحم اور جھگڑالو تھے لیکن اس کے سامنے جو لوگ موجود تھے، وہ جنگی سپاہیوں کی طرح سے منظم و مرتب تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات انہیں چودھری کے کارندوں سے زیادہ خطرناک اور سفاک ظاہر کرتے تھے۔ اس کی جب بھی ان میں سے کسی پر نظر پڑتی، وہ اپنی جگہ لرز کر رہ جاتی تھی۔ شکر یہ تھا کہ وہ اپنی تمام تر سفاکی کے باوجود اب تک اس کی طرف سے قطعی بے نیاز نظر آتے تھے۔ یہاں اسے سوائے قید تنہائی کے کوئی اور تکلیف نہیں تھی۔ اس کے پاس آرام دہ بستر بھی تھا اور موسم کی سختی کو برداشت کرنے والا لباس بھی۔ کھانے پینے کے سلسلے میں بھی اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اسے تینوں وقت کا کھانا نہایت پابندی سے فراہم کر دیا جاتا تھا۔ بس پریشانی تھی تو یہ کہ اسے کس کے حکم پر اور کیوں یہاں لایا گیا ہے؟ اس وقت بھی وہ رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد انہی سوالوں کا جواب کھوجنے کے لیے سوچوں کے تانے بانے میں الجھی ہوئی تھی کہ خود کو گھورے جانے کے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اسے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورنے والا شخص وہی تھا جو کچھ دیر قبل اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اب اس کی دوبارہ آمد کا مقصد یقیناً یہ تھا کہ کھانے کے خالی برتن واپس لے جائے لیکن وہ خالی برتن واپس لے جانے کے بجائے اس کے پُرشباب وجود میں الجھ گیا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی تحریر لکھی تھی... ایسی تحریر جسے عورت بہ خوبی پڑھ سکتی ہے۔ ماہ بانو نے بھی فوراً ہی یہ تحریر پڑھ لی اور خوف کے باعث اپنے اندر سمٹ سی گئی۔ اس سے قبل اس نے چودھری افتخار اور ہوشے کی کیمپنگ سائٹ میں ملنے والے امریکی سیاح کی آنکھوں میں بھی یہ تحریر پڑھی تھی لیکن دونوں ہی شیطانوں کے مقابلے میں قدرت نے اس کی مدد کی اور وہ ان ہوس پرستوں کی تمام تر طاقت کے باوجود ان سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی... لیکن یہاں، اس مقام پر وہ اپنے سامنے موجود درندے سے بچنے کے لیے کیا کر سکتی تھی؟ یہاں نہ تو اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ تھا اور نہ ہی کسی بیرونی مدد کی امید...! بے بسی کے اس عالم میں وہ بے ساختہ ہی دل کی گہرائیوں سے اپنے رب کو پکارنے لگی۔ ساکت لبوں کے ساتھ رب کو پکارتے ہوئے اس کی آنکھیں اس شخص پر... جمی ہوئی تھیں جو کسی درندے کی طرح اس پر نظریں جمائے دبے قدموں... اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب آتے آتے وہ اتنا نزدیک پہنچ گیا کہ اس کے اور ماہ بانو کے درمیان مشکل سے ایک فٹ کا... فاصلہ رہ گیا۔ اس قدر کم فاصلے سے وہ اس کے چہرے کی غیر معمولی سرخی اور سانسوں کے ہیجان کو بہ خوبی محسوس کر سکتی تھی۔ اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ شخص بدنیتی سے ہی اس کے قریب آنا چاہتا تھا۔ اس شخص کی نیت بھانپ کر وہ تیزی سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی

اور دیوار سے اس حد تک چپک کر کھڑی ہو گئی کہ اگر کسی طرح ممکن ہوتا تو وہ پتھروں کی اس دیوار میں سما جاتی۔ اس کے خوف کو محسوس کر کے وہ شخص دانت نکوسنے کے انداز میں مسکرانے لگا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"گل شیر! چھیتی کر... اساں نو کمانڈر نے کال کیا ہے۔ وہ کوئی امپورٹنٹ گل دسنے والا ہے۔" اس کی انگلیاں ماہ بانو کے چہرے کو چھونے بھی نہیں پائی تھیں کہ کسی نے دور سے ملی جلی بولی میں اسے پکارا۔ اس پکار کو سن کر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور نیچے فرش پر رکھے کھانے کے برتن سمیٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا تیزی سے وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک ماہ بانو سانس روکے دیوار سے چپکی کھڑی رہی۔ وہ ایک موڑ مڑ کر راہداری سے غائب ہو گیا تو وہ گرنے کے سے انداز میں نیچے بیٹھ گئی۔ اب وہ ایک بار پھر پتھریلی دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھی... تھی لیکن اس کے اندازِ نشست میں پہلے کی سی بے فکری نہیں رہی تھی۔ جو خطرہ لمحہ بھر پہلے اس کے قریب آنے کے بعد ٹل گیا تھا، دوبارہ کسی بھی وقت پوری شدت سے اسے اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا۔ اسے اس خطرے سے بچنے کے لیے کوئی سبیل نکالنی تھی لیکن فی الحال تو کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

"پھر آپ اس ویک اینڈ پر لاہور آ رہے ہیں نا؟" بستر پر اوندھی لیٹی وہ ایک ہاتھ سے موبائل تھامے آفتاب سے باتوں میں مصروف تھی۔ حویلی کے مقابلے میں اسے یہاں بہت آزادی حاصل تھی........ یہاں اسے آفتاب سے بات کرنے کے لیے رات کا انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ آفتاب کی مصروفیت اور معمول کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ دن کے وقت بھی اس سے بات کر لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دن کی روشنی میں ایک دوسرے کی، ہوا کے دوش پر سفر کرنے والی آوازوں سے جذبات کی شدت کا اندازہ کرتے ہوئے محوِ گفتگو تھے۔

"نہ آنے کا کیا سوال؟ میں تو خود گن گن کر لمحے گزار رہا ہوں۔ اچھے بھلے آدمی کو نکما بنا کر آپ نے اپنا اسیر کر لیا ہے۔ پہلے پڑھنے پڑھانے اور لکھنے کے سوا کوئی اور کام نہیں تھا، اب آپ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔" اس کے سوال کے جواب میں وہ بڑی بے بسی کا اظہار کرتا ہوا بولا تو کشور کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس ہنسی میں خوشی کے رنگ بھی تھے اور یہ ناز بھی کہ وہ کسی کو اپنا دیوانہ بنانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔

"ہنسیے، ہنسیے... جی بھر کر ہنسیے۔ میں آؤں گا نا تو سارے بدلے چکا دوں گا۔ پھر آپ کو پتا چلے گا کہ یوں دور دور سے کسی کو للچانے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔" اس کے بہ ظاہر روٹھے ہوئے لہجے میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کشور کا چہرہ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے حیا سے سرخ ہو گیا۔ مارے شرم کے وہ جواب میں کچھ کہہ بھی نہیں سکی۔

"بس بولتی بند ہو گئی محترمہ کی۔ پہلے تو بڑی بہادری دکھائی جاتی تھی۔ اب یہ حال ہے کہ فون پر بھی ہمارا ایک جملہ سن کر ڈھے جاتی ہیں آپ۔ کبھی کبھی تو یقین نہیں آتا کہ آپ وہی کشور ہیں جس کی طرف سے اظہارِ محبت میں پہل کی گئی تھی۔" آفتاب نے اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"تب اور اب میں بہت فرق ہے آفتاب! تب میں جانتی تھی کہ آپ چودھری افتخار شاہ کی بیٹی کی طرف خود سے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے، چنانچہ میں نے اظہار میں پہل کر ڈالی۔ اب معاملہ مختلف ہے۔ اب میں صرف چودھری افتخار کی بیٹی نہیں، آپ کی بیوی بھی ہوں۔ ایسی بیوی جسے اس بات کا مکمل یقین ہے کہ اس کا شوہر اس سے محبت کرتا ہے... چنانچہ اب مجھے قطعی اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ میں اپنی نسوانی انا کو داؤ پر لگاتے ہوئے جارحانہ رویہ اختیار کروں۔ مرد کی طرف سے اظہارِ محبت سننا اور اس پر شرمانا عورت کا حق ہوتا ہے۔ پہلے مجھے یہ حق حاصل نہیں تھا لیکن اب حاصل ہے تو پھر کیوں میں اپنی حدود سے باہر نکلوں اور اللہ کی طرف سے انعام کی صورت ملنے والے حق سے محروم ہو جاؤں۔"

"یعنی اس کا مطلب ہے کہ اب ساری زندگی مجھے ہی آپ سے اظہارِ محبت کا فریضہ انجام دینا پڑے گا؟" اس کے بے حد سنجیدگی سے دیے گئے جواب پر آفتاب بے چارگی سے بولا۔

"وہ تو کرنا پڑے گا۔" کشور دلبرانہ ادا کے ساتھ ایک بار پھر کھلکھلائی۔ آفتاب جواب میں کچھ بولتا، اس سے قبل ہی دروازے پر دستک ابھری۔

"ایک منٹ ہولڈ کریں آفتاب!" وہ مدھم آواز میں

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

ماؤتھ پیس میں بولی اور موبائل تکیے کے نیچے رکھ کر سیدھی ہوئی۔

''کون ہے؟ اندر آجاؤ۔'' بلند آواز میں دیے گئے اس جواب پر حاجرہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ رانی کو خود اس نے اپنی کچھ ذاتی چیزوں کی خریداری کے لیے ڈرائیور کے ساتھ مارکیٹ تک بھیجا ہوا تھا۔ پہلے کبھی اس کا لاہور آنا ہوتا تھا تو وہ اپنی ہر طرح کی خریداری کے لیے خود ہی جایا کرتی تھی۔ اس طرح اسے کچھ وقت آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع مل جاتا تھا لیکن اب وہ خود کوٹھی سے باہر نکلنے سے گریز کررہی تھی تاکہ آفتاب کی لاہور آمد پر جب باہر نکلنا پڑے تو ملازمین کو یہ محسوس نہ ہوسکے کہ وہ روز روز سیر سپاٹے کرنے چلی جاتی ہے۔

''کیا کام ہے حاجرہ؟ کیوں آئی ہو؟'' بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے حاجرہ سے پوچھا۔

''وہ بی بی... آپ سے ملنے کے لیے ایک عورت آئی ہے۔ کہتی ہے کشور بی بی سے ملنا ہے۔'' حاجرہ نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

''یہاں کون عورت مجھ سے ملنے آسکتی ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''تم نے نام پوچھا تھا اس عورت کا؟''

''جی بی بی! پر اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ بس یہی کہتی ہے کہ آپ سے ملنا ہے۔ لمبی چوڑی سی برقع والی عورت ہے۔ منہ پر نقاب بھی لگایا ہوا ہے۔ آپ کہیں تو میں جاکر منع کردوں... جانے کون عورت ہے؟ چوکیدار نے اسے گیٹ پر ہی روک رکھا ہے۔'' حاجرہ نے اسے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے اپنی طرف سے آنے والی عورت کو ٹالنے کے سلسلے میں اجازت بھی چاہی۔

''نہیں، رہنے دو۔ میں دیکھتی ہوں۔ شاید میری کوئی جاننے والی ہی ہو۔'' وہ الجھی الجھی سی بستر سے اتر کر کمرے سے باہر کی طرف چل پڑی۔ حاجرہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

''چوکیدار سے کہو کہ عورت کو گیٹ سے اندر آنے دے۔'' گیٹ سے کافی فاصلے پر ہی رک کر اس نے حاجرہ کو حکم دیا تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئی جبکہ کشور اپنی جگہ رک کر انتظار کرنے لگی۔ حاجرہ نے اس کا حکم چوکیدار کو پہنچایا تو ذرا دیر کے تذبذب کے بعد اس نے ذیلی گیٹ کھول کر عورت کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ لمبی چوڑی عورت سر جھکا کر اندر داخل ہوئی اور اعتماد سے چلتی ہوئی فاصلے پر کھڑی کشور کی طرف آنے لگی۔ اس کے پیچھے چوکیدار رائفل تھامے بالکل الرٹ کھڑا تھا۔ عورت ذرا بھی کوئی الٹی سیدھی حرکت کرتی تو وہ اسے فوراً گولی ماردیتا۔ کشور خود الجھن میں کھڑی اس عورت کو دیکھ رہی تھی جو اب اس سے ذرا سے فاصلے پر آکر رک گئی تھی۔

''کون ہیں آپ... اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟'' عورت کے اعتماد سے ذرا سا خائف ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔ جواباً عورت نے کچھ بولنے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر اپنے چہرے پر موجود نقاب ہٹا دیا۔ نقاب کے پیچھے سے نمودار ہونے والے چہرے کو دیکھ کر کشور بری طرح چونکی لیکن یہ اس کا ابتدائی ردِعمل تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ فرطِ مسرت سے عورت کے گلے لگ چکی تھی۔

''آپ مجھ سے ملنے یہاں آئی ہیں... مجھے یقین نہیں آرہا۔'' اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ لہجے میں بھی بے پناہ خوشی تھی۔

''میں نے سوچا کہ اپنی دیورانی کا حال چال ہی معلوم کر آؤں۔ ویسے تمہاری خوشی دیکھ کر تو مجھے سوچنا پڑ رہا ہے کہ مجھے سامنے دیکھ کر تمہارا یہ حال ہے... تو اگر جو کبھی دیور جی اس طرح اچانک آگئے تو تم کیا کرو گی؟'' وہ مسکرا کر دھیمی آواز میں بولتی ہوئی کشور کو چھیڑنے لگی۔ اس چھیڑ چھاڑ پر کشور کا چہرہ گل رنگ ہوگیا لیکن پھر وہ فوراً ہی چونک کر اپنے اطراف میں دیکھنے لگی۔ اسے ڈر محسوس ہوا تھا کہ کہیں حاجرہ نے مہتاب کے الفاظ نہ سن لیے ہوں لیکن یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ حاجرہ کافی فاصلے پر تھی۔ چوکیدار تو خیر تھا ہی دور۔

''چلیں، اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔'' اس نے مہتاب کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور پھر پلٹ کر حاجرہ سے تحکمانہ لہجے میں بولی۔ ''جلدی سے اسپیشل چائے تیار کر کے لے آؤ اور پھر اچھا سا کھانا بھی تیار کرلینا۔''

''کھانے وانے تک میں نہیں رکوں گی۔ وہ تو میرا تم سے ملنے کا بہت دل چاہ رہا تھا اس لیے چلی آئی۔ بچے اسکول گئے ہوئے ہیں۔ ان کے واپس آنے تک مجھے گھر پہنچنا ہوگا۔'' اس کا حاجرہ کو دیا جانے والا حکم سنتے ہوئے مہتاب نے جھٹ اس پر صورتِ حال واضح کی۔

''تو آپ بچوں کے اسکول سے آنے کے بعد انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر آجاتیں نا۔ میرا تو خود بڑا دل کررہا ہے ان سے ملنے کا۔'' مہتاب کی بات سن کر وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ اب وہ دونوں اس کے بیڈروم تک پہنچ چکی تھیں اور کھل کر بات کرسکتی تھیں۔

''بچوں کو میں جان بوجھ کر ساتھ نہیں لائی۔ بچے معصوم ہوتے ہیں۔ انجانے میں ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل سکتی تھی جس کی وجہ سے تم مشکل میں پڑ جاتیں۔''

مہتاب نے اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے بچوں کو ساتھ نہ لانے کی وجہ بتائی۔

''اچھا، آپ یہ برقع تو اتاریں اور آرام سے بیٹھیں۔ ابھی بچوں کی چھٹی میں کافی وقت ہے۔ کھانا چاہے آپ نہ کھائیں لیکن درمیان کا وقت میرے ساتھ ہی گزارنا ہوگا۔'' کشور نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو مہتاب مسکراتی ہوئی برقع اتارنے لگی۔

''ویسے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنی پردہ دار خاتون ہیں کہ گھر سے باہر نکلنے کے لیے باقاعدہ برقع اوڑھتی ہوں گی۔ میں تو ملازمہ کی زبانی یہ سن کر حیران ہی ہورہی تھی کہ کوئی برقع پوش خاتون مجھ سے ملنے آئی ہیں۔ آپ نے اپنا نام بھی تو نہیں بتایا تھا۔''

''نام تو میں نے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ اچانک تمہارے سامنے پہنچ کر تمہیں سرپرائز دے سکوں۔ رہی برقع والی بات تو سچ کہوں، یہ برقع میں پردہ دار ہونے کی وجہ سے نہیں پہنتی بلکہ اس لیے پہنتی ہوں کہ خود کو کچھ لوگوں کی نظروں سے روپوش رکھ سکوں۔'' مہتاب کا جواب سن کر اسے آفتاب کی اس کے متعلق سنائی گئی داستان یاد آگئی۔ مہتاب نئے دور کی سوہنی تھی جس کے لیے محبوب سے ملن زندگی کی بنیادی شرط تھا لیکن اس ملن کے لیے اس نے جو قدم اٹھایا تھا، وہ منہ زور لہروں کو کچے گھڑے پر پار کرنے سے کم نہیں تھا۔ اپنے قبیلے کے رسم و رواج کو ٹھکرا کر وہ ساری دنیا سے ناتا توڑ کر افضل کی بن گئی تھی اور اب بھی اس خوف کا شکار تھی کہ جانے کب کوئی تند لہر اسے اس کے کچے گھڑے سمیت بہا کر لے جائے۔

''اوہو... مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ میں آپ کے آنے سے پہلے آفتاب سے باتیں کررہی تھی۔ ذرا انہیں آپ کے بارے میں بتادوں تاکہ وہ مطمئن ہوجائیں ورنہ بے چارے پریشان ہی ہوتے رہیں گے کہ میں کس مشکل میں گرفتار ہوں۔'' مہتاب سے متعلق آفتاب کی بتائی ہوئی باتیں یاد آئیں تو ساتھ ہی یہ بھی یاد آگیا کہ وہ آفتاب سے اپنی گفتگو ادھوری چھوڑ کر حاجرہ کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔ اب یاد آیا تو فوراً تکیے کے نیچے چھپا موبائل نکال کر آفتاب کو خوشی ...... سے مہتاب کی آمد کے بارے میں مطلع کیا۔

''ٹھیک ہے، آپ بھابی کے ساتھ انجوائے کریں... میں بھی اپنے کام دھندے نمٹاتا ہوں۔'' اس کی دی ہوئی اطلاع سن کر آفتاب نے کہا اور فون بند کردیا۔

''اب آپ بتائیں بھابی کہ کیا حال ہے؟ بچے اور افضل بھائی تو خیریت سے ہیں نا؟'' آفتاب کی طرف سے مطمئن ہوکر وہ مہتاب کے برابر میں آکر بیٹھی اور اس سے پوچھنے لگی۔ اپنا موبائل اس نے بے پروائی سے بیڈ پر ہی ڈال دیا تھا۔

''سب ٹھیک ہیں۔ بچے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ مجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ دلہن چاچی دوبارہ ہمارے گھر کب آئیں گی؟'' مہتاب مسکراتے ہوئے اسے بتانے لگی۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی بے تکلفانہ باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے لگا۔ حاجرہ اس دوران کھانے پینے کی پُرتکلف اشیا سے بھری ٹرالی کمرے میں پہنچا کر جاچکی تھی۔ رانی کے بارے میں بھی اطلاع مل گئی تھی کہ وہ مارکیٹ سے واپس آچکی ہے اور اب باورچی خانے میں حاجرہ کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔ مہتاب کے کھانے سے انکار کے باوجود کشور یونہی اسے واپس نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اگر مہتاب کھانے پر نہ بھی رکتی تو وہ بچوں کے نام سے اس کے ساتھ کھانا باندھ کر بھجوا دیتی۔ ابھی تو خیر وہ باتوں میں مگن تھیں اور مہتاب نے واپس جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ آپس کی باتوں میں مگن وہ دونوں اس وقت چونکیں جب کسی نے بنا دستک دیے دھڑ سے دروازہ کھولا۔ اس غیر مہذبانہ انداز پر کوئی ردِعمل ظاہر کرنے سے قبل ہی کشور نے کھلے دروازے میں کھڑی ناہید کو دیکھ لیا۔

''السلام علیکم اماں! آپ یہاں... وہ بھی اتنی اچانک؟'' وہ بوکھلا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور ماں کی اچانک آمد پر حیرت کا اظہار کرنے لگی۔

''کیوں، میرے یہاں آنے پر پابندی ہے کیا؟ جیسے یہ تیرے باپ کی کوٹھی ہے، ویسے ہی میرے شوہر کی بھی ہے۔ تو یہاں رہ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں رہ سکتی؟'' چودھرائن ناہید نے نروٹھے پن سے جواب دیا۔ عموماً اس کے انداز میں کشور کے لیے بڑی رعایت ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ خاصی خفا لگ رہی تھی۔ کشور اس خفگی کا پس منظر سمجھ سکتی تھی۔ تاجور نے اپنے لاہور کے دورے سے واپس جانے کے بعد یقیناً اس کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہی ہوں گی کہ اس کی ماں سے پیرآباد میں زیادہ دن نہیں رکا گیا اور وہ موقع ملتے ہی بیٹی کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے لاہور آپہنچی۔ ماں کی آمد کا مقصد سمجھتے ہوئے کشور نے بے ساختہ ہی اپنے مہندی سے سجے ہوئے ہاتھ پشت پر کرلیے۔ اس کے ہاتھوں پر لگی مہندی بے شک مدھم پڑ چکی تھی لیکن آفتاب کی محبت کا جو رنگ اس کے پورے وجود پر چڑھا تھا، وہ بہت پکا تھا اور اسے چھپانا بھی ممکن نہیں تھا۔ چودھرائن ناہید نے بھی پہلی نظر میں

ہی اس میں در آنے والی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور اب خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں نے آپ کے یہاں آنے پر اعتراض تو نہیں کیا اماں! آپ آئیں، یہاں بیٹھیں۔'' مہتاب کے سامنے ماں کے لہجے پر سبکی محسوس کرنے کے باوجود کشور نے رسان سے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے اسے اس جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ خود بیٹھی تھی ...... چودھرائن ناہید مہتاب کو گھورتی ہوئی بیٹھ گئی۔

''تسی کون ہو بی بی؟'' بیٹھنے کے بعد اس نے براہِ راست مہتاب سے سوال کیا۔

''یہ میری سہیلی ہیں اماں۔ یہیں کتابوں کی دکان پر میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بس پھر ہماری دوستی ہوگئی۔ آج یہ پہلی بار مجھ سے ملنے یہاں آئی ہیں۔'' مہتاب کے کچھ بولنے سے قبل خود کشور نے اس کا ماں سے تعارف کروایا۔

''ایسے راہ چلتی عورتوں سے دوستیاں گانٹھنے کی تجھے کس نے اجازت دے دی؟ اپنے ابا جی کو جانتی ہے نا؟ وہ تو کتا بھی خریدیں تو اس کی نسل کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرتے ہیں... تو بغیر جانے پرکھے دوستی کر کے راہ چلتوں کو گھر لانے لگی۔'' ناہید کے الفاظ اور لہجہ دونوں اتنے ہتک آمیز تھے کہ مہتاب کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''میں اب چلتی ہوں کشور!'' اس نے کشور کی خاطر چودھرائن ناہید کو کوئی بھی جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے خود پر... ضبط کیا اور کھڑی ہو کر اپنا برقع اوڑھنے لگی۔ کشور کی آنکھوں میں ماں کے رویے کے لیے گہری معذرت تھی لیکن اس وقت وہ کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ مہتاب برقع اوڑھ کر باہر نکلنے لگی تو چودھرائن ناہید کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''یہ فون شاید تمہارا ہے، اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ... یہاں کہاں چھوڑ کر جا رہی ہو؟'' اس نے بستر پر پڑا کشور کا موبائل اٹھا کر مہتاب کی طرف بڑھایا۔

''یہ موبائل میرا نہ...'' مہتاب نے موبائل کی ملکیت سے انکار کرنا چاہا لیکن فوراً ہی کشور نے مداخلت کر کے اسے درمیان میں ہی روک دیا۔

''ارے ہاں اماں! یہ تو ان کا ہی موبائل ہے۔ اچھا ہوا آپ نے صحیح وقت پر دیکھ لیا ورنہ بے چاری کو پریشانی ہو جاتی۔'' اس نے چودھرائن ناہید کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ کر مہتاب کو تھما دیا۔ اس نے بھی صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے خاموشی سے موبائل اپنے پرس میں رکھ لیا اور خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

''میں تجھے اپنے ساتھ واپس گاؤں لے جانے کے لیے آئی ہوں۔ بہت رہ لی یہاں۔ اب واپس چل۔ یہاں رہ کر تو جو ڈرامے کر رہی ہے وہ میں ہور برداشت نہیں کر سکتی۔ ساری حیاتی وڈی چودھرائن سے دب کر رہی ہوں اور اب تیری وجہ سے ہور بھی طعنے سننے پڑتے ہیں۔ حویلی چل، میں دیکھتی ہوں وہاں رہ کر تیرا دماغ کیسے ٹھیک نہیں ہوتا۔ تیرے ابا جی بھی میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔ انہیں مراد کے پاس امریکا جانا ہے۔ ابھی تو وہ مجھے یہاں اتار کر خود کسی کام نال گئے ہیں پھر شام میں ائرپورٹ چلے جائیں گے۔ تو تیاری رکھ۔ ڈرائیور انہیں چھوڑ کر واپس آئے گا تو ہم اس کے ساتھ واپس گاؤں چلے جائیں گے۔'' مہتاب کے جاتے ہی چودھرائن ناہید نے اٹل لہجے میں اسے حکم سنایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی کشور گرنے والے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ جتنے اٹل لہجے میں چودھرائن نے اسے حکم سنایا تھا، اس سے صاف ظاہر تھا کہ چاہے وہ کتنی ہی حیل وحجت سے کام لے، اسے چودھرائن کے ساتھ واپس جانا ہی پڑے گا۔ واپس جانے کا مطلب تھا... آنے والے ویک اینڈ پر آفتاب سے طے شدہ ملاقات سے محرومی۔ اس ملاقات کے حوالے سے ان دونوں کے دلوں میں کتنے ارمان تھے، یہ بات کوئی اور کیسے سمجھ سکتا تھا؟ اور وہ کسی کو سمجھا بھی کیسے سکتی تھی؟ فی الحال تو اس کے پاس موجود آفتاب سے رابطے کا ذریعہ وہ ننھا منا سا موبائل بھی جدا ہو گیا تھا اور وہ ذرا دیر کے لیے ملنے والی پرواز کی آزادی کے بعد ایک بار پھر کسی بے زبان کبوتر کی طرح واپس اپنے قفس کی طرف ہانکی جا رہی تھی۔

☆☆☆

''دیکھ بالے! میرے پیچھے سارے کام ڈھنگ سے نبیڑ لینا۔ اس واری مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ میں تیرے ساتھ وڈی رعایت کر چکا ہوں، پر اب کے کام بگڑا نا تو تیرا انجام اچھا نہ ہوگا... یہ گل چنگی طرح سمجھ لے۔ انور کی طرح میں تجھے کتوں کے آگے ڈلوا دوں گا۔ غداری کی طرح کام چوری بھی نمک حرامی کی نشانی ہے۔ اب کی واری تو نے نمک حرامی دکھائی نا تو سمجھ لے کہ فیر انجام بھی نمک حراموں جیسا ہی ہوگا۔'' ڈیپارچر لاؤنج میں موجود چودھری افتخار بالے کو دھمکی نما ہدایات جاری کر رہا تھا۔ فرماں برداری سے سر ہلاتے بالے کی روح اس کی دھمکیوں پر اندر سے فنا ہوئی جا رہی تھی۔ وہ انور کو اور اس کے انجام کو بھولا نہیں تھا۔ ماہ بانو کا بڑا بہنوئی انور جو اپنی بیوی نگار کو نازک حالت

میں اسپتال پہنچانے کے لیے حویلی کی طرف سے گاڑی کی فراہمی کا طلب گار ہوا تھا اور انکار پر برگشتہ ہو کر بغاوت پر اتر آیا تھا۔ بیوی کی موت کے صدمے نے انور کے حواس چھین لیے تھے اور غصے میں وہ چودھری سے ٹکر لیتے ہوئے اے سی شہریار کا مخبر بن بیٹھا تھا۔ راز کھلنے کے بعد انور کو چودھری کی طرف سے ملنے والی عبرت ناک سزا سہنی پڑی تھی۔ چودھری نے کمزور اور ناتواں انور کو شکاری کتوں کے آگے دھکیل دیا تھا۔ انور اپنے ناتواں وجود کے ساتھ ان طاقتور کتوں سے مقابلہ نہ کر سکا اور کتوں نے لمحوں میں اس کے جسم کو ادھیڑ ڈالا تھا۔ انور کی اس بے بسی سے لطف اندوز ہونے والے بالے نے جب اپنے سانڈ جیسے پلے پلائے جسم کو تصور کی آنکھ سے کتوں سے بھنبھوڑے جانے کا منظر دیکھا تو کانپ اٹھا اور چودھری کی چاپلوسی کرتا ہوا خوشامدانہ انداز میں بولا۔

''آپ فکر نہ کریں سرکار... سب کام خیر نال ہو جائیں گے۔ آپ بس چھوٹے شاہ جی کے پاس امریکا پہنچیں، پیچھے سے میں کام کر کے آپ کو خوش خبری سناتا ہوں۔ اس واری آپ کے دشمن کی ایک نہیں چلے گی۔ میں ناک کے رستے اس کی ساری افسری نکال دوں گا۔ ایک رات میری قید میں گزار لے گا تو اپنے سارے پہنچ والے ماموں چاچوں کو بھول جائے گا۔ بس آپ تھوڑا سا انتظار کریں۔ امریکا سے واپسی پر آپ کے سامنے آپ کی پسند کا تحفہ پیش کر دیا جائے گا۔''

''اپنی گل پر قائم رہنا۔ اگر تو نے میری مرضی کے مطابق کام کیا تو میں بھی تجھے مالا مال کر دوں گا۔ اور ہاں... اس اے سی کے بچے سے کوئی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وڈا نخرا ہے اس میں۔ میں اس کے کزن کی موت پر افسوس کرنے گیا تھا تو اس نے مجھ سے ڈھنگ سے گل تک نہیں کی تھی۔'' چودھری جو شہریار سے خار کھائے بیٹھا تھا، بالے کو اور چڑھانے لگا۔

''تسی بے فکر ہو جاؤ سرکار! اے سی کو تو میں گل کرنا سکھاؤں گا۔ طوطے کی طرح فرفر بولے گا اور وہ سب بتائے گا جو ہم چاہیں گے۔'' بالے نے چودھری کا موڈ بحال کرنے کے لیے بڑک ماری۔

''پر احتیاط سے کام کرنا۔ خبردار! کسی کو ایسا کوئی ثبوت نہ ملنے پائے کہ وہ ہم تک پہنچ سکے۔ بغیر ثبوت کے اے سی کتنا ہی شور مچائے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

''اگر آپ حکم کریں تو اے سی کی زبان ہمیشہ کے لیے ہی بند کر دوں۔ سالا رہے گا نہ شور مچا سکے گا۔'' بالے نے جوش میں زیادہ ہی مستعدی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

''نہیں اوئے... اے سی کو تو میں نے زندہ ہی رکھنا ہے تاکہ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ سکوں۔ وڈا مرغی کی طرح کڑی کو اپنے پروں میں چھپا کر رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جب ہم اس کڑی کو مسل کر رکھ دیں گے تو اے سی کی جو حالت ہوگی، اسے دیکھ کر ہمیں اس کی موت سے زیادہ خوشی ملے گی۔'' چودھری نے فوراً ہی بالے کی تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے شیطانی ذہن میں پلتی خواہش کا اظہار کیا۔

''جیسی آپ کی مرضی سرکار! بالا تو آپ کے حکم کا غلام ہے۔'' بالے نے ایک بار پھر خوشامدانہ انداز اختیار کیا جس پر بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چودھری نے اپنی گردن موڑ لی۔ ایسے لہجے اور رویے اس کی زندگی کے معمولات میں شامل تھے۔ وہ ہمیشہ سے لوگوں کو اپنے سامنے جھکتے دیکھنے کا عادی تھا۔ اگر کبھی کوئی جھکنے سے انکار کر دیتا تو وہ بے چین ہو جاتا اور اسے جھکانے کی ترکیبیں سوچنے لگتا۔ اب بھی اسے کافی اطمینان ہو گیا تھا کہ شہریار سے ماہ بانو کا پتا حاصل کر کے اسے اپنے قبضے میں لانے کے بعد شہریار کی بے بسی کا تماشا دیکھ سکے گا۔ اسی پُرفریب خواب کو آنکھوں میں سجائے وہ چیکنگ کے مراحل سے گزرتا ہوا جہاز میں پہنچ گیا۔ اس کے لیے بزنس کلاس میں سیٹ ریزرو ڈ تھی۔ وہاں مسافروں کے استقبال کے لیے موجود ائرہوسٹس نے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ سجاتے ہوئے اس کی سیٹ تک راہنمائی کی۔ ائرہوسٹس کی یہ دل فریب مسکراہٹ سراسر کاروباری نوعیت کی تھی جس سے وہ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے مطابق ہر ایک مسافر کو نوازتی تھی لیکن چودھری جیسے خود پسند بندے نے اس مسکراہٹ کو خاص اپنے لیے تصور کیا اور اس کی عیش پرست فطرت خوش ہو گئی کہ طویل سفر کے دوران ذرا رنگینی اور موج مستی رہے گی۔ دورانِ سفر ائرہوسٹس سے دل پشوری کے خیال نے اسے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے گورے کی موجودگی پر بھی کبیدۂ خاطر نہیں ہونے دیا۔ ویسے وہ عموماً گوروں کی ہم سفری کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے اور مختصر گفتگو کرنے والے گوروں کی سنگت اسے بور کر دیتی تھی۔ ایسے لوگ زیادہ بات چیت کا موقع ہی نہیں دیتے تھے تو انہیں اپنے مربعوں اور جاگیر کے قصے سنا کر مرعوب کیا خاک کیا جا سکتا؟ جہاز کے ٹیک آف کرنے تک وہ گورے کی طرف سے رخ موڑے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ البتہ سیٹ بیلٹ باندھنے کے لیے آنے والی ائرہوسٹس کی قربت کے لمحات طویل کرنے کے لیے اسے اپنے ساتھ خوب الجھائے رکھا۔ ائرہوسٹس اپنے ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ

سجائے اسے برداشت کرتی رہی لیکن اس کی آنکھوں سے جھلکتی ناگواری واضح تھی۔ جہاز کے ٹیک آف کرنے کے بعد جب پرواز ہموار ہوگئی اور پائلٹ کی طرف سے مسافروں کو سیٹ بیلٹ کھول لینے کا عندیہ دیا گیا تو چودھری نے خود سے یہ معمولی کام انجام دینے کے بجائے ائرہوسٹس کی خدمات حاصل کرنا ضروری سمجھا اور سیٹ کے ساتھ لگے بٹن کو دبانے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''لائیں جناب! میں آپ کی سیٹ بیلٹ کھول دیتا ہوں۔'' چودھری کے بٹن دبانے سے پہلے اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا گورا شائستگی سے رواں اردو میں بولا۔ گورے کی زبان سے اتنی صاف اردو سن کر چودھری اتنا حیران ہوا کہ بٹن دبانا بھول گیا۔ اس کی حیرانی کی پروا نہ کرتے ہوئے گورے نے اس کی طرف جھک کر اس کی سیٹ بیلٹ کھول دی۔

''آپ تو بڑی صاف اردو بول لیتے ہیں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ آپ اردو جانتے ہوں گے۔ شاید آپ نے پاکستان میں طویل عرصہ گزارا ہے۔'' گورے کے اردو بولنے پر حیرت کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ چودھری نے اندازہ بھی لگایا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب! میں یہاں بے شک کئی بار آچکا ہوں لیکن اردو میں نے یہاں سے نہیں بلکہ امریکا میں ہی رہ کر سیکھی ہے۔ اصل میں مجھے زبانیں سیکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں اردو کے علاوہ اور بھی کئی زبانیں روانی سے بول سکتا ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھ سے پنجابی میں بات کر سکتے ہیں۔'' گورے نے اسے مزید حیران کیا۔

''یہ سن کر مینو وڈی خوشی ہوئی ہے۔ اردو اور پنجابی بولنے والا امریکی مینو پہلی واری ملا ہے۔ ایسا کرو، پہلے تہاڈا تعارف کرا دو تا کہ آگے چنگی گل شل رہے۔'' چودھری نے پُرجوش انداز میں فرمائش کی۔

''میرا نام ڈیوڈ ہے۔ پیشے کے اعتبار سے میں انجینئر ہوں لیکن سیاحت خصوصاً کلائمبنگ کا بڑا شوق ہے۔ یہ شوق مجھے بار بار مشرقی ممالک کا رخ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ آپ اپنے بارے میں بتائیے کہ آپ کیا شغل فرماتے ہیں؟ ویسے آپ کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے میں نے آپ کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا ہے، اس کے مطابق تو آپ کوئی فیوڈل لارڈ ہی ہو سکتے ہیں۔''

''آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے جی۔ میرا نام چودھری افتخار عالم شاہ ہے۔ میں پیرآباد نامی ایک گاؤں کا مالک ہوں۔ پرکھوں سے ہم وہاں حکمرانی کرتے آرہے ہیں۔ پڑھنے لکھنے اور سیر و تفریح کے لیے ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں لیکن پھر اپنے اصل ٹھکانے کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ ابھی میں اپنے پُتر سے ملنے نیویارک جا رہا ہوں۔ تھوڑے دن اس کے ساتھ رہ کر واپس آجاؤں گا۔ میرا پتر ذرا وکھری ٹائپ ہے۔ پرکھوں کی طرح اسے حکمرانی کا ذرا شوق نہیں ہے۔ امریکا میں رہ کر پڑھا لکھا اور اب وہیں ملازمت کر کے خوش ہے۔ پتا نہیں آپ کے ملک میں ایسی کیا گل ہے کہ ہمارے جوانوں پر جادو ہو جاتا ہے۔ واپس آنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔'' چودھری نے شکوہ کیا۔

''ارے نہیں چودھری صاحب! ہمارے ہاں کچھ نہیں رکھا ہوا، جو کچھ ہے مصنوعی ہے۔ اصل حسن اور جادونگری تو آپ کے ملک میں موجود ہے۔ میں تو آپ کے شمالی علاقہ جات کے حسن کا اتنا عاشق ہوں کہ موقع ملتے ہی یہاں کا رخ کرتا ہوں۔ کہنے والے آپ کے نانگا پربت کو دیامیر یعنی پریوں کی سرزمین کہتے ہیں اور سچ کہوں تو مجھے بھی ان برف پوش پہاڑیوں پر پریاں رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آپ پاکستانی تو اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتے ورنہ ایک بار ان برف پوش پہاڑوں کی سیر کے لیے چلے جائیں تو ہمارے امریکا کو بھول ہی جائیں۔'' ڈیوڈ کے انداز سے ظاہر تھا کہ واقعی وہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی خوب صورتی سے بہت متاثر ہے۔

''آپ کہتے ہیں تو ماننا ہی پڑے گا مسٹر ڈیوڈ! ہم پاکستانیوں کو تو ویسے بھی امریکا کی ہر گل ماننے کی عادت ہے۔'' چودھری اپنی بات کہہ کر خود ہی بلند آواز میں ہنسا۔

''باقی باتوں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا چودھری صاحب لیکن جو بات میں آپ سے کہہ رہا ہوں، اس پر تو آپ آنکھیں بند کر کے یقین کر لیں... کیونکہ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم امریکی کبھی بھی کسی غلط جگہ اپنا سرمایہ خرچ نہیں کرتے۔ میں اتنا خرچہ کر کے ان علاقوں کی سیر کرنے آتا ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ خاص ہے ان علاقوں میں ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے اپنی رقم ضائع کرنے کی؟'' ڈیوڈ نے ایسی دلیل دی کہ چودھری کو قائل ہونا پڑا۔

''گل تو تہاڈی ٹھیک ہے۔ اب تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں ادھر کی سیر کے لیے جاؤں۔''

''تو ایسا کریں نا چودھری صاحب میرے... ساتھ پروگرام رکھ لیں۔ آپ مجھے اپنا کانٹیکٹ نمبر دے دیں۔ میں نیکسٹ ٹائم پاکستان آؤں گا تو آپ کو انفارم کر دوں گا۔ پھر

آپ میری ٹیم کے ساتھ چلیے گا۔ ویسے ہم لوگ تو کافی اوپر تک جاتے ہیں، آپ کی جہاں تک ہمت ہو ہمارا ساتھ دیجیے گا۔ اصل میں کلائمبنگ میں فٹنس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں لوگ اپنی فٹنس کا خیال نہیں رکھتے اس لیے زیادہ بلندی تک نہیں جا پاتے ورنہ تو ہمارے پاس ان لوگوں کی بھی مثالیں ہیں جو ستر اسی سال کی عمر میں کے ٹو کے بیس کیمپ تک پہنچ گئے۔'' ڈیوڈ کے آخری الفاظ نے چودھری کی انا کو زک پہنچائی لیکن بہرحال، سچ سچ تھا اس لیے وہ چاہنے کے باوجود ڈیوڈ کے سامنے کوئی بڑک نہیں مار سکا۔ اگر وہ ابھی اپنی جواں مردی کا دعویٰ کر بیٹھتا تو آنے والے وقت میں اسے ثابت نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ اس موضوع پر خاموشی کو ہی غنیمت جانا اور ڈیوڈ کو اپنا کانٹیکٹ نمبر لکھوانے لگا۔

''چلیں تو پھر ڈن ہو گیا کہ اب جب بھی میرا دوبارہ پاکستان آنا ہوا، ہم ساتھ مل کر ایکسپی ڈیشن پر چلیں گے۔ ابھی میں ایسا کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے حالیہ وزٹ کی تصویریں دکھاتا ہوں۔ بڑے شان دار سینز شوٹ کیے ہیں میں نے۔'' چودھری کا کانٹیکٹ نمبر نوٹ کرنے کے بعد ڈیوڈ اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے بولا اور اس میں سے ایک بڑا سا لفافہ نکالا۔

''اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے تصویریں بنائی تھیں میں نے۔ زیادہ تر تو ابھی کیمرے میں ہی محفوظ ہیں۔ بس کچھ خاص خاص تصویریں جو مجھے زیادہ ہی پسند آئی تھیں، انہیں میں نے یہیں سے ڈیولپ کروا لیا۔ آپ تصویریں دیکھیں گے تو خود میرے حسنِ نظر کے قائل ہو جائیں گے۔'' اس نے لفافہ چودھری کے ہاتھ میں تھمایا۔ لفافے کے وزن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں اچھی خاصی تصویریں موجود ہیں۔ چودھری نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک البم برآمد ہوا۔ وہ پُراشتیاق انداز میں البم کھول کر اس میں لگی تصویروں کا جائزہ لینے لگا۔ ڈیوڈ کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔ واقعی اس نے بڑی خوب صورتی سے قدرتی مناظر کو کیمرے کی آنکھ سے قید کیا تھا۔ چودھری بے ساختہ ہی تعریفیں کرتا ہوا ایک ایک تصویر دیکھتا آگے بڑھتا رہا لیکن پھر اچانک ایک مقام پر اس کی بولتی بند ہوگئی اور وہ حیرت سے گنگ تصویر میں نظر آنے والے چہرے کو دیکھنے لگا۔ بھاری گرم لبادے میں کسی پہاڑی دوشیزہ کے روپ میں موجود وہ لڑکی ماہ بانو ہی ہے، اسے شناخت کر لینے کے باوجود اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کی انا کے لیے امتحان بن کر اس کی نیندیں چھین لینے والی ماہ بانو چہرے پر مسکراہٹ سجائے خوشی کی محفلوں میں شرکت کرتی پھر رہی تھی... اس بات کو سوچ کر اس کا تن بدن سلگ اٹھا۔

''خوب صورت لڑکی ہے نا چودھری صاحب؟ مجھے بڑی اچھی لگی تھی اس لیے میں نے اس کے کئی پوز لے لیے تھے۔ آپ آگے دیکھیں، آگے اور بھی پوز ہیں اس لڑکی کے۔'' چودھری کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈیوڈ نے اس سے کہا اور پھر خود ہی ہاتھ بڑھا کر نئی تصویر سامنے کر دی۔

''یہ لڑکی آپ کو کہاں ملی تھی مسٹر ڈیوڈ؟'' تصویر پر نظر جمائے جمائے چودھری نے سرسراتی ہوئی آواز میں ڈیوڈ سے سوال کیا۔

''اسے میں نے ایک پہاڑی گاؤں میں دیکھا تھا۔ میں اپنی ٹیم کے ساتھ اس گاؤں کی کیمپنگ سائٹ میں موجود تھا کہ ہمیں اطلاع ملی، گاؤں میں شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔ ہم لوگ مقامی شادی دیکھنے کے شوق میں بغیر دعوت کے وہاں جا پہنچے۔ بڑے اچھے مہمان نواز لوگ تھے گاؤں والے۔ انہوں نے ہمارے اس طرح پہنچنے کا برا نہیں مانا بلکہ تصویریں بنانے کی بھی اجازت دے دی۔ تصویریں بناتے ہوئے میری اس لڑکی پر نظر پڑی تو بس بے ساختہ ہی اس کی کئی تصویریں لے بیٹھا۔'' ڈیوڈ نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''اس گاؤں کا کیا نام تھا مسٹر ڈیوڈ؟'' ڈیوڈ کی تفصیلات میں سب کچھ ہونے کے باوجود بنیادی جواب نہیں تھا اس لیے اس بار چودھری نے ذرا زیادہ وضاحت سے اپنا سوال دہرایا۔

''خیریت ہے چودھری صاحب! مجھے لگتا ہے کہ آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں اور اس کی تصویر دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے ہیں؟'' ڈیوڈ کا انداز اگرچہ سرسری تھا لیکن وہ بہت گہری نظروں سے چودھری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی اس لڑکی کو جانتا ہوں۔ اس کا نام ماہ بانو ہے اور یہ میرے ایک مزارع کی بیٹی ہے۔ یہ لڑکی کافی دنوں سے اپنے گھر سے غائب ہے اور اس کے ماں باپ اس کے لیے بے حد پریشان ہیں۔ میں نے اپنے طور پر اسے تلاش کروانے کی کوشش کی تھی لیکن میرے لوگ کامیاب نہ ہو سکے۔ کسی کو گمان ہی نہیں تھا کہ لڑکی اتنی دور ایک پہاڑی گاؤں میں پہنچی ہوئی ہوگی۔'' چودھری نے ایک ہمدرد حکمراں کا سا لہجہ اختیار کرتے ہوئے ڈیوڈ کو تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''اوہ، آئی سی! خیر، آپ فکر نہ کریں بلکہ یہ سمجھیں کہ آپ کی تلاش اب ختم ہوئی۔ میرے رابطے ہیں وہاں۔ ہم

لینڈ کر جائیں پھر میں پاکستان میں موجود اپنے دوستوں سے رابطہ کر کے اس لڑکی کو اس کی موجودہ قیام گاہ سے بازیافت کروالوں گا۔ اگر اغوا وغیرہ کا معاملہ ہے تو میں آپ کی پولیس کے ذریعے بھی یہ کام لے سکتا ہوں۔'' ڈیوڈ کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا کہ وہ غیر ملکی ہونے کے باوجود پاکستان میں کافی مضبوط رابطے رکھتا ہے۔

''نہ جی! پولیس کے ہاتھ میں معاملہ نہیں دینا ہے۔ وہ لوگ خوامخواہ کا ایشو بنا دیتے ہیں۔ مجھے لڑکی بالکل رازداری سے اپنے قبضے میں چاہیے۔'' چودھری نے فوراً ہی ڈیوڈ کی تجویز سے انکار کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''جیسا آپ چاہیں، ویسا ہی ہوگا چودھری صاحب! آخر آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو دوستی نبھانی بھی ہوگی۔ میرے خیال میں ہم منزل پر پہنچ جائیں تو پھر اس موضوع پر کھل کر بات کریں گے۔ آپ مجھے تفصیل سے بتائیے گا کہ آپ کا پرسنلی لڑکی میں کیا انٹرسٹ ہے... بلکہ ایسا ہے کہ میں آپ کو اپنے ہاں کھانے پر انوائٹ کروں گا پھر ہم کھل کر اور اعتماد کی فضا میں بات چیت کریں گے۔ آپ البتہ اتنا اطمینان رکھیں کہ آپ کی ماہ بانو اب آپ کے ہاتھ سے نکلنے والی نہیں ہے۔ وہ ہماری نظر میں ہے بلکہ آپ ایک طرح سے یہی سمجھیں کہ وہ ہمارے پاس ہے۔ آپ جب چاہیں گے، وہ آپ کو مل جائے گی۔'' ڈیوڈ کے آخری جملے بڑے معنی خیز تھے۔ ان جملوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ماہ بانو کو اچھی طرح جانتا ہے اور چودھری کی اس کے لیے بے تابی سے بھی واقف ہے۔ یعنی اب تک جو کچھ چودھری کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا، وہ محض ایک ڈراما تھا۔ اس ڈرامے کا مقصد سمجھنے کے لیے چودھری، ڈیوڈ کے چہرے کا ٹٹولنے والی نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ وہاں صاف لکھا تھا کہ اس کا اندازہ غلط نہیں ہے۔

''کون ہو تم؟ اور ماہ بانو کے بدلے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' اس نے سرد سے لہجے میں ڈیوڈ سے دریافت کیا۔

''ان سوالوں کے جواب کے لیے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔'' ڈیوڈ نے اس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں جواب دیا اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتا ہوا بولا۔ ''ایکسکیوز می! میں بہت تھک گیا ہوں، اب آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کے لہجے اور چہرے کے تاثرات میں وہی رعونت تھی جو حکمرانی کرنے والوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ چودھری اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا خود بھی اس کی طرف سے رخ موڑ گیا۔ ڈیوڈ اس کی جاگیر پر کام کرنے والا کوئی بے بس مزارع نہیں تھا جس سے وہ کسی قسم کی زبردستی کر سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا موڈ خراب کر سکتا تھا، سو وہ تو پہلے ہی خراب ہو چکا تھا۔ مزاج کی اس خرابی نے اسے طویل سفر میں ائر ہوسٹسوں سے دل پشوری کا خیال بھی بھلا دیا تھا۔

☆☆☆

کشور بستر پر چت لیٹی کمرے کی چھت کو گھور رہی تھی۔ یہ کمرا اس کے لیے ایک ایسے قفس کے مانند تھا جہاں اسے ہر حال میں لوٹ کر واپس آنا ہی پڑتا تھا۔ اس بار بھی وہ لاہور میں آزادی کے چند دن گزارنے کے بعد واپس یہاں پہنچا دی گئی تھی۔ چودھرائن ناہید نے اس کی ایک نہ سنتے ہوئے اسے اپنے ساتھ حویلی آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حویلی کی یہ قید اس پر پہلے بھی اتنی بھاری نہیں گزری تھی جتنی کہ اب... اب تو دل ہمیشہ اپنے دلدار کے ساتھ رہنے کی خواہش کرتا تھا لیکن اچانک حویلی واپسی نے سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ جو آنے والے دنوں میں ایک بار پھر آفتاب کی بانہوں میں سما کر زندگی کی خوشیاں کشید کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی، یک دم ہی زمین پر آ گری تھی۔ بالائے ستم یہ کہ آفتاب سے رابطے کا ذریعہ وہ موبائل بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ موبائل کو اپنی ملکیت نہ ظاہر کرنے کے چکر میں اسے موبائل مہتاب کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ اس وقت اگر موبائل ہی اس کے پاس ہوتا تو وہ آفتاب سے بات کر کے ہی اپنی تسلی کر لیتی۔ جب آمنے سامنے بیٹھ کر ملاقات کرنے کی سبیل نہ نکلے تو اس ننھے سے برقی آلے کا سہارا بھی غنیمت لگتا ہے لیکن اس سے تو یہ سہارا بھی جدا ہو گیا تھا۔ لاہور سے پیر آباد واپس آتے وقت راستے بھر اور اب اپنے کمرے میں عالمِ استراحت میں بھی اس کا ذہن مسلسل اپنے موبائل میں ہی اٹکا رہا تھا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ آفتاب میری کال کا انتظار کر رہے ہوں گے، انتظار سے تھک کر اب انہوں نے خود کال ملالی ہوگی... شاید مہتاب بھابی نے ان کی کال ریسیو کی ہو اور بتا دیا ہو کہ کشور کو اس کی ماں واپس حویلی لے گئی ہے۔ آفتاب یہ اطلاع سن کر بڑے مایوس ہوئے ہوں گے۔

آفتاب کی مایوسی کا سوچ کر وہ مزید افسردہ ہو گئی اور چھت پر سے نظر ہٹا کر اپنے ہاتھوں پر ڈالی۔ کچھ دن قبل خوب کھل کر اپنا رنگ جمانے والی مہندی کے نقش و نگار بے حد مدھم پڑ چکے تھے لیکن وہ حنا کے رنگ سے ہٹ کر بہ ظاہر غیر مرئی لیکن حقیقتاً بہت گہرے آفتاب کی محبت کے رنگوں کو وہاں دیکھ سکتی تھی۔ یہ رنگ تو اس کی پور پور میں بس گئے تھے۔ اس کے

مضبوط مردانہ ہاتھوں کی پُرجوش سی گرفت، ہونٹوں کی نرم سی حدت، پُرشوق نگاہوں کی شوخی... سب کچھ ہی تو بڑی آب و تاب سے اس کے وجود سے لپٹا ہوا تھا۔ آفتاب نے اتنی نزاکت سے اسے اپنی محبت کے رنگوں سے رنگا تھا کہ وہ اس کی مہارت کی قائل ہو گئی تھی۔ اس کی بے رنگ تصویر آفتاب کی محبت کے رنگوں سے رنگ کر ایسی سجی تھی کہ اب اس کا دل چاہتا تھا، وہ ہر روز نئے سرے سے ان رنگوں سے رنگی جائے... مگر یہاں اس قفس تک آفتاب کی رسائی ہی کہاں تھی؟ حویلی میں رہ کر وہ آفتاب سے ملنے کی خواہش کرتی تو اسے رات کی تاریکی میں چھپ کر اس انڈسٹریل ہوم تک جانا پڑتا جہاں پہلی بار اس نے آفتاب کو اپنے جسم و جاں سونپے تھے... جہاں وہ دونوں نکاح کے بندھن میں بندھے تھے اور آفتاب نے اپنے تعلق پر سے ہوس کا ٹیگ ہٹا کر محبت کا جگمگاتا نیون سائن آویزاں کر دیا تھا۔ انڈسٹریل ہوم تک راتوں کو چھپ کر ملاقات کے لیے جانا بہت خطرناک تھا۔ خطروں سے وہ اتنا نہیں ڈرتی تھی لیکن نکاح کے بعد اس نے خود اپنے آپ پر یہ پابندی عائد کر لی تھی کہ وہ اس جگہ آفتاب سے ملنے نہیں جائے گی۔ وہ اپنے کیے اس فیصلے پر قائم بھی رہنا چاہتی تھی لیکن افضل اور مہتاب کے گھر اس کی اور آفتاب کی جو یادگار ملاقاتیں ہوئی تھیں، اس کے بعد آفتاب سے زیادہ دن کی دوری برداشت کرنا بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ لاہور سے روانہ ہونے سے لے کر اب تک وہ گھنٹوں اس مسئلے پر سوچتی رہی تھی۔ شاید بہت زیادہ سوچنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی دباؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ اسے اپنا پورا جسم بری طرح تھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عجیب سی کسل مندی اور سستی تھی کہ وہ بستر سے اٹھنے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ حالانکہ کئی بار فریدہ سے ملاقات کا خیال بھی دل میں آیا۔ حرماں نصیب فریدہ جو ذہنی معذور بہزاد شاہ کی منکوحہ کی حیثیت سے حویلی کی اوپری منزل میں مقیم تھی اور جسے درحقیقت ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چودھری اپنی ہوس کا پیٹ بھرنے کے لیے حویلی لے کر آیا تھا... وہ فریدہ سے مل کر اسے اپنے باپ کے اس ظلم کے خلاف لڑنے پر اکسانا چاہتی تھی لیکن جب اس نے فریدہ سے ملاقات کے خیال سے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو اتنی بری طرح سر چکرایا کہ پھر وہ ہمت ہی نہیں کر سکی۔ طبیعت میں عجیب سا بھاری پن تھا۔ یہاں تک کہ ملازمہ رات کے کھانے کا پوچھنے آئی بھی تو اس نے انکار کر دیا۔ ایک اور مصیبت یہ تھی کہ رانی اس کے ساتھ حویلی واپس نہیں آئی تھی۔ اسے وڈی چودھرائن کی طرف سے حکم بھجوایا گیا تھا کہ وہ لاہور والی کوٹھی میں ہی رک کر حاجرہ کے ساتھ کوٹھی کا کام کاج دیکھے۔ کشور نے اس حکم پر احتجاج کیا تھا لیکن اس کے احتجاج کو خاطر میں نہیں لایا گیا اور رانی کو لاہور میں ہی رکنا پڑا۔ رانی کے بغیر وہ خود کو بالکل بے دست و پا محسوس کر رہی تھی۔ وہی تھی جو اس کی آفتاب تک رسائی کو ممکن بناتی تھی۔ وہ نہیں تھی تو نہ تو پیغام رسانی کا کوئی ذریعہ تھا، نہ ہی ملاقات کی کوئی سبیل نکالی جا سکتی تھی۔ حویلی کے سازشی ماحول میں رانی جیسی وفادار ملازمہ کے بغیر موجودہ صورتِ حال میں رہنا اسے عذاب ناک لگ رہا تھا۔ اتنا عذاب ناک کہ سوچ سوچ کر سر چکرانے لگا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے چکراتے سر کو تکیے پر ادھر ادھر پٹختی نیند کے مہربان ہونے کا انتظار کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور پھر فوراً ہی نجھی دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں بڑی سی ٹرے تھام رکھی تھی۔

''کھانا کھا لیں بی بی! وڈی دیر ہو گئی ہے۔ رات میں خالی پیٹ سونا صحت کے لیے چنگا نہیں ہوتا۔'' کشور کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

''تجھ سے کس نے کہا تھا کھانا لانے کو؟ چل جا یہاں سے۔ مجھے نہیں کچھ کھانا وانا۔'' نجھی سے پہلے ہی اس کی جان جلتی تھی اور اس وقت تو ویسے ہی طبیعت بڑی عجیب ہو رہی تھی اس لیے بالکل بھی برداشت نہیں کر سکی اور نجھی کو ڈپٹ کر رکھ دیا۔

''یہ میرے کہنے سے آئی ہے۔'' نجھی اس کے حکم پر واپس پلٹتی، اس کے بجائے کمرے میں وڈی چودھرائن کی آواز گونجی۔ وہ شاید نجھی کے پیچھے پیچھے ہی وہاں تک آئی تھی اور اب بالکل عین وقت پر دخل انداز ہوئی تھی۔

''مجھے مالوم ہے رانی کے شہر میں رکنے کی وجہ سے تجھے پریشانی ہوگی اس لیے میں نے نجھی کو حکم دیا تھا کہ جب تک رانی حویلی میں نہیں ہے، اسے تیرا خیال رکھنا ہوگا۔ چل اب اٹھ اور اٹھ کر کھانا کھا لے تاکہ اس وچاری کی ڈیوٹی بھی ختم ہو۔'' چودھرائن کی طرف سے محبت کا یہ اظہار درحقیقت اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

''میرا جی نہیں کر رہا وڈی ماں!'' وہ وڈی چودھرائن کے احترام میں لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی لیکن کھانا کھانے پر پھر بھی آمادہ نہیں تھی۔

''جی نہیں کر رہا، تب بھی تھوڑا سا کھا لے۔ تیری طبیعت پہلے ہی صحیح نہیں، بھوکی رہ کر اور کمزور ہو جائے گی۔'' چودھرائن اس واقعے کے حوالے سے اس کی طبیعت کو خراب قرار دے رہی تھی جب وہ چودھری کو فریدہ کے ساتھ قابلِ

اعتراض حالت میں دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی اور عالمِ طیش میں چودھری کے مقابل کھڑی ہو گئی تھی۔ اس وقت چودھری نے خود کو بچانے کے لیے اسے ذہنی طور پر بیمار قرار دیتے ہوئے علاج کے بہانے لاہور بھجوا دیا تھا حالانکہ درحقیقت خود اس میں حوصلہ نہیں رہا تھا کہ اپنی چوری پکڑی جانے کے بعد بیٹی کا سامنا کر سکے اور اس سے نظر ملا سکے۔

''تو کیا ابھی تک ٹرے پکڑ کر کھڑی ہے؟ یہاں رکھ بی بی کے سامنے۔'' اس بار چودھرائن نے چھی کو ڈانٹتے ہوئے حکم دیا تو اس نے ٹرے کشور کے سامنے رکھ دی۔ کشور کو اندازہ ہو گیا کہ وڈی چودھرائن ایسے ٹلنے والی نہیں۔ چاہے اسے دوبارہ اس قید خانے میں بلا لینے کی خوشی میں اس کی بے بسی سے حظ اٹھانے کے لیے ہی سہی... وہ اس وقت اس کی ہمدرد بنی کھڑی تھی تو وہ اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ دل پر جبر کرتے ہوئے اس نے کھانے سے بھری ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پلیٹ میں تھوڑا سا سالن نکال کر روٹی کا لقمہ منہ میں رکھا۔ لقمہ منہ میں رکھتے ہی اسے زور کی ابکائی آئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ غسل خانے کی طرف دوڑی لیکن اس بری طرح سر چکرایا کہ خود کو سنبھال نہیں سکی۔ اگر بروقت چھی اسے سہارا نہ دیتی تو وہ فرش پر گر پڑتی۔ چھی کے سہارے وہ نڈھال سی اپنے بستر تک پہنچی۔ منہ میں رکھا لقمہ تو پیلے پیلے پانی کے ساتھ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ بستر پر بیٹھنے کے بعد بھی اسے دوبارہ ابکائی آئی، اس بار اس کے پیٹ سے صرف پانی نکلا۔

''ڈرائیور سے کہہ چھی کہ اسپتال سے ڈاکٹرنی کو لے کر آئے۔ ڈاکٹرنی آ کر دیکھے تو مالوم ہو کہ کیا ہوا ہے کڑی کو؟'' کشور دو ہی الٹیوں کے بعد پیلی پڑ گئی تھی اور اب بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نڈھال سی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی حالت کا بہ غور جائزہ لیتی چودھرائن نے سرد سے انداز میں چھی کو حکم دیا۔ وہ فوراً اس کے حکم کی تعمیل کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

''اور ہاں، اس کی ماں کو بھی خبر کر دینا دھی کی طبیعت کی خرابی کے بارے میں۔ اس کو اپنی نیندیں پوری کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی، دھی کی خبر کیا خاک رکھے گی۔'' یہ دوسرا حکم وڈی چودھرائن نے چھی کے کمرے سے باہر نکلتے نکلتے جاری کیا تھا جسے سن کر چھی تو سر ہلاتی باہر کی طرف دوڑ گئی لیکن نڈھال سی کشور کے اندر عجیب سا احساس جاگا۔ وڈی چودھرائن کے کٹیلے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ابتر ہوئی حالت کے باوجود وہ اس کی بات پر غور کرنے لگی۔ یک دم ہی اس کے اندر ایک احساس جاگا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ سوچنے کے نتیجے میں جو خیال ذہن میں ابھرا اس نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ جو نڈھال سی بیٹھی تھی، بیٹھنے کی سکت بھی کھو بیٹھی اور بستر پر لڑھک سی گئی۔ زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصولتے ہوئے یہ خیال تو ذہن میں آ ہی نہیں سکا تھا کہ کبھی ایسی کسی صورتِ حال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

''کیا گل ہے وڈی آپا! کیا ہوا ہے کشور کو؟'' وہ آنکھیں بند کیے خوف زدہ سی لیٹی تھی کہ اسے اپنی ماں چودھرائن ناہید کی پریشان اور بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔ الٹیوں پر الٹیاں کر رہی ہے۔ اب کیا ہوا ہے یہ تو ڈاکٹرنی ہی آ کر بتائے گی۔ ڈرائیور کو بھجوایا ہے میں نے ڈاکٹرنی کو لانے کے لیے۔'' وڈی چودھرائن کے طنز بھرے لہجے پر اندر ہی اندر مزید سہمتے ہوئے کشور نے آنکھوں کے درمیان ذرا سی جھری بنا کر کمرے کا منظر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جبکہ وڈی چودھرائن اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھی فرش صاف کرتی شادو کا جائزہ لے رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے کشور! کیا الٹا سیدھا کھا لیا تھا جو ایسے طبیعت خراب ہو گئی؟'' چودھرائن ناہید نے کشور کے قریب آ کر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کشور اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکی اور چپ چاپ پڑی رہی۔ خاموشی سے بوجھل پریشان کن لمحات آخر کار کسی نہ کسی طرح آگے بڑھ ہی گئے اور ڈاکٹر ماریا حویلی آ پہنچی۔ آتے کے ساتھ اس نے پیشہ ورانہ انداز میں کشور کا چیک اپ کیا اور اس سے اس کے کھانے پینے کے متعلق چھوٹے موٹے سوالات کیے۔ چیک اپ سے فارغ ہونے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی وڈی چودھرائن کی طرف پلٹی اور اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے چودھرائن صاحبہ! ایسا کوئی تشویشناک مسئلہ نہیں ہے بلکہ آپ کے لیے ایک اچھی خبر یہ ہے کہ...'' اس ''کہ'' کے آگے وہ جو بھی کہنے والی تھی، وہ حویلی کے در و دیوار کو لرزا کر بھی رکھ سکتا تھا۔ آنے والے طوفان کی آہٹیں سنتی چودھرائن ناہید کا دل چاہا کہ وہ ڈاکٹر ماریا کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دے... جبکہ خود کشور کا یہ حال تھا کہ طبیعت کی خرابی سے اس کا پیلا پڑ جانے والا چہرہ۔ خوف کی زردی سے مل کر اور بھی پیلا ہو گیا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

''کل ہمارے یونٹ کی عراق کے لیے روانگی ہے۔'' کرنل جیسن نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سلسلے میں کوئی سوال؟''

سوزن نے ہاتھ اوپر کیا۔ ''مجھے ایک سوال پوچھنا ہے؟''

''پوچھو سولجر!'' کرنل جیسن نے کرخت لہجے میں کہا۔

''سر.....! ہمیں لڑنے کے لیے عراق کیوں بھیجا جا رہا ہے؟''

''اس لیے کہ ہمیں عراق سے خطرہ ہے۔''

''کیسا خطرہ سر... عراق نے کبھی امریکا پر حملہ نہیں کیا؟''

''یہ خطرہ عام نوعیت کا نہیں ہے۔'' کرنل جیسن نے جواب دیا۔ ''عراق مہلک ہتھیار بنا رہا تھا اور وہ یہ ہتھیار دہشت گردوں کے حوالے کر سکتا تھا اس لیے امریکا نے اس پر پیشگی حملہ کر دیا۔''

''سر!'' ایک سپاہی نے ہاتھ بلند کیا۔ ''کیا اس پیشگی حملے کی وضاحت کریں گے؟''

''ہاں اگر ہمیں کسی دشمن سے خطرہ ہو کہ وہ ہم پر مہلک حملہ کر سکتا ہے تو ہم اس پر پیشگی حملہ کر کے اس کا تدارک کر سکتے ہیں۔'' کرنل نے وضاحت کی۔ ''اس تھیوری کو پیشگی دفاع بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں جس دشمن سے خطرہ ہو، اسے پہلے ہی ختم کر دو۔''

سوزن اور اس کے ساتھی سترھویں فوج کا ایک حصہ تھے اور ان کی بٹالین کو عراق بھیجا جا رہا تھا۔ عراق پر امریکی حملہ چند مہینے پہلے کیا گیا تھا اور اس وقت ساری دنیا میں عراق کے مہلک ہتھیاروں کا پروپیگنڈا زور و شور سے جاری تھا۔ عراق روانہ کیے جانے والے امریکی فوجی بھی پُرجوش تھے کہ وہ دشمن سے لڑنے اور اپنے ملک کو ان کے ممکنہ حملے سے بچانے کے لیے جا رہے ہیں۔ سوزن کا خاندانی پس منظر فوجی خدمات سے پُر تھا۔ اس کے دادا کے پردادا نے خانہ جنگی میں وفاق کی طرف سے حصہ لیا تھا اور اس جنگ میں مارا گیا تھا۔ اس کے دادا نے دوسری جنگِ عظیم میں امریکی فوج کی جانب

جنگ کے پس منظر میں جنم لینے والی کہانی کا ایک المناک پہلو

آصف ملک

پیشگی دفاع

خواتین اب مردوں کے شانہ بشانہ ہر میدان میں کھڑی نظر آتی ہیں۔ پھول جیسے ہاتھوں میں آگ اگلتی بندوقیں تھام کر وطن کا دفاع کرنے والی ایسی ہی عورتوں کا المیہ جو محاذِ جنگ پر دشمنوں کے بجائے اپنوں سے نبرد آزما تھیں۔

سے جاپان پر حملے میں حصہ لیا تھا اور اوکی ناوا کی خوں ریز لڑائی میں اپنی جان دے دی تھی۔ خود سوزن کا باپ ریٹائرمنٹ سے پہلے خلیج کی پہلی جنگ میں شریک تھا۔ اس وقت سوزن ہائی اسکول کی طالبہ تھی اور اس نے حبّ الوطنی کے جذبات سے سرشار ہو کر اپنا نام امریکی رضا کار فورس کے لیے لکھوا دیا تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اسے ایک سال کی تربیت کے لیے منتخب کر لیا گیا۔

اسے ایریزونا کے علاقے میں تربیت کے لیے بھیجا گیا۔ اس کے یونٹ میں بارہ مرد اور سات لڑکیاں تھیں۔ یہ سب ہائی اسکول سے فارغ ہو کر آئی تھیں جبکہ مرد بڑی عمروں کے بھی تھے اور ان میں سے کچھ اپنی صورت اور باتوں سے خراب کردار کے نظر آتے تھے۔ سوزن کو حیرت تھی کہ ان لوگوں کو تربیت کے لیے کیوں منتخب کیا گیا ہے؟ اس کے باپ نے اسے یہی بتایا تھا کہ امریکی فوج میں ہمیشہ اچھے کردار کے لوگ لیے جاتے ہیں۔ انہیں ایک اجاڑ نظر آنے والے صحرائی کیمپ میں تربیت دی جانے لگی۔ لڑکیوں کے رہنے کے لیے الگ بیرک تھی۔ مردوں کی الگ بیرک تھی۔

شروع میں تو مردوں کا رویہ ایک حد میں رہا یعنی وہ باتیں کرتے تھے اور اشارے کرتے تھے۔ ظاہر ہے، لڑکیاں انہیں نظر انداز کر دیا کرتی تھیں لیکن پھر رفتہ رفتہ ان کی ہمت بڑھنے لگی اور انہوں نے لڑکیوں کے ساتھ جسمانی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ یہ کام وہ زیادہ تر تربیت کے دوران دو بدو لڑائی میں کرتے تھے۔ ان کے دو انسٹرکٹرز تھے۔ ایک میجر جونز جو اس کیمپ کا انچارج بھی تھا اور دوسرا سارجنٹ آئن جو ڈرل انسٹرکٹر تھا۔ جسمانی چھیڑ چھاڑ کے واقعات اسی کی کلاس کے دوران ہوتے تھے۔ لڑکیوں نے شروع میں تو برداشت کیا لیکن پھر انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا اور سارجنٹ آئن سے شکایت کر دی۔ مگر سارجنٹ آئن کا ردِعمل ان کی توقع کے برعکس تھا، اس نے کہا۔

''جسمانی تربیت کے دوران کیا جسمانی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوگی؟''

''سر!'' سوزن نے کہا۔ ''یہ ہمیں جنسی طور پر ہراساں کرتے ہیں؟''

مگر سارجنٹ نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ ''یہ بھی تربیت کا ایک حصہ ہے۔ جب تمہارا کسی دشمن سے جسمانی مقابلہ ہوگا تو کیا تم اس سے درخواست کرو گی کہ وہ تمہیں جنسی طور پر ہراساں نہ کرے۔''

سوزن حیران رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ''سر! وہ ہمارا دشمن ہوگا اور یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ ہم دشمن سے اس رویّے کی توقع کر سکتے ہیں، اپنے ساتھیوں سے نہیں۔''

''یہ تربیت کا ایک حصہ ہے تاکہ تم آنے والے دنوں میں اس کے لیے بھی تیار رہو۔'' سارجنٹ آئن نے ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

سوزن تلخی سے بولی۔ ''سر! دشمن تو ہمیں قتل کرنے کی کوشش بھی کرے گا تو کیا دورانِ تربیت ہم ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش بھی کریں؟''

سارجنٹ اس کھرے جواب پر بھڑک اٹھا اور اس نے سوزن کو مکمل کٹ کے ساتھ کیمپ کے گرد دو چکر لگانے کی سزا سنا دی۔ لڑکیوں نے احتجاج کیا اور جب سوزن چکر لگا رہی تھی تو لڑکیاں میجر جونز کے پاس گئیں۔ ساری بات سن کر اس نے سوزن کی سزا منسوخ کر دی لیکن مرد ساتھیوں کی طرف سے جسمانی چھیڑ چھاڑ کے بارے میں کچھ کرنے سے معذرت کر لی۔ ''تم سب جانتی ہو کہ تربیت کے دوران یہ سب ہوتا ہے اور ہم کسی کو بنا ثبوت کے کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

لڑکیاں واپس اپنے کمرے میں آئیں تو سخت غصے میں تھیں۔ بے چاری سوزن کی سزا منسوخ ہوتے ہوتے بھی اس نے کیمپ کے گرد ڈیڑھ چکر لگا لیا تھا۔ اس نے لڑکیوں سے کہا۔ ''سنو، ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔''

''میں صبر سے کام نہیں لوں گی۔'' سائرس نامی لڑکی نے کہا۔ وہ لمبی تڑنگی اور مضبوط جسمانی ساخت رکھتی تھی۔ ''اب کسی نے میرے ساتھ کوئی غلط حرکت کی تو میں اسے مزہ چکھا دوں گی۔''

''کیا کرو گی تم؟'' سوزن نے پوچھا۔

''بس دیکھ لینا۔'' اس نے جواب دیا۔

دو دن بعد جسمانی تربیت کی کلاس تھی۔ جب سائرس کی باری آئی تو اس کے مقابل ریڈ نامی شخص تھا اور مردوں میں سب سے زیادہ خبیث فطرت تھا۔ لڑکیوں کو سب سے زیادہ شکایت اسی سے تھی۔ جب دونوں میں مقابلہ شروع ہوا تو ریڈ نے اپنی فطرت کے مطابق خباثت دکھائی۔ سوزن نے دیکھا، سائرس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور پھر جیسے ہی ریڈ اس کے داؤ پر آیا، سائرس نے اسے اٹھا کر بُری طرح پٹخ دیا۔ اس نے جان بوجھ کر ریڈ کو اس طرح گرایا تھا کہ اسے اچھی خاصی چوٹ آئی۔ سارجنٹ آئن نے فوراً رکنے کا اشارہ کیا لیکن اس دوران میں سائرس ریڈ کے منہ پر دو گھونسے رسید کر چکی تھی اور اس کے منہ اور ناک سے خون نکل آیا تھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم؟'' سارجنٹ آئن نے گرج کر کہا۔

''تم جان بوجھ کر اسے نشانہ بنا رہی ہو۔''

سائرس سیدھی کھڑی ہو گئی اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''سر! میں اسے دشمن سے نمٹنے کی تربیت دے رہی ہوں۔''

''یہ تربیتی سیشن ہے۔'' سارجنٹ آئن بولا۔

''سر! جب یہ دشمن سے مقابلہ کرے گا تو وہ اسے کوئی رعایت نہیں دے گا۔'' سائرس نے سارجنٹ کے کہے ہوئے الفاظ اسے لوٹا دیے۔ سارجنٹ اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اس دن کے بعد سے سائرس لڑکیوں کی ہیرو بن گئی تھی۔ اس کے بعد جب بھی مردوں کی جانب سے کسی لڑکی کو ہراساں کیا جاتا تو وہ جسمانی تربیت کے سیشن میں اس کا بدلہ لے لیا کرتیں۔ سوزن کے گروپ کو چار مہینے کی تربیت کے بعد ایک مہینے کی چھٹی دی جاتی تھی۔ اس کے بعد چار مہینے کا اگلا سیشن پھر ہوتا اور ایک مہینا نیول اکیڈمی میں تربیت کے بعد ان کی پاسنگ آؤٹ ہوتی۔ جس روز انہیں جانا تھا، سوزن نے محسوس کیا کہ سائرس چپ چپ سی ہے۔ وہ ایک دن پہلے رات کو بھی دیر تک بیرک سے غائب رہی تھی۔ سوزن اس کے بارے میں پریشان تھی۔ وہ کافی دیر بعد واپس آئی تھی۔

''سائرس! تم ٹھیک تو ہو؟'' سوزن نے اس سے پوچھا۔

''ہاں! میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ سب اپنے اپنے شہروں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جب سوزن ایک مہینے کی چھٹی کے بعد واپس آئی تو گروپ سے سائرس، ریڈ اور ایک میش نامی آدمی غائب تھے۔ سوزن اور دوسری لڑکیوں نے ان کے بارے میں پوچھا لیکن انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ ان تینوں کی جگہ دو نئی لڑکیاں اور ایک لڑکا آ گئے تھے۔ سوزن کو تربیت کے دوران علم ہوا تھا کہ فوج میں بہت کچھ ویسا نہیں تھا جیسا کہ عوام کو بتایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا اعتماد برقرار رہا۔ اس نے جو دیکھا تھا، وہ ایک چھوٹے سے گروپ کا حصہ تھا اور اس میں صرف دو افراد فوج سے متعلق تھے۔ اس تربیت کے بعد وہ نیول اکیڈمی گئی۔ اصل میں وہ میرین فوج کی رضا کار کا ایک حصہ بنتی اور اسے جب طلب کیا جاتا، اس پر لازم تھا کہ وہ فوج میں خدمات انجام دے۔ ایک سال کی تربیت کے بعد اسے سرٹیفکیٹ دے کر رخصت کر دیا گیا۔ وہ واپس اپنے شہر آئی اور اس نے مزید تعلیم کے لیے کالج میں داخلہ لے لیا۔ گریجویشن کے بعد اس نے سول ڈرافٹس مین کا کورس کیا اور ایک کنسٹرکشن کمپنی میں ملازمت کر لی۔ وہ اس جاب سے مطمئن تھی اور کچھ عرصے بعد وہ بھول ہی گئی کہ اس نے کبھی رضا کار کی حیثیت سے جنگی تربیت لی ہے۔ نائن الیون کے

ٹی وی انٹرویو

ٹی وی پر ایک صحافی نے ایک سابق فوجی کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو یہ زخم کیسے آئے؟''

فوجی بولا۔ ''جنگ کے دوران میں ایک بم میرے قریب آ کر گرا تھا۔''

صحافی۔ ''تو کیا وہ بم پھٹ گیا تھا؟''

فوجی نے جل کر کہا۔ ''نہیں، اس نے گھر تک میرا پیچھا کیا اور کاٹ کر بھاگ گیا۔''

بعد حالات نے پلٹا کھایا اور امریکا اپنے اصل روپ میں سامنے آ گیا۔ صدر امریکا نے اعلان کر دیا کہ جو ان کے ساتھ نہیں ہے، وہ دشمن ہے۔ مہذب دنیا میں شاید ہی کسی مہذب ملک کے صدر نے کبھی ایسا اعلان کیا ہو اور پھر بہت جلد امریکا کی فوج افغانستان جیسے چھوٹے اور نہتے ملک پر ٹوٹ پڑی۔ اس وقت کیونکہ پورا ملک جنگی بخار میں جل رہا تھا اس لیے محاذِ جنگ پر جانے کے خواہش مندوں کی کمی نہیں تھی۔

اس لیے سوزن کو طلب نہیں کیا گیا اور اس نے سکون کا سانس لیا کیونکہ ایک چھوٹے ملک کے خلاف تاریخ کی سب سے بڑی جنگی کارروائی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ویسے بھی وہ اپنی کمپنی میں ایک اچھے عہدے تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے ایک گھر بنا لیا تھا اور کار بھی لے لی تھی۔ اس دوران میں اس کی کئی مردوں سے دوستی رہی لیکن ان میں سے کوئی اسے اتنا اچھا نہیں لگا کہ وہ اس کے بارے میں شادی کا سوچتی اس لیے وہ اب بھی اکیلی تھی۔

پھر جب افغانستان سے تابوتوں سے بھرے جہاز آنے لگے اور ان تابوتوں کا چرچا میڈیا پر آنے لگا... اور جب امریکی فوجیوں کو افغانستان میں مرتے دکھایا جانے لگا تو قوم کا جنگی بخار خود بہ خود اتر گیا۔ جو باقاعدہ فوجی ایک بار افغانستان سے ہو آتا، وہ دوبارہ جانے سے انکار کر دیتا۔ اس لیے محکمۂ دفاع کو ان رضا کاروں کی یاد ستانے لگی جن کی تربیت کو دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور از روئے قانون ان کو طلب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سوزن کی بدقسمتی کہ اس کی دس سال کی مدت ختم ہونے میں ابھی تین مہینے باقی تھے اس لیے اسے طلب کر لیا گیا۔

اگر سوزن کا ایک خاندانی پس منظر نہ ہوتا اور اس کا خاندان فوج سے جڑا نہ ہوتا تو شاید وہ بھی غائب ہو جاتی اور تین مہینے بعد کوئی اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے لیٹر ملنے پر سینٹر پر رپورٹ کر دی اور فوری طور پر اسے ایک یونٹ کے ساتھ کر کے تربیت کے لیے بھیج دیا گیا۔ سوزن کو یہ جان کر

حیرت ہوئی کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو صرف پندرہ دن کی تربیت دی جا رہی ہے۔ وہ سالوں سے ایک عام سی زندگی گزار رہے تھے اور ان میں سے بہت کم کے پاس مطلوبہ فٹنس تھی۔ انہیں کم سے کم دو مہینے کی تربیت کی ضرورت تھی، تب ہی وہ کسی جنگ میں حصہ لینے کے قابل ہوتے لیکن یہ سوزن کا خیال تھا۔ فوج کے کرتا دھرتاؤں کا خیال تھا کہ ان کی اتنی تربیت کافی ہے اور باقی محاذِ جنگ پر ہو جاتی... جبکہ ان میں اکثر ڈرل کرنا بھی بھول گئے تھے۔ عجلت میں انہیں جو سکھایا جا سکتا تھا اس کے بعد انہیں ایک بٹالین سے منسلک کر کے عراق روانگی کا اشارہ دے دیا گیا۔ ائربیس سے روانگی سے پہلے انہیں معمولی سا بریف کیا گیا... اور اس کے بعد وہ سی ون تھرٹی طیاروں میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ امریکا سے اسپین تک کا یہ سفر بہت طویل اور اذیت ناک تھا کیونکہ انہیں پوری کٹ کے ساتھ غیر آرام دہ نشستوں پر بیٹھنا پڑا۔ یہ فوج کا اصول ہوتا ہے کہ سپاہی کو کوئی ایسی سہولت نہ دی جائے جس سے اسے آسانی محسوس ہو۔ اسپین میں انہیں غیر معروف ائربیس پر ایک رات صرف چھ گھنٹے کے آرام کے بعد اسی طیارے میں عراق کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

مئی میں جب وہ اسپین سے روانہ ہوئے تو موسم خوش گوار تھا لیکن جب بغداد ائرپورٹ پر ان کا طیارہ اترا تو باہر نکلتے ہی جھلسا دینے والے لو کے تھپیڑوں نے انہیں بدحواس کر دیا۔ اتنی گرمی کا تجربہ تو سوزن کو ایریزونا میں تربیت کے دوران بھی نہیں ہوا تھا۔ اوپر سے مکمل کٹ میں یہ گرمی عذاب ناک بن گئی تھی۔ وہ بکتر بند گاڑیوں میں شہر کے پاس امریکی اڈے کی طرف روانہ ہوئے۔ سوزن کو راستے میں جا بہ جا جلی ہوئی گاڑیوں کا ملبا اور تباہ شدہ مکان نظر آئے۔ شہر میں چہل پہل تھی لیکن لوگوں کے چہروں پر ہراس تھا۔ بکتر بند میں موجود مقامی فوجی نے کہا۔

''حالات بہت خراب ہیں۔ پرسوں ہی بغداد میں ہماری دو گاڑیاں راکٹ حملوں کا نشانہ بنی ہیں۔ چار مارے گئے اور سات زخمی ہیں۔''

''حملہ آوروں کا کیا ہوا؟'' سوزن نے سوال کیا۔

فوجی نے شانے اچکائے۔ ''ان کا کچھ نہیں پتا چلا لیکن بعد میں ہونے والی فائرنگ سے دو درجن عراقی مارے گئے۔''

''فائرنگ کس نے کی تھی؟''

وہ مسکرایا۔ ''بچ جانے والے سپاہیوں نے... وہ خوف سے پاگل ہو گئے تھے۔''

سوزن نے سوچا کہ حملہ آوروں کا پتا نہیں چلا تو عام لوگوں کو نشانہ بنا دیا...! امریکی یہاں کیا کر رہے تھے؟ وہ بیس میں داخل ہوئے تو اس کے ساتھ موجود سپاہیوں کی جان میں جان آئی۔ سوزن اور اس کی ساتھیوں نے رپورٹ کی تو سوزن کو تین دیگر خواتین سمیت یونٹ بارہ میں بھیج دیا گیا۔ سوزن کا خیال تھا کہ وہاں عورتیں ہوں گی لیکن جب اس نے یونٹ کمانڈر میجر بوران کو رپورٹ کی تو اس نے اسے بتایا کہ وہ اس یونٹ میں آنے والی اولین خواتین ہیں۔ میجر بوران نے حریص نظروں سے سوزن اور اس کی ساتھیوں کا جائزہ لیا۔

''تم سب زبردست لگ رہی ہو؟''

''شکریہ سر!'' سوزن نے کھردرے انداز میں کہا۔ ''ہم یہاں ملک کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔''

''تم لوگ فکر مت کرو، تمہیں اس کا بھرپور موقع ملے گا۔ اس جگہ میرے جوانوں کو سخت زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ ان کے لیے یہاں رنگینیوں کی کمی تھی لیکن تم لوگوں کے آنے سے امید ہے کہ یہ کمی دور ہو جائے گی۔''

سوزن نے محسوس کیا کہ میجر کی بات سن کر اس کی ساتھیوں کا رنگ اڑ گیا ہے۔ ان کو رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرا ملا جس میں اے سی بھی نہیں تھا جبکہ سوزن نے یہاں کئی جگہوں پر اے سی لگے دیکھے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر آئے، سوزن کی ایک ساتھی کارٹا نے کہا۔

''ہمارے لیے آنے والا وقت بہت مشکل ہوگا۔''

''کیوں؟'' سوزن نے پوچھا۔

''جب اس یونٹ کے کمانڈر کا یہ حال ہے تو باقی لوگوں کے بارے میں تو ہم سوچ ہی سکتے ہیں۔''

کارٹا کی بات درست ثابت ہوئی کیونکہ انہیں اگلے دن تک کے لیے آرام کرنے کو کہا گیا تھا اس لیے وہ لباس بدلنے لگیں۔ اسی دوران میں بیرک کی کھڑکیوں کے سامنے سپاہی جمع ہونے لگے۔ وہ انہیں گھور رہے تھے اور فقرے کس رہے تھے۔ بعض سیٹیاں بجا رہے تھے اور ساتھ میں بےہودہ اشارے کر رہے تھے۔ سوزن اور اس کی ساتھی برہم ہو گئیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے انہوں نے کھڑکیاں بند کیں تو ذرا دیر میں بیرک اندر سے کسی تندور کی طرح گرم ہو گئی۔ ویسے تو باہر بھی شدت کی گرمی تھی لیکن بند کمرے میں تو گرمی حد سے بڑھ گئی۔ انہوں نے بوکھلا کر کھڑکیاں کھول دیں اور چونکہ وہ لباس بدل چکی تھیں اس لیے باہر جمع ہونے والے تماشائی مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ سوزن نے اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں جان بوجھ کر یہ کھلی سی بیرک دی گئی ہے ورنہ یہاں اور بھی کئی بیرکس ہیں۔''

ایلس نے سر ہلایا۔ ''ہم کل ہی میجر سے کہتے ہیں کہ وہ ہمیں کوئی اور جگہ دے۔''

لیکن کارٹا کا خیال تھا کہ میجر مشکل سے ہی مانے گا۔ ''ان کا مقصد ہی اس طرح کی حرکات کرنا ہے۔''

بیرک کی دیواروں میں کئی جگہ خلا بھی تھے جہاں سے اندر جھانکا جا سکتا تھا اور کھڑکیاں بند کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ انہوں نے یہ سارا دن ایسے رخنے بند کرنے میں گزارا۔ گرمی کی شدت سے وہ بار بار پانی پی رہی تھیں اور اس وجہ سے انہیں معمول سے زیادہ باتھ روم جانا پڑتا۔ سوزن کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس یونٹ کے لیے باتھ روم بیرک سے خاصے دور تھے اور رات کو وہاں بالکل سناٹا ہوتا تھا۔ اس نے اپنی ساتھیوں سے کہا۔

''رات کو اس طرف اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔''

کارٹا نے سر ہلایا۔ ''تم لوگ پہلی بار سروس میں آئی ہو اور میں کئی سال سے سروس میں ہوں۔ میرے علم میں ایسے واقعات ہیں جب عورتیں رات کو باتھ روم گئیں تو ان پر مجرمانہ حملہ ہوا۔''

سوزن خوف زدہ ہو گئی۔ کوئی مرد اس پر مجرمانہ حملہ کرے، یہ تصور ہی اس کے لیے خوفناک تھا۔ ''مجرمانہ حملہ...!'' اس نے دُہرایا۔

''ہاں اور ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی عورت کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔''

''میرے خدا! تو ان لوگوں کا کیا ہوا؟'' شارلین بے ساختہ بولی۔

کارٹا کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''میرے علم میں جو واقعات آئے ہیں، ان میں، میں نے کسی مجرم کو ہونے والی سزا کا نہیں سنا... اور سزا بھی ایسی ہوتی ہے جس سے ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی تنزلی کر دی جاتی یا پھر ان کی تنخواہ میں کمی کر دی جاتی۔ عہدے کی انہیں ویسے بھی پروا نہیں ہوتی ورنہ ایسی حرکتیں کیوں کریں... اور جہاں تک تنخواہ میں کمی کا تعلق ہے تو میں نے ایک ایسے سزا یافتہ مجرم کا بیان سنا... اس کا کہنا تھا کہ اس سے زیادہ رقم تو اسے کسی طوائف کو دینی پڑتی ہے اس لیے یہ سودا برا نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں پوری طرح محتاط رہنا ہوگا۔'' سوزن نے کہا۔ ''کوئی بھی اکیلے باہر نہیں جائے گا اور اگر جانا ہی ہوگا تو کسی ساتھی کو ساتھ لے کر جائے۔ ساتھ ہی اپنا ہتھیار اپنے پاس رکھنا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے ہم رات کو ایک ساتھ ہی باہر جائیں۔'' کارٹا نے تجویز دی۔

''بار بار ساتھ جانا تو مشکل ہے۔'' شارلین پریشان ہو گئی۔ ''مجھے تو رات میں کئی بار جانا پڑتا ہے۔''

''اس کا بھی کوئی حل نکال لیں گے۔'' سوزن بولی۔ ''لیکن پہلے تو اس واہیات کمرے سے نجات حاصل کرنی ہے۔''

لیکن جب انہوں نے اگلے روز میجر سے کمرے کے بارے میں شکایت کی تو اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''فی الحال تو یہی کمرا ہے اس کے سوا اور کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔''

''سر! آپ ہمارا کمرا تبدیل کروا سکتے ہیں، یہ کسی اور کو دے دیں۔'' سوزن نے اصرار کیا۔

''دیکھتے ہیں۔'' میجر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''ابھی تم لوگوں کو آئے ہوئے ایک دن ہوا نہیں ہے اور تم نے شکایتیں شروع کر دیں۔''

سوزن نے احتجاج کیا۔ ''یہ شکایت نہیں ہے سر! ہمارے لیے وہ کمرا بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اس میں اتنے سوراخ ہیں کہ ہم اطمینان سے کپڑے بھی بدل نہیں سکتے۔''

''سوراخ بند کیے جا سکتے ہیں اور ویسے بھی یہ محاذِ جنگ ہے اس لیے تم لوگ بھول جاؤ کہ تم خواتین ہو۔''

''ہم بھول کر ہی آئے تھے سر!'' کارٹا تلخی سے بولی۔ ''لیکن یہ بات ہمیں یہاں آتے ہی یاد دلا دی گئی کہ ہم خواتین ہیں۔''

میجر کھڑا ہو گیا، اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ ''میں اس جگہ کا کمانڈر ہوں... کیا تم لوگ مجھ سے بحث کرو گی؟''

''نو سر! لیکن ہم اپنی شکایت لے کر پھر کس کے پاس جائیں؟'' کارٹا نے اس سے ڈرے بغیر کہا۔

''تمہاری شکایت بے معنی ہے۔'' میجر نے بے پروائی سے کہا اور واپس بیٹھ گیا۔ ''اب تم لوگ جاؤ اور اس یونٹ میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرو... اور جوانوں کے لیے اپنے رویّے میں نرمی لاؤ۔''

''سر! وہ ہمیں ساتھی نہیں بلکہ عورت سمجھ کر ٹریٹ کر رہے ہیں۔'' سوزن نے کہا۔ ''مجھے فوج میں ایسے رویّے کی توقع نہیں تھی۔''

میجر نے اسے استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔ ''تو تم کیا توقع لے کر آئی تھیں؟''

''سر! میں نے سوچا تھا کہ امریکی فوج دنیا کی

بہترین فوج ہے اس لیے اس کے سپاہی بھی کردار کے بہترین ہوں گے۔''

''یہ اچھے لوگ ہیں... بس عورت کو ترسے ہوئے ہیں۔'' میجر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگر تم انہیں کمپنی دو گی تو یہ بہت اچھے ساتھی بھی ثابت ہوں گے اور تم لوگ بھی سکون سے رہو گی۔''

میجر کا انداز بتا رہا تھا کہ کمپنی سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ سوزن اور اس کی ساتھی خواتین اس کے سپاہیوں کی دل بستگی کا سامان بنیں۔ سوزن نے اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ''سر! ہم سب شریف عورتیں ہیں اور ہم میں سے کسی نے کبھی مردوں کا دل نہیں بہلایا۔ ہمیں امریکا کے دشمن سے لڑنے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے، اس مقصد کے لیے نہیں کہ ہم یہاں مرد سپاہیوں کی دل بستگی کریں۔''

''یہ بھی ایک کام ہے۔'' میجر مسکرایا۔

''تب حکومت کو چاہیے کہ ایک رجمنٹ طوائفوں کی بنا لے اور انہیں یہاں بھیج دے۔'' سوزن نے کہا اور سیلیوٹ کرکے باہر آگئی۔ باقی بھی اس کے پیچھے باہر آگئیں۔ شارلین سب سے زیادہ خوف زدہ تھی، اس نے کہا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا... اب یہ ہمارا دشمن ہو جائے گا۔''

''تو کیا اس کا مطالبہ مان لیتے۔؟'' سوزن نے تلخی سے کہا۔ ''تم نے اس کی بات سنی... وہ اور اس یونٹ کے جوان ہمیں ساتھی سولجر نہیں بلکہ طوائفوں کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' انہوں نے آپس میں سر جوڑ کر سوچا لیکن اس مسئلے کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔ شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ان کا یونٹ کمانڈر ان کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اگر وہ اس سے اوپر کسی اتھارٹی کے پاس جاتیں تو وہاں ان کے مقابلے میں میجر کی زیادہ سنی جاتی اور وہ ان کو جھٹلا سکتا تھا۔ کارٹا نے کہا۔

''ہمیں یہ سب برداشت کرنا ہوگا۔''

''لیکن اس سے ان لوگوں کی ہمت اور بھی بڑھ جائے گی۔'' ایلس بولی۔ ''آج میں دن میں اکیلی باتھ روم کی طرف گئی تھی تو وہاں دو مرد موجود تھے اور انہوں نے مجھے دیکھ کر جو باتیں کیں، وہ میں تم لوگوں کو بتا نہیں سکتی۔ اس کے بعد سے میں بہت خوف زدہ ہوں۔''

''یعنی اب ہم دن میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔'' کارٹا تلخی سے بولی۔

''اس گرمی میں ہم پانی پیے بغیر نہیں رہ سکتے اور ہمارے پانی میں منرلز کی مقدار زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے گردے زیادہ کام کرتے ہیں اور ہمیں بار بار باتھ روم جانا پڑتا ہے۔'' سوزن نے بتایا۔

اس کے بعد سے انہوں نے یہ کیا کہ پانی کم پینے لگیں لیکن دن میں جس قیامت کی گرمی ہوتی تھی، اس میں کم پانی پینے سے ان کو ڈی ہائیڈریشن ہونے لگا۔ اس کا پتا اس طرح چلا کہ ایک دن پہرے کے دوران ایلس بے ہوش ہو گئی اور اسے بیس کے اسپتال لے جایا گیا تو وہاں انکشاف ہوا کہ وہ ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہے اور کم پانی پینے سے اس کے جسم میں منرلز کی سطح بھی گر گئی تھی اور اس کا بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔ ایک دن بعد وہ واپس بیرک میں آئی تو سوزن نے اس سے پوچھا۔

''ایلس! تم پانی کیوں نہیں پیتیں؟''

ایلس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''سوزن! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ میرے دو بچے ہیں، میرا شوہر ہے۔ اگر یہاں کسی نے میرے ساتھ زیادتی کی تو میں کیا منہ لے کر ان کے سامنے جاؤں گی؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' سوزن نے اسے تسلی دی۔ ''ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔''

اس صورتِ حال سے وہ سب ہی پریشان تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ریگولر آرمی کا حصہ نہیں تھا اس لیے یہاں آنے سے پہلے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال اس حد تک خراب ہوگی۔ انہیں عراق میں موجود امریکا کے دشمنوں سے زیادہ خطرہ خود امریکی فوجیوں سے ہوگا اور وہ محفوظ ترین امریکی بیس میں بھی غیر محفوظ ہوں گی۔ انہیں ایسا لگتا تھا جیسے وہ چاروں طرف سے بھیڑیوں میں گھر گئی ہوں اور ان کی آنکھ بھی جھپکی تو یہ بھیڑیے انہیں پھاڑ کھائیں گے۔

وہ اب دن میں بھی کہیں جاتی تھیں تو اکیلی نہیں جاتیں بلکہ دو مل کر جایا کرتیں۔ ان کی ڈیوٹی سخت نہیں تھی، عام طور سے ان کو پہرے پر لگایا جاتا تھا یا کبھی کبھی پٹرولنگ پر بھیج دیا جاتا۔ پہرے کے مقابلے میں وہ پٹرولنگ میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھتی تھیں کیونکہ اس دوران میں ان کے مرد ساتھیوں کو عراقی حریت پسندوں کے حملے کا خوف کھائے جاتا تھا اور وہ ان پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ جبکہ بیس میں پہرے کے دوران انہیں حریت پسندوں کا خوف نہیں ہوتا تھا لیکن یہ ڈر ضرور لگا رہتا تھا کہ کہیں تنہا پا کر ان کا ساتھی مردان پر نہ ٹوٹ پڑے۔

وہ دن میں تو اپنے ہتھیار اپنے پاس رکھتی تھیں۔ رات کو بھی جب باتھ روم جانا ہوتا تو اپنی رائفل ساتھ لے کر جاتی

تھیں۔ ان میں ایلس کو بار بار باتھ روم جانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ڈی ہائیڈریشن والے واقعے کے بعد وہ پانی زیادہ پینے لگی تھی کیونکہ ڈاکٹر نے اسے خبردار کر دیا تھا کہ اس قسم کی گرمی میں اگر ڈی ہائیڈریشن کا حملہ ہو تو انسان کی جان بھی جا سکتی ہے۔ ایلس ابھی مرنا نہیں چاہتی تھی لیکن زیادہ پانی پینے سے اسے رات میں کم سے کم ایک بار لازمی باتھ روم جانا پڑتا تھا۔ اس رات بھی وہ سوتے سے اٹھی۔ اسے باتھ روم جانا تھا لیکن اس کی تمام ساتھی بہت گہری نیند میں تھیں۔ گزشتہ روز وہ سب ہی پٹرولنگ کی سخت ڈیوٹی کر کے آئی تھیں اس لیے مدہوشی کی نیند سو رہی تھیں۔ ایلس نے کسی کو جگانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی رائفل لے کر باہر آگئی۔ باتھ روم کے پاس اسے کوئی نظر نہیں آیا لیکن جب وہ فارغ ہو کر باہر آئی تو تین سپاہی اس کا انتظار کر رہے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے قابو کرتے، اس نے پھرتی سے رائفل اتار لی۔ ان تینوں کو اس ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔

''اے سویٹی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف کچھ مزے کرنے آئے ہیں۔''

''دور رہو مجھ سے ورنہ میں...'' ایلس نے دھمکی آمیز انداز میں رائفل کو حرکت دی۔ جب سپاہیوں نے دیکھا کہ وہ سنجیدہ ہے اور زبردستی کی صورت میں گولی بھی چلا سکتی ہے تب انہوں نے اسے جانے دیا۔ ایلس لرزتی ہوئی بیرک تک آئی اور رائفل ایک طرف پھینک کر اپنے بستر پر گر کر رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سے باقی ساتھیوں کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس کے گرد جمع ہو گئیں۔

''ایلس! کیا ہوا ہے؟'' سوزن نے پوچھا۔

''کیا تم باہر گئی تھیں؟'' کارٹا معاملے کو سمجھ گئی۔

''ہاں۔'' ایلس بولی پھر اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ''میں ایسے نہیں رہ سکتی، ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔''

سوزن اور اس کی ساتھی بھی محسوس کر رہی تھیں کہ ان کے اعصاب زیادہ دن تک اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اگلے روز اس واقعے کی رپورٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ سوزن کو اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جب وہ میجر کے دفتر پہنچیں تو اس کا رویہ ان کی توقع کے عین مطابق تھا۔ اس نے ایلس کی شکایت ماننے سے انکار کر دیا۔

''ایسا ممکن نہیں ہے۔ میرا کوئی سپاہی رات گیارہ بجے کے بعد باہر نہیں رہتا۔''

''میں نے خود وہاں تین سپاہی دیکھے تھے۔'' ایلس بولی۔ ''میں ان کو پہچانتی ہوں اور انہوں نے میرے ساتھ زبردستی کی کوشش کی تھی۔ اگر میرے پاس رائفل نہ ہوتی تو شاید میں بچ کر نہ آتی۔''

''ٹھیک ہے، میں انکوائری کروں گا۔'' میجر نے کہا۔

اس نے انکوائری کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ رات کے وقت سپاہیوں پر اپنے ہتھیار لے کر بیرک سے باہر آنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ انہیں ایک سرکلر کے ذریعے اس پابندی کا پتا چلا۔ سوزن کا غصے سے برا حال ہو گیا۔

''یہ پابندی صرف ہمارے لیے ہے۔''

کارٹا زیادہ پریشان تھی۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ ہمارے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے۔ آج جب میں پہرے پر تھی تو دو سپاہیوں نے مجھے بہت گندے الفاظ میں کہا کہ ہم نے ان کی جو شکایت کی ہے، عنقریب ہمیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

سوزن اور اس کی ساتھی خواتین ریگولر فوجی خواتین کی طرح سخت جان نہیں تھیں اور نہ ان کے اعصاب اتنے مضبوط تھے۔ اس لیے وہ وحشت زدہ رہنے لگیں۔ اب وہ پہلے سے زیادہ احتیاط کرنے لگی تھیں۔ رات میں ہتھیار رکھنے کی پابندی لگا دی گئی تھی لیکن وہ چاقو لے کر جاتی تھیں۔ اس سے ان کو تسلی رہتی .... کہ وہ بالکل نہتی نہیں ہیں اور کسی افتاد کی صورت میں اپنا دفاع کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ ایک رات جب ایلس اور شارلین باتھ روم کی طرف گئیں تو وہاں پہلے سے چھپے چار ہٹے کٹے مرد سپاہیوں نے ان کو قابو کر لیا۔ ان کو مزاحمت کا موقع بھی نہیں ملا۔ شارلین نے چاقو نکالا جو اس سے بہت آسانی سے چھن گیا اور پھر ایلس کا چاقو بھی لے لیا گیا۔ انہوں نے ان کو چاقوؤں سے دھمکایا اور باتھ رومز کے پیچھے ایک ویران جگہ لے گئے جہاں انہوں نے ایلس اور شارلین کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی اور انہیں وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔

سوزن اس وقت جاگ رہی تھی جب شارلین اور ایلس باہر گئی تھیں پھر اسے نیند آگئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اور وہ دونوں اب تک غائب تھیں۔ سوزن نے کارٹا کو جگایا۔ ''وہ دونوں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت سے غائب ہیں۔''

کارٹا اٹھ گئی۔ ''ہمیں دیکھنا ہوگا۔''

وہ اپنی رائفلوں کے ساتھ باہر آئیں۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھیں کہ شارلین اور ایلس کے ساتھ کچھ ہوا ہے جب ہی وہ

واپس نہیں آسکی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے انہیں باتھ روم کے عقب میں پایا تو ان کی حالت دیکھ کر تڑپ گئیں۔ ایلس بے ہوش تھی اور شارلین ہوش میں ہونے کے باوجود اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ سوزن نے فوری طور پر طبی امداد کے لیے کال کی اور دس منٹ بعد وہ دونوں بیس کے اسپتال میں تھیں۔ سوزن اور کارٹا نے میجر کی پروا کیے بغیر اس واقعے کی رپورٹ بیس کمانڈر کے دفتر میں کر دی۔ جب تک شارلین اور ایلس اپنے ہوش میں نہیں آئیں، وہ ان کے پاس رہی۔ انہوں نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے خود پر گزرنے والی داستان سنائی۔ سوزن اور کارٹا کا غم و غصے سے بُرا حال تھا۔ ان کا خیال تھا بیس کمانڈر اس واقعے پر کوئی فوری ردِعمل ظاہر کرے گا اور کچھ نہیں تو ان سپاہیوں کو گرفتار کرلیا جائے گا۔

لیکن جب وہ یونٹ میں آئیں تو سب معمول کے مطابق تھا۔ سارے مرد سپاہی حسبِ معمول اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ وہ یوں ہنسی مذاق کر رہے تھے جیسے رات کو یونٹ میں کچھ ہوا ہی نہیں..... میجر نے ان کو بلا کر واقعے کی رپورٹ لینے کے بجائے سرزنش کی کہ انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے بیس کمانڈر کے دفتر میں شکایت کیوں کی؟ اس نے کہا۔ ”یہ دیکھنا میرا کام ہے کہ میرے یونٹ میں کیا ہو رہا ہے۔“

سوزن نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ”سر! کیا آپ واقعی دیکھ رہے ہیں؟“

”ہاں اور بہت جلد تم لوگوں کو معلوم ہو جائے گا۔“

سوزن اس وقت میجر کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی لیکن جب دو دن بعد ان کی ایک اور امریکی بیس میں منتقلی کا حکم آیا تو وہ سمجھ گئی۔ انہیں اگلے روز شارلین اور ایلس سے ملنے بھی نہیں دیا گیا اور اس کی وجہ بیس کمانڈر کا حکم بتائی گئی۔ وہ ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے عراق کے اندرونی حصے میں واقع اس بیس کے لیے روانہ ہو گئیں۔ راستے میں سوزن نے کارٹا سے کہا۔ ”ہمیں شکایت کرنے کی سزا دی گئی ہے۔“

”یہ سب ایک ہی ہیں۔“ کارٹا بولی۔ ”مجھے تو لگ رہا ہے کہ ہم آرمی چیف یا وزیرِ دفاع سے شکایت کرتے، تب بھی یہی نتیجہ نکلنا تھا۔“

سوزن نے نیچے دور تک پھیلے صحرا کی طرف دیکھا۔ ”میں اب اس جہنم میں کبھی واپس نہیں آؤں گی۔“

”اگر ہم یہاں سے زندہ سلامت واپس گئے تو۔“ کارٹا نے اس کی تائید کی۔ ”میں بھی کبھی واپس نہیں آؤں گی، چاہے مجھے اس کے لیے فرار کیوں نہ ہونا پڑے۔ ویسے تم نے سوچا کہ اس جگہ کو جہنم کس نے بنایا ہے؟“

سوزن نے سر ہلایا۔ ”ہمارے اپنے لوگوں نے... ذرا سوچو جو ہمارے ساتھ یہ کر رہے ہیں، وہ مقامی لوگوں کے ساتھ کیا نہیں کرتے ہوں گے۔“

اس دور دراز صحرائی بیس میں امریکی اسپیشل فورس کے یونٹس تھے جن کا کام ٹارگٹس پر حملہ کرنا تھا۔ وہ اپنے دشمن کو قتل کرنے جاتے تھے... گویا وہ سرکاری قاتل تھے۔ یہاں سوزن اور کارٹا کو ایک یونٹ میں تعینات کیا گیا جس کا کام مواصلاتی نظام کی دیکھ بھال اور حفاظت تھا۔ وہ دونوں حفاظتی دستے میں شامل تھیں۔ ان کے ساتھ مزید چار خواتین اور تھیں اور اس پورے بیس میں کل یہی چھ خواتین تھیں جبکہ کم سے کم چار سو مرد تھے۔ ان چھ خواتین کو ایک بیرک ملی ہوئی تھی مگر اس کی حالت بغداد کے بیس والی بیرک سے کہیں بہتر تھی۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ جب امریکی فوج میں خواتین کو شامل کیا جاتا ہے تو انہیں ایسی جگہ کیوں نہیں لگایا جاتا جہاں صرف خواتین ہوں؟“ کارٹا نے کمرے میں آنے کے بعد کہا۔ دوسری خواتین اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ذرا دیر سے آئی تھیں۔ سوزن نے ان سے مقامی حالات پوچھے۔ جیسمین نامی لڑکی نے بتایا۔

”بہت خراب حالات ہیں... ہمہ وقت راکٹ یا مارٹر حملے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔“

”اور یہاں موجود مردوں کا رویہ کیسا ہے؟“

جیسمین کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ ”ان سے بچنا ناممکن ہے۔ شروع میں مجھے کئی تجربات ہوئے۔ اس کے بعد میں نے بیس کمانڈر سے تعلق قائم کرلیا، تب سے سکون میں ہوں۔“

”ہمیں سکون سے رہنے کے لیے کسی کو بھی لازمی خوش کرنا پڑتا ہے۔“ نورما نامی عورت نے کہا۔ وہ خوب صورت تو نہیں تھی لیکن اس کا جسم بہت متناسب تھا۔ اس نے نائب کمانڈر سے تعلق قائم کر لیا تھا۔ وہ دونوں اسی وجہ سے ساتھیوں کی دست درازیوں اور فقرے بازیوں سے بچی ہوئی تھیں لیکن ان کی باقی دو ساتھی اس معاملے میں سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں اس لیے انہیں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ان میں میگی نامی لڑکی بہت جذباتی تھی۔ اسے زیادہ خوف تھا کہ کوئی کسی دن اس کی عزت لوٹ لے گا۔ اس نے سوزن سے کہا۔

”جس دن میرے ساتھ ایسا ہوا، میں ایسا کرنے والے کو مار کر خود بھی خودکشی کرلوں گی۔“

”خودکشی کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن میں ذلت کے احساس کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی۔“

جیسمین ہنسی۔ ”رہ لوگی... جب پہلی بار میرے ساتھ ایسا ہوا تھا تو مجھے بھی یہی لگ رہا تھا کہ میں زندہ نہیں رہ سکوں گی لیکن دیکھو... آج بھی زندہ ہوں جبکہ کمانڈر ہر ہفتے میرے ساتھ مالِ غنیمت والا سلوک کرتا ہے۔“

”لیکن میں نہیں رہ سکتی۔“ میگی چلّائی۔ ”تم دیکھ لینا کہ میں کسی کو مار دوں گی یا مر جاؤں گی۔“

میگی سخت جذباتی ہو رہی تھی۔ سوزن نے محسوس کیا کہ یہاں بھی صورتِ حال بغداد والے بیس سے مختلف نہیں ہے بلکہ یہاں یوں زیادہ خراب تھی کہ وہ کُل چھ خواتین تھیں اور یہاں کمانڈر اور اس کے نائب کا کریکٹر ویسے ہی واضح تھا۔ ایسے لوگوں سے کیا توقع رکھی جا سکتی تھی کہ وہ انہیں وحشی صفت سپاہیوں سے بچائیں گے۔ انہیں اپنی حفاظت خود کرنا تھی اور اگر وہ لٹ جاتیں تو کسی کے پاس جا کر دادِ فریاد کرنا بے کار تھا۔

انہی دنوں ایک آرڈر آیا کہ امریکی فوج میں شامل کسی عورت کو رات کی ڈیوٹی نہیں دی جائے گی اور ان سے صرف دن کی روشنی میں ڈیوٹی لی جائے گی۔ ظاہر ہے یہ آرڈر ان خواتین کو حریت پسندوں سے بچانے کے لیے نہیں تھا بلکہ ان کے ساتھیوں کی دست درازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تھا کیونکہ فوج میں زیادتی کا شکار ہونے والی تمام ہی خواتین پر رات میں حملے ہوئے تھے۔ لیکن لازمی تو نہیں تھا کہ کوئی عورت صرف ڈیوٹی کے لیے باہر جائے۔ اسے اور بھی کام ہوتے تھے اور باتھ روم وغیرہ کیمپ سے دور دراز حصے میں بنائے جاتے تھے۔ عورتوں کا رات کو اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہاں بھی یہی طریقہ تھا کہ رات کو ساری خواتین مل کر جاتی تھیں اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ انہیں رات میں پھر جانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اس بیس پر بھی سپاہیوں کا رویہ مختلف نہیں تھا اور وہ جب ان کے سامنے ہوتے تو فقرے کستے اور فحش اشارے کرنے سے نہیں چوکتے لیکن وہ اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ شاید انہیں کمانڈر کی طرف سے منع کیا گیا تھا۔ ورنہ ان کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ ان پر پل پڑنے کے لیے بے تاب ہیں۔

سوزن اور اس کی ساتھی لڑکیوں کو اگرچہ بِنا کسی مناسب تربیت کے یہاں بھیج دیا گیا تھا لیکن عراق میں آمد کے بعد انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا اور وہ رفتہ رفتہ سخت فوجی

اسرائیل کے علاوہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: ثمر عباس

(فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

زندگی سے ہم آہنگ ہوتی جارہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کا اعتماد بھی بڑھ رہا تھا۔ ڈیوٹی سے آکر سوزن چاقو زنی کی مشق کرتی تھی کیونکہ دست بدست لڑائی میں یہی کسی عورت کا سب سے بہترین ہتھیار ہو سکتا ہے۔ شروع میں تو وہ اکیلی ہوتی تھی لیکن پھر دوسری خواتین بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئیں اور مل کے مشق کرنے لگیں۔ سوزن نے مشق کے لیے آسانی سے مڑ جانے والا چاقو حاصل کر لیا تھا اگر مشق کے دوران یہ کسی کو لگ بھی جاتا، تب بھی اسے زخم نہیں آتا..... میگی چاقو زنی کی مشق میں حصہ نہیں لیتی تھی۔ اس نے سوزن سے کہا۔

''اگر ہم کہیں مردوں کے ہاتھ آگئے تو یہ چاقو زنی کی مشق ہمیں نہیں بچا سکے گی۔''

''ممکن ہے بچا ہی لے۔'' سوزن نے جواب دیا۔ ''فرض کرو ایسا کوئی موقع آئے اور ہمارے پاس چاقو بھی ہو لیکن اسے استعمال کرنے کا سلیقہ نہ ہو، تب ہم ضرور مارے جائیں گے۔''

''پتا نہیں۔'' میگی نے بے دلی سے کہا۔ ''مجھے تو یہ سب بے کار لگتا ہے۔'' وہ ایک کسان کی بیٹی تھی اور اس نے بھی سوزن والی غلطی کی تھی... یعنی جوش میں آکر رضا کار فورس میں بھرتی ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے اچانک ہی ملک سے ہزاروں میل دور بھیج دیا جائے گا اور وہ اتنے خوفناک حالات میں زندگی بسر کرے گی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ اسے کسی طرح واپس امریکا بھیج دیا جائے۔

سوزن اور میگی شام کے وقت اپنی ڈیوٹی پر تھیں، ان کی ڈیوٹی جنریٹرز پر لگائی گئی تھی۔ اس علاقے میں بجلی نہیں تھی اور جنریٹرز سے کام چلایا جاتا تھا۔ حریت پسندوں کے حملے میں سب سے زیادہ خطرہ جنریٹرز کو ہوتا تھا کیونکہ ایک تو ان کے بند ہونے سے سیکیورٹی کا سارا نظام بند ہو جاتا اور دوسرے ان کے پائپوں سے نکلنے والا دھواں حرارت پر لپکنے والے راکٹس کی راہنمائی کرتا اس لیے ان کی خصوصی حفاظت کی جاتی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ دو مرد سپاہی بھی تھے.... وہ ان سے الگ تھے۔ پھر ان میں سے ایک ٹہلتا ہوا ان کی طرف آیا۔

''سنو... آج رات ہم نے ایک پارٹی رکھی ہے، کیا تم لوگ اس میں شریک ہوگی؟''

''کیسی پارٹی... اور کیا کمانڈر نے اس کی اجازت دی ہے؟''

''پارٹی کچھ ڈانس اور پینے پلانے والی ہوگی۔'' سپاہی نے سوزن کو آنکھ ماری۔ ''کمانڈر کی فکر مت کرو، آج رات اسے اپنا ہوش نہیں ہوگا۔''

''سوری! میں اور میری ساتھی اس پارٹی میں نہیں آسکتے۔''

سپاہی کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''اتنی جلدی انکار مت کرو۔ یقین کرو تمہیں بہت مزہ آئے گا۔''

''ہم دن بھر ڈیوٹی دے کر تھک جاتے ہیں اس لیے پارٹی میں نہیں آسکتے۔'' اس بار میگی نے کہا۔

''تم لوگوں کی شرکت لازمی ہے۔'' سپاہی کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ ''ورنہ تم لوگوں پر کوئی آفت بھی آسکتی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بارے میں کمانڈر سے بات کرنی چاہیے۔'' سوزن نے میگی سے کہا تو سپاہی انہیں گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے۔'' میگی بولی۔ ''ٹھیک کیا، میں شرط لگا سکتی ہوں کہ ہم میں سے کوئی اس پارٹی میں چلا گیا تو اس کی عزت محفوظ نہیں رہے گی۔''

''اگر ہم پارٹی میں نہ گئے تو یہ انتقامی کارروائیوں پر اتر آئیں گے۔'' میگی روہانسی ہو گئی۔ ''ان کے پاس ہمیں تنگ کرنے کے ہزار طریقے ہیں۔''

یہ بات سوزن بھی جانتی تھی۔ اس نے میگی کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے لیکن ہم ان کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔''

رات کو وہ سب جمع ہوئیں تو جیسمین اور نورما بن سنور کر کمانڈر اور اس کے نائب کے پاس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ سوزن نے انہیں آج رات ہونے والی پارٹی کے بارے میں بتایا۔ ''مجھے خدشہ ہے کہ وہ زبردستی پر نہ اتر آئیں۔''

نورما ہنسی۔ ''چلو ہماری تو بچت ہے، اب کوئی ہمارے پیچھے کمانڈرز کے کمروں میں تو آنے سے رہا۔''

میگی کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ ہم پر جو گزرتی رہے تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں؟''

''نہیں میری جان... میں کہہ رہی ہوں کہ تم لوگ بھی اپنے رویّے میں ذرا لچک پیدا کرو ورنہ یہ بھیڑیے تمہیں پھاڑ کھائیں گے۔''

''یہ پھاڑ کھانے والے بھیڑیے ہیں اور ان کو صرف سخت رویّے سے خود سے دور رکھا جا سکتا ہے۔'' سوزن نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ ''ہم نے ذرا بھی کمزوری دکھائی تو یہ ہمیں سچ مچ پھاڑ کھائیں گے۔''

''تمہاری مرضی۔'' جیسمین اپنا پرس اٹھاتے ہوئے بولی

اور نورما کے ساتھ بیرک سے نکل گئی۔ ان کے جانے کے بعد سوزن نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ یہ شہر سے دور صحرائی علاقہ تھا اس لیے یہاں رات ٹھنڈی ہوتی تھی اور وہ کھڑکیاں دروازے بند کر کے سو سکتی تھیں۔ سوزن نے کہا۔ ''آج رات دو جاگ کر پہرا دیں گی اور دو سوئیں گی۔''

''پہرا کیوں؟'' سانتھ پریشان ہو گئی۔

''کیونکہ امکان ہے کہ سپاہی ہماری بیرک میں گھسنے کی کوشش کریں گے۔'' سوزن بولی۔

''فرض کرلو کہ اگر کوئی زبردستی اندر آنا چاہے تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''شوٹ دیم۔'' سوزن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ورنہ یہ درندے ہماری جان بھی لے سکتے ہیں۔''

طے ہوا کہ پہلے سوزن اور میگی چار گھنٹے جاگ کر پہرا دیں گی اور اس کے بعد یہ ڈیوٹی کارٹا اور سانتھ سنبھال لیں گی۔ انہوں نے اپنے ہتھیار تیار حالت میں رکھے تھے۔ اگرچہ ... انہوں نے کھڑکیاں دروازے اندر سے بند کر لیے تھے لیکن یہ ہلکی پلائی کے بنے ہوئے تھے اور انہیں بہ آسانی توڑا جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ صرف دروازہ اندر سے بند کر کے سکون سے نہیں سو سکتی تھیں۔ ان کے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ آج رات خطرہ ہے۔ سوزن نے نیند بھگانے کے لیے کافی تیار کی۔ میگی کھڑکیوں کے رخنوں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سوزن نے اسے کافی کا مگ دیا۔ میگی پریشان تھی۔

''اگر وہ زیادہ تعداد میں آگئے تو ہم کیا کریں گے؟''

''ایک بات یاد رکھنا... ہمیں ان کی خواہش پوری نہیں کرنی ہے۔ اس کے لیے ہمیں جو کرنا پڑا، ہم کریں گے۔''

میگی ہچکچا رہی تھی۔ ''اگر فائرنگ کرنی پڑی تو اس سے معاملہ خراب ہو جائے گا۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن ہمیں اپنے دفاع کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

ابھی وہ کافی پی رہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سوزن اور میگی نے بیک وقت اپنی رائفلیں اٹھا لیں، سوزن نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''مس سوزن، دروازہ کھولو۔'' باہر سے کسی نے کہا۔

سوزن اور میگی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سوزن نے اسے کارٹا اور سانتھ کو اٹھانے کا اشارہ کیا۔ ''کیا بات ہے... اس وقت تم کیوں آئے ہو؟''

''کمانڈر کا آرڈر ہے۔ اس نے تم سب کو پارٹی میں بلایا ہے۔''

''سرداریاں''

سردار بوٹا سنگھ کی بیوی بیاہ کے تیسرے دن انہیں چھوڑ کر اپنے میکے جا بیٹھی۔ ان تین دنوں میں اس نے آنے جانے والوں کو اپنے شوہر کی بہت سی برائیاں بتائیں جو اس کے جاتے ہی پورے محلے میں گونجنے لگیں۔

''یار! تو بڑا ظالم ہے۔'' ایک بے تکلف دوست نے سردار جی کو راستے میں روک کر شکایت کی۔ ''نئی نویلی دلہن کو اتنا ستایا کہ بے چاری تنگ آکر گھر سے بھاگ گئی۔''

''گرو کی قسم، یہ سب جھوٹ ہے۔ ستانا کیا، میں نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا... اسے بالکل اپنی بہن کی طرح گھر میں رکھا...'' سردار بوٹا سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کی۔

سردار جوگیندر سنگھ نے بے روزگاری سے تنگ آکر اپنے ایک ساتھی کی مدد سے ایک بچے کو اسکول سے واپسی پر اغوا کر لیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے باپ سے پانچ لاکھ روپے لے کر آئے ورنہ وہ اسے مار ڈالیں گے۔

بچے کے جانے کے بعد یکایک وہ فکر مند ہو گئے کہ بچہ رقم لانے کے بجائے گھر میں بیٹھ گیا تو ساری مہم جوئی غارت ہو جائے گی، کوڑی بھی ہاتھ نہیں آئے گی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ان کے ساتھی نے تسلی دی کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بچہ بھی ایک سردار کا پوت ہے، اس کا باپ اسے رقم دے کر ضرور بھیجے گا۔

یہی ہوا۔ دو گھنٹے بعد بچے نے پوری رقم لا کر ان کے حوالے کر دی۔

ہانگ کانگ میں چار سردار پریشان تھے۔ ان کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کاروبار میں ہاتھ ڈالا جائے۔

کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے پیٹرول پمپ لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس کام میں نقصان کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

انہوں نے پیٹرول پمپ کھولا۔ ایک ہفتہ گزر گیا لیکن وہاں کوئی ایک بوند بھی خریدنے نہیں آیا۔ چاروں تشویش کے عالم میں سر جوڑ کر بیٹھے۔ آخر بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ زمین کے ہوش ربا داموں کی وجہ سے انہوں نے ایک عمارت کی پہلی منزل پر پیٹرول پمپ کھولا تھا۔ اس معمولی سی غلطی سے سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا۔

جگہ موجود تھی۔ متبادل کاروبار کے طور پر ہوٹل کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ چاروں سردار باہم کھانا سنبھال سنبھال کر تھک گئے۔ پھر اجلاس ہوا۔ اس بار یہ چھوٹی سی غلطی ہوئی کہ ہوٹل سے پیٹرول پمپ کا بورڈ اتارنا بھول گئے۔ پیٹرول پمپ میں کوئی کھانا کھانے کیسے آتا۔

بدشگونی کی وجہ سے یہ دھندا ختم کیا اور ٹیکسی کے طور پر ایک شان دار لیموزین خرید لی۔ چاروں بے چارے ہفتوں سے ہانگ کانگ کی سڑکوں کی خاک چھان رہے ہیں لیکن انہیں کوئی مسافر نہیں ملتا۔ سبب یہ ہے کہ وہ چاروں اسی لیموزین میں سوار، مسافر ڈھونڈ رہے ہیں۔

انتخاب: ولید بلال، کراچی

”ہمیں کمانڈر کا ایسا کوئی آرڈر نہیں ملا۔“

”آرڈر میرے پاس ہے۔“

”اسے دروازے کے نیچے سے اندر ڈال دو۔“ سوزن نے کہا۔

”سوری! آرڈر زبانی ہے۔“

”سولجر!“ سوزن کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ زبانی حکم صرف کمانڈر کی زبان سے ہی دیا جا سکتا ہے؟“

”تم لوگ شرافت سے دروازہ کھول دو۔“ بولنے والے کا لہجہ خطرناک ہو گیا۔ ”ورنہ ہمارے لیے اس دروازے کو توڑنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

کارٹا اور سانتھ بھی بیدار ہو گئی تھیں اور انہوں نے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ سوزن نے انہیں تیار دیکھا تو بلند آواز سے بولی۔ ”اگر تم لوگ ایک منٹ کے اندر یہاں سے دفع نہیں ہوئے تو ہم کھڑکیوں اور دروازے سے فائرنگ شروع کر دیں گے۔ اس کے بعد جو ہو گا اس کی ذمے داری تم لوگوں پر عائد ہو گی۔“

”بکواس... کیا تم ہمارے خلاف ہتھیار اٹھاؤ گی؟“ بولنے والے نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں، اپنے دفاع کے لیے ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔“

”تمہیں پتا ہے فوج میں اپنے ساتھیوں پر ہتھیار اٹھانا کتنا بڑا جرم ہے؟“

”ہاں لیکن اگر کوئی آپ کے درپے ہو جائے تو اپنا دفاع ہر انسان کا حق ہوتا ہے۔“ سوزن مضبوط لہجے میں بولی۔ ”سنو، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، تمہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“ کارٹا نے بھی کہا۔ ”یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

”ہم دروازہ توڑ کر بھی اندر آ سکتے ہیں۔“

”اس صورت میں ہم اپنے دفاع میں گولی چلانے کے لیے آزاد ہیں۔“ کارٹا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”جس نے مرنا ہو، وہ پہلے اندر آئے۔“

اس دھمکی کے بعد بولنے والے کو سانپ سونگھ گیا اور کچھ دیر بعد وہ لوگ دبی زبان میں گالیاں دیتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا لیکن یہ طوفان عارضی طور پر ٹل جانے والی بات تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے اور ان کے پیچھے پڑے رہیں گے۔ سوزن نے اس واقعے کی رپورٹ بنا کر بیک وقت بیس کمانڈر اور محکمۂ دفاع کو ای میل کر دی۔ اس نے کہا کہ اس کی اور اس کی ساتھیوں کی عزت اور جان کو یہاں خطرہ ہے اس لیے انہیں یہاں سے کہیں اور بھیجا جائے۔ اگلے ہی دن اسے کمانڈر نے طلب کر لیا۔ اس نے ای میل کا پرنٹ آؤٹ لہرایا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟“

”یہ حقیقت ہے سر!“ سوزن نے جواب دیا۔ ”کئی افراد نے ہماری بیرک میں گھسنے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے ان کی کوشش ناکام بنا دی۔“

”اس کا کیا ثبوت ہے کہ کسی نے ایسی حرکت کی ہے؟“ کرنل کے لہجے میں برہمی تھی۔

”سر! آپ نے غور نہیں کیا، ای میل ہم سب کی طرف سے ہے۔“

”اس میں جیسمین اور نورما کے نام نہیں ہیں۔“

سوزن بولی۔ ”اس وقت وہ وہاں نہیں تھیں۔“

کرنل کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ یہ شکایت واپس لے لو۔“

”سوری سر! ہم واقعی خطرے میں ہیں اس لیے میں شکایت واپس نہیں لے سکتی اور اگر آپ اس سے متفق نہیں ہیں تو ہمارا کیس محکمۂ دفاع کے پاس جانے دیں۔“ سوزن نے انکار کر دیا۔

”لیکن اس سے میرے کیمپ کی بدنامی ہو گی۔“

سوزن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سر! اس کے لیے آپ کیمپ کے سپاہیوں کو قابو کریں ورنہ یہ آپ کی بدنامی کرواتے رہیں گے۔ ہم یہاں ہوں یا نہ ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

کرنل نے اسے نخوت سے دیکھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ یہاں سے جا کر تم محفوظ ہو جاؤ گی؟ نہیں، ہر جگہ تمہیں ایسے ہی لوگ ملیں گے۔ تم کہاں تک ان سے بھاگو گی؟“

”سر! میں اپنی آرمی کی اخلاقی گراوٹ پر افسوس ہی کر سکتی ہوں لیکن میں یہاں اپنے ملک کی خدمت کرنے آئی ہوں... ہوس کے مارے سپاہیوں کی خواہشات پورے کرنے نہیں آئی۔“

”اگر تم نے درخواست واپس نہیں لی تو تمہیں اور دوسری خواتین کو یہاں سے جانا ہو گا۔“

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔“ سوزن نے جواب دیا۔ ”ہم یہاں خود کو محفوظ نہیں سمجھتے۔“

کرنل نے اسے سرد نظروں سے دیکھا۔ ”ممکن ہے جہاں تمہیں بھیجا جائے، وہاں جا کر تم اس بیس کو یاد کرو۔“

سوزن جانتی تھی کہ اسے اور اس کی ساتھی خواتین کو ہر جگہ ایسے ہی مردوں سے واسطہ پڑے گا لیکن یہاں وہ مردوں سے کھلی مخاصمت مول لے چکی تھیں۔ اب یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اپنے ارادوں میں ناکام ہونے والے سپاہی ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے اور وہ ان کو ہر بار نہیں روک سکتی تھیں۔ سوزن کو بغداد والے کیمپ میں اپنی ساتھی خواتین یاد آئیں جو اپنے ہی ساتھیوں کی وحشت اور درندگی کا نشانہ بن گئی تھیں۔ مرد ایک بار ٹھان لے تو وہ عورت کو نشانہ بنانے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا ہے۔

ایک ہفتے بعد انہیں کال آ گئی اور پھر انہیں لے جانے کے لیے ہیلی کاپٹر آ گیا... وہ انہیں شام اور عراق کی سرحد کے پاس ایک اڈے پر لے جا رہا تھا۔ حریت پسندوں کا سب سے زیادہ اسی علاقے میں زور تھا اور وہاں کا نام سن کر امریکی فوجیوں کے چہرے زرد پڑ جاتے تھے۔ کارٹا نے سوزن سے کہا۔ ”یہ ہمیں سزا کے طور پر وہاں بھیج رہے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ سوزن انجن کے شور میں چلا کر بولی۔ ”ہم اس کھلے دشمن کا مقابلہ کر لیں گے۔“

کارٹا اور اس کی ساتھی خواتین سوزن کی بات سے متفق تھیں، وہ کھلے دشمن کا مقابلہ کر سکتی تھیں لیکن آستین کے سانپوں کے ساتھ اندیشوں بھری زندگی گزارنا بہت مشکل کام تھا۔ اس لیے وہ اس کیمپ میں جاتے ہوئے خوش تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ دشمن میں گھرے امریکیوں کے پاس ان کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ہو گی۔ لیکن ان کا اندازہ ہیلی کاپٹر سے اترتے ہی غلط ثابت ہو گیا۔ وہاں موجود سپاہیوں کو اطلاع مل گئی تھی کہ ان کے کیمپ میں کچھ خواتین آ رہی ہیں اور وہ ان کے انتظار میں ڈیوٹی چھوڑ کر ہیلی پیڈ کے پاس جمع تھے۔ جیسے ہی وہ نیچے اتریں، سپاہیوں نے سیٹیاں بجانا اور فقرے کسنا شروع کر دیے۔ سوزن اور اس کی ساتھی لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر ہیلی کاپٹر سے اپنا سامان اتارنے لگیں۔

خلافِ توقع کیمپ کمانڈر کرنل رچ مین ایک شریف آدمی ثابت ہوا... انہوں نے اسے رپورٹ کی تو اس نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا۔ ”اس کیمپ میں اپنی حفاظت کی ذمے داری خود تم لوگوں پر ہو گی۔“

کارٹا نے جواب دیا۔ ”یس سر! اس کا اندازہ تو ان لوگوں کو دیکھ کر ہو گیا ہے۔“

کرنل رچ مین نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”آج کل فوج میں زیادہ تر جرائم پیشہ آ رہے ہیں۔“

”سوری سر! میں نے بہت مہذب اور اچھے گھروں سے آئے آفیسرز کا رویہ بھی ان جرائم پیشہ سے مختلف نہیں پایا۔“ کارٹا بولی۔

کرنل رچ مین نے سرد آہ بھری۔ ”تم صحیح کہہ رہی ہو۔ اصل میں اخلاقی لحاظ سے ہمارا پورا معاشرہ ہی زوال پذیر ہے۔“

کرنل رچ مین نے انہیں ایسی رہائش گاہ دی تھی جو محفوظ تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ باتھ روم بھی تھا، یعنی انہیں راتوں کو اٹھ کر غیر محفوظ جگہوں پر نہیں جانا پڑتا۔ وہاں تین خواتین پہلے سے تھیں اور انہوں نے کرنل کے اچھے رویّے کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے ماتحتوں کو دنیا کے چھٹے ہوئے بدمعاش قرار دیا تھا۔

”اگر انہیں کرنل کا خوف نہ ہو تو وہ ہمیں پامال کرنے میں دیر نہ لگائیں۔“ وہاں رہنے والی تین خواتین میں سے ایک رومیلا نے کہا۔

سوزن اور دوسری خواتین کو ویسے بھی اندازہ ہو چکا تھا لیکن آنے والے چند دنوں میں انہیں پتا چل گیا کہ کرنل نے اپنے آدمیوں کو دنیا کے چھٹے ہوئے بدمعاش کیوں قرار دیا تھا۔ وہ بے حد غلیظ لوگ تھے۔ ان کے انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے کبھی کوئی عورت نہ دیکھی ہو۔ حالانکہ وہ اس معاشرے سے تعلق رکھتے تھے جہاں عورت قدم قدم پر موجود تھی اور ہر طرح سے دستیاب بھی تھی۔ اس پر بھی یہ عالم تھا کہ کہیں کوئی خاتون سپاہی نظر آ جاتی تو وہ سب کام چھوڑ کر بس اسی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ اسے اشارے کرتے، آوازیں دیتے اور اگر ان کی طرف توجہ نہ دی جاتی تو کھلم کھلا غلیظ گالیوں پر اتر آتے۔

کرنل نے خواتین کی ڈیوٹی الگ جگہ لگائی تھی۔ اس نے ان کو محفوظ رکھنے کے لیے مرد سپاہیوں پر پابندی لگا رکھی تھی کہ وہ خواتین کے رہائشی حصے کی طرف نہیں جائیں گے اور جہاں وہ ڈیوٹی دیں گی وہاں بھی بلاوجہ نہیں جا سکتے لیکن وہ کتنی پابندیاں لگاتا؟ کیونکہ ان کا واسطہ کہیں نہ کہیں مردوں سے پڑ ہی جاتا تھا اور جب ان کا واسطہ کسی مرد سے پڑتا تو انہیں خود کو محفوظ رکھنے کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑتی..... کیمپ میں پہلے سے موجود خواتین میں ایک مارنڈا بھی تھی۔ وہ چپ چاپ اور خود میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ سوزن شروع میں سمجھی کہ وہ خاموش فطرت کی ہے لیکن ایک دن شاور لیتے ہوئے اس نے مارنڈا کی پشت پر ایک زخم دیکھا۔ سوزن نے پوچھا۔

''کیا یہ کسی لڑائی میں آیا تھا؟''

''لڑائی!'' وہ بولی۔ ''نہیں، یہ زخم مجھے اس وقت آیا تھا جب اسی کیمپ میں چار میرینز نے میری آبرو ریزی کی تھی۔''

سوزن دنگ رہ گئی۔ ''یہاں... تم نے ان کی شکایت کی... کرنل نے کوئی قدم اٹھایا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''کرنل نے انہیں معطل کر کے واپس بھیج دیا تھا لیکن اس کے بعد ان کا کچھ نہیں پتا چلا کہ وہ کہاں چلے گئے اور نہ ہی میرے کیس پر کوئی پیش رفت ہوئی۔''

''میرا خیال ہے کہ انہیں چھوڑ دیا گیا ہوگا۔''

مارنڈا نے سے کہا۔ ''ہمارا مقدر یہی ہے کہ ہم اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں بے آبرو ہوتے رہیں۔''

سوزن کو ایسا لگا جیسے وہ کسی جنگل میں ہو جہاں جنگل کا قانون ہو۔ جہاں ہر طاقت ور کو حق ہو کہ کمزور کو پھاڑ کھائے اور یہ سب دنیا کی سب سے مہذب کہلانے والے ملک کی مہذب فوج میں ہو رہا تھا۔ اس دن وہ سوچتی رہی پھر رات کو جب سب خواتین اپنی بیرک میں جمع ہوئیں تو اس نے ان سے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے لیکن پہلے تم لوگوں کو حلف اٹھانا ہوگا کہ یہ بات یہاں سے باہر نہیں جائے گی۔''

''ایسی کیا بات ہے؟'' کارٹا نے پوچھا۔ ساری خواتین سوزن کے گرد جمع ہو گئیں۔

''دوستو! ہمیں اب خود کچھ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ کوئی بھیڑیا ہم پر حملہ کرے، ہمیں خود انہیں ختم کرنا ہوگا۔ پہلے تم لوگ حلف اٹھاؤ کہ میں جو کہوں گی، وہ تم لوگوں تک محدود رہے گا۔''

یہ سن کر سب نے ہاتھ اٹھا دیے۔

☆☆☆

واشنگٹن ڈی سی، پینٹاگون کی ایک خفیہ فوجی عدالت میں سوزن اور اس کی دو ساتھی خواتین پر بند کمرے میں مقدمے کی سماعت جاری تھی۔ سوزن، کارٹا اور بیٹریٹ نامی خواتین پر الزام تھا کہ انہوں نے عراق میں دو مختلف امریکی فوجی اڈوں پر سات امریکی سپاہیوں کو قتل کیا۔ یہ سات سپاہی مختلف اوقات میں قتل ہوئے تھے اور یہ سارے مجرمانہ ذہن رکھنے والے ایسے افراد تھے جو خواتین کو ہراساں کرنے اور ان کے خلاف مجرمانہ حملوں میں ملوث رہے تھے۔

فوج کی اسپیشل انوسٹی گیشن ٹیم نے بڑی عرق ریزی کے بعد سوزن اور اس کی دو ساتھیوں پر فردِ جرم عائد کی تھی۔ انہیں عراق میں گرفتار کر کے واپس بھیج دیا گیا اور اب ان پر یہاں مقدمہ چل رہا تھا۔ انہیں وکیل مہیا کیا گیا تھا لیکن یہ ایک خانہ پری والی بات تھی کیونکہ ان کے خلاف تمام واقعاتی شہادتیں موجود تھیں۔ اگرچہ انہوں نے تمام شواہد کو بڑی مہارت سے چھپایا تھا۔ ان کے پاس سے نہ تو آلۂ قتل برآمد ہوئے تھے اور نہ کوئی گواہ تھا۔ لیکن دوسری شہادتیں بتا رہی تھیں کہ ان سات افراد کے قتل میں وہی تینوں ملوث ہیں۔ شروع میں سوزن اور باقی دو نے جرم سے انکار کیا لیکن جیسے جیسے کیس آگے بڑھتا گیا اور انہوں نے دیکھا کہ وہ پھنس چکی ہیں تو انہوں نے اقرارِ جرم کر لیا۔ سوزن نے اقرار کر لیا کہ یہ ساتوں قتل اس نے کیے تھے۔ کارٹا اور بیٹریٹ اس کی معاون تھیں۔ کیس کی سماعت کرنے والے تین رکنی فوجی افسران میں جنرل کلاز سربراہ تھا۔ اس نے سزا سنانے سے پہلے سوزن سے پوچھا۔

''تم نے یہ جرم کیوں کیا... کیا ان سات افراد نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا تھا؟''

''نہیں سر!'' سوزن نے کہا۔ ''لیکن ان افراد کا کردار بتاتا تھا کہ وہ خواتین کے خلاف جرائم میں ملوث رہے تھے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ خواتین کے خلاف جرائم میں ملوث رہے تھے؟''

''پڑتا ہے سر!'' سوزن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''جب میں انہیں دیکھتی تھی تو مجھے لگتا تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی میرے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کریں گے۔''

جنرل کلاز نے اسے شک سے دیکھا۔ ''تم نے صرف اس وجہ سے انہیں قتل کر دیا؟''

''یس سر... جب میں عراق جا رہی تھی تو مجھے بتایا گیا تھا کہ عراق سے امریکا کو خطرہ ہے اور اس خطرے کا بہترین تدارک یہ ہے کہ امریکا پہلے ہی عراق پر حملہ کر دے اور اسے تباہ کر دے۔ دشمن کو اس قابل ہی نہ چھوڑے کہ وہ امریکا پر حملہ کر سکے۔''

جنرل کلاز اور ساتھیوں کے چہرے سخت ہو گئے۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''

سوزن مسکرائی۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھا جو منصف کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ ''سر! میں نے ان افراد کو قتل کر کے اپنا پیشگی دفاع کیا ہے اور پیشگی دفاع کرنا امریکا کی نظر میں کوئی جرم نہیں ہے۔''

وہاں بیٹھی انوسٹی گیشن ٹیم کے ارکان نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر جنرل کلاز نے نظریں جھکا کر پہلے سے تحریر شدہ سزا کا فیصلہ سنانا شروع کر دیا۔

❄

خیال سراب

مریم کے خان

زندگی میں تقدیر کئی ایسے رنگ دکھاتی ہے... کہ بعض اوقات جن کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا... ایک ستم رسیدہ حسینہ کا فسوں خیز ماجرا جس کے وجود میں محبت کی شدید طلب اور تمنا پروان چڑھ رہی تھی...

قسمت کی ستم گری کا انوکھا وار جس نے آخری لمحات میں بازی پلٹ دی

وہ حسین دوشیزہ بستر پر لیٹی تھی۔ اس کی زلفیں ابھی بھی مخملیں تھیں۔ اس کی رنگت میں ہلکا سا گلابی پن تھا۔ اس کے نقوش ابھی بھی دل آویز تھے۔ اس کی نیلی آنکھوں کی چمک ابھی ماند نہیں ہوئی تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ موت اس کے جسم میں گھر کر چکی تھی۔ اسے ٹی بی تھی، جسے اس زمانے میں ٹی بی ہوتی تھی اسے مردہ سمجھ لیا جاتا تھا۔ اس وقت اسٹیج سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ اس موذی مرض کا علاج ہی دریافت نہیں ہوا تھا۔

روبین نامی یہ لڑکی فرانس کے ایک عام سے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا باپ ایک بڑھئی تھا اور اس کے ہنر مند ہاتھ طبقۂ امرا کے لیے ایسا فرنیچر تیار کرتے تھے جس کی مثال ملنا مشکل تھی لیکن اس کے گھر میں سوائے ٹوٹے پھوٹے معمولی فرنیچر کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ روبین اس بڑھئی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ اس نے ابھی جوانی کی بہاروں کو محسوس کیا تھا کہ موت نے اس چمن میں ڈیرے ڈال لیے۔ وہ اسے ساتھ لے جانے آئی تھی۔ جب باپ کو پتا چلا تو اس نے روبین کو اس سرائے میں منتقل کر دیا کیونکہ یہ جگہ اس کے گھٹے ہوئے مکان کے مقابلے میں کہیں پُر فضا اور تازہ ہوا سے بھرپور تھی۔ سرائے کا ایک کمرا جس سے دریا کا منظر صاف نظر آتا تھا، روبین کو دے دیا گیا تھا۔

سرائے کی مالکن اس کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اس نے معاوضے کے عوض اس کی ساری ذمّے داری اٹھا لی تھی۔ روبین کا باپ ہر ہفتے آتا اور روبین کو دیکھ کر اور سرائے کی مالکن کو اس کا معاوضہ دے کر چلا جاتا۔

روبین کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا باپ اس کے لیے رقم کہاں سے لاتا ہے لیکن اس نے سرائے کی مالکن کو رقم دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی جب تک زندہ رہے، اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ سرائے کی مالکن مہربان عورت تھی اور وہ روبین کا بہت خیال رکھتی تھی۔

جب روبین یہاں آئی تو اس کی بیماری اتنی نہیں تھی۔ وہ تھوڑا بہت چل لیا کرتی تھی اور عام طور سے دوپہر کے کھانے کے بعد چہل قدمی کے لیے دریا کے کنارے چلی جاتی تھی۔ ایک دن وہ حسبِ معمول دریا کے کنارے چہل قدمی کر رہی تھی کہ اسے ایک گھڑسوار تیزی سے دریا کی طرف آتا دکھائی دیا۔ روبین رک گئی۔ اس کا خیال تھا کہ گھڑسوار عجلت میں ہے مگر جیسے ہی وہ اس کے نزدیک آیا، گھوڑے کی رفتار کم ہوگئی اور پھر وہ اس سے کچھ دور رک گیا۔ روبین نے دیکھا، اس نے شان دار لباس پہن رکھا تھا اور اس کے عبا پر شاہی نشانات تھے۔ ذاتی طور پر بھی وہ وجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی عمر شاید پچیس کے آس پاس تھی اور اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی سنہری ڈاڑھی تھی... کھڑے نقوش اور مضبوط جسم...!

روبین کا باپ ملک کے شاہی اور برسرِاقتدار طبقے سے نفرت کرتا تھا کیونکہ وہ اس ملک کے غریب لوگوں کا استحصال کر رہے تھے۔ ان میں روبین کا باپ بھی تھا جسے شدید محنت کا صلہ بہ مشکل اتنا ملتا تھا جس سے وہ اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ بھر سکتا۔ روبین اپنے باپ سے محبت کرتی تھی اور اسے احساس تھا کہ اس کا باپ اس کے لیے کتنی قربانی دے رہا ہے... صرف اس لیے کہ اس کے آخری ایام سکون سے گزر سکیں۔ جب اسے اپنے باپ کی نفرت یاد آئی تو اس نے نوجوان سے منہ پھیر لیا۔

نوجوان اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اس لیے جب اس نے منہ پھیرا اور روبین کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات آئے تو وہ بے چین ہوگیا۔ وہ گھوڑے سے اترا۔ ”اے دل کش حسینہ... کیا بات ہے، مجھے دیکھ کر تمہارے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات کیوں آئے ہیں؟“ اس نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہیں نہیں جانتی... تم مجھ سے کیوں بات کر رہے ہو؟“

”بے شک تم مجھے نہیں جانتیں... میں...“ نوجوان بولتے بولتے رکا پھر اس نے کہا۔ ”میں شہزادہ مارک ڈی فولیٹ ہوں۔“

”اگر تم شہزادے ہو تو میں تم سے بالکل بھی بات نہیں کر سکتی۔“ روبین نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔۔۔ اب وہ اس کی طرف پشت کر کے کھڑی تھی۔

”مگر کیوں؟“ نوجوان تڑپ گیا۔

”اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے... اور اب مہربانی کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔“

نوجوان شہزادہ کچھ دیر اسے حسرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن شاید ہمت نہیں ہوئی۔ وہ ست قدموں سے گھوڑے کی طرف بڑھا... مڑ کر روبین کو دیکھا جو بدستور اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ ایک منٹ میں وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ روبین نے اسے مڑ کر دیکھا تو وہ دریا پر بنے پل پر چڑھ چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور واپس سرائے کی طرف چل پڑی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا۔

یہ فرانس کی تاریخ کا پُرآشوب ..... دور تھا۔ ملک واضح طور پر دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک طرف غریب عوام تھے جن میں مزدور، کسان اور ملازمین شامل تھے۔ ان میں ہر قسم کے ہنرمند اور کام کرنے والے لوگ تھے جنہیں ان کی محنت کا صحیح معاوضہ نہیں ملتا تھا اور ان کے لیے دو وقت کی روٹی کھانا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ ان پر مختلف ٹیکس لاگو تھے اور ان کی محنت کی کمائی کا بیشتر حصہ امرا کی جیبوں، پادریوں کے چندہ بکسوں اور حکومتی خزانے میں چلا جاتا تھا۔

دوسری طرف وہ چھوٹا سا لیکن بہت طاقت ور طبقہ تھا جس نے ملک کے تقریباً وسائل اپنے قبضے میں لے رکھے تھے ملک کی ستر فی صد زرخیز زمین، کارخانے اور تجارتی مراکز ان کی ملکیت تھے۔ وہ ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنٰی تھے اور وہ غریبوں کے خون پسینے کی کمائی بے دردی سے لٹاتے تھے۔ انہیں ہر طرح کا عیش و آرام میسر تھا۔ ان کے رہنے کے لیے محلات تھے اور وسیع و عریض رقبے پر ان کی جاگیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ملک کی ہر اچھی شے ان کے لیے مخصوص تھی۔

غربت... اور اس سے بھی زیادہ حالات کی چکی میں پستے پستے لوگ اب تنگ آگئے تھے۔ انہوں نے بغاوت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پورے ملک میں ہنگامے اور مظاہرے پھوٹ پڑے تھے۔ ملک بھر میں پھیلے جاگیرداروں اور اونچے طبقے کے لوگوں پر حملے ہونے لگے۔ لوگ اوپری طبقے سے اس قدر نفرت کرنے لگے تھے کہ اس کے کسی فرد کو دیکھتے ہی مشتعل ہو جاتے اور اکثر اوقات یہ اشتعال تشدد کی صورت اختیار کر لیتا۔ ظالم جاگیرداروں کے خلاف ان کے کسانوں نے باقاعدہ بغاوت کر دی تھی۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے شاہی فوج ملک بھر میں باغیوں کے خلاف کارروائی کر رہی تھی لیکن حالات قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

روبین جس سرائے میں مقیم تھی، وہ وسطی فرانس میں ایک مصروف شاہراہ پر واقع تھی۔ یہاں سارا دن نچلے اور متوسط طبقے کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا اور ان لوگوں کے توسط سے تازہ ترین خبریں بھی پہنچتی رہتیں۔ سرائے کی مالکن جب رات کو سونے سے پہلے روبین کے پاس آتی تو اسے دن بھر کی خبریں بھی سناتی۔ اس رات وہ روبین کے پاس آئی تو بہت سنجیدہ تھی۔ اس نے آتے ہی روبین سے پوچھا۔

”کیا آج دریا کے کنارے تم کسی شخص سے ملی تھیں؟“

روبین کو نوجوان شہزادہ یاد آ گیا۔ ”ہاں، ایک شخص آیا تھا اور اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اس لیے میں نے اس سے بات نہیں کی۔“

سرائے کی مالکن نے سر ہلایا۔ ”میں جانتی ہوں، تم ایک غیور باپ کی بیٹی ہو لیکن پھر بھی محتاط رہو۔ ایسے لوگوں کے سائے سے بھی بچو۔“

روبین نے اسے دیکھا۔ ”آپ کو کس نے بتایا؟“

”سرائے کے ملازمین آپس میں بات کر رہے تھے۔ اب تم دریا کی طرف کم جایا کرو۔“

روبین سمجھ گئی۔ سرائے کی مالکن کو اپنی سرائے کا بھی خیال تھا۔ وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور اس نے بڑی محنت سے یہ سرائے قائم کی تھی۔ ان دنوں حریت پسند اس شخص کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو اوپری طبقے سے ملتا تھا۔ روبین نے وعدہ کیا۔ ”میں اب خیال رکھوں گی اور اگر وہ دوبارہ نظر آیا تو فوراً سرائے میں واپس آ جاؤں گی۔“

سرائے کی مالکن کو خیال آیا کہ وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کی عمر بہت کم رہ گئی تھی اور اس کی زندگی میں خوشیاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ دریا کے کنارے سیر کر کے وہ کچھ لمحات اپنی پسند سے گزارتی تھی اور اس پر پابندی لگانا درست نہیں تھا۔ سرائے کی مالکن مسکرائی۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو اور حریت پسندوں کی حامی ہو۔ تمہارا باپ بھی ایک حریت پسند ہے اور تم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤ گی جس سے اس کی عزت پر حرف آئے۔“

سرائے کی مالکن خود بھی حریت پسندوں کی حامی تھی اور اس کی سرائے میں آنے والے زیادہ تر افراد حریت پسند تھے۔ کبھی کبھی وہ یہاں میٹنگ بھی کرتے تھے اور اوپری طبقے کے خلاف منصوبے بناتے۔ سرائے کی مالکن ان کی کوئی عملی مدد نہیں کرتی تھی لیکن اپنی سرائے میں وہ ان کی سرگرمیوں سے چشم پوشی کر کے ایک طرح سے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ دوسری طرف وہ اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ اس کی سرائے کا اوپری طبقے سے کسی قسم کا کوئی تعلق ظاہر نہ ہو۔ اسے معلوم تھا کہ ایسی جگہیں بھی حریت پسندوں کا نشانہ بنتی تھیں جن کا اوپری طبقے سے کوئی ذرا سا بھی تعلق ہوتا تھا۔ اندر ہی اندر ایک لاوا پک رہا تھا۔ سرائے کی مالکن کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ جب یہ لاوا پھٹے گا تو اس کی آگ میں بہت ساری غیر متعلقہ چیزیں بھی بھسم ہو جائیں گی۔ وہ اس وقت سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

روبین نے اس واقعے کے بعد دریا کے کنارے جانا کم کر دیا تھا لیکن کبھی کبھی اس کا دل زیادہ گھبراتا تو وہ وہاں چلی جاتی ۔۔۔ شہزادے سے ملاقات کے ایک ماہ بعد کی بات

ہر ضرورت مند اپنے دلی مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے

خدانخواستہ اگر آپ بھی تنگی ☆ مشکلات اور پریشانیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں ☆ ممکن ہے آپ کی الجھنوں میں کسی دشمن کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہو ☆ بالوجہ حسد و بغض آپ کے دنیاوی امور میں رکاوٹ ڈال کر ناکامیوں کو آپ کا مقدر بنانا چاہتا ہو ☆ مثلاً کاروبار میں نقصان/ شادی میں رکاوٹ ☆ گھریلو لڑائی جھگڑے، رشتوں میں رکاوٹ ☆ دوستی ☆ محبت میں ناکامی ☆ نافرمان اولاد اور ازدواجی زندگی کے کامیاب حل کے لیے ابھی فون کریں contact : faith healer

ماہر عملیات و تعویزات: این اے جوہری

0300-2222567

ہے، روبین دریا کے کنارے ٹہل رہی تھی۔ ساحل کی ریت پر کچھ کشتیاں بھی لگی تھیں۔ نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ وہ ایک کشتی دھکیل کر پانی میں لے گئی اور پھر اس میں سوار ہو کر چپو سنبھال لیے۔ اسے کشتی چلانی نہیں آتی تھی۔ اس کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب کشتی لہروں پر آنے کے بعد اس کے قابو سے باہر ہو گئی اور دریا کے رخ پر بہنے لگی۔ اس نے گھبرا کر آس پاس دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا جس سے وہ مدد طلب کر سکتی۔ اس نے خود چپوؤں کی مدد سے کشتی کنارے تک لے جانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پھر کشتی میں پانی بھرنے لگا۔ اصل میں یہ ناکارہ کشتی تھی اور روبین کو اس کا علم نہیں تھا۔ دریا میں پہنچ کر کشتی کا پیندا ٹوٹ گیا اور اس میں پانی بھرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کشتی ڈوب گئی اور روبین پانی میں غوطے کھانے لگی۔ اسے واجبی سا تیرنا آتا تھا اور وہ بھی ساکت پانی میں۔ یہاں تو دریا کی منہ زور لہریں تھیں۔ وہ غوطے کھانے لگی اور اسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ کسی نرم و گرم بستر میں تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ چادر تلے اس کے بدن پر لباس نہیں ہے۔ اس نے چادر کو اپنے جسم سے لپیٹ لیا۔ یہ ایک صاف ستھرا کمرا تھا اور یہاں کوئی نہیں تھا۔ روبین کو یاد آیا کہ وہ دریا میں ڈوب گئی تھی لیکن شاید کسی نے اسے بچا لیا تھا۔ ایک طرف آتش دان کے ساتھ اس کا لباس لٹکا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر اپنا لباس پہن لیا۔ لباس ہلکا سا گیلا تھا لیکن اس نے اس کی پروا نہیں کی۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور وہی سنہری بالوں والا شہزادہ مارک اندر آیا تو روبین حیرت زدہ ہو گئی۔ ”تم...؟“

وہ اس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہاں میں... اس روز تو تم نے مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کی تھی لیکن آج میں تمہیں دریا کے منہ سے نکال لایا۔“

”تم نے مجھے بچا لیا۔“ روبین آہستہ سے بولی۔

مارک نے سر ہلایا۔ ”میں اتفاق سے اس طرف سے گزر رہا تھا اور میری نظر پڑ گئی۔ کچھ دیر اور ہو جاتی تو تم ڈوب جاتیں۔“

”میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“ روبین نے ممنونیت سے کہا۔ ”لیکن اب مجھے جانا ہوگا۔“

”میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“ مارک نے پیش کش کی۔

”نہیں، تمہارا میرے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔“

روبین نے انکار کر دیا۔ اس کی شال دریا کی نذر ہو گئی تھی۔ مارک نے اسے اپنی ایک شال پیش کی۔

”یہ لے لو۔“

روبین نے ہچکچاتے ہوئے شال لے لی۔ ”شکریہ!“

مارک اسے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی مینار نما عمارت تھی۔ روبین حیران تھی کہ مارک جیسا شہزادہ اس معمولی سی عمارت میں کیا کر رہا تھا؟ مارک نے اس سے کہا۔ ”تمہیں بہت دور تک پیدل جانا ہوگا۔ میں تمہیں گھوڑے پر دریا کے کنارے تک چھوڑ دیتا ہوں۔ تم وہاں سے پیدل جا سکتی ہو۔“

روبین مان گئی۔ وہ واقعی اتنا پیدل نہیں چل سکتی تھی۔ مارک نے اسے سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا اور اس کے پیچھے خود سوار ہو گیا۔ روبین کو شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس سفر کو طویل کرنے کے لیے مارک گھوڑے کو ہلکی رفتار سے دوڑا رہا تھا لیکن یہ سفر جیسے بہت جلد ختم ہو گیا۔ کچھ دیر میں وہ دریا کے کنارے تھے۔ مارک نے اسے سہارا دے کر اتارا۔ وہ روبین سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تذبذب کا شکار رہا۔ پھر بنا کچھ کہے روبین کی طرف دیکھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد روبین تھکے تھکے قدموں سے سرائے میں لوٹ آئی جہاں سرائے کی مالکن بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی لپکی۔

”میری بچی! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ میرے آدمیوں نے سارا علاقہ چھان مارا۔“

”میں دریا میں کشتی چلانے گئی تھی لیکن کشتی ڈوب گئی پھر ایک آدمی نے مجھے بچا لیا، وہ مجھے ابھی چھوڑ کر گیا ہے۔“

”شکر ہے۔“ سرائے کی مالکن نے سکون کا سانس لیا۔ ”ورنہ میں تمہارے باپ کو کیا منہ دکھاتی۔“ پھر اس کی نظر شال پر گئی۔ ”یہ شال کس کی ہے... تمہاری تو نہیں ہے؟“

”میری شال دریا میں بہہ گئی تھی، یہ اسی آدمی کی شال ہے۔“

سرائے کی مالکن نے شال کو غور سے دیکھا تو تشویش زدہ ہو گئی۔ وہ جلدی سے روبین کا بازو پکڑ کر اسے کمرے میں لے آئی۔ اس نے شال اتار کر دیکھا اور بولی۔ ”وہ شخص کون تھا؟ یہ دیکھو، شال پر شاہی خاندان کی علامت بنی ہے اور یہ قیمتی بھی ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم لیکن وہ کسی اچھے گھرانے سے لگ رہا تھا۔“ روبین نے معصومیت سے جواب دیا۔

سرائے کی مالکن نے شال کو اس کے صندوق میں رکھ دیا۔ ”کسی کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ یہ شال تمہارے لیے مصیبت بن جائے گی۔“

روبین کو بھی اندازہ تھا۔ اس نے وعدہ کیا۔ ”میں کسی کو نہیں دکھاؤں گی۔“

”بہتر ہے تم اسے ضائع کر دو، اگر غلطی سے بھی کسی کی نظر میں آ گئی تو بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔“

روبین ہچکچائی پھر اس نے وعدہ کر لیا۔ ”ٹھیک ہے، میں اسے ضائع کر دوں گی۔“

”شاباش!“ سرائے کی مالکن نے اسے تھپکا۔ ”اب تم آرام کرو، میں کچھ دیر میں تمہارے لیے سوپ لاتی ہوں۔“

روبین واقعی تھکن محسوس کر رہی تھی جب سے اسے ٹی بی کا مرض ہوا تھا، وہ ذرا سی مشقت سے ہانپ جاتی تھی۔ اس نے شال اپنے صندوق میں سب سے نیچے رکھ دی۔ اس شام اسے تیز بخار چڑھا اور وہ پورے دو دن تک تیز بخار میں تپتی رہی۔ سرائے کی مالکن نے پریشان ہو کر ایک ڈاکٹر کو بلا لیا۔ اس نے روبین کو دوائیاں دیں تو بخار اترا لیکن ان دو دنوں میں وہ نچڑ کر رہ گئی تھی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ بستر سے اٹھ سکے۔ سرائے کی مالکن اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کر رہی تھی مگر اسے صحت یاب ہونے میں ایک مہینا لگ گیا۔

ایک مہینے بعد اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تو اسے حسین روبین کی جگہ ایک کمزور سی لڑکی نظر آئی۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں اور رنگت میں زردی نمایاں ہو رہی تھی۔ ذرا سا چلنے پھرنے سے اس کی سانس پھول جاتی۔ لیکن ڈاکٹر نے اسے کہا تھا کہ اس کی کمزوری اسی طرح دور ہو گی کہ وہ چلے پھرے اور جب تھک جائے تو آرام کرے۔ اسے بھوک لگے گی تو اس کی کمزوری خود دور ہو جائے گی۔

سرائے کی مالکن اب خود اسے صبح اور شام کو دریا کے کنارے لے جاتی۔ جب سے وہ دریا میں گری تھی، تب سے وہ اسے اکیلے جانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ اس کے آرام اور کھانے پینے کا بھی پورا خیال رکھتی تھی۔ اس کی کوششوں سے روبین کی صحت پھر سے بحال ہونے لگی۔ اس کے رخسار بھر گئے اور رنگت میں سرخی لوٹ آئی تھی۔

ملک میں ہنگامے آئے دن بڑھتے جا رہے تھے۔ اردگرد سے فسادات اور لوٹ مار کی خبریں آ رہی تھیں۔ حریت پسند شاہی فوج پر حملے کر رہے تھے اور شاہی فوج حریت پسندوں کا تعاقب کر رہی تھی۔ حریت پسندوں کا اولین ہدف امیر طبقے کے لوگ تھے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ شاہی خاندان کے حامی تھے یا نہیں۔ جو شخص بھی دولت مند تھا یا کسی طرح سے صاحبِ حیثیت تھا، وہ تحریک کا دشمن تھا۔

روبین یہ سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ اس کا باپ اس سے ملنے آتا تو وہ اسے بتاتا کہ بہت جلد ملک سے طبقۂ امرا کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور پھر ملک پر عوام کی حکومت ہو گی۔ روبین یہ سن کر خوش ہوتی تھی کہ اس کے باپ جیسے مزدوروں اور محنت کشوں کو ظلم و ستم سے نجات ملے گی اور وہ بھی خوشحال ہو سکیں گے۔ لیکن پھر اسے مارک کا خیال آتا تو وہ مضطرب ہو جاتی۔ کیا مارک بھی مارا جائے گا؟ وہ شہزادہ تھا اور حریت پسند شاہی خاندان کے دشمن تھے۔ شہزادوں، شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں اور جاگیرداروں پر خاص طور سے حملے کیے جاتے تھے۔ لازمی بات تھی کہ شہزادہ مارک بھی حریت پسندوں کا ہدف ہو گا۔ روبین کو اس کی دلیری پر حیرت تھی۔ وہ کس طرح کھلے عام بنا کسی محافظ کے اس علاقے میں گھومتا پھرتا تھا۔ اسے حریت پسندوں کا کوئی خوف نہیں تھا۔

ایک بار سرائے کی مالکن نے روبین سے شال کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے اسے ضائع کر دیا ہے مگر یہ جھوٹ تھا۔ اکثر راتوں کو جب اسے مارک کا خیال آتا تو وہ صندوق سے شال نکال کر دیکھتی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اگر اسے ٹی بی کا مرض نہ ہوتا اور ملک میں یہ بدامنی نہ ہوتی... اور اس کے ملک میں طبقاتی نظام نہ ہوتا تو شاید وہ مارک سے محبت بھی کر سکتی تھی۔ اب وہ اس سے محبت کر بھی لیتی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کچھ عرصے بعد مر جاتی اور شاید مارک بھی زیادہ عرصے زندہ نہ رہتا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔

سرائے میں حریت پسندوں کی آمد و رفت بڑھتی جا رہی تھی اور ان کی اجتماعات یہیں ہوتے تھے۔ ان اجتماعات میں حریت پسند اپنے آئندہ کا لائحۂ عمل طے کرتے تھے۔ ان اجتماعات کو نہایت خفیہ رکھا جاتا تھا۔ روبین کئی مہینے سے یہاں مقیم تھی اس لیے اس کے علم میں تھیں۔ سرائے کی مالکن اس سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ روبین کا باپ خود ایک حریت پسند تھا۔

ایک رات روبین کھانے کے بعد سونے کے لیے کمرے میں لیٹی تو اسے سرائے کے نچلے حصے سے شور کی آواز سنائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سارے افراد بیک وقت بول رہے ہوں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ جب حریت

پسندوں کا اجتماع ہوتا تھا تو بعض اوقات اس میں لڑائی جھگڑے کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ اس لیے روبین یہاں ہونے والے شور پر زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی لیکن اس رات شور کچھ زیادہ ہی تھا۔ اسے تجسس ہونے لگا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ اٹھ کر نیچے آئی اور اس نے اجتماع والے کمرے میں جھانکا۔ اندر ایک درجن سے زیادہ افراد تھے اور ان میں جھگڑا ہو رہا تھا لیکن روبین کے نیچے آنے تک معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ وہ واپس جانے لگی تو ایک نام اس کے کان میں پڑا۔

"اب مارک ڈی فولیٹ کی باری ہے۔ اس کے مظالم حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔" کسی نے کہا۔ روبین تڑپ کر پلٹی اور اس نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ ایک لمبا اور دبلا پتلا لیکن مضبوط نظر آنے والا شخص کھڑا ہو کر بول رہا تھا۔

"لیکن وہ بہت مضبوط ہے۔" کسی نے اس سے اختلاف کیا۔ "اگر ہم نے براہِ راست اس کے قلعے پر حملہ کیا تو ہمیں بہت نقصان ہو سکتا ہے۔"

"لیکن ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے۔ دو سو سے زیادہ حریت پسند اس کی قید میں ہیں اور ممکن ہے وہ انہیں سزائے موت دینے والا ہو۔" لمبے شخص نے کہا۔ "اس لیے حملہ کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

وہ آپس میں بحث کرنے لگے۔ روبین کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ خوب صورت اور شریف نظر آنے والا مارک ڈی فولیٹ اتنا سفاک ہو گا۔ حریت پسند آپس میں بات کرتے ہوئے اس کے مظالم بھی بیان کر رہے تھے۔ اس کے ہاتھ بے شمار حریت پسندوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ وسطی فرانس میں وہ شاہی خاندان کا سب سے مضبوط مہرہ تھا اور اس علاقے میں موجود تمام شاہی افواج کا سربراہ وہی تھا۔ اس لیے بھی حریت پسند اس پر حملہ کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ لیکن لمبا آدمی اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور انہوں نے طے کر لیا کہ وہ کل رات اس کے قلعے پر حملہ کریں گے۔

'یہ کل رات قلعے پر حملہ کریں گے۔' روبین نے سوچا۔ 'اور اگر مارک کی فوج شکست کھا گئی تو یہ اسے مار ڈالیں گے۔'

ان دنوں فرانس میں یہ ہو رہا تھا کہ حریت پسند جہاں قابض ہو جاتے، وہاں چن چن کر اوپری طبقے کے لوگوں کو پکڑ لیتے۔ ان پر سرسری سے مقدمے چلا کر سزائے موت سنا دی جاتی اور فوری طور پر گلوٹن کی مدد سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ گلوٹن ایک تیز دھار وزنی کلہاڑا ہوتا ہے جو لکڑی کے ایک کھانچے میں اس طرح سے فٹ ہوتا ہے کہ جب اسے بلندی سے گرایا جاتا ہے تو یہ نیچے لیٹے شخص کا سر اڑا دیتا ہے۔ یہ طریقہ پہلی جنگ عظیم تک فرانس میں رائج رہا تھا۔

روبین یہ سوچ کر کانپ گئی کہ مارک کو بھی گلوٹن کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے دل نے بے ساختہ کہا کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مارک کچھ بھی سہی... ممکن ہے وہ اتنا ہی ظالم ہو... کیونکہ حریت پسند جھوٹ نہیں بول رہے تھے لیکن پھر بھی اسے سزائے موت نہیں ہونی چاہیے۔ روبین اپنی تڑپ پر حیران رہ گئی۔ کیا وہ مارک سے محبت کرنے لگی تھی؟ وہ واپس اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔

روبین کی زندگی زیادہ عرصے کی نہیں تھی۔ ایک دو سال میں موت اسے آدبوچتی اور اس دنیا سے اس کا ناتا ٹوٹ جاتا لیکن اس کی خواہش تھی کہ مارک زندہ رہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ زندہ رہتی ہے یا نہیں۔ وہ ساری رات جاگتی رہی اور روتی رہی۔ اسے احساس تھا کہ وہ مارک کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ اس کی موت کا پیشگی دکھ منا رہی تھی۔ صبح کے قریب اسے خیال آیا کہ وہ مارک کو بتا دے تو اس کی جان بچ سکتی ہے' اس سوچ نے اسے لرزا دیا۔

'یہ تو غداری ہو گی۔' اس نے سوچا۔ 'صرف اپنے باپ سے نہیں بلکہ پوری فرانسیسی قوم سے جو اس وقت ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑ رہی ہے۔'

روبین کشمکش کا شکار تھی۔ ایک طرف اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ مارک کو خبردار کر دے اور دوسری طرف اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا کہ وہ بے شمار بے گناہوں کے قاتل شہزادے کو بچانے کا سوچ رہی ہے۔ صبح تک وہ مضطرب رہی۔ سرائے کی مالکن ناشتا لے کر آئی تو اسے جاگتے دیکھ کر حیران ہو گئی۔

"کیا تم رات کو سوئیں نہیں؟"

"نیند نہیں آ رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر تم رات کو نہیں سو گی تو تمہاری طبیعت مزید خراب ہو سکتی ہے۔"

"ہاں، مجھے پتا ہے مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔" اس نے بے دلی سے کہا پھر اچانک سوال کیا۔ "یہ مارک ڈی فولیٹ کون ہے؟"

"مارک ڈی فولیٹ!" اس نے نفرت سے کہا۔ "اس

علاقے میں شاہی خاندان کا سب سے ذلیل شخص ہے۔ اس کی ذلالت کے قصے ہر طرف مشہور ہیں... لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ایسے ہی... میں نے سنا ہے کہ اس نے بہت سارے لوگوں کو بے گناہ مروایا ہے۔"

"ہاں، بہت سارے لوگوں کو... ان میں میرا شوہر بھی شامل ہے۔" سرائے کی مالکن بولی۔ "لیکن اس کا یومِ حساب قریب ہے۔"

روبین جانتی تھی کہ یہ حساب آج رات ہی کر دیا جائے گا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ بے چینی کے عالم میں وہ صحیح سے ناشتا بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ سرائے کی مالکن اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھ لیا۔ "کیا بات ہے... تم پریشان ہو کیا؟"

"نہیں... نہیں تو۔" اس نے جلدی سے تردید کی۔

جب اس نے ناشتا کر لیا تو سرائے کی مالکن برتن لے گئی۔ اس کے جاتے ہی روبین نے دروازہ اندر سے بند کیا اور صندوق کھول کر اس میں سے شہزادے کی دی ہوئی شال نکالی۔ اس نے شال تہ کر کے اسے اپنے بستر تلے چھپا کر رکھ دیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شام ہوتے ہی وہ سرائے سے نکل جائے گی اور مارک ڈی فولیٹ کے قلعے پہنچ کر اسے خبردار کر دے گی۔ کچھ بھی ہو، وہ اس کا محبوب تھا اور وہ اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

سارا دن وہ بے چین سی رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ دن میں وہ نہیں نکل سکے گی کیونکہ سرائے کی مالکن نے اس پر اکیلے باہر جانے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اگر وہ جانے کی کوشش کرتی تو فوراً ہی نظروں میں آجاتی۔ اس لیے اسے رات ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ جیسے ہی سورج غروب ہوا اور باہر تاریکی چھا گئی، وہ کمرے سے نکلی۔ اس نے شال بغل میں دبا رکھی تھی۔ یہی شال دکھا کر وہ مارک ڈی فولیٹ تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔

اسے سرائے سے نکلنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ اس وقت سب ہی مصروف ہوتے تھے اور عقبی طرف تو کوئی نہیں ہوتا تھا۔ تاریکی نے بھی اسے نکلنے میں مدد دی۔ وہ دریا کے کنارے پہنچی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس پُل کی طرف بڑھنے لگی جہاں سے مارک اسے چھوڑنے کے لیے اس طرف آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شہزادے کی جاگیر اور قلعہ اسی طرف ہو گا۔ وہ پیدل ہی سفر کر رہی تھی اس لیے جلد اس کا سانس پھولنے لگا۔ اسے سانس درست کرنے کے لیے بار بار رکنا پڑتا۔

پھر ایک جگہ اسے کھیت کے ساتھ ایک گھوڑا چرتا نظر آگیا۔ اس پر زین نہیں تھی لیکن اس کے منہ میں لگام تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ روبین نے گھوڑے کی لگام تھامی اور اسے پچکارتی ہوئی اس جگہ سے دور لے جانے لگی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ اتنی دور نکل آئی ہے کہ گھوڑے کی ٹاپیں کسی کو متوجہ نہیں کر سکیں گی تو وہ اس پر سوار ہوئی اور اسے ہلکی رفتار سے دوڑانے لگی۔ اسے گھڑ سواری میں اتنی مہارت نہیں تھی۔ لیکن یہ شریف قسم کا گھوڑا تھا جس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی اور سکون سے دوڑتا رہا۔ روبین خوش تھی کہ اسے گھوڑا مل گیا ورنہ وہ جس رفتار سے جا رہی تھی اسے قلعے تک پہنچنے میں صبح ہو جاتی اور اس کے پہنچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ذرا دیر بعد پل آگیا اور وہ پل عبور کر کے اس جگہ پہنچ گئی جہاں سے مینار نما گھر کا راستہ جاتا تھا۔ شہزادہ اسے وہیں ملا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ وہاں سے قلعے کا راستہ معلوم کر لے گی۔ راستہ اس کا دیکھا ہوا تھا اس لیے اسے مینار نما عمارت تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے عمارت کے سامنے گھوڑا روکا اور نیچے اتر کر اس کا چوبی دروازہ پیٹنے لگی۔

"کون ہے؟" کسی نے اندر سے کہا۔

"دروازہ کھولو... مجھے شہزادہ مارک ڈی فولیٹ سے ملنا ہے۔" روبین نے چلّا کر کہا۔

اندر خاموشی چھا گئی۔ خاصی دیر کے بعد کسی نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک چوغہ پوش کھڑا تھا۔ اس نے کسی قدر گھبرائے انداز ہوئے میں کہا۔ "تمہیں شہزادے سے کیا کام ہے؟"

"یہ میں اسی کو بتا سکتی ہوں۔"

"نہیں، کام بتائے بغیر تم اس سے نہیں مل سکتیں۔" چوغہ پوش نے انکار کر دیا۔ روبین کشمکش میں پڑ گئی کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔ پھر اس نے سوچا کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے، ایسا نہ ہو کہ حریت پسند قلعے پر حملہ کر دیں۔ اس نے کہا۔ "آج رات کچھ لوگ قلعے پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اگر شہزادے کو خبردار نہیں کیا گیا تو وہ قلعے پر قبضہ بھی کر سکتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر چوغہ پوش یوں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا جیسے کسی نے اسے گھونسا مارا ہو۔ "کک.... کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور یہ اطلاع شہزادے تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔" چوغہ پوش نے جلدی سے کہا۔ "تم کچھ دیر رکو، میں ابھی آتا ہوں۔"

"دیر مت کرو، ایسا نہ ہو کہ حملہ ہو جائے۔" روبین نے بے چینی سے کہا۔

"بس میں ابھی آیا۔" چوغہ پوش نے کہا اور اندر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ روبین بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگی۔ وقت گزر رہا تھا۔ چوغہ پوش کو اندر گئے خاصی دیر ہو گئی تھی لیکن وہ باہر نہیں آیا۔ روبین نے اسے آواز دی۔ کئی بار آواز دینے پر کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا اور نہ ہی اندر سے کوئی آواز آئی تو اس نے دروازے کو دھکیلا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ روبین اندر داخل ہو گئی۔ وہاں تاریکی تھی۔

"کوئی ہے؟" روبین نے آواز دی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اب اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ "تم کہاں ہو؟"

اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ روبین باہر جانے کے لیے پلٹ رہی تھی کہ ایک ہاتھ آ کر اس کے منہ پر جم گیا۔ ہاتھ میں موجود کپڑے سے اٹھتی تیز بو نے اسے ایک لمحے میں بے ہوش کر دیا۔ اسے نہیں معلوم کہ بے ہوشی میں اس پر کیا گزری لیکن جب اس کا ذہن بیدار ہونے لگا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم ہچکولے لے رہا ہے۔ اسے تعجب ہوا کہ کیا زلزلہ آ رہا تھا؟ مگر کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ کسی گاڑی میں ہے جو محوِ سفر تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔

باہر ہلکی سی روشنی بتا رہی تھی کہ صبح ہونے والی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس چوغہ پوش نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ کیا وہ شہزادے کا دشمن تھا... ورنہ اس کے ساتھ اس طرح کیوں پیش آتا؟ وہ اسے کہیں لے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اور کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی اور اس کا لباس بھی سلامت تھا۔ یعنی چوغہ پوش کی اس پر نیت خراب نہیں تھی۔ وہ اسے کہیں لے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کہیں رک گئی۔ باہر سے لوگوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر ایک تیز سرسراہٹ کے بعد کسی کی ادھوری چیخ سنائی دی۔ روبین خوف زدہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد کسی نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسے بے دردی سے کھینچ کر نیچے اتار دیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک قلعہ نما جگہ ہے اور وہاں جو لوگ گھوم پھر رہے تھے ان کے حلیے حریت پسندوں جیسے تھے۔ پھر روبین نے ایک خوف ناک منظر دیکھا۔ قلعے میں ایک طرف کچھ گلوٹن لگے تھے اور ان پر لوگوں کو سزائے موت دی جا رہی تھی۔ روبین نے جو ادھوری چیخ سنی تھی، وہ ایک آدمی کی تھی جس کا سر کٹ کر ٹوکری میں جا گرا تھا۔ کچھ اور افراد کے سر کاٹنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔

روبین کا دل ڈوبنے لگا۔ یہ یقیناً مارک ڈی فولیٹ کا قلعہ تھا اور حریت پسند اس پر قابض ہو چکے تھے اور اب اپنے دشمنوں کے سر کاٹ رہے تھے۔ نہ جانے مارک کا کیا ہوا تھا؟ روبین کو گاڑی سے اتارنے والا وہی چوغہ پوش تھا۔ اس نے روبین کے ہاتھ پیر کی رسی کھولی اور پھر اس کے منہ سے کپڑا بھی نکال دیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اور سخت چہرے والا شخص تھا۔ اس نے تمسخر اڑانے والے لہجے میں روبین سے کہا۔ "تم مارک ڈی فولیٹ کو خبردار کرنا چاہتی تھیں... کچھ دیر بعد وہ تمہیں یہاں ملے گا اور تم اسے خبردار کر سکتی ہو۔"

روبین شہزادے کا سن کر بے تاب ہو گئی۔ "تم لوگوں نے اسے مار دیا؟"

"نہیں، ابھی وہ زندہ ہے لیکن جلد اس کا سر بھی ان میں سے کسی ایک ٹوکری میں پڑا ہوگا۔" اس نے گلوٹن کے سامنے رکھی ٹوکریوں کی طرف اشارہ کیا۔ "آؤ... تمہارا فیصلہ بھی کرتے ہیں۔"

چوغہ پوش اسے کھینچ کر ایک طرف لگی عدالت میں لایا۔ جہاں پانچ مجرموں کو سزائے موت سنائی جا رہی تھی۔ انہیں گلوٹن کی طرف بھیجنے کے بعد جج روبین کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے لانے والے سے پوچھا۔

"اس کا کیا قصور ہے؟"

چوغہ پوش بولا۔ "اس نے کل رات کے حملے سے متعلق مارک ڈی فولیٹ کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی اور میں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ میں اسے سزا دلانے کے لیے عدالت کے سامنے لایا ہوں۔"

جج کا چہرہ بگڑ گیا۔ "اس کا جرم بہت سنگین ہے۔ اگر یہ کامیاب ہو جاتی تو ہم اتنی آسانی سے قلعے پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے۔" جج روبین کی طرف متوجہ ہوا۔ "لڑکی! تمہارا نام کیا ہے اور تمہیں اپنے جرم کا اقرار ہے؟"

"ہاں، میں اقرار کرتی ہوں، اور میرا نام روبین ہے۔" اس نے بلا جھجک اقرار کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ انکار... کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ "میری ایک درخواست ہے... اگر عدالت منظور کرے۔"

"یہاں مجرموں کی درخواستیں نہیں سنی جاتیں ان کو سزا سنائی جاتی ہے۔" جج نے فوراً کہا۔ "تمہاری سزا یہ ہے کہ تمہیں مارک ڈی فولیٹ کے ساتھ سزائے موت دی

جاتی ہے۔"

روبین یہی درخواست کرنے والی تھی لیکن اس نے کہا نہیں کہ جج کہیں فیصلہ بدل نہ دے۔ اس نے سکون سے کہا۔ "مجھے عدالت کا فیصلہ منظور ہے۔"

سزا سناتے ہی اسے عدالت سے نکال کر اس طرف لایا گیا جہاں گلوٹن لگے تھے۔ ان کی تعداد چار تھی اور ان چاروں پر چار افراد کو لٹا کر ان کا سر قلم کیا جا رہا تھا۔ جلادوں نے کلہاڑوں کی رسیاں تھام رکھی تھیں۔ جیسے ہی انہیں ان کے افسر نے اشارہ کیا، انہوں نے رسیاں چھوڑ دیں اور وزنی کلہاڑے تیزی سے نیچے آئے اور انہوں نے چشم زدن میں تمام مجرموں کی گردنیں اڑا دیں۔ روبین سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جلادوں کے ساتھ موجود عملہ تیزی سے حرکت میں آیا اور انہوں نے سربریدہ لاشوں کو تختوں سے نکال کر انہیں ایک طرف کھڑی گاڑی میں ڈال دیا جس میں پہلے ہی درجن بھر سے زیادہ لاشیں موجود تھیں۔ پانی مار کر تختوں پر موجود خون صاف کیا گیا۔ پانچواں شخص تھر تھر کانپ رہا تھا اسے پکڑ کر ایک تختے پر لٹایا جانے لگا تو اس نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ جلادوں نے کلہاڑوں کو کھینچ کر پھر اوپر کر لیا تھا۔ اس شخص کے بعد روبین کو لایا گیا اور اسے ایک تختے پر اس طرح سے لٹایا کہ اس کی گردن ایک خلا سے نکلی ہوئی تھی اور وہ اسے باہر نہیں نکال سکتی تھی۔ کلہاڑا اس خلا سے بالکل لگ کر گزرتا اور اس کی گردن کاٹ کر رکھ دیتا۔

روبین خوف زدہ نہیں تھی کیونکہ موت اس کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں رہی تھی۔ اس کے بجائے اس کی نگاہیں مارک کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنے محبوب کو دیکھنا چاہتی تھی وہ جس زاویے سے لیٹی تھی۔ اسے عدالت نظر نہیں آ رہی تھی لیکن وہاں ہونے والی کارروائی اسے سنائی دے رہی تھی۔ مارک ڈی فولیٹ کی فردِ جرم سنائی جا رہی تھی اور پھر اسے بھی سزائے موت سنا دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ روبین کو محسوس ہوا کہ یہ مارک کی آواز تھی۔ اسے دکھ ہوا، اس کا محبوب اتنا بزدل تھا کہ موت کو سامنے دیکھ کر رونے گڑگڑانے لگا تھا۔ وہ ان لوگوں سے معافی مانگ رہا تھا۔ روبین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سوچا نہیں تھا کہ جو دوسروں پر ظلم کرتا ہے، وہ بہادر کب ہو سکتا ہے۔ مارک ڈی فولیٹ اس کا محبوب تھا لیکن وہ ظالم تھا اور ایک ظالم سے اسی بزدلی کی توقع کی جا سکتی تھی۔

مارک ڈی فولیٹ کو گلوٹن کی طرف لایا جا رہا تھا۔ پھر اسے زبردستی تختے پر لٹایا گیا۔ وہ ممکن حد تک مزاحمت کر رہا تھا۔ روبین ابھی تک اسے دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ جب جلادوں نے اسے تختے پر لٹا کر اسے جکڑ دیا تو وہ وحشیوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگا اور تب روبین نے پہلی بار اس کی شکل دیکھی۔ اسے دھچکا لگا۔ وہ مارک نہیں تھا بلکہ وہ تو صورت سے سفاک نظر آنے والا ایک بدصورت شخص تھا۔ روبین نے اپنے پاس کھڑے چوغہ پوش سے پوچھا۔

"کیا یہی مارک ڈی فولیٹ ہے؟"

"ہاں، تم اس کی ہمدردی میں دوڑی آئیں اور تمہیں اس کی شکل بھی نہیں یاد ہے؟" چوغہ پوش نے طنز کیا۔

"لیکن یہ وہ مارک نہیں ہے جسے میں جانتی ہوں۔"

"اچھا، جب مرنے کے بعد تم دونوں کے سر جمع ہوں تو ایک دوسرے کو اچھی طرح جان لینا۔" چوغہ پوش بدستور مذاق کے موڈ میں تھا۔

"یہ وہ نہیں ہے۔" روبین چلائی۔ اسی لمحے اس کی نظر سامنے سے آتے سنہری بالوں والے اس نوجوان پر پڑی جس نے اپنا تعارف مارک ڈی فولیٹ کے نام سے کرایا تھا۔ وہ اس وقت حریت پسندوں کے لباس میں تھا اور اس جج کے ساتھ آ رہا تھا جس نے روبین اور دوسرے لوگوں کو سزائے موت سنائی تھی۔ تو کیا وہ مارک ڈی فولیٹ نہیں تھا؟ اس نے روبین سے جھوٹ بولا تھا؟ وہ اصل میں مزاحمتی تحریک سے تھا اور اس نے کسی وجہ سے ایک شہزادے کا روپ دھار رکھا تھا۔

روبین کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ کتنا بڑا دھوکا کھا گئی تھی۔ اگر وہ رات کو مارک ڈی فولیٹ کے پاس پہنچ جاتی تو آج حریت پسندوں کی ناکامی اس کے سر جاتی۔ ساتھ ہی وہ خوش بھی تھی کہ اس کا محبوب کوئی ظالم شہزادہ نہیں بلکہ ایک بہادر حریت پسند ہے۔ اس نے آواز دی۔

"میرے محبوب...!"

نوجوان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اسی لمحے جلادوں نے افسر کے اشارے پر کلہاڑوں کی رسیاں چھوڑ دیں۔ سنسناتی موت تیزی سے روبین کی طرف آنے لگی... اور اب اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ روبین کا محبوب بھی نہیں جو اسے دیکھ کر اس کی طرف لپک رہا تھا۔ وہ چلا کر کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ روبین نے سنا نہیں، وہ اسے آخری بار دیکھ رہی تھی۔ پھر کھٹ کی آواز آئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ نوجوان شدتِ غم سے گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ...... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ...... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ...... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ...... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان, محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ...... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ...... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ...... ایک للکار ہے۔

چوتھی قسط

میں نے اس کے بدن سے نگاہیں چرا کر قالین پر گاڑ دیں۔ یوں اس کی شعلہ بدنی سے جدا ہو کر مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں نے اپنے خیالات مجتمع کیے اور کہا۔ ''میڈم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں جو کچھ میرے علم میں ہے، میں آپ کو صاف صاف بتا دوں گا۔ آپ بھی وعدہ کریں کہ مجھ پر شک نہیں کریں گی۔''

میڈم نادیہ نشیلے انداز میں مسکرائی۔ ''مردوں پر شک نہ کرنا بہت بڑی بے وقوفی ہوتی ہے۔ بہر حال، تم کہتے ہو تو یہ بے وقوفی کر لیتے ہیں۔''

''میں ثابت کر دوں گا کہ آپ نے بے وقوفی نہیں

کی۔'' میں نے وثوق سے کہا اور پھر اپنی روداد کو بالکل شروع سے بیان کرنے لگا۔

میں نے میڈم نادیہ کو بتایا کہ کس طرح قریباً ڈیڑھ سال پہلے واجی اور اس کے اوباش دوست میری منگیتر ثروت کے پیچھے پڑے۔ کس طرح انہوں نے میرا اور ثروت کا جینا حرام کیا۔ پھر ثروت کے اغوا اور واپسی کی تفصیل بتانے کے بعد میں نے اس حوالے سے واجی کے باپ سیٹھ سراج کے منفی کردار کا ذکر کیا۔ بعدازاں سیٹھ سراج اور اس کے کارندوں نے میرے گھر کے قریب مجھ پر جو بہیمانہ تشدد کیا، اس کی تفصیل بھی بیان کردی۔

میڈم نادیہ دھیان سے سنتی رہی اور بیچ بیچ میں مجھ سے سوالات بھی کرتی رہی۔ میں نے میڈم سے کہا۔ ''میں سچ کہتا ہوں، میں سخت مایوس تھا۔ اپنی جان لینے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر عمران مجھے نہ ملتا تو شاید میں اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتا... عمران میری کہانی پر بہت دکھی ہوا۔ خاص طور سے سیٹھ نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کی تھی، اس کا اسے بہت صدمہ پہنچا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے سیٹھ سراج کو تھوڑا سا سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ پہلے سیٹھ صاحب کی گاڑی کو ایک وین نے ٹکر ماری تھی اور بعد میں وہاں لڑائی بھی ہوئی تھی۔''

''ویری گڈ... بہت خوب!'' میڈم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''تو وہ طے شدہ ایکسیڈنٹ تھا... ویری اسمارٹ!''

''دراصل یہی ایکسیڈنٹ تھا میڈم جس کے بعد ہم سیٹھ سراج کے پیچھے لگے۔ یہ سب کچھ اتفاقاً ہوا۔ سیٹھ سراج کی گاڑی میں کچھ بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند بوریاں ایکسیڈنٹ کی وجہ سے پھٹ گئیں...'' اس کے بعد میں نے بوریوں کے بارے میں سارا ماجرا میڈم کے گوش گزار کردیا اور بتایا کہ صرف ان بوریوں سے پیدا ہونے والا تجسس دور کرنے کے لیے ہم نے سیٹھ سراج کا پیچھا کیا اور ہڑپہ پہنچ گئے۔

آگے کی ساری روداد میڈم کو زلیخا اور اس کے شوہر سے معلوم ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ زلیخا اور اس کے شوہر کی زبان سے ہم نے لال کوٹھیوں کا ذکر سنا اور پھر اپنے ''تجسس کے گھوڑے'' پر بیٹھ کر دگڑ دگڑ کرتے لال کوٹھیوں تک پہنچ گئے۔

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے، یہاں تک تو سب کلیئر ہوگیا۔ تم لوگ اس شوق میں یہاں گھس آئے کہ شاید یہاں سے تمہیں بیش قیمت تحفے تحائف مل سکیں گے۔ کروڑ دو کروڑ کی مورتیاں، تین چار کروڑ کی تصویریں اور اس طرح کی دوسری چیزیں، برتن، زیور وغیرہ وغیرہ... مگر پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ تم لوگ اچانک روپوش ہوگئے۔ روپوش اور خاموش تو تم لوگ تب ہوتے جب یہاں سے کچھ لے جاتے... مگر تم تو خالی ہاتھ گئے تھے پھر تمہاری غیر حاضری کیوں لگ گئی؟''

''دراصل ہم ڈر گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں کچھ دیر خاموش رہنا چاہیے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات بھی آگئی تھی کہ وی ٹی آر سسٹم میں ہماری تصویریں آگئی ہوں گی اور ہمیں پہچان لیا جائے گا۔''

''تمہاری یہ بات کچھ ہضم نہیں ہورہی۔ میں تمہارے بارے میں تو ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن وہ تمہارا ہیرو بھائی بڑی خرانٹ شے ہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمارے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے بعد بھی خاموش رہا ہوگا۔ اس کے دماغ میں کھجلی نہیں ہوئی ہوگی؟''

میڈم بات تو ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ واقعی خاموش نہیں بیٹھا رہا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' میڈم نے بڑی بے تکلفی سے میرے گال پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔

''یہی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو اپنی بات کا یقین کس طرح دلاؤں۔''

''اچھا... سلیم لنگڑے نے تم لوگوں سے کیا کہا تھا؟''

''اس نے ہمیں ڈرایا ہی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم نے لال کوٹھیوں میں گھس کر سخت غلطی کی ہے۔ ہم بہت بری طرح پھنس سکتے تھے۔ ہمیں آئندہ اس طرح کی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔'' جواب دینے کے بعد میں نے میڈم نادیہ کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ میرے جوابات سے سو فیصد مطمئن تو نہیں تھی پھر بھی اس کا ذہن کچھ نہ کچھ صاف ضرور ہوا تھا۔

حوصلہ پا کر میں نے وہ سوال کیا جو دیر سے میرے اندر مچل رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا میں آپ سے ہیرو بھائی کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟''

''پوچھو۔'' اس نے ادا سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی تو اس کے جسمانی خطوط اور بھی ہوش رُبا ہونے لگے۔

''مم... میرا مطلب ہے... وہ خیریت سے تو ہے؟''

''بہت چاہتے ہو ہیرو بھائی کو؟'' میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ''ویسے وہ ہے بھی چاہے جانے کے قابل... لیکن اکھڑ گھوڑے کی طرح ہے۔ اس پر کاٹھی ڈالنے کے لیے تھوڑی سی محنت کرنا پڑے گی۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرسکتے ہو؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''وہ تمہارا دوست ہے۔ تم ہر وقت اکٹھے رہتے ہو۔ تمہیں اس کے مزاج کی ہر سردی گرمی کا پتا ہوگا۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''میں چاہتی ہوں، وہ میرے بیڈروم میں ہو۔ بالکل گرم... جوش سے بھرا ہوا۔ وہ مجھے اور میں اسے جھنجوڑ کر رکھ دوں۔'' وہ بڑی بے باکی سے بولی۔ اس کی ہلکی بادامی آنکھوں میں عجیب سی تپش کروٹیں لے رہی تھی۔

مجھ سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر میں نے نگاہ جھکا لی۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''جو میرے دل میں ہوتا ہے، وہ میں صاف صاف کہہ دیتی ہوں... اور سچ یہی ہے کہ تمہارا یہ ہیرو بھائی میرے دل میں ٹھاہ کرکے لگا ہے اور جو چیز میرے دل کو بھا جاتی ہے پھر میں اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہتی۔ تم لوگ اچانک میرے گھر سے نکل گئے۔ ہیرو بھی نکل گیا، پر وہ باسٹرڈ میرے اندر سے نہیں نکل سکا۔ میں نے پچھلے دنوں اس کے لیے بڑی بے چینی محسوس کی ہے اور اسے اپنے طور پر ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتی رہی ہوں۔ بس اسے میری ''لک'' سمجھ لو کہ کل رات میرے ملازموں کو اچانک اس کی گاڑی نظر آگئی۔''

''کیا میں آپ سے...'' میں فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی خاموش ہوگیا۔

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ معاملہ فہم انداز میں بولی۔ ''میرے خیال میں تم پوچھنا چاہ رہے ہو کہ تمہارے ہیرو بھائی کو میں نے کیسے کیچ کیا... تو پوچھ لو۔''

''در... اصل... میرا ذہن صاف ہوجائے گا تو پھر میں بہتر طور پر سوچ سکوں گا اور آپ کے سوالوں کے جواب دے سکوں گا۔''

''آجاؤ میرے ساتھ۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اور اس کے بدن سے نگاہیں چراتا اس کے وسیع بیڈروم میں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس رات کے سارے واقعات ذہن میں تازہ ہوگئے جب ہم چوری چھپے یہاں گھسے تھے اور نادیہ کو باندھ کر بے بس کیا تھا۔ دائیں طرف وہ خوب صورت اٹالین الماری تھی جو سلیم کے بقول میڈم نے صرف اس لیے کھولی تھی کہ ہمیں شراب کی بوتلیں دکھا سکے۔ سامنے ہی وہ جہازی سائز بیڈ تھا جس پر عمران اور میڈم نادیہ کی دھینگا مشتی ہوئی تھی اور عمران نے مشتعل ہوکر نیم عریاں نادیہ کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے۔ سلیم نے بتایا تھا کہ اس بیڈ کی ایک سائڈ پر ایک نیلا بٹن ہے جسے دباتے ہی نادیہ درجن بھر گارڈز کو دوسری کوٹھی سے طلب

دو افیمی

دو افیمی جیل بھیج دیے گئے۔ دونوں کو ایک ہی کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔

ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ ''تمہیں کتنی سزا ہوئی ہے؟''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''آٹھ سال۔''

پہلا بولا۔ ''پھر تم اپنا بستر دروازے کے پاس بچھاؤ مجھے دس سال ہوئی ہے۔ میں اپنا بستر پیچھے بچھاتا ہوں۔''

کرسکتی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' نادیہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں کسی معمول کی طرح بیش قیمت صوفے کے گداز میں دھنس گیا۔ وہ تکیے کے سہارے بیڈ پر نیم دراز ہوگئی۔ سامنے دیوار پر ایک ٹی وی اسکرین نظر آرہی تھی۔ نادیہ نے ریموٹ کنٹرول سے اسکرین روشن کی پھر کئی ایک بٹن دبائے۔ کچھ دیر بعد اسکرین پر ''وی ٹی آر'' کی ایک پرانی فوٹیج چلنے لگی۔ یہ اس رات کے مناظر تھے جب میں، عمران اور اقبال یہاں داخل ہوئے تھے۔ ایک منظر میں اقبال رائفل بدست باتھ رومز کے بند دروازوں کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ ایک منظر میں ہم پرچھائیوں کی طرح اس نیم تاریک گیلری میں گھوم رہے تھے جہاں نہایت نایاب پینٹنگز دیواروں پر سجی تھیں۔ پھر باؤنڈری وال کا منظر دکھائی دیا۔ باؤنڈری وال سے باہر عمران کی مہران گاڑی کھڑی تھی۔ غالباً میں ہی اس میں موجود تھا مگر صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میڈم نادیہ نے بٹن دبا کر گاڑی کی فوٹیج کو اسکرین پر ساکت کردیا۔

وہ کہنے لگی۔ ''میرے پاس تم لوگوں کا بس یہی سراغ تھا مگر تم دیکھ رہے ہو گاڑی کی پوزیشن ایسی ہے کہ نمبر پلیٹس نظر نہیں آرہیں۔ اگر گاڑی کا نمبر نظر آجاتا تو شاید دوسرے تیسرے روز ہی ہماری ملاقات ہوجاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہاں، گاڑی کی ایک دو نشانیاں ضرور اس فوٹیج میں ریکارڈ ہوگئیں۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ گاڑی کی چھت پر ''کیریر'' لگا ہوا ہے۔ اب دوسری نشانی دیکھو۔'' نادیہ نے کہا اور اسکرین پر نظر آنے والی گاڑی کی شبیہ کو کچھ کلوز کیا۔ گاڑی کی سائڈ پر عمران نے یا اقبال نے ایک طویل اسٹیکر چپکایا ہوا تھا۔ یہ ایک، جست لگاتے ہوئے چیتے کی شبیہ تھی اور نیچے انگریزی کے چند حروف تھے۔ اسٹیکر جزوی طور پر اتر چکا تھا اور حروف

بھی مٹے مٹے تھے۔ بہرحال، یہ سب کچھ فوٹیج میں دکھائی ضرور دے رہا تھا۔

نادیہ نے ٹی وی اسکرین کو آف کیا اور بولی۔ ''میرے ملازم اس گاڑی کی ٹوہ میں تھے۔ کل رات اتفاقاً میرے ایک ملازم شوکت کو یہ گاڑی ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس نے ساتھیوں کو فون کیا۔ تمہارے ہیرو بھائی کے آنے سے پہلے ہی گاڑی کو گھیرا جا چکا تھا۔ اب آگے کی بات تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔''

''وہ... خیریت سے ہے نا؟ مم... میرا مطلب ہے آپ نے اس سے مار پیٹ تو نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تو نہیں کی لیکن میرے گارڈز کو اس رات والے واقعے پر غصہ تھا۔ انہوں نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی دو چار ہاتھ لگا دیے تھے اسے... بہرحال، پریشانی کی بات نہیں۔ وہ اب خیریت سے ہے۔''

یہ بات تو ہرگز ماننے والی نہیں تھی کہ گارڈز نے میڈم کی مرضی کے بغیر ہی عمران سے مار پیٹ کی ہو گی۔ وہ یقیناً تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ میرے تصور میں عمران کا زخمی چہرہ اور اس کا پھٹا ہوا لباس گھومنے لگا۔ میں نے بڑی بے چینی سے سوچا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہو گا؟ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آسانی سے بے بس ہونے والا نہیں ہے۔ یقیناً اس پر پلاننگ سے ہاتھ ڈالا گیا تھا۔

اب میرے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا تھا کہ سلیم کے بارے میں نادیہ کو شک کیونکر ہوا؟ یہ سلیم ہی تھا جس کی وجہ سے ہم بھی پھنس گئے تھے۔ میں نے محتاط لفظوں میں اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ ''لگتا ہے کہ تم اپنے ذہن کو پورا پورا کلیئر کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ چلو بھئی، کرلو کلیئر۔''

اس نے ایک بار پھر ٹی وی اسکرین روشن کی... اور وی ٹی آر میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ جلد ہی مطلوبہ فوٹیج اسے مل گئی۔ یہ بھی اسی رات کی فوٹیج تھی جب ہم پہلی بار لال کوٹھی میں آئے تھے۔ پوشیدہ کیمرا ایک خالی راہداری کو دکھا رہا تھا۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ راہداری بالکل خالی نہیں ہے۔ راہداری کے نیم روشن فرش پر تین سائے نظر آرہے تھے۔ ان میں ایک سایہ واضح طور پر سلیم کا اور دوسرا شاید عمران کا تھا۔ نادیہ نے فوٹیج کو ایک جگہ ''اسٹل'' کر دیا۔ اور بولی۔ ''غور کرو... یہ کیا ہے؟''

میں خاموش رہا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ان میں سے درمیان والا تو سلیم لنگڑا ہے۔ دائیں طرف تمہارا ہیرو بھائی ہے اور بائیں طرف شاید تم ہو۔ تم تینوں راہداری سے باہر کھڑے ہو مگر تمہاری پرچھائیاں راہداری کے فرش پر پڑ رہی ہیں۔''

''آپ... کیا بتانا چاہ رہی ہیں؟''

''میں سلیم کی ''بیڈ لک'' بتانا چاہ رہی ہوں۔ وہ بڑا ہوشیار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کوٹھی میں وی ٹی آر کیمرے کس کس جگہ کو فوکس کرتے ہیں اور کون کون سی جگہ ان کی پہنچ سے دور ہے۔ اس لیے جب اس نے تم دونوں سے راز داری کے ساتھ بات کی اور تمہیں کوٹھی سے نکل بھاگنے کا مشورہ دیا تو وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کیمرا تم تینوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی مائیکروفون کوئی آواز کیچ کر سکتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ تم تینوں کے سائے راہداری میں پڑ رہے تھے اور راہداری کو کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس سایوں والی فوٹیج پر میری نظر بس دو تین دن پہلے ہی پڑی ہے۔ اس کے بعد میری ہدایت پر گارڈ بختیار نے سلیم پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب تمہیں ہیرو کی شامت کی اطلاع دینے راوی روڈ پہنچا تو تم دونوں بھی نظر میں آگئے۔''

بات ختم کر کے نادیہ نے شیری کے چند اور گھونٹ بھرے اور اس کا چہرہ شراب کی حدت سے تمتمانے لگا۔ اس کی حرکات و سکنات میں عجیب سی تپش تھی۔ جسم کا ہر حصہ انگڑائی لیتا محسوس ہوتا تھا۔ کہنے لگی۔ ''تم بہت سوال کر چکے ہو۔ اب میرے کچھ سوالوں کے جواب دو۔''

''جی کہیں۔''

''ہیرو عمران صاحب کو لڑکیاں پسند ہیں؟'' میڈم نادیہ نے اچانک سوال کیا۔

میں پہلے تو گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ مجھے اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزرا۔ سرکس میں کام کرنے والی ایک دو لڑکیوں کے ساتھ اس کا ہنسی مذاق ضرور ہے۔''

''کوئی پکی گرل فرینڈ؟''

''میرے علم میں تو نہیں۔''

''ڈرنک وغیرہ کرتا ہے؟''

''ایک دوبار بیئر پیتے دیکھا ہے۔''

''کوئی خفیہ شادی وغیرہ؟''

میں نے ایک بار پھر لاعلمی میں سر ہلایا۔ ''دراصل عمران اپنے بارے میں اپنے دوستوں کو بھی بہت کم بتاتا ہے۔ اس معاملے میں وہ ذرا مختلف ٹائپ کا ہے۔''

''نہیں رہے گا مختلف ٹائپ کا۔'' میڈم نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ ''سرکش گھوڑا ہے۔ بس ذرا اس کی سمجھ آگئی تو ایک دم شانت ہو جائے گا۔ اشاروں پر چلے گا اور سرپٹ بھاگے گا...'' اس کی بادامی آنکھوں میں ایک بار پھر نشہ تیرنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہی جیسے وہ تصور ہی تصور میں اسے اپنے اشاروں پر چلتا دیکھ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی راحت جھلکنے لگی۔ پھر وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ مت سمجھنا کہ ابھی وہ میرے بس میں نہیں ہے۔ میں چاہوں تو وہ اب بھی سرپٹ بھاگ سکتا ہے۔ جیسے بھینسوں کا دودھ دھونے کے لیے انہیں انجکشن لگائے جاتے ہیں، اس طرح اڑیل گھوڑوں کو سرپٹ چلانے کے لیے بھی زبردست انجکشن ہوتے ہیں۔ اوپر سے وھسکی کی ڈوز دے دو تو گھوڑا ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ لیکن میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔ کم از کم تمہارے ہیرو عمران کے حوالے سے مجھے یہ بناوٹ بالکل پسند نہیں آئے گی۔ ناٹ ایٹ آل۔ میں چاہوں گی کہ وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنی شکست کو تسلیم کرے اور اسے محسوس بھی کرے۔''

شاید سلیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میڈم نادیہ ایک ایب نارمل لڑکی تھی۔ فی الوقت اس کی تمام توجہ کا مرکز عمران بنا ہوا تھا۔ وہ اسے تسخیر کرنے کے چکر میں تھی۔ شاید ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ اس سلسلے میں تھوڑی بہت کوشش کر بھی چکی تھی۔ پتا نہیں کیوں نادیہ کا رویہ دیکھ کر مجھے ایک طرح کی تسلی بھی ہوئی۔ اس سے پہلے مجھے اور اقبال کو اندیشہ تھا کہ عمران کے پکڑے جانے کے پیچھے جہلم میں مجید مٹھو کی ہلاکت کا واقعہ ہے اور نوادرات والا معاملہ بھی اس ساری صورتِ حال کو گمبھیر بنا رہا ہے مگر میڈم نادیہ سے بات کر کے پتا چلا کہ صورتِ حال اتنی نازک نہیں جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ میڈم نادیہ نے صرف اس رات والے واقعے کو انا کا مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ وہ عمران کو شکار کرنا چاہ رہی تھی اور اگر اس سارے معاملے میں اسے کسی پر حقیقی غصہ تھا تو وہ سلیم پر تھا۔ وہ اسے غداری کا مرتکب سمجھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک سلیم کا قصور ناقابلِ معافی تھا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف پہلی بار ہم تینوں لال کوٹھی سے بچ کر نکل گئے تھے بلکہ دوسری بار بھی اس نے مجھے اور اقبال کو بھگانے کی پوری کوشش کی تھی۔

''مجھے میرے سرکش گھوڑے کے بارے میں کوئی ٹپ دو۔'' وہ سگریٹ سلگا کر بولی۔ ''اس پر کاٹھی ڈالنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''ہاں، تم کیا کہہ سکتے ہو۔ تم گھوڑوں کے سائیس تو نہیں ہو... لیکن... لیکن تم گھوڑے تو ہو۔ ایک گھوڑا اپنے ساتھی گھوڑے کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ شروع میں، میں کافی خوف زدہ تھا مگر اب نادیہ کا رویہ اور اس کا ''نصب العین'' جاننے کے بعد میں خود کو کافی ایزی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! میں کوئی نفسیات دان تو نہیں ہوں، نہ ہی مجھے یہ دعوئی ہے کہ میں عمران کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں لیکن ایک بات آپ کو بتا سکتا ہوں۔ وہ اپنے دوستوں کے بارے میں بہت پکّا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ سلیم کے بارے میں آپ کا رویہ بڑا سخت ہے۔ کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ کافی مار پیٹ ہو چکی ہے اور لگتا ہے کہ آپ اسے کوئی کڑی سزا دینے والی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ایسا کر کے غلط کریں گی۔ اپنے نکتۂ نظر سے آپ صحیح ہیں لیکن اگر آپ اسے معاف کر سکیں تو اس کا عمران پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔''

''ویری گڈ! تمہارا مطلب ہے کہ عمران کو راہِ راست پر لانے کے لیے سلیم کو استعمال کیا جا سکتا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''تو پھر کیوں نہ اس کو ذرا اچھے طریقے سے استعمال کیا جائے۔'' نادیہ کا لہجہ بدل گیا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''ہو سکتا ہے سلیم کو معافی دینے کا تمہارے ہیرو صاحب پر وہ اثر نہ ہو جو اسے سزا دینے کا ہو۔ سلیم کو سخت سزا سے بچانے کے لیے بھی تو وہ اپنی سرکشی ختم کر سکتا ہے اور پھر...'' اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تم بھی تو اس کے دوست ہی ہو۔ آج کل عمران کے دل میں تمہارے لیے خصوصی ہمدردی جاگی ہوئی ہے۔''

پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنی سیدھی اور آسان نہیں جتنی نظر آتی ہے۔ اس کے لہجے میں میرے لیے ایک خطرناک دھمکی پوشیدہ تھی۔

وہ میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ''نو نو... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں انگلش میں... ایک پتھر سے دو پرندے شکار کرنا۔ میں بھی یہی کروں گی۔ اگر میں نے استعمال کرنا ہوا نا تو سلیم لنگڑے کو ہی کروں گی۔ اس کو سزا بھی ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کی سزا سے تمہارے ہیرو صاحب کی دولتیاں بھی ختم ہو جائیں۔''

میں اندر ہی اندر بری طرح سٹپٹایا اور پچھتایا بھی کہ میں نے ایسی بات کیوں کہی۔ اس نے فوراً میری یہ بات پکڑ

لی تھی کہ عمران اپنے دوستوں کے بارے میں بڑا اچّی ہے۔

عمران کی مصیبت کے خیال نے مجھے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ بندہ جس کو ناقابلِ شکست سمجھتا ہے اور جس کی صلاحیتوں پر بہت زیادہ اعتماد کرتا ہے، وہ اچانک کسی وجہ سے بے دست و پا نظر آئے تو دل کو شدید ٹھیس لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہو رہا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمران یہاں میڈم نادیہ کی گرفت میں آ چکا ہے اور اسے بے بس کر کے مارا پیٹا گیا ہے۔ عمران کو پریشانی اور بے بسی کی حالت میں دیکھنے کا تصور ہی مجھے ہلکان کر رہا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے نادیہ سے پوچھا۔ ''کیا میں عمران کو دیکھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ ابھی لو۔''

اس نے بیڈ پر لیٹے لیٹے بڑے سائز کے ریموٹ کنٹرول پر دو تین بٹن پریس کیے۔ ایک دم اسکرین پر عمران میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ وہ ایک قالین پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ یہ اسی لال کوٹھی کا کوئی کمرا نظر آتا تھا۔ عمران کے چہرے پر گہرے نیل تھے۔ دونوں آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا جس پر آہنی گرل تھی۔ گرل کے پاس ایک موٹی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس ملازمہ کو ہم پچھلی بار بھی دیکھ چکے تھے۔ یہی تھی جس نے ''روٹین'' میں کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا اور عمران نے مجھے باہر سے بلوا کر دروازہ کھلوایا تھا۔ اس کا نام آسیہ تھا۔ میں نے دیکھا، عمران کے چہرے پر تکلیف کا سایہ ہے اور وہ بے چارگی کے انداز میں ملازمہ آسیہ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ شاید وہ اس سے کسی طرح کی مدد طلب کر رہا تھا۔ عمران کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔

میڈم نادیہ نے کہا۔ ''آواز بھی سننا چاہتے ہو عمران صاحب کی؟''

پھر میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس نے سائڈ ٹیبل کے پاس سے کوئی بٹن پریس کیا اور اسکرین پر تصویر کے ساتھ آواز بھی ابھرنے لگی۔ آواز زیادہ صاف نہیں تھی لیکن سنی جا سکتی تھی۔

عمران کہہ رہا تھا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں آسیہ جی! عورت کی خوب صورتی موٹے یا پتلے ہونے میں نہیں ہوتی، اس کے چہرے میں ہوتی ہے... اور تمہارا چہرہ ایک سو ایک فیصد میری منگیتر روزینہ سے ملتا ہے۔ آج اگر روزینہ زندہ ہوتی تو ہو بہو تمہاری طرح ہوتی۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں، میں مذاق نہیں کر رہا۔ تمہیں دیکھ کر میرے سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ ہرے بھی اور لال سرخ بھی۔''

''لگتا ہے تمہیں بکواس کرنے کی عادت ہے۔'' قریب کھڑے ایک گارڈ نے بھڑک کر کہا۔

''عادت نہیں ہے یار! میں تو اتنا خاموش طبع ہوں کہ کبھی بولوں تو یار دوست سمجھتے ہیں شاید آج کوئی تہوار ہے۔ یہ تو آپ کی بہن کو دیکھ کر بولنا پڑ رہا ہے۔ یقین کرو، میں تمہیں اپنی روزینہ کی تصویر دکھاؤں تو تم بھی ہکا بکا رہ جاؤ گے اور آسیہ جی تو سمجھیں گی کہ آئینہ دیکھ رہی ہیں۔''

گارڈ دانت پیس کر بولا۔ ''میں ایک بار میڈم سے اجازت لے لوں پھر تمہاری بولتی ایسے بند کروں گا کہ قیامت تک آواز نہیں نکلے گی۔''

''تو اب اور قیامت کیا ہو گی؟ میرے لیے تو قیامت آ چکی ہے میرے برادر۔'' اس نے یکسر فدا ہو جانے والی نظروں سے ملازمہ آسیہ کو دیکھا۔

آسیہ کے ہاتھ میں سفید روئی تھی اور شاید کوئی دوا تھی۔ وہ غالباً عمران کے چہرے کے زخم صاف کرنے کے لیے آئی تھی۔ جھنجلا کر بولی۔ ''تمہیں دوا لگوانی ہے یا نہیں؟''

''تم اپنے ہاتھ سے لگاؤ گی تو کون کافر انکار کرے گا لیکن...''

ملازمہ نے سٹپٹا کر پلاسٹک کی بوتل اور روئی وغیرہ آہنی گرل کے راستے کمرے میں پھینکی اور اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی چلی گئی۔

میڈم نادیہ نے ریموٹ کے ذریعے اسکرین کو تاریک کر دیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہ تمہارا ہیرو دلچسپ شے ہے۔ اتنی مار کھا کر بھی شرمندہ نہیں ہے۔''

میں بس سر ہلا کر رہ گیا۔ دلی طور پر مجھے واقعی مسرت ہوئی تھی۔ بے شک عمران کو مارا پیٹا گیا تھا لیکن یہ مار پیٹ اس کے چہرے سے اس کی جادوئی مسکراہٹ چھیننے میں قطعاً ناکام رہی تھی۔ کہیں پڑھی ہوئی یہ بات یاد آنے لگی کہ جو انسان اپنا حوصلہ نہیں ہارتا، وہ کچھ بھی نہیں ہارتا۔ پتا نہیں کیوں عمران کو ہشاش بشاش دیکھنے کے بعد میں خود کو بھی ویسا ہی محسوس کرنے لگا۔

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نادیہ فون سننے کے لیے سائڈ روم میں چلی گئی۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ سامنے شیشے کی نہایت نفیس تپائی پر انگریزی اخبار رکھا تھا۔ یہ آج کا ہی تھا۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اندرونی صفحے پر

ایک خبر میرے لیے قابلِ توجہ تھی۔ یہ تین دن پہلے جہلم میں پیش آنے والے واقعے سے ہی متعلق تھی۔ دو کالمی خبر کی سرخی تھی۔ ''روڈ ایکسیڈنٹ میں مجید مٹھو کی ہلاکت اتفاقیہ نہیں تھی۔''

ذیلیوں میں درج تھا... ''پولیس تفتیش میں مجید مٹھو کی ہلاکت کے بارے میں کچھ نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کھائی میں گرنے سے پہلے مجید کی کار کسی اور گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ جائے حادثہ سے کچھ فاصلے پر سڑک کے اوپر بھی تباہ ہونے والی گاڑی کے شیشے ملے ہیں اور ٹائروں کے نشان بھی ہیں۔ تفتیشی پولیس افسر کے مطابق دونوں طرح کے امکان موجود ہیں۔ یہ اتفاقی حادثہ ہو سکتا ہے اور کسی عداوت کا شاخسانہ بھی۔''

اسی دوران میں میڈم نادیہ اپنی عریاں ٹانگوں کو بڑے اسٹائل سے حرکت دیتی ہوئی واپس آ گئی۔ شاید فون پر کسی سے کوئی تلخ بات ہوئی تھی، وہ کچھ برہم نظر آتی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ بستر پر نیم دراز ہو کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کوشش میں اس نے شیری کا ایک اور گلاس پیا۔ اس کے علاوہ امپورٹڈ سگریٹ کے چند گہرے کش بھی لیے، تب وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ملنا چاہو گے عمران سے؟''

''اگر آپ پسند کریں تو۔'' میں نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں ایک بار پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس عمارت میں ہر جگہ کیمرے موجود ہیں اور ڈکٹا فون بھی لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ نادیدہ کان ہمیں سن رہے تھے اور نادیدہ آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اس عمارت میں جگہ جگہ پینٹنگز اور نوادر کی سجاوٹ نظر آتی تھی۔ راہداریوں میں قیمتی قالین تھے اور یہ ساری جگہ سینٹرلی ائر کنڈیشنڈ تھی۔ جلد ہی ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچ گئے۔ سامنے ہی وہ دیوار گیر آہنی گرل تھی جس کی دوسری طرف عمران موجود تھا۔ گرل کے ساتھ جالی نہیں تھی اس لیے چھوٹی موٹی اشیا گرل میں سے کمرے میں ''پاس'' کی جا سکتی تھیں۔ عمران غالباً سیال آیوڈین کے ذریعے اپنے چہرے کے زخم صاف کر رہا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنا بایاں ہاتھ استعمال کر رہا تھا، دایاں ہاتھ پٹی میں جکڑا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ زیادہ چونکا نہیں۔ یقیناً وہ یہاں ہماری آمد سے آگاہ ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے مغموم چہرے کے ساتھ ایک لمبی آہ بھری۔ ''اچھا ہوا تابی! تم سے ملاقات ہو گئی۔ اب میں سکون سے مر سکوں گا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''مریں تمہارے دشمن۔'' نادیہ بولی۔

''کہتے سب ہیں، مرتا کوئی نہیں۔'' وہ ترت بولا۔

''یعنی میں تمہاری دشمن ہوں؟''

''میں نے یہ کب کہا؟ اپنا سب سے بڑا دشمن تو میں خود ہوں۔ عاشق خود ہی اپنا دشمن ہوتا ہے۔ مجنوں، رانجھا، فرہاد ان میں سے کون ایسا ہے جس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں ماری۔ عاشق کا تو شروع سے ایجنڈا ہی ہلاک ہونے کا ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اب مجھے بھی مرنا ہے۔ اس موچھیل گارڈ کے ہاتھوں یا پھر اپنے تایا ابا کے ہاتھوں۔'' موچھیل گارڈ وہی تھا جس سے ذرا دیر پہلے عمران کی تلخی ہوئی تھی۔

''موچھیل گارڈ اور تایا ابا.. یہ کیا بات ہوئی؟'' نادیہ نے عمران کی گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''گارڈ صاحب کے ہاتھوں مرنے کے امکانات یوں روشن ہیں کہ میں ان کی بہن سے عشق فرمانے سے باز نہیں آتا... اور وہ مجھے شوٹ کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے ہم دونوں میں ایک جھڑپ بھی ہو چکی ہے... اور تایا ابا والی بات یہ ہے کہ وہ ہر فن مولا ہونے کے علاوہ بڑے سخت قسم کے مذہبی ہیں۔ میں جب انہیں بتاؤں گا کہ میری مرحومہ منگیتر روزینہ، لال کوٹھی کی نہایت دلکش اور چربیلی ملازمہ آسیہ کی صورت میں واپس آ گئی ہے تو انہیں شدید جھٹکا لگے گا۔ وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ میں ''آواگون'' پر یقین کرنے لگا ہوں۔ بس اسی بات پر وہ مجھے قتل فی سبیل اللہ کر دیں گے۔''

''جب تمہیں مرنا ہی ہے تو پھر کسی کے کام کیوں نہیں آ جاتے باسٹرڈ۔'' نادیہ عجیب نشیلے انداز میں بولی۔

''کام تو میں اسی کے آ سکتا ہوں جس سے مجھے یہ آناً فاناً عشق ہوا ہے۔ اپنی اس چربیلی ملازمہ کو میرے حوالے کر دو۔ تین ساڑھے تین سال کے اندر ہی چار ہٹے کٹے بچے پیدا نہ کر دوں تو مجھے ہیرو نہ کہنا۔'' عمران بڑے یقین کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''تین ساڑھے تین سال میں چار بچے؟'' نادیہ نے بھویں اچکائیں۔

''بیس اوورز میں آج کل دو سو اسکور ہو رہا ہے تو ساڑھے تین سال میں چار بچے کیوں نہیں ہو سکتے؟ میرے خیال میں تو پانچ بھی ہو سکتے ہیں۔ جڑواں بچوں کا چانس بھی تو ہوتا ہے۔''

نادیہ نے عمران کو گھور کر دیکھا پھر اس کی بادامی آنکھوں میں ایک زہریلی چمک ابھر آئی۔ وہ لمبی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں کرکٹ سے کافی دلچسپی

ہے۔ چلو ایک ٹوکٹی ٹوکٹی میچ تمہیں میں بھی دکھاتی ہوں۔"

اس نے باوردی گارڈز کو کوئی اشارہ کیا۔ اچانک میری شریانوں میں ایک برقیلی لہر دوڑ گئی۔ دو صحت مند گارڈز تیزی سے میری طرف آئے اور مجھے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہٹا کٹا شیرا برآمد ہو گیا۔ یہ وہی کرخت چہرہ گرانڈیل تھا جس سے پچھلی مرتبہ عمران کی خونی جھڑپ ہوئی تھی۔ عمران نے اس انچارج گارڈ کو دو خوفناک ٹکروں سے "ناک آؤٹ" کر کے سبھی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ شیرے کے ہاتھوں میں نائلون کی رسّی نظر آ رہی تھی۔

مجھے پکڑنے والے دونوں گارڈز کی گرفت بڑی سخت تھی۔ انہوں نے مجھے دھکیل کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ ایسے مناظر اس سے پہلے میں نے کہانیوں میں پڑھے تھے یا فلموں اور ڈراموں میں دیکھے تھے۔ چند ماہ پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن خود میرے ساتھ یہ سب کچھ پیش آئے گا۔ جابر لوگوں کی سختی، اسلحے کی نوک اور موت کا لمس میں اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ محسوس کروں گا۔

میں نے خود کو چھڑانے کی اضطراری کوشش کی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس وقت میرا چہرہ زرد ہو چکا ہے اور میری آنکھوں کی رنگت مجھے پکڑنے والوں کا حوصلہ بڑھا رہی ہے... اور یہی وقت تھا جب میں نے عمران کی طرف بھی دیکھا۔ ان لمحوں میں مجھے عمران کا چہرہ بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ بہ ظاہر چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت تھی جو میں نے پہلے بس ایک دو دفعہ ہی دیکھی تھی۔ یہ کیفیت اس کی معصوم صورت سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ اس میں آگ تھی، سفاکی تھی اور ایک پوشیدہ توانائی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ عمران کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر رہا ہے... اور اس کے ساتھ ہی دل نے یہ گواہی بھی دی کہ وہ جو کچھ کرنا چاہ رہا ہے، وہ کر گزرے گا۔ ہاں، اگر میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا گیا تو وہ کر گزرے گا۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ وہ کیا کرے گا؟ دروازہ مقفل تھا۔ کھڑکی پر آہنی گرل تھی۔ ہاں، ایک گارڈ ضرور کھڑکی کے قریب موجود تھا۔ کیا وہ گرل میں سے ہاتھ گزار کر اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کرے گا؟ یا پھر کسی زوردار ضرب سے دروازے کا کھٹکا توڑنا چاہے گا؟ ابھی یہ سب کچھ میرے ذہن میں چل ہی رہا تھا کہ ایک اور واقعہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کھڑے دو گارڈز ایک دم اٹین شین ہو گئے، ان میں شیرا بھی شامل تھا۔ مجھے پکڑنے والے دونوں گارڈز بھی بے حرکت ہو گئے۔ شاید انہوں نے مجھے تھاما نہ ہوتا تو وہ بھی اٹین شین ہو جاتے۔ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور میں نے ایک جواں سال عورت کو اندر آتے دیکھا۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر یہی کوئی پچیس سال رہی ہوگی۔ اس نے چست پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی۔ جرسی کے دونوں بازو واڑ سے ہوئے تھے۔ بال بوائے کٹ تھے۔ وہ گداز جسم ہونے کے باوجود کسی یورپین کھلاڑی کی طرح چست اور توانا نظر آتی تھی۔

میرے دل نے پکار کر کہا کہ یہی بڑی میڈم صفورا شیرازی ہے۔ اس کی صورت بھی یہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ میڈم نادیہ کی بڑی بہن ہے۔ اس نے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بولی۔ "ہیلو نادو! بھئی کیا چل رہا ہے یہاں؟"

"کچھ نہیں سسٹر! بس اس بندے سے چھوٹا سا انٹرویو کرنا تھا۔" نادیہ نے عمران کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ اسے بڑی بہن کی آمد کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ دوسری طرف بڑی بہن نے بھی اس کی نہایت مختصر نیکر اور کھلے گریبان کو ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔

"اچھا، یہ ہے وہ اسپائڈر مین جو یہاں گھسا تھا؟" صفورا نے عمران کا جائزہ لیا۔

"ہاں سسٹر! یہ بھی... اور یہ بھی۔" اس مرتبہ نادیہ نے میری طرف اشارہ کیا۔ "ان کے علاوہ ایک تیسرا بھی ہے۔"

"اچھا، ان میں سے شیرے کے ساتھ جھڑپ کس کی ہوئی تھی؟" میڈم صفورا کے لہجے میں تجسس ابھرا۔

"اس کی جو اندر بیٹھا ہے۔ عمران نام ہے۔ ہیرو ہیرو بھی کہتے ہیں۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتا ہے اور بازی گری کرتا ہے۔"

"زبردست!" صفورا، عمران کے قریب چلی گئی اور یوں دیکھنے لگی جیسے پنجرے میں بند کسی خاص نسل کے جانور کو دیکھا جاتا ہے۔

نادیہ نے کھنکھار کر بڑی بہن کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بولی۔ "سلیم لنگڑے کے ساتھ اس کا پرانا یارانہ ہے۔ وہ بھی سرکس میں کام کرتا تھا۔ اسی کی وجہ سے یہ لوگ یہاں سے نکل بھاگے تھے۔"

میڈم صفورا بڑی شان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نادیہ کے اشارے پر مجھے تھامنے والے دونوں گارڈز نے مجھے چھوڑ دیا اور ذرا ہٹ کر اٹین شین کھڑے ہو گئے۔

میڈم صفورا نے مجھے دیکھا۔ اس کی کھوجی نظریں جیسے میرے سر کے اندر گھسنے لگیں اور دماغ کا ایکسرے کرنے لگیں۔ وہ نگاہیں واقعی ورمے جیسی تھیں۔ پھر یہ ورما صفت

نگاہیں عمران کی طرف اٹھ گئیں۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ "نادو! ہمیں اس سارے معاملے کو ایزی نہیں لینا چاہیے۔ یہ صرف چور اُچکے ہو سکتے ہیں اور اس سے بڑھ کر بھی۔ ان سے پوری پوری پوچھ گچھ کرو۔ ان کی تلاشی وغیرہ ہو گئی ہے؟"

"ہاں سسٹر! ابھی تک کوئی خاص چیز تو نہیں ملی، سوائے ایک پستول کے۔"

"گاڑی کی تلاشی؟"

"نہیں، وہ تو نہیں لی۔"

"جاؤ شیرا! گاڑی کو اچھی طرح دیکھو۔"

شیرا حکم کی تکمیل کے لیے تیزی سے باہر چلا گیا۔ عمران کی گاڑی کی چابی یقیناً اس کے پاس ہی تھی۔

شیرے کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں میڈم صفورا فون پر ہی کسی سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتیں رئیل اسٹیٹ کے کاروبار کے بارے میں تھیں۔ زمینوں کی قیمت، بلڈنگ میٹریل کے خرچے اور ٹیکسز... بس اس طرح کی باتیں تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر نامدار کی موت کے بعد اس کے کاروبار کو بہ خوبی سنبھال رہی ہے۔ دوسری طرف شاید کوئی پٹھان تھا۔ میڈم نے اسے خان خاناں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پھر بات کرتے کرتے وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو شیرا ابھی تلاشی لے کر واپس آ چکا تھا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے نکلنے والی اشیا اس نے گاڑی کے صفائی والے کپڑے میں باندھ رکھی تھیں۔ اس نے یہ کپڑا میڈم صفورا شیرازی کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھا اور گرہ کھول دی۔ گاڑی کے کاغذات تھے، چند کیسٹس تھیں ایک پیچ کش اور کچھ رسیدیں وغیرہ۔

میڈم صفورا ان چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کاغذات کو دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے عمران سے سوال کیا۔ "ہیرو صاحب! تم جمعرات کے دن جہلم گئے تھے، جی ٹی روڈ کے ذریعے؟"

"جی ہاں۔" عمران نے مغموم لہجے میں کہا۔

میڈم صفورا کے ہاتھ میں دریائے چناب اور جہلم کے پلوں پر لیے گئے ٹول ٹیکس کی دو پرچیاں نظر آ رہی تھیں۔

"کیوں گئے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"دراصل میں ایک آرٹیکل لکھ رہا ہوں۔ آرٹیکل کا موضوع یہ ہے کہ سوہنی اصل میں دریائے چناب میں نہیں ڈوبی تھی بلکہ دریائے جہلم میں ڈوب کر فوت ہوئی تھی۔"

"ونڈرفل... زبردست... بڑے اونچے خیالات ہیں۔ لیکن تمہارے یہ خیالات پڑھے گا کون؟" میڈم صفورا نے استفسار کیا۔

"پڑھے گا نہیں تو دیکھے گا ضرور۔ یہ دور ہی دیکھنے کا ہے۔ دراصل میرے تایا صاحب جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، ایک نیوز چینل بھی چلا رہے ہیں۔ میرے اس آرٹیکل کے ٹکڑے نیوز چینل پر چلیں گے اور ہزاروں لاکھوں لوگ پڑھیں گے... دراصل بات یہ ہے میڈم کہ آج کل خبروں کا کام کچھ مندا چل رہا ہے۔ خبروں کی پیاس میں تایا جی کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے بلکہ سب چینلو کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ اب ایسے میں یہ سوہنی والی اطلاع بریکنگ نیوز ثابت ہوگی..."

"اس پر یقین کون کرے گا؟"

"نہ کرے یقین۔ بحث تو چھڑ جائے گی نا۔ گجرات والے ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے کہ اتنا بڑا اعزاز دریائے چناب سے چھن جائے۔ وہ ہر صورت یہ ثابت کریں گے کہ سوہنی کو دریائے چناب نے ہی نگلا تھا۔ دوسری طرف جہلم والے اپنے دریا کی مشہوری چاہیں گے۔ چینلو والے اپنے اپنے بمبوکاٹ بلائیں گے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ ان میں سے ہر کوئی ارسطو اور افلاطون کے کان کاٹتا ہے۔ یہ لوگ میزوں پر مکے مار مار کر اور چلّا چلّا کر اپنے اپنے موقف کے حق میں دلیلیں دیں گے۔ چند ہی دنوں میں سوہنی کی غرقابی والا مسئلہ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ چینلو پر مشتہر کیا جائے گا، ایس ایم ایس کے ذریعے اپنی رائے دیں۔ آپشن نمبر ایک... سوہنی دریائے چناب میں غرق ہوئی۔ آپشن نمبر دو... سوہنی دریائے جہلم میں غرق ہوئی۔ آپشن نمبر تین... سوہنی غرق ہی نہیں ہوئی۔

"شاہراہوں پر گاڑیاں روک روک کر لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ آپ کے خیال میں سوہنی کا رجحان دریائے چناب کی طرف زیادہ تھا یا دریائے جہلم کی طرف؟ اس کے علاوہ چینلو پر پٹیاں چل جائیں گی... اگر آپ کے پاس سوہنی کے غرق ہونے کی کوئی تصویر یا فوٹیج ہو تو ہمیں ارسال کریں اور ثوابِ دارین حاصل کریں۔ جی ہاں میڈم! آپ مسکرا رہی ہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔ چند ہی دنوں میں یہ اہم ترین ایشو بن جائے گا اور عین ممکن ہے کہ دونوں صوبوں میں سوہنی کی موت کا کریڈٹ لینے کے لیے کھینچا تانی شروع ہو جائے گی۔"

"دونوں صوبے؟ یہ گجرات اور جہلم تو دونوں ایک ہی صوبے میں ہیں۔" میڈم نے کہا۔

"میں لڑائی چھڑ جانے کے بعد کی بات کر رہا ہوں جی۔" عمران نے روانی سے کہا۔ "زیادہ نہیں تو ڈھائی تین ماہ یہ بحث چلے گی۔ اس کے بعد سوہنی واپس دریائے چناب میں

آ بھی گئی تو ہم انشاء اللہ کوئی اور شوشہ چھوڑ دیں گے۔ مثلاً یہ کہ ہیر زہر کھانے سے نہیں مری تھی بلکہ اس کی جان ایک اور صدمے نے لی تھی۔ رانجھے نے اپنا نیٹ ورک تبدیل کر لیا تھا اور اپنے نئے نمبر سے ہیر کو بے خبر رکھا تھا...''

''ہیر اور نیٹ ورک؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

''میڈم! بحث ہی چھیڑنی ہے نا۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن اطلاع کوئی ایسی ہونی چاہیے جس سے بحث چھڑ بھی سکے۔ میں تمہارے تایا کے نیوز چینل کے لیے تمہیں ایک بریکنگ نیوز دیتی ہوں۔'' میڈم صفورا نے عجیب لہجے میں کہا۔

اس کے بدلے ہوئے لہجے نے مجھ سمیت سارے حاضرین کو چونکا دیا۔ وہ نپے تلے قدموں سے عمران کے قریب پہنچی اور بولی۔ ''میں ابھی پورچ میں تمہاری گاڑی دیکھ کر آرہی ہوں۔ وہ ایک طرف سے پچکی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر کسی گاڑی کو سائڈ ماری ہے تم نے... یا کسی نے تمہیں ماری ہے۔''

''تو اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں آپ؟''

وہ عمران کی بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے تیسرے ساتھی کو بھی دیکھ کر آرہی ہوں۔ اس کی دونوں ٹانگیں جلی ہوئی ہیں اور زخم دو تین دن پرانے ہیں۔ کہتا ہے کہ کیروسین کے چولہے سے آگ لگ گئی تھی، چائے بنا رہا تھا۔''

''وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ حالانکہ یہ شرم کی بات ہے کہ ایک بندہ شادی شدہ ہونے کے باوجود خود چائے بنائے۔''

اس بار بھی میڈم نے عمران کے مزاحیہ جملے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ اور آنکھوں میں عجب سنسنی تھی۔ وہ سب کی موجودگی میں بھی جیسے کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ اس کی پُر تفکر نگاہیں عمران پر جمی تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں چھوٹی بہن نادیہ کی طرف مڑی اور گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا نادو... کہ اس معاملے کو ایزی نہ لو۔ یہ صرف چوری چکاری کا چکر نہیں ہے۔ جمعرات کے دن جس وقت مجید کو حادثہ پیش آیا، یہ لوگ جہلم میں موجود تھے... نہ صرف جہلم میں موجود تھے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ موقعے پر بھی موجود تھے۔''

''موقعے پر؟'' نادیہ نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں، ان کی گاڑی کا جو سائڈ ایکسیڈنٹ ہے... وہی سائڈ مجید کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اس بات کا 95 فیصد امکان ہے کہ مجید کی گاڑی کو اسی گاڑی سے ٹکر مار کر کھائی میں گرایا گیا ہو۔'' صفورا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اس کے جملے نے ہر چہرے پر سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ ان میں نادیہ کا چہرہ بھی تھا۔ صفورا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ان کے تیسرے ساتھی کی ٹانگیں جلی ہوئی ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ان ٹانگوں کو اسی آگ نے جلایا ہے جس نے مجید کو بھسم کیا ہے۔ کہو، کیسی نیوز ہے؟''

کمرے میں کتنی ہی دیر تک خاموشی رہی پھر نادیہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھے بھروسا نہیں ہو رہا سسٹر کہ انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔''

''لگتا ہے تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا۔ تم بس ایک ہی رخ پر سوچتی ہو۔'' میڈم صفورا جھنجلا کر بولی۔ ''الکحل لینا کچھ کم کر دو۔''

پھر وہ تیزی سے شیرے کی طرف مڑی۔ ''شیرے! باندھو اس کو رسّی سے۔ یہ ابھی بتائیں گے سب کچھ۔''

شیرا تو جیسے حکم کا منتظر تھا۔ وہ میری طرف بڑھا۔ اس کے ساتھی نے نائلون کی رسّی اس کی طرف بڑھائی۔ دونوں گارڈز نے مجھے پھر بازوؤں سے دبوچ لیا۔ عمران گرج کر بولا۔ ''ٹھہرو۔''

دونوں بہنوں سمیت سب لوگ عمران کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کچھ دیر پہلے کے عمران سے بالکل مختلف نظر آرہا تھا۔ ''اگر میں کہوں میڈم صفورا کہ میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا... کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھوں گا تو پھر؟''

''تو پھر اس کو کھول دیں گے۔'' میڈم روانی سے بولی۔ پھر اس نے دوبارہ میرے بارے میں حکم صادر کیا۔ ''باندھو اس کو۔''

''ٹھہرو۔'' عمران بھی دوبارہ گرجا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ گھن گرج کے ساتھ میڈم صفورا پر برس پڑے گا۔ تاہم اس نے اپنے لب و لہجے کو چیک کیا اور گہری سانس لے کر ہموار انداز میں بولا۔ ''میڈم صفورا! یہ میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہے۔ تم میرے بارے میں جانتی نہیں ہو، اس لیے اعتبار نہیں کر رہی ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ میں اس معاملے کے حوالے سے تم سے ایک لفظ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میری خواہش ہے کہ ہمارے درمیان جو بات ہو، اچھے ماحول میں ہو۔ اگر تم اسے باندھ دو گی یا مار پیٹ کرو گی تو پھر اچھا ماحول باقی نہیں رہے گا۔''

میڈم چند سیکنڈ تک گہری نظروں سے عمران کا جائزہ لیتی رہی، تب اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ رسّی بردار شیرا مجھ سے دور چلا گیا۔ مجھے دبوچنے والے دونوں گارڈز بھی پیچھے

ہٹ گئے۔ میڈم کو بھی غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ اتنے افراد کی موجودگی میں، میں کسی طرح کی مہم جوئی کا نہیں سوچ سکتا۔

عمران نے مجھے کسی بھی طرح کی سختی سے بچانے کے لیے بڑی تیزی سے فیصلہ کیا تھا۔ اس کی یہ تیزی میرے دل میں اس کا پیار کچھ اور بھی بڑھا گئی۔ میں نے خود کو اس کے اور زیادہ قریب محسوس کیا۔ میں نے گرل کے پار اس کی چوڑی چھاتی اور روشن آنکھیں دیکھیں اور مجھے فخر سا محسوس ہونے لگا کہ وہ میرا دوست ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر ایک جوش سا ابھر گیا۔ مجھے لگا کہ آئندہ گھڑیوں میں مجھے کہیں اس کے شانے سے شانہ ملا کر لڑنا پڑا تو میں لڑ جاؤں گا۔ اس پر ثابت کر دوں گا کہ میں لڑ سکتا ہوں۔

میڈم نادیہ یکسر خاموش کھڑی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سب کے سامنے اسے بڑی بہن سے جو ڈانٹ پڑی تھی، وہ اسے بدمزہ کر گئی تھی۔ احتجاج کے طور پر اس نے میٹھی شراب کا ایک اور جام چڑھایا اور اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

میڈم صفورا نے بھی ایک صوفہ سنبھال لیا۔ اس کے بعد اس نے اشارے سے سب گارڈز کو باہر بھیج دیا۔ بس ایک گارڈ وہاں رہا، یہ شیرا تھا۔ میڈم صفورا کے ساتھ عمران کی بات چیت شروع ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عمران نے واقعی میڈم صفورا شیرازی کو الف سے یے تک ساری کہانی سنانی شروع کر دی۔ اس نے سچ مچ کچھ بھی میڈم سے نہیں چھپایا۔ اس نے تسلیم کیا کہ سیٹھ سراج کی گاڑی سے انہوں نے جان بوجھ کر گاڑی ٹکرائی تھی... پھر ہڑپہ... اور لال کوٹھیوں کا کھوج۔ اس کے بعد سلیم کا ہمارے ہاں آنا اور ہمارا سلیم کا تعاقب کر کے مجید مٹھو تک پہنچنا۔ پھر مجید مٹھو کے ساتھ کار ریس لگاتے ہوئے مجید مٹھو کا کھائی میں گر جانا... سب کچھ عمران نے میڈم کے گوش گزار کر دیا۔ درمیان میں میڈم نے سوالات کیے جن کے جواب عمران نے وضاحت سے دیے۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”میں نے آپ کو سچ اور صرف سچ بتایا ہے۔ میں آپ کو یہ بات بھی پوری سچائی کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا ارادہ مجید مٹھو کے بارے میں برا نہیں تھا۔ ہم صرف اس سے بات کرنا چاہتے تھے... بس تھوڑی سی پوچھ گچھ لیکن جب وہ بھاگا تو ہمیں اس کا پیچھا کرنا پڑا۔ وہ بڑی بری ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہم نے اسے سائڈ نہیں ماری، اس نے ہمیں ماری اور پھر خود ہی اپنی گاڑی پر کنٹرول نہیں رکھ سکا۔ وہ معمولی زخمی ہوا تھا۔ ہم نے وہیں پر اس سے سوال جواب کیے۔ اس پر کسی طرح کا تشدد نہیں کیا۔ مجید کو جو نقصان پہنچا، وہ اس کی اپنی غلطی سے پہنچا۔ وہ اقبال پر جھپٹ پڑا۔ اقبال کے منہ میں سگار تھا۔ یہ سگار اچھل کر اس پیٹرول پر جا گرا جو گاڑی سے بہہ رہا تھا۔ اقبال اور مجید دونوں آگ کی لپیٹ میں آئے۔ مجید چونکہ گاڑی سے زیادہ قریب تھا، اس لیے اس کا زیادہ نقصان ہو گیا۔“

یہ پوری روداد سننے کے بعد میڈم صفورا کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔

دوسری طرف میڈم نادیہ، عمران کے بیان سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جو ایک دو سوالات کیے، وہ بھی خاصے تیکھے تھے۔

میڈم صفورا نے گہری سانس لی تو تنگ شرٹ میں اس کے جسمانی نشیب و فراز اور بھی نمایاں نظر آنے لگے۔ وہ چھوٹی بہن کی طرف دیکھ کر حتمی لہجے میں بولی۔ ”نادو! میں ان تینوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ میں نے ابھی تم سے کہا تھا نا کہ یہ پیچیدہ معاملہ ہے۔ اب دیکھو، بات کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ نہ صرف ان کی وجہ سے مجید مٹھو کی جان گئی ہے بلکہ قادر بھی اب وہاں نہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔“ یہ آخری فقرہ میڈم صفورا نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اس ساری روداد میں اسے جس اطلاع نے سب سے زیادہ پریشان کیا ہے، وہ یہی ہے کہ قادرا اب اس کی دسترس میں نہیں ہے۔ اس پریشانی کی وجہ بھی کافی حد تک ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ قادرے کے اوجھل ہو جانے کا مطلب تھا کہ قادرے کی خوبرو بہن کنول بھی اب ہاتھ سے نکل چکی ہے اور کنول کے ہاتھ سے نکلنے کا مطلب تھا کہ میڈم صفورا کا ’صدیقی‘ کے حوالے سے سارا پلان فلاپ ہو گیا ہے۔

میڈم صفورا نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تمہارا دعویٰ ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ تو کیا میں ہوپ رکھوں کہ تم قادرے کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں بھی سچ کہو گے؟“

عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ہاں میڈم! قادرے کے بارے میں بھی سچ کہوں گا اور قادرے کے بارے میں سچ یہ ہے کہ میں نے اسے اس کی فیملی سمیت یہاں سے نکال دیا ہے۔“

”بہت خوب!“ میڈم صفورا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ اس کی ورمے جیسی نگاہیں عمران کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد وہ چھوٹی بہن کی طرف گھومی۔ ”دیکھ رہی ہو نادو!

یہ ہوتے ہیں جلیبی کی طرح سیدھے سادے معاملے۔“

نادو یعنی نادیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی صفورا نے گارڈز کو حکم دیا کہ وہ عمران کو کمرے سے نکالیں اور اس کی رہائش گاہ پر پہنچائیں۔

نادیہ نے کہا۔ ”سسٹر! میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ ایک دم ہتھ چھٹ ہے۔ اس کے لیے احتیاط کرنی ہو گی۔“

”مجھے یہ اتنا بےوقوف نہیں لگتا کہ دو تین رائفلوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایڈونچر کرے گا۔“ پھر صفورا، عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”کیوں مسٹر! ایسی بےوقوفی کا ارادہ ہے تمہارا؟“

”نو میڈم! ناٹ ایٹ آل۔“ عمران نے سعادت مندی سے کہا۔

”لیکن پھر بھی سسٹر! بہتر ہے کہ اس سے یہیں پوچھ گچھ کر لو۔ ہم نے بڑا رسک لے کر اسے یہاں تک پہنچایا ہے۔“

”اوہو نادو! اب اسے اتنا بھی ہوّا نہ بناؤ۔ اگر زیادہ ڈر ہے تو ہینڈ کف لگا لو دونوں کو۔“ اس کے ساتھ ہی صفورا نے مونچھیل گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ بغلی دروازے میں داخل ہوا اور چند سیکنڈ بعد دو اسٹائلش ہینڈ کف لیے واپس آ گیا۔ یہ ہتھکڑی کی جدید اور ہلکی پھلکی قسم تھی۔ عمران نے خاص پس و پیش نہیں کیا۔

مونچھیل گارڈ نے باہر کھڑے ہینڈ کف کو گرل کے اندر سے گزارا اور پھر عمران کے ہاتھوں میں پہنا دیا۔ ایک ایسا ہی ہینڈ کف مجھے بھی پہنا دیا گیا۔ میں زندگی میں پہلی بار ہتھکڑی کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ یہ توہین آمیز بےبسی کی عجیب سی کیفیت تھی۔

شیرے نے کمرے کا لاک کھول کر عمران کو باہر نکالا۔ عمران کو باہر نکالتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں عمران پر کوئی فقرہ کسا۔ جواب میں عمران نے بھی کچھ کہا۔ دونوں کے الفاظ مجھ تک نہیں پہنچے۔ تاہم میں نے شیرے کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھا۔ وہ غضب ناک ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا پھر ایک زوردار دوہتڑ عمران کی گردن پر مارا۔ عمران اس حملے کے لیے پوری طرح تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اس کے ہاتھ آگے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ پیچھے کی طرف بندھے ہوتے تو شاید چہرہ صوفے سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتا۔ عمران کے گرتے ہی شیرا اور اس کے دو ساتھی چیلوں کی طرح اس پر جھپٹے اور اسے پیٹنے لگے۔ عمران نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں سے ایک گارڈ کے چہرے پر نیچے سے ضرب لگائی، وہ اچھل کر میڈم صفورا کے پاس گرا اور ایک قیمتی ڈیکوریشن پیس چکنا چور کر گیا۔ اس کے ساتھی نے جواباً عمران کے سر پر رائفل کا بٹ مارا۔

”رک جاؤ... رک جاؤ۔“ میڈم صفورا گرجی۔

پھر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک گارڈ کے سر کے بال پکڑے اور اسے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ گارڈز میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میڈم صفورا کے حکم کو نظرانداز کر سکتے۔ وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ تاہم اب دو گارڈز نے اپنی رائفلیں عمران کی طرف سیدھی کر لی تھیں۔ عمران بھی صوفے کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ میڈم صفورا، شیرے پر برسی۔ ”میرے ہوتے ہوئے تم ایسا کر رہے ہو تو آگے پیچھے کیا کرتے ہو گے؟“

”میڈم! اس نے گالی دی ہے۔“ شیرا بھاری آواز میں بولا۔

”کوئی گالی نہیں دی ہے... اور پہل تم نے کی تھی۔“ صفورا نے جواب دیا۔

”اس کے منہ میں کتے کی زبان ہے میڈم!“ شیرا بولا۔

عمران نے کہا۔ ”اور تم سرتاپا کتے ہو، وہ بھی گندی نسل کے۔ بندھے ہوئے پر حملہ کرتے ہو۔ آزاد کے سامنے پونچھ ٹانگوں میں دبا کر بھاگتے ہو۔“

”میڈم! اس کو بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے اپنے بارے میں۔ اس کے ہاتھ کھول دیں اور مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی اکڑفوں نکال سکوں۔“

”اچھا اچھا، ابھی یہ ڈراما بند کرو۔“ میڈم صفورا پھر گرجی۔ ”ابھی اسے لے کر چلو میری طرف۔“

نادیہ کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے بالکل خوش نہیں ہے۔ بہرطور وہ سب کے سامنے خاموش تھی۔ گارڈز نے ہمیں دھکیل کر کمرے سے باہر نکالا اور ایک طویل راہداری میں لے آئے۔ ہم نے کوٹھی سے نکل کر ایک وسیع گراسی لان طے کیا۔ اس میں فوارے لگے تھے اور پھولوں کی کیاریاں تھیں، تب ہم دوسری کوٹھی کے پورچ میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک شان دار لینڈ کروزر اور ایک ویلز جیپ کھڑی تھی۔ رہائشی عمارت کے مین دروازے کے پاس ایک بہت بڑا السیشین کتا سنہری زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ گارڈز ہمیں لے کر اس دوسری کوٹھی کے اندر داخل ہوئے اور سیڑھیاں اتار کر ایک کشادہ بیسمنٹ میں لے آئے۔ اس بیسمنٹ میں دو کمرے تھے اور ایک لاؤنج نما جگہ تھی جہاں ایک خوب صورت شیلف پر ٹی وی اور آڈیو سسٹم وغیرہ موجود

تھے۔ کمرے میں دائیں طرف ایک کھڑکی تھی جس میں ڈیزائن دار آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی کھڑکی تھی جیسی میں اس سے پہلے نادیہ کی رہائش گاہ پر دیکھ چکا تھا۔

عمران مجھے دیکھ کر مسکرایا تو اس کی سوجی ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی نظر آنے لگیں۔ چہرہ نیلونیل تھا۔ دائیں ہاتھ کی پٹی میں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ وہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو حرکت دے کر بولا۔ ''جگر! یہ ہتھکڑیاں تو مردوں کا زیور ہوتی ہیں اور چوٹیں وغیرہ بناؤ سنگھار۔ ایسی باتوں کو دل سے نہیں لگانا چاہیے۔ بندہ دل کو لگا لے تو پھر گندم کی گولیاں ڈھونڈنا شروع کر دیتا ہے۔''

وہ اکثر گندم کی گولیوں کا حوالہ دیتا رہتا تھا اور یہ بات مجھے بہت بُری لگتی تھی مگر پہلی مرتبہ اس کی یہ بات مجھے بُری نہیں لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس وقت جب میں مایوسی کی انتہا کو چھو کر زہریلی گولیاں ڈھونڈ رہا تھا، میں واقعی غلطی پر تھا۔ تب مجھے سرِعام زدوکوب کیا گیا تھا اور میں اس صورتِ حال کو اپنے لیے بے حد ذلت آمیز محسوس کر رہا تھا۔ آج عمران کو بھی تو زدوکوب کیا گیا تھا۔ اس کے جسم پر مجھ سے زیادہ چوٹیں آئی تھیں لیکن اس نے یہ سب کچھ ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ بالکل ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ شاید دکھوں سے بھری ہوئی زندگی کا سامنا کرنے کے لیے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے جگر؟'' اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔

''تمہارے ساتھ کافی مار پیٹ ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس خبیث شیرے کا ہی کیا دھرا ہے۔''

''میں نے کہا تھا نا جگر! ہمارے ساتھ رہو گے تو آہستہ آہستہ باتیں تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو جائیں گی۔ یہ واقعی شیرے ہی کی والہانہ محبت ہے۔ اس نے مجھ پر پرانا غصہ نکالا ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ اس کی باری آگئی ہے تو ہماری بھی آجائے گی مگر جب ہماری آئے گی تو ہم اسے باندھ کر نہیں ماریں گے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ تم بتاؤ تم اس دعوتِ شیراز میں کیسے شریک ہو گئے ہو؟''

''دعوتِ شیراز میں؟''

''او یار! میں ذرا ادبی بات کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ تم یہاں کیسے آپھنسے؟''

''تمہارا یار سلیم، تمہارے یہاں پکڑے جانے کی اطلاع لے کر ہمارے پاس آیا تھا... وہاں راوی روڈ۔''

''پھر؟''

''پھر ہم گھر سے نکلے اور نکلتے ہی پکڑے گئے۔ سلیم کی نگرانی ہو رہی تھی...''

میں نے اپنے پھنسنے کی ساری تفصیل عمران کے گوش گزار کر دی۔ وہ پریشانی کے بجائے دلچسپی سے سنتا رہا۔

اس دوران میں تہ خانے کا دروازہ کھلا اور ہمیں اقبال کی صورت نظر آئی۔ دو گارڈز اسے لے کر سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ اقبال نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ تاہم گارڈز اسے ہمارے کمرے میں لانے کے بجائے ساتھ والے کمرے میں لے گئے اور دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

''کیا حال ہے شہزادے؟'' عمران نے بلند آواز میں اقبال سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں... اور تم؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں یار! لیکن اب میری بات پر یقین کون کرے گا؟'' عمران نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''پوری رات میڈم صفورا کی ڈاکو بہن کے پاس رہا ہوں۔ بے شک میری عزت بچی رہی ہے مگر لوگوں کی زبانیں تو بند نہیں کی جاسکتیں نا۔ پتا نہیں کیا کیا باتیں بنیں گی؟ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ پتا نہیں کہ اب شاہین مجھے قبول بھی کرے گی یا نہیں؟''

''چلو قبول نہیں کرے گی تو میں شادی کر لوں گا۔''

''مجھ سے؟''

''نہیں یار! شاہین سے۔''

''لعنت ہے تیری دوستی پر۔ میرے دکھ میں شریک ہونے کے بجائے زخموں پر مرچیں چھڑک رہا ہے۔ کم از کم تجھے تو میرا انداق نہیں اڑانا چاہیے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں بالکل پاک ہوں۔ میڈم نادیہ نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ تیرے سر کی قسم، میری عزت محفوظ ہے۔ تو تو مجھے جانتا ہے میرے پیارے سہیلے! اگر میرے ساتھ کچھ ہوا ہوتا تو میں نے اب تک پنکھے سے لٹک کر آتما ہتھیا کر لی ہوتی۔''

ایک سینئر گارڈ دہاڑا۔ ''تم اپنی بکواس بند کر دو تو اچھا ہے۔''

''دیکھ لو دنیا والو! یہ مارتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ اب اگر ان کی ہمشیرہ کی شکل میری بچپن کی محبوبہ سے مل گئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' عمران نے فریاد بلند کی۔

''تمہاری تو...'' سینئر گارڈ نے نازیبا الفاظ استعمال کیے اور کھڑکی کو زور سے بند کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اقبال کے کمرے والی کھڑکی بھی بند کر دی۔

یہی وقت تھا جب ایک بار پھر اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ ہم نے کھڑکی کی جھری میں سے جھانکا۔ میڈم صفورا بارعب چال چلتی ہوئی تہ خانے میں آرہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک گنجا شخص تھا جس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ میڈم صفورا ہماری

طرف آئے گی۔ وہ اقبال والے کمرے کی طرف چلی گئی... میڈیکل باکس والا ڈاکٹر نما شخص بھی ادھر ہی گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اقبال کی زخمی ٹانگوں کو دیکھنے گیا تھا۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے۔ پھر گنجا شخص تو اپنے باکس سمیت ہمارے کمرے میں آگیا تاہم میڈم صفورا اقبال کے پاس ہی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پولیس والوں والا حربہ استعمال کر رہی ہے۔ ہمارے بیانات کی تصدیق کے لیے اقبال کو علیحدہ سے کرید رہی ہے۔ عمران کو پتا تھا کہ اقبال سے میڈم کا اہم ترین سوال یہی ہونا ہے کہ قادرا اور اس کی بہن کہاں ہیں۔ اس حوالے سے عمران کو تسلی تھی۔ دراصل اقبال کو بھی صرف اتنا ہی پتا تھا کہ عمران نے قادر اور اس کی فیملی کو ملتان بھیجا ہے۔ کس کے پاس بھیجا ہے... کہاں بھیجا ہے، اس کے بارے میں وہ بھی نہیں جانتا تھا۔

گنجا شخص واقعی ڈاکٹر تھا۔ لگتا تھا کہ وہ گونگا ہے۔ جتنی دیر ہمارے پاس رہا، اس نے ''ہوں ہاں'' کے سوا کوئی بات نہیں کی۔ اس نے عمران کے چہرے کی مرہم پٹی کی... ہاتھ کی بینڈیج بھی کھول کر دیکھی۔ ہاتھ پشت کی طرف سے بُری طرح سوج گیا تھا۔ ڈاکٹر نے روئی وغیرہ رکھ کر دوبارہ پٹی باندھ دی۔ مسلح گارڈز بہ دستور دروازے پر موجود رہے۔ اسی دوران میں میڈم صفورا کی شکل بھی نظر آگئی۔ وہ کمرے میں نہیں آئی تھی بلکہ اس نے کھڑکی کھول کر ہمیں اپنی صورت دکھائی تھی۔

''ہاں ڈوک! تمہارا کام مکمل ہو گیا؟'' میڈم نے پوچھا۔

''یس میڈم!'' ڈاکٹر نے کہا تو ہمیں پتا چلا کہ وہ بھی منہ میں زبان رکھتا ہے۔ ہم دونوں کے ہاتھ ابھی تک سامنے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ میڈم صفورا کھڑکی کے عین سامنے کرسی ڈلوا کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کی نسبت زیادہ سنجیدہ اور دانا نظر آتی تھی۔ وہ ذرا سی ''اوورویٹ'' ضرور تھی تاہم نادیہ سے خوب صورت دکھائی دیتی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ تک اپنی عقابی نگاہیں عمران کے چہرے پر گاڑے رکھیں پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تو تم قادر اور اس کی بہن کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں نے انہیں ان کی مرضی سے جانے دیا ہے۔ وہ کہاں گئے، مجھے خود پتا نہیں۔''

''تمہارے نہ بتانے سے ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ یہ ہمارے لیے بڑا نازک معاملہ ہے۔ صدیقی ایک بڑے خبطی شخص کا نام ہے۔ اس نے ایک بار ''نہ'' کہہ دی تو پھر کوئی طاقت اسے ہاں میں نہیں بدل سکے گی۔ ہم بڑی مشکل سے اسے اپنے راستے پر لائے ہیں۔ سراج کے ساتھ صدیقی کی ''کمٹمنٹ'' ہو چکی ہے۔ اگر وہ لڑکی کنول... ابرار صدیقی سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے تو وہ بھی ہماری بات مان لے گا اور وہ بہت حد تک راضی ہو بھی چکی تھی۔ تم لوگوں نے بیچ میں کود کر سارا معاملہ اَپ سیٹ کیا ہے۔''

عمران بولا۔ ''میڈم! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس لڑکی کو کس طرح رضامند کیا جا رہا تھا۔ خیر، آپ یہ باتیں چھوڑیں۔ آپ مجھے صرف ایک بات بتائیں۔ وہ ایسی کیا خاص شے ہے جس کو صدیقی سے حاصل کرنے کے لیے آپ اس قدر ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں؟ آپ کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک نادر شے موجود ہے... پھر کسی ایک شے کی خاطر اتنی زیادہ بے قراری؟''

''یہ تم نہیں سمجھ سکتے اور نہ میں سمجھا سکتی ہوں۔ ہاں، کوئی میرا ہم ذوق ہو تو اور بات ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی ''ارج'' ہوتی ہے۔ ایک ایسی پیاس جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔'' اس کی بادامی آنکھوں میں واقعی ایک عجیب طرح کی پیاس اُمڈ آئی۔ وہ جیسے تصور میں اس نادر پیس آف آرٹ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے کاروباری رقیب ابرار صدیقی کے پاس تھا اور جس کو پانے کے لیے وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

''کیا وہ گندھارا آرٹ کا کوئی نمونہ ہے؟''

''تم یہی سمجھ لو۔'' میڈم نے مختصر جواب دیا۔

عمران نے بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلائیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ میڈم صفورا کھڑکی کے دوسری طرف تھی اور عمران کو گھور رہی تھی۔ اس بے بسی کی حالت میں بھی عمران کا اعتماد اور بے پناہ اطمینان اسے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا پالا کسی معمولی شخص سے نہیں پڑا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اب سختی کے بجائے نرمی اور حکمت سے کام لینا چاہ رہی تھی۔ اس میں مردم شناسی کی خاص صلاحیتیں نظر آتی تھیں۔

عمران پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''میڈم! آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو قادرے اور اس کی بہن کی ضرورت ہے یا اس پیس آف آرٹ کی؟''

''ظاہر ہے، مجھے اس پیس آف آرٹ کی ضرورت ہے لیکن میں صدیقی سے بھی اپنا تعلق خراب کرنا نہیں چاہتی۔''

''اگر میں کہوں کہ صدیقی سے آپ کا تعلق خراب نہیں ہوگا اور وہ پیس آف آرٹ بھی آپ کو مل جائے گا تو پھر؟''

''تمہارے پاس جادو کی چھڑی ہے؟''

''جادو کا ڈنڈا ہے اور انشاء اللہ آپ خود بھی اس ڈنڈے کی معترف ہو جائیں گی۔ میڈم! گستاخی معاف، میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ کے پاس بندے ضرور ہیں اور وہ باصلاحیت بھی ہیں لیکن ان کا کیلیبر اتنا نہیں ہے کہ وہ آپ کے لیے کوئی بڑا کام کر سکیں۔ سیٹھ سراج اور عارف خان جیسے لوگ بس گزارہ کر سکتے ہیں، کوئی چمتکار نہیں دکھا سکتے۔ میں ایک مسکین بندہ ہوں لیکن... معافی چاہتا ہوں... آپ کے ان کرائے کے ٹٹوؤں سے بہت بہتر ہوں۔ اس کے علاوہ مار دھاڑ بھی میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک میڈم نادیہ دیکھ چکی ہیں۔ ان کا ہیڈ گارڈ شیرا میرے ہاتھوں جس طرح ناک آؤٹ ہوا تھا، وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔''

''اچھا تو اس واقعے کی وجہ سے تم یہ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو؟ لیکن شیرے کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہوا اتفاقاً ہوا ورنہ وہ تم جیسے دو تین بندوں کا بہ یک وقت بھُرتا بنا سکتا ہے... اور سچ پوچھو تو میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ اس روز اتفاقاً ہی اس کے ساتھ کچھ ہوا تھا۔''

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں اب بھی بلکہ اسی وقت اس سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ لوگوں کی تھوڑی سی تفریح بھی ہو جائے گی۔''

میڈم کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اسے جیسے اب بھی بھروسا نہیں ہو رہا تھا کہ عمران جیسا عام قد کاٹھ کا شخص شیرے جیسے نہایت خطرناک اور پہلوان نما فائٹر کو صرف دو تین سیکنڈ میں زمین چٹوا سکتا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ اگر میں نے بھی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ عمران کا قد بہ مشکل چھ فٹ تھا۔ شانے چوڑے لیکن جسم چھریرا تھا۔ خاص طور سے اپنی صورت کے اعتبار سے تو وہ بالکل بھی کرخت اور مار دھاڑ والا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شوخ سی معصومیت چھائی رہتی تھی۔ میڈم نے کھڑکی کے پاس آ کر عمران کو بہ غور دیکھا اور بولی۔ ''تجویز تو تمہاری ٹھیک ہے... لیکن اگر اس کھیل میں تم دونوں میں سے کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو کیا ہوگا؟''

''اگر آپ چاہتی ہیں تو ہڈی پسلی بھی نہیں ٹوٹے گی اور آپ کا پہلوان چت بھی ہو جائے گا۔''

''خود پر اتنا بھروسا ہے؟''

''بھروسا تو اللہ پر ہے۔ میرا کام کوشش کرنا ہے۔'' اسی دوران میں میڈم کی نظر کا زاویہ تبدیل ہوا۔ غالباً اس کا دھیان عمران کے زخمی ہاتھ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ بولی۔ ''لیکن تمہارا ہاتھ تو زخمی ہے۔ کیا اسی طرح لڑنا پسند کرو گے؟''

''میرے دونوں ہاتھ زخمی ہوتے تو بھی میں پسند کرتا۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''سوچ لو۔''

''سوچ لیا۔''

میڈم صفورا کی آنکھوں میں دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے موبائل فون نکالا اور ایک نمبر پریس کرنے کے بعد بولی۔ ''شیرا! یہاں آ جاؤ میرے پاس۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں بھی جان گیا کہ اب یہاں ہلچل ہوگی۔ میری دھڑکن بڑھ گئی۔ قریباً دو منٹ بعد شیرا تہ خانے میں موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ شاید وہ جان گیا تھا کہ اسے کس لیے بلایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے میڈم نادیہ بھی وہاں آ دھمکی۔ اس کے ساتھ دو باوردی گارڈز بھی تھے۔ گارڈز کی ''اے کے 56'' رائفلیں خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے نادیہ کی شکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ بالکل ناقابلِ اعتبار تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عمران پر ''کاٹھی ڈالنے'' کے لیے میرے ساتھ بدسلوکی نہیں کرے گی لیکن اس وعدے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ مجھے کرسی سے باندھنے پر تل گئی تھی۔

دو گارڈز نے عمران کو کمرے سے باہر نکالا اور اس کے ہاتھ کھول دیے۔ شیرے نے اپنی جیکٹ میں سے تمام اشیا نکال کر اپنے ایک ساتھی کو پکڑا دیں۔ ان میں ایک عدد ماؤزر بھی شامل تھا۔ اس کے بعد اس نے گھڑی اتاری اور وہ بھی ساتھی کے حوالے کر دی۔ عمران کی تلاشی تو پہلے بھی کئی بار ہو چکی تھی۔

''کوئی ہتھیار استعمال نہیں ہوگا۔'' میڈم صفورا نے شیرے اور عمران دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کسی بھی چیز سے کوئی ضرب نہیں لگائی جائے گی۔'' اس نے آخر میں اضافہ کیا۔

احتیاط کے طور پر میڈم نے وہاں سے ہر وہ شے ہٹوا دی جسے ضرب لگانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سب کے چہرے پر سنسنی نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید شیرا، عمران کے زخمی ہاتھ کو دیکھے گا اور اس حوالے سے کوئی بات کرے گا لیکن وہ یہ اخلاقی جرأت نہیں کر سکا اور ایک طرح سے یوں اس نے خود کو اخلاقی طور پر کمزور ثابت کیا۔

باکسنگ گلوز وغیرہ پہن کر لڑنا اور بات ہوتی ہے۔ جب دو مشتعل افراد خالی مکوں سے لڑتے ہیں تو اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ چہرے پر گہرے زخم آئیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے عمران کے زخمی چہرے کو مزید زخمی دیکھا... اور میرے دل میں... شدید خواہش پیدا ہوئی کہ یہ دوبدو لڑائی کسی طرح ٹل جائے۔

بہرحال، ایسا نہیں ہوا۔ بیسمنٹ کے خالی حصے نے ''فائٹنگ رنگ'' کی شکل اختیار کر لی۔ عمران اور شیرا ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ شیرے کی آنکھوں میں نفرت کی بجلیاں کوندر ہی تھیں۔ یقیناً وہ اس رات والی ہزیمت کا پورا پورا بدلہ عمران سے لینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف عمران کو بھی ایک مناسب موقع ملا تھا۔ اسے یہاں لا کر باندھا گیا تھا اور شیرے نے اس کے ساتھ ''مکّا، لات'' کی تھی۔ اب اس مکّا، لات کا جواب دیا جا سکتا تھا۔

پہلا وار شیرے نے ہی کیا۔ اس نے عمران پر مکّا چلایا۔ یہ مکّا عمران کی ٹھوڑی کو چھوتا ہوا گیا۔ شیرے کا دوسرا مکّا بھی اچٹتا ہوا سا پڑا۔ تاہم وہ اتنے جوش سے آگے آیا تھا کہ عمران اسے سنبھالتے سنبھالتے لڑکھڑا گیا اور گر پڑا۔ شیرا اس کے اوپر گرا اور مکّے برسانے لگا۔ عمران نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ اس کی پسلیوں کو نشانہ بنانے لگا۔ عمران نے بھی ایک دو ضربیں اس کے چہرے پر لگائیں۔

میڈم صفورا کے حکم پر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک بار پھر ایک دوسرے پر جھپٹے۔ اس بار شیرے کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو کچھ عرصہ پہلے میڈم نادیہ کی رہائش گاہ پر ہو چکا تھا۔ وہ عالمِ جوش میں پچھلا سبق بھلا بیٹھا۔ اس نے اپنا چہرہ عمران کے سر کی خوفناک ٹکر کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ مجھے تو یہی لگا جیسے یہ اس پہلے سین کا ری پلے ہے۔ عمران کے سر کی دھواں دھار ضرب شیرے کے ماتھے پر لگی۔ ناریل چٹخنے کی سی آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا، اس کے کھوپڑے کو عمران کے سر کی دوسری ضرب سہنا پڑی۔ اس ضرب نے اسے کئی فٹ پیچھے اچھالا اور وہ میڈم صفورا کے قدموں میں جا گرا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے پوری ہمت مجتمع کر کے اٹھنے کی کوشش کی مگر تیورائے ہوئے باکسر کی طرح ڈگمگا کر گھٹنوں کے اوپر گر گیا۔

''اسٹاپ... اسٹاپ اٹ۔'' میڈم صفورا چلّائی۔

دو گارڈز عمران اور شیرے کے بیچ آ گئے۔ توہین اور تکلیف کے شدید اثر کے تحت شیرا اٹھا اور عمران کی طرف بڑھنا چاہا تاہم اب میڈم صفورا نے باقاعدہ اس کے سامنے آ کر اسے روک دیا۔

یہ لڑائی بہ مشکل دو تین منٹ جاری رہ سکی تھی۔ شاید حاضرین میں سے کسی کو بھی ایسے تیز رفتار اختتام کی توقع نہیں تھی۔

شیرا رک گیا مگر بہ دستور احتجاج کرتا رہا۔ اس کے احتجاج میں کوئی جان نہیں تھی۔ وہاں موجود ہر فرد نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میڈم صفورا نے عقل مندی کا ثبوت دے کر شیرے کو بچا لیا ہے۔ وہ ایک بار پھر.... عمران کے سامنے آتا تو شاید بہت زیادہ نقصان اٹھا لیتا۔ شیرے کے علاوہ شیرے کے دو تین قریبی ساتھی بھی عمران کو خوں خوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ تاہم ان نظروں میں خوف کی جھلکیاں بھی تھیں۔

میں کوئی مارشل آرٹ کا ماہر نہیں تھا کہ اس کی باریکیوں پر بہت زیادہ غور کر سکتا۔ تاہم میں نے کافی عرصے تک جوڈو کراٹے کی کلاسیں لی تھیں۔ میں دوبدو لڑائی کے بنیادی اصول جانتا تھا۔ میں نے بہترین لڑاکوں کو رِنگ میں لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن میں نے عمران کے انداز میں جو حیران کن جھپٹ دیکھی، وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑائی میں اس کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کے سر کی ضرب تھی۔ یہ وار وہ اس قدر اچانک اور اتنے بھرپور طریقے سے کرتا تھا کہ مدِمقابل بھونچکا رہ جاتا تھا۔ یہ وار کرتے ہوئے سر سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک عمران کا جسم ایک ایسا زاویہ اختیار کر جاتا تھا جس سے بے پناہ توانائی پیدا ہوتی تھی۔ اس توانائی کو پیدا کرنے میں اس کے پاؤں کی انگلیاں شاید سب سے اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ پھر یہ توانائی ایک شوریدہ لہر کی طرح اس کے سر تک جاتی تھی اور ایک خوفناک ضرب کی شکل اختیار کرتی تھی۔

ڈیئر! میں نے تمہارا ناشتہ لگا دیا ہے

ته خانے میں سب ہکا بکا تھے۔ جسمانی لحاظ سے عمران اور شیرے کا مقابلہ گھوڑے اور ہاتھی کا مقابلہ تھا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے اقبال نے بھی اس تیز رفتار مقابلے کو دیکھا تھا اور اندر سے ہی غالباً تالیاں بھی بجائی تھیں۔

میڈم صفورا کے اشارے پر شیرے کو باہر جانا پڑا۔ اس مقابلے کے بعد نادیہ کا منہ بھی بند ہو گیا تھا۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔ میڈم صفورا نے اپنے گارڈز کو اشارہ کیا۔ انہوں نے عمران کو واپس کمرے میں چلنے کو کہا۔ عمران، میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اگر آپ کی تفریح ادھوری رہی ہے تو میں مزید تفریح مہیا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔ اگر شیرا صاحب کے ایک دو ساتھی اکٹھے میرے ساتھ کشتی لڑنا چاہیں تو بھی میں حاضر ہوں۔''

''اس بارے میں پھر بات کریں گے۔'' میڈم صفورا سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''ابھی تم کمرے میں جاؤ۔''

میں نے شکر کیا کہ عمران کمرے میں واپس آ گیا۔ ورنہ ایک موقعے پر تو میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ کسی بڑے ایڈونچر کی کوشش نہ کرے۔ اس کے اردگرد رائفل بردار گارڈز موجود تھے اور وہ ان میں سے کسی پر جھپٹنے کا سوچ سکتا تھا یا پھر ایسی ہی کوئی اور حرکت۔ کمرے میں واپس آنے سے پہلے عمران کو پھر ہینڈ کف پہنا دیے گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہمارے اردگرد سکون ہو گیا۔ بس تہ خانے کے دروازے پر دو باوردی گارڈز کھڑے رہے۔ ہم اپنے راوی روڈ والے گھر سے شام سات بجے کے قریب نکلے تھے، اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا اور جن حالات سے گزر رہے تھے، اس کے نتیجے میں بھوک بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

بہرطور تھوڑی دیر بعد کھانے کی خوشبو محسوس ہوئی۔ ایک جواں سال ملازمہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ چکن بریانی، قورمہ، فرائی فش اور نان وغیرہ بہت سے لوازمات ٹرالی میں موجود تھے۔ اس میں سے کچھ کھانا اقبال کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ باقی ہمارے کمرے میں آ گیا... میڈم نے جاتے جاتے ہم پر واضح کر دیا تھا کہ اقبال ابھی دوسرے کمرے میں ہی رہے گا۔ اس نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ فی الحال ہم اس سے بات چیت کی کوشش نہ کریں، ورنہ گارڈز کو مداخلت کرنا پڑے گی۔

''کھاؤ یار!'' عمران نے بائیں ہاتھ سے ایک بڑا لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، بھوک نہیں۔'' میرا لہجہ آزردہ تھا۔

عمران نے بھی ہاتھ روک لیا۔ ''کیوں بھوک نہیں ہے؟''

''عمران! میں اسی وقت سے ڈرتا تھا۔ ہم اس معاملے میں بُری طرح پھنس چکے ہیں اور اگر صرف ہماری ہی بات ہوتی تو بھی خیر تھی... مگر اب میرے گھر والے بھی زد میں آ رہے ہیں۔''

''تم نے اپنے بارے میں چھوٹی میڈم کو کچھ بتایا ہے؟''

''سب کچھ بتایا ہے۔''

''کیا ضرورت تھی؟''

''نہ بتاتا تو چند گھنٹے میں اسے خود ہی معلوم ہو جانا تھا۔ وہ میرے سامنے فون پر سیٹھ سراج سے بات کر رہی تھی۔ سیٹھ نے صبح دس بجے یہاں آنا ہے۔''

عمران کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر منرل واٹر کے چند گھونٹ لے کر بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں یار! میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بڑی میڈم میرے ہاتھ پر بیعت ہونے والی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! مریدنی بننے والی ہے اپنی۔ جو کچھ کہیں گے، مانے گی۔ نہ مانے گی تو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دیں گے۔''

''ہر وقت پہیلیوں میں بات نہ کیا کرو۔'' میں نے منہ بنایا۔

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے چھوٹی میڈم کو اپنی سوانح حیات نہ سنائی ہوتی تو زیادہ آسانی ہوتی۔ ہم بڑی میڈم سے کہہ دیتے کہ وہ تمہیں سیٹھ سراج کے سامنے آنے ہی نہ دے لیکن اب اس سے فائدہ نہیں۔ اب دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ میڈم سے کہنا ہو گا کہ وہ تمہارے گھر والوں کی حفاظت کا انتظام کرے تاکہ نادیہ یا سیٹھ سراج وغیرہ انہیں پریشان نہ کر سکیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ بڑی میڈم انہیں پناہ دے... بالکل بوگس خیال ہے تمہارا۔ یہ لوگ جس طرح کی پناہ دیتے ہیں، وہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ قادرے کو بھی تو بڑی میڈم نے پناہ دی تھی نا... پھر کیا کیا اس کے ساتھ؟''

''کیا تمہیں قادرے اور مجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟''

''مجھے صرف ایک بات کا پتا ہے۔ تم مجھے اس لعنتی معاملے میں پھنساتے چلے جا رہے ہو۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''اس سے بہتر تھا کہ تم مجھے مر جانے دیتے اسی دن۔ قصہ پاک ہوتا۔ میری وجہ سے میرے گھر والوں پر تو آفت نہ آتی... لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی۔ بس اپنے شغل میلوں میں لگے رہے ہو۔ تم بس اپنے ہی ڈھنگ سے چلنا جانتے ہو۔ تمہیں کسی کی کوئی پروا نہیں۔'' میں بھنایا ہوا کھانے کے

سامنے سے اٹھا اور دوسری دیوار کے ساتھ جا بیٹھا۔

عمران نے بھی کھانا ایک طرف ہٹایا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دو منٹ بعد وہ میرے پاس بیٹھا۔ اس نے اپنا زخمی ہاتھ بڑی ملائمت سے میرے ہاتھ پر رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جو میں دیکھ رہا ہوں تابی... وہ تم نہیں دیکھ رہے۔ اگر مجھ پر تھوڑا سا بھی بھروسا ہے... تو اس بات پر یقین رکھو کہ تمہارے گھر والوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ میں تمہیں حلف دیتا ہوں۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میری بے قراری اچانک کم ہو گئی۔ جیسے کسی بھڑکتی ہوئی آگ پر بہت سارا ٹھنڈا پانی پھینک دیا گیا ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔ ''بس یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں اور میرا کام۔''

اور پتا نہیں کیا ہوا، میں واقعی ایک دم پُرسکون ہو گیا۔

''چلو، اٹھو اب کھانا کھاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں میرے لیے بلاوا آ جائے۔''

''کہاں سے؟''

''کہیں سے بھی آ سکتا ہے یار!'' اس نے کہا اور مجھے اٹھا کر دسترخوان تک لے گیا... ہم بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ لقمے لینے لگے۔ یہ میری زندگی کا عجیب تجربہ تھا۔ لقمہ ایک ہاتھ سے لیا جاتا ہے لیکن جب ہاتھ بندھے ہوں تو خالی ہاتھ کو بھی نیچے اوپر حرکت دینا پڑتی ہے۔ کسی سے ہاتھ ملانا ہو، کہیں کھجلی کرنی ہو، کچھ لکھنا ہو تو بھی خالی ہاتھ بڑی بے چارگی سے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے۔ جیسے وہ کوئی ایسا بچہ ہو جو پیدائشی طور پر اپنے بھائی بہن سے جڑا ہوا ہو۔ کھانے کے دوران میں ہی میرے ایک سوال کے جواب میں عمران نے سرگوشی میں بتایا کہ ریلوے اسٹیشن پر میڈم کے بندوں کے ہتھے چڑھتے ہی اس نے اپنا موبائل، کچرے کے ایک ڈبّے میں پھینک دیا تھا۔ یہ کام بڑی صفائی سے اس وقت ہوا تھا جب میڈم کے بندے اس سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ عمران کے پاس موبائل کی غیر موجودگی نے قادرے اور کنول وغیرہ کو زیادہ محفوظ کر دیا تھا۔

اسی دوران میں لمبی ناک اور تیکھے نقوش والا ایک آرٹسٹ ٹائپ شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب آ کر گارڈ سے بولا۔ ''مجاہد علی! کھولو اسے۔ میڈم نے بلایا ہے۔'' لمبی ناک والے کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

''تمہیں کہا تھا نا... بلاوا آئے گا۔'' عمران نے سرگوشی کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا؟'' میں کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

''مسئلہ ہو گا تو میں سراپا حل بن جاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔'' اس نے کہا اور نو وارد کے ساتھ باہر چلا گیا۔ دو گارڈز بھی اس کے عقب میں گئے۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مختلف اندیشے بے پناہ رفتار سے میرے ذہن میں آتے اور جاتے رہے۔ دیو ہیکل السیشین کتّے کی آواز پورچ کی طرف سے ابھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں، اقبال اور سلیم کو دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ دونوں میری نظر سے دور تھے۔

عمران کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ ایک گارڈ کے ساتھ گپیں لگاتا ہوا واپس آ رہا تھا۔ اس کی اڑتی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

''میری بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ آسیہ واقعی میری منگیتر کی ہم شکل ہے۔ میرے سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں شیر فتح۔''

''شیر فتح نہیں جی، فتح شیر۔'' گارڈ نے اپنے نام کی تصحیح کی۔

''شیر آگے ہو یا پیچھے، شیر ہی رہتا ہے یار۔'' عمران نے کہا۔ ''بلکہ پیچھے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

اب میں نے غور کیا تو عمران کے ہاتھوں میں ہینڈ کف بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

گارڈ نے میرے کمرے کو اَن لاک کیا اور بڑی عزت سے مجھے باہر آنے کے لیے کہا۔ میرے ہینڈ کف بھی ایک لمبی چابی کے ذریعے کھول دیے گئے۔ اس کے بعد اقبال کی باری آئی۔ اسے کمرے سے نکالا گیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی آزاد تھے۔ بہرحال، ٹانگوں کی تکلیف کے سبب وہ بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ میں نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے ساتھ مار پیٹ نہ کی گئی ہو مگر ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔

ہمیں ایک راہداری میں لایا گیا۔ میں صاف دیکھ رہا

''تیرھویں منزل''

ایک چور نے واردات کے دوران گھبراہٹ زدہ لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ''پولیس آ رہی ہے... جلدی سے کھڑکی سے کود جاؤ...''

''لیکن ہم تو تیرھویں منزل پر ہیں۔'' ساتھی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''اس وقت صرف چھلانگ لگانے کی فکر کرو... توہمات میں پڑنے کی ضرورت نہیں...'' چور نے تیزی سے کہا۔

تھا کہ گارڈز کا رویہ بدل چکا ہے۔ ان کی رائفلیں ایزی موڈ میں کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ ''کہاں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے مدھم آواز میں عمران سے پوچھا۔

''اس وقت بستر سے اچھی جگہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ بول بول کر میری تو ٹانگیں دُکھنے لگی ہیں۔''

''ٹانگیں؟''

''ہاں جگر! یہ مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ بولنے سے ٹانگیں دُکھتی ہیں... زیادہ چلوں تو زبان کا مسَل پُل ہو جاتا ہے۔'' اس نے بے پَر کی اڑائی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خود بھی ٹھیک سے پتا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اس چھوٹی عمارت میں داخل ہو رہے تھے جو دونوں لال کوٹھیوں کے سنگم پر واقع تھی۔ یہ یہاں کی انیکسی تھی۔ اسے چاروں طرف سے کچنار اور نیم کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اندر سے یہ جگہ خوب سجی سنوری تھی۔ ہمیں ایک نہایت آرام دہ بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا۔ اس عالی شان کمرے میں تین لگژری بیڈ تھے۔ باتھ روم بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر جدید آسائش باتھ روم میں موجود تھی۔

جب ہم یہاں داخل ہو رہے تھے، ہم نے ایک ساتھ والے کمرے سے ایک ملازم کو کچھ سامان وغیرہ نکالتے دیکھا۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہ انچارج گارڈ شیرے کا سامان ہے۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ یہاں رہائش رکھے ہوئے تھا، اب اسے یہاں سے شفٹ کیا جا رہا تھا۔ جلد ہی ہمیں شیرا بھی نظر آ گیا۔ عمران کی دُوُدھواں دھار ضربوں کی وجہ سے اس کا چہرہ متورم تھا۔ وہ اپنا بیگ اٹھائے ہوئے باہر آ رہا تھا۔ اس نے عجب زہریلی نظروں سے ہمیں گھورا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

جلد ہی دو خوبرو ملازمائیں ہماری خدمت کے لیے حاضر ہو گئیں۔ ان کی عمریں بیس بائیس سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ ان کی مسکراہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر ہم چاہیں تو وہ ہر قسم کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ وہ دونوں شلوار قمیص میں تھیں۔ سویٹرز بغیر آستین کے تھے اور قمیصیں آدھی آستین کی تھیں۔ ان کی سڈول بانہیں اور صراحی دار گردنیں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ انہوں نے ایک وسیع وارڈ روب کھولی اور قریباً دو درجن مردانہ لباس، سویٹر، کوٹ وغیرہ ہینگرز پر لٹکا دیے۔ ان میں سلیپنگ گاؤن وغیرہ بھی تھے۔ نفیس چپلیں اور جوتے وغیرہ پہلے ہی قطار اندر قطار اس وسیع وارڈروب میں موجود تھے۔

قدِ آدم ریفریجریٹر میں کھانے پینے کے بہت سے لوازمات رکھے تھے۔ ان میں امپورٹڈ وسکی کی چمکیلی بوتلیں نمایاں تھیں۔ بڑے سائز کے ایل سی ڈی ٹیلی ویژن پر کوئی انگریزی فلم، دھیمی آواز میں چل رہی تھی۔ یہ غیر معمولی حد تک شان دار رہائش گاہ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میڈم صفورا ہمیں مرعوب کر دینا چاہتی ہے۔

''کوئی خدمت سر؟'' ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''نو تھینک یو۔ فی الحال ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن یار! آرام کرنے کے لیے تھکنا ضروری ہوتا ہے۔'' اقبال نے بھی معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ابھی تم اپنی ٹانگوں کو سنبھالو۔'' عمران نے سرزنش کی۔

''چلو پھر تھوڑا سا مساج ہی کرا دو۔ ہمیں کچھ تو فائدہ ہو ان مہربان میزبانوں کا۔'' اقبال چہکا۔

عمران نے ایک لڑکی کو مساج کے لیے کہا۔ وہ تو پہلے سے اشارے کی منتظر تھی۔ اس نے جھٹ ایک الماری میں سے دو تین امپورٹڈ آئلز نکال لیے۔ ''چلو جی چلیں۔'' اقبال اٹھ کر بغلی کمرے کی طرف بڑھا۔

عمران نے اسے گردن سے دبوچ کر دوبارہ بستر پر ڈال دیا۔ ''جو کچھ کرانا ہے، یہیں پر کراؤ... ہمارے سامنے۔ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

''پھر کیا فائدہ؟'' اقبال نے ٹھنڈی سانس لی اور فلم اسٹار ندیم کی آواز میں بولا۔ ''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ٹیلی فون پر شادی کرنے کے بعد ٹیلی فون پر ہی سہاگ رات منانا۔ ٹھیک ہے بی بی! جاؤ تم۔ ابھی ہمارے ستارے آپس میں نہیں مل رہے۔'' اس نے آخری فقرہ لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ لڑکی اس کی آواز اور اسٹائل پر ششدر رہ گئی۔

عمران نے بڑی احتیاط سے اس وسیع بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ پھر ایک کاغذ کی چٹ پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھایا۔ لکھا تھا۔ ''ہمیں بات کرتے ہوئے بہت احتیاط کرنی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں ہمیں دیکھا اور سنا جا رہا ہو۔''

اس کے بعد یہی چٹ اس نے اقبال کو دکھائی۔

میں عمران سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میڈم صفورا سے اس کی کیا بات چیت ہوئی ہے اور میرے گھر والوں کے حوالے سے اس نے میڈم سے کیا تحفظ حاصل کیا ہے۔ عمران نے میرے تاثرات سے میرا ارادہ بھانپ لیا اور میرا ہاتھ دبا کر بولا۔ ''ایک دم بے فکر ہو جاؤ۔ میڈم جی سے ساری بات ہو گئی ہے۔ نو پرابلم ایٹ آل۔''

اس رات میں بہت تھوڑی دیر کے لیے سویا۔ دوسری

طرف عمران اور اقبال بے فکری سے پڑے رہے۔ وہ جیسے اپنے ہی گھر میں سو رہے تھے۔ عجب مزاج تھے ان کے۔ چند گھنٹے پہلے پیش آنے والے واقعات کی فلم سی بار بار تصور کے پردے پر چلتی رہی اور میں بے قرار ہوتا رہا۔ سب سے اہم سوال میرے ذہن میں یہی ابھر رہا تھا کہ صبح جب سیٹھ سراج کو میری یہاں موجودگی کا علم ہو گا تو اس کا ردِعمل کیا ہو گا؟

اگلے روز ہم دونوں نے بہترین باتھ رومز میں غسل کیا اور وارڈ روب میں سے اپنی پسند اور اپنے ناپ کے کپڑے نکال کر پہنے۔ اقبال اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے ان سہولتوں سے محروم رہا۔ ابھی ہم ایک پُرتعیش ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سیٹھ سراج، شیرا اور ایک دراز قد شخص اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، دراز قد شخص سیٹھ سراج کا ساتھی عارف خان تھا۔

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ آخر میرا اور سیٹھ کا سامنا ہو ہی گیا تھا۔ شیرا بھی ساتھ تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن عمران یہاں موجود تھا اور اس کے ہوتے مجھے کیا فکر ہو سکتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر سیٹھ سراج نے آگے بڑھ کر عمران اور اقبال سے ہاتھ ملایا اور پھر میری طرف بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے سراج سے مصافحہ کیا۔ سب لوگ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں میڈم صفورا بھی تیز قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔ اس نے بھی سب سے ہاتھ ملایا۔ پھر سیٹھ سراج سے مخاطب ہو کر بولی۔

''سراج! یہ بات اب کلیئر ہے کہ عمران اور اس کے دونوں ساتھی اب ہمارے ساتھ شامل ہیں اور ہمارا ہی ایک حصہ ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے اپنے ہی ساتھیوں کا ایک دوسرے سے اختلاف رکھنا بالکل پسند نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے، اسے آپ سب لوگ بالکل بھول جائیں اور ایک نئے تعلق کی شروعات کریں۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی میڈم... لیکن...''

''لیکن نہیں سراج... یہ لفظ ''لیکن'' مجھے زہر لگتا ہے۔ جو کچھ میں نے تم سب سے کہہ دیا ہے، اس میں ''لیکن'' کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''ٹھیک ہے میڈم!'' سیٹھ نے مدھم لہجے میں کہا۔

''تہاڈے سامنے ہُن کیسے بولاں۔''

''تم نے بھی سن لیا ہے شیرے؟''

''ہاں جی میڈم!''

''چلو اٹھو... پھر ایک دوسرے سے گلے ملو۔''

سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آئندہ کیا ہو گا لیکن رسمی طور پر تو کشیدگی کم ہوتی نظر آتی تھی۔

سیٹھ سراج جب مجھ سے گلے مل کر پیچھے ہٹا تو ایک لمحے کے لیے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میری آنکھیں ملیں۔ ایک بار پھر وہی چنگاری سی اس کی نگاہوں میں نظر آئی جو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی اور جس کی دید نے میرے دل میں اتھاہ خوف پیدا کیا تھا۔ کیا یہ چنگاری واقعی دوبارہ نظر آئی تھی یا بس میرا وہم تھا؟

کچھ ہی دیر بعد سیٹھ سراج، شیرا اور عارف خان واپس چلے گئے۔ سیٹھ سراج کا لحیم شحیم ڈولتا ہوا جسم میری نگاہوں سے اوجھل ہوا تو مجھے ایک گونا گوں اطمینان محسوس ہوا۔

صلح صفائی کی اس کارروائی سے عمران بھی کچھ زیادہ مطمئن دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس کی وجہ عیاں تھی۔ چھوٹی میڈم نادیہ اس کارروائی میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میڈم صفورا نے اسے بلایا ہو لیکن وہ کسی بہانے سے کترا گئی ہو۔ وہ ہر لحاظ سے من موجی اور من مانی کرنے والی دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے ہینڈل کرنے میں میڈم صفورا کو بھی دشواری محسوس ہوتی ہے۔

کل رات میں نے نادیہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ میڈم صفورا کی مداخلت کے بعد نادیہ، عمران کو ایسی نظروں سے گھورتی رہی تھی جن میں حرص کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی گہری مایوسی بھی شامل تھی۔ جیسے کوئی

خبردار! یہاں سے کچھ نہ خریدنا ورنہ اناڑی پن میں برف پر پھسل کر اپنی ہڈیاں پسلیاں تڑوا کر آرام سے اسپتال میں مزے کرو گے اور برف سمیٹنے کا کام مجھے کرنا پڑے گا۔

بھوکا شکاری اپنے ہاتھ سے نکلنے والے لذیذ شکار کو دیکھتا ہے۔

رات کو عمران نے مزاحیہ لہجے میں مجھ سے کہا تھا کہ میڈم صفورا عنقریب اس کی مریدنی بننے والی ہے...اور لگتا تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی گرویدہ نظر آنے لگی تھی اور یہ سب کچھ بہت تھوڑے وقت میں ہوا تھا۔

ہم انیکسی کے لان میں آبیٹھے۔ یہ بڑی سرسبز جگہ تھی۔ اسے چاروں طرف سے گارڈینا کی سات آٹھ فٹ اونچی باڑ نے گھیر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں کسی قسم کے ڈکٹا فون یا ریکارڈنگ ڈیوائس کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''میرے گھر والوں کے بارے میں میڈم نے کیا کہا ہے؟''

''میڈم نے ہر طرح تسلی بلکہ گارنٹی دی ہے کہ سیٹھ سراج وغیرہ کی طرف سے تمہاری فیملی کو کسی طرح کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوگا۔ میڈم نے سیٹھ سراج اور عارف خان وغیرہ سے ساری بات کرلی ہے۔ اس کے باوجود میں نے مزید احتیاط کے طور پر انہیں کچھ روز کے لیے ایک دوسری جگہ منتقل کردیا ہے۔''

''کہاں؟''

''ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں۔ یہ میرے ایک دوست کی ملکیت ہے۔ میڈم اور اس کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ یہاں دو گارڈز بھی موجود رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے ایک گاڑی بھی ہے۔''

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ یہاں ہمارے عزیز رشتے دار اور جاننے والے ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے کہ ہم اچانک ناصر بھائی کی طرح گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟''

''اچانک نہیں گئے یار! سب کچھ طریقے سے ہوا ہے۔ میں نے کل فون پر تمہاری والدہ سے کافی دیر بات کی تھی۔ میں نے انہیں سمجھا دیا ہے کہ حفاظت کی غرض سے انہیں چند دن گھر سے دور رہنا ہوگا۔ اس دوران میں تمہارے سارے گھر کا رنگ روغن ہوگا اور مرمتیں وغیرہ ہوں گی۔ کم از کم ایک ڈیڑھ مہینا تو لگ ہی جائے گا ان کاموں پر۔ یہ گھر سے باہر رہنے کی ایک معقول وجہ ہوگی۔ اور ویسے بھی یار! عنقریب ثروت بی بی کے ساتھ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ گھر کا حلیہ تو ٹھیک کرنا ہی ہے نا۔'' اس نے آنکھ ماری۔

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں...اور میرے خیال میں تمہیں بھی اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔''

''یار! اس میں غیر سنجیدگی والی کون سی بات ہے؟ تمہاری شادی ہونی ہے، ثروت سے ہونی ہے، عنقریب ہونی ہے اور میں نے گواہوں کے خانے میں اپنا نام لکھوانا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں بھول گیا ہوں... ہر گھڑی تمہارے ماتھے پر سجنے والے سہرے کا خیال میرے ذہن میں رہتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میری اور میرے گھر والوں کی جمی جمائی زندگی تہس نہس ہو رہی ہے۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق وہ لوگ واقعی ڈیفنس چلے گئے ہیں تو پھر بھی انہوں نے رہنا تو یہیں لاہور میں ہے نا۔ میری بہن فرح کو کالج جانا ہوتا ہے، عاطف کو بھی جانا ہوتا ہے۔ وہ کیا گھر میں چھپ کر بیٹھے رہیں گے اور پڑھائی کا حرج کریں گے؟''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عاطف کے امتحان ہو چکے ہیں اور وہ آج کل فارغ ہے۔ سسٹر فرح کی کلاس بھی آج کل ہفتے میں بس دو روز ہوتی ہے۔ اگر اسے جانا بھی ہوا تو وہ گاڑی میں پوری حفاظت کے ساتھ جائے گی۔ تمہیں بتایا ہے نا، یہ ساری میری دردِسری ہے۔ باقی والدہ اور گھر والے پوری طرح مطمئن ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں ان سے فون پر تمہاری بات بھی کرا دیتا ہوں۔''

ابھی ہماری بات جاری تھی کہ میڈم صفورا پھر وارد ہو گئی۔ اس کے ساتھ وہی کل والا گنجا ڈاکٹر تھا۔ میڈم صفورا نے اپنی نگرانی میں اقبال کی زخمی ٹانگیں چیک کروائیں۔ گنجے ڈاکٹر نے موبائل فون پر کسی دوسرے سینئر ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا۔ اس نے اپنے جدید موبائل کے ساتھ اقبال کی زخمی ٹانگوں کی کلرڈ تصویریں لیں اور انہیں سینئر ڈاکٹر کو ایم ایم ایس کیا۔ سینئر ڈاکٹر نے فون پر اقبال سے بات کی اور دوائیں تجویز کیں۔

اندازہ ہوتا تھا کہ میڈم صفورا ہماری دیکھ بھال میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ میڈم صفورا اور ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر اسی لان میں آکر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ جاتی سردیوں کی نرم دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ایک خوبرو ملازمہ ہمارے سامنے چھوٹی تپائی پر مالٹے اور سرخ انار کا جوس رکھ گئی۔ میں نے عمران سے پوچھا کہ یہ سارا کیا گورکھ دھندا ہے اور وہ میڈم صفورا جیسی دبنگ عورت کو کس طرح رام کرنے میں کامیاب ہوا ہے؟

عمران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں نے میڈم کو قائل کیا کہ اسے ہماری ضرورت ہے۔ جب وہ مان گئی تو اس نے ہمارے لیے اپنے دل میں نرم رویہ ''ایجاد'' کرلیا۔''

''ہم اس کی کیا ضرورت پوری کر سکتے ہیں؟''

''وہی جو اس وقت اس کے دل کا روگ بنی ہوئی ہے۔ وہ نوادر کا کاروبار کرتی ہے۔ اس حوالے سے ہر طرح کے نوادر میں اس کی بے حد دلچسپی ہے۔ کوئی اچھا پیس آف آرٹ دیکھ کر اس کی وہی حالت ہوتی ہے جو پانچ روز کے بھوکے کی گرما گرم روٹی اور چکن کڑاہی دیکھ کر ہو سکتی ہے۔ اب یہ چکن کڑاہی اس سے دور ہے اور اس کی بھوک روز بروز اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی ہے۔''

''وہ ہے کیا شے جس کے لیے اتنے لوگ دیوانے بنے ہوئے ہیں؟''

''بدھا کا ایک دو فٹ اونچا مجسمہ۔ یہ فاقے کی حالت میں ہے۔ اسے ''فاسٹنگ بدھا'' کہا جاتا ہے۔ اس کی تخلیق میں بے پناہ فن کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ فاقہ زدہ بدھا کے پنجر اور اس کے رگ پٹھوں اور دھنسی ہوئی آنکھوں کو نمایاں کرنا ایک نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ اس طرح کے جتنے بھی مجسمے مختلف جگہوں سے برآمد ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، ان میں عموماً کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے۔ صدیوں کا سفر طے کر کے جو شے ہم تک پہنچتی ہے، اس میں کچھ نہ کچھ ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوتی ہے۔ کہیں انگلیاں نہیں ہوتیں، کہیں ناک نہیں ہوتی اور کہیں سر علیحدہ اور دھڑ علیحدہ پایا جاتا ہے۔ ایسے مجسموں اور چھوٹی مورتیوں کو ماہرین بعد میں جوڑ کر مکمل کرتے ہیں۔ بہت کم پیس آف آرٹ ایسے ہوتے ہیں جو شان دار ہونے کے علاوہ مکمل بھی ہوتے ہیں۔ بدھا کا یہ مجسمہ ان میں سے ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈم اسے حاصل کرنے کے لیے دیوانی ہو رہی ہے اور میڈم کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کی یہی کیفیت ہے۔''

''وہ اس کا کیا کرے گی؟''

''اس کا اپنا ایک پرائیویٹ میوزیم بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لیے خریدنا چاہتی ہو... یا پھر اس کا خیال ہو کہ وہ اپنے ذرائع سے اسے زیادہ مہنگے داموں فروخت کر سکتی ہے۔ آج کل جاپان اور تھائی لینڈ وغیرہ میں یہ کام زوروں پر ہے۔''

''تو کیا تم نے اس سے کہا ہے کہ تم وہ مجسمہ اسے لادو گے؟''

''ہاں، کچھ ایسی ہی حماقت کی ہے میں نے۔'' وہ مسکرایا۔

''اس حماقت کا نتیجہ کیا ہوگا؟''

''نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اس کی ڈیمانڈ پوری کردیں گے اور وہ خوشی سے نہال ہو کر ہم تینوں کی... نہیں نہیں... ہم میں سے کسی ایک کی زوجیت میں آجائے گی۔'' وہ پھر پٹڑی سے اترنے لگا۔

''یعنی تم وہ پیس آف آرٹ حاصل کرلو گے... لیکن کیسے؟ یہ کام اتنا آسان تھا تو پھر یہ لوگ خود کیوں نہ کر سکے؟''

''یہ لوگ اس لیے نہیں کر سکے کیونکہ یہ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل نہیں چلا سکتے، نہ ہی پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی پر بغیر جال کے ہوا میں کرتب دکھا سکتے ہیں... اور نہ پستول کے چیمبر میں تین گولیاں رکھ کر خود پر فائر کر سکتے ہیں۔'' وہ عجب انداز میں بولا۔ اس کے اندر کی بے پناہ توانائی اس کی مسکراتی آنکھوں میں جھلک رہی تھی اور معصوم چہرے پر لہریں مار رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہم اس معاملے کو خطرناک سے خطرناک بناتے چلے جارہے ہیں۔ ہم جو بھی کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک بندے کی جان ہماری وجہ سے جا چکی ہے۔ اب یہ نہ ہو کہ کوئی اور جان چلی جائے۔''

فقیر

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ پاکستان کا سب سے صاف ستھرا اور خوب صورت شہر اسلام آباد ہے، وہاں کیوں نہ جایا جائے، وہاں منو بھائی ایک دفعہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ گئے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کے بیٹے نے اپنے ابو کی گردن میں بانہیں ڈالیں اور کہا۔ ''میں اداس ہو گیا ہوں، واپس پاکستان چلیں، سو جو شہر پاکستان کا حصہ لگتا ہی نہیں، وہاں فقیروں کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، سو میں اسلام آباد چلا آیا اور یہ دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی کہ واقعی وہاں کوئی فقیر نہیں تھا۔ عالی شان عمارتیں تھیں، جھنڈوں والی کاریں تھیں لوگ سوٹوں میں ملبوس ''سوٹے'' لگاتے پھر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے گھر کا رخ کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کیسے آئے؟ میں نے کہا ''فقیروں سے بھاگ کر آیا ہوں، خدا کا شکر ہے اس شہر میں کوئی فقیر نہیں ہے۔'' اس پر ڈاکٹر صاحب نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''یہ آپ سے کس نے کہا، یہ شہر تو فقیروں سے بھرا پڑا ہے۔'' میں نے عرض کی۔ ''میں نے پورے شہر کا چکر لگایا ہے مجھے تو کوئی فقیر دکھائی نہیں دیا۔'' اس پر ایک بار پھر ڈاکٹر صاحب کا قہقہہ گونجا اور بولے۔ ''یہ آپ کی خوش فہمی ہے، دراصل ان دنوں اسلام آباد کے سارے فقیر وزیرِ خزانہ کی قیادت میں واشنگٹن بھیک مانگنے گئے ہوئے ہیں!''

(''ہنسنا رونا منع ہے'' عطاالحق قاسمی کی کتاب، انتخاب ولید بن بلال)

’’میں نے کہا ہے نا... جو اندیشہ سب سے آخر میں ذہن میں آنا چاہیے وہ سب سے پہلے تمہارے ذہن میں آتا ہے۔‘‘

’’مگر کرو گے کیا؟‘‘

’’بس دیکھتے جاؤ، جو کام ان کو پہاڑ نظر آرہا ہے وہ ہم چٹکی بجاتے کریں گے۔ اس طرح سے...‘‘ اس نے باقاعدہ چٹکی بجانے کی کوشش کی مگر ہاتھ زخمی تھا اس لیے کراہ کر رہ گیا۔

اسی دوران میں میڈم صفورا پھر آگئی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی تھی۔ پینٹ شرٹ اور اونچی ایڑی والی جوتی کے ساتھ وہ خاصی اسمارٹ نظر آتی تھی۔ شولڈر بیگ اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس نے بیگ میں سے پانچ سو کے کرنسی نوٹوں والی چار گڈیاں نکالیں اور عمران کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ’’یہ خرچے وغیرہ کے لیے رکھ لو۔ شام تک ایک کریڈٹ کارڈ بھی تمہیں مل جائے گا۔‘‘

’’اس کی کیا ضرورت ہے میڈم! جب ضرورت پڑے گی آپ سے خود مانگ لوں گا۔‘‘

’’نہیں نہیں، یہ رکھو۔ اس سے مجھے تسلی رہے گی... بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ...‘‘ وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

’’جی فرمائیں... آپ رک کیوں گئیں؟‘‘

’’میں تو چاہتی ہوں کہ چھوڑ دو یہ سرکس وغیرہ۔ جو وہاں سے کماتے ہو، اس سے چار پانچ گنا تم کہیں بھی کما سکتے ہو۔‘‘

’’میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے میڈم کہ سرکس میرا روزگار نہیں بلکہ شوق ہے۔ اور میرے لیے اسے فی الحال چھوڑنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں، آپ کے حکم کے مطابق میں دس پندرہ روز کی چھٹی لے لیتا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے، اس بارے میں مزید سوچ بچار کرلو۔ میری طرف سے تمہارے لیے ہر طرح کی آفر موجود ہے۔‘‘

ہمارے پاس کچھ دیر تک مزید بیٹھنے کے بعد اور اپنایت کا اظہار کرنے کے بعد میڈم صفورا واپس چلی گئی۔ یہ ملاقات مکمل رازداری سے ہوئی تھی اور بات چیت کے دوران میں ہمارے اردگرد کوئی ملازم یا گارڈ وغیرہ موجود نہیں تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مختصر وقت میں میڈم صفورا عمران کو اپنے باقی تنخواہ داروں پر فوقیت دینے لگی ہے۔

اقبال نے کہا۔ ’’یار ہیرو! میڈم کی یہ ’’محبت‘‘ ہمیں کہیں لے نہ ڈوبے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں سراج اور شیرے جیسے بہت سے رقیب پیدا ہونے والے ہیں۔‘‘

’’جو پیدا ہونے والا ہے، اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ نیچر کا اصول ہے۔‘‘

’’نیچر کے اور بھی بہت سے اصول ہیں۔‘‘ میں نے زچ ہو کر کہا۔ ’’آگ سے کھیلیں گے تو وہ ہمیں ضرور جلائے گی اور تم آگ سے کھیل رہے ہو۔ نہ صرف کھیل رہے ہو بلکہ آگے بڑھتے جارہے ہو۔ میں اس معاملے میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اگر تم مجھے معافی دے دو تو بہتر ہے۔‘‘

’’ارے... تم تو سنجیدہ ہوگئے ہو۔ بالکل اس بیٹسمین کی طرح لگ رہے ہو جو ڈپریشن میں الٹی سیدھی ہٹ لگا کر آؤٹ ہو جاتا ہے۔ پتا ہے اپنے آخری میچ میں ہمارے انضمام الحق نے بھی...‘‘

’’خدا کے لیے عمران... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔‘‘ میں نے تڑخ کر کہا۔ ’’میں اب اور تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا...‘‘

عمران نے ایک دم میرا ہاتھ دبا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور یاد دلایا کہ یہاں کیمرے اور مائیکروفون وغیرہ موجود ہیں۔

میں اٹھا اور بھناتا ہوا باہر لان میں آگیا۔ گفتگو کے لیے یہ لان ہی مناسب تھا۔ عمران بھی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ ہم زرد گلاب کی کیاریوں کے پاس بیٹھ گئے۔

میں نے عمران سے دوٹوک لہجے میں کہا کہ وہ جو کچھ کررہا ہے اور جو کچھ کرنے جارہا ہے، وہ بالکل میرے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر والوں کی عزت اور سلامتی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے لہٰذا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ سمجھے۔ میں اب ایک قدم بھی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوں اور اگر وہ مجھے چلنے پر مجبور کرے گا تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ مجھے بلیک میل کررہا ہے۔

عمران نے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں مجھے سمجھانے بجھانے اور قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر پتا نہیں آج کیا بات تھی کہ میں نے اس کی ہر دلیل کو رد کردیا اور کہا کہ میں اپنا راستہ ابھی اور اسی وقت اس سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔ میری آنکھوں میں بار بار آنسوؤں کی نمی آرہی تھی اور اپنے اہلِ خانہ کی پریشانیوں کا خیال میرا خون جلا رہا تھا۔ میں نے عمران سے بس ایک بات ہی کہی۔ میں نے کہا کہ وہ میڈم سے کہہ کر مجھے اس سارے چکر سے الگ کردے۔ میں واپس اپنے گھر جانا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ میرے اہلِ خانہ بھی گھر واپس آجائیں۔

’’مگر تابی! سمجھنے کی کوشش کرو۔‘‘ عمران بولا۔ ’’جو بھی ہوا اور جس طرح بھی ہوا لیکن حقیقت اب یہی ہے کہ تم اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہو۔ یہ لوگ اب کسی صورت تمہیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔‘‘

’’نہ رہنے دیں لیکن اگر ہمیں مرنا ہے تو اپنی مرضی سے

مریں گے، تمہاری مرضی سے نہیں۔ تم جس طرح مجھے اس دلدل میں دھنساتے جارہے ہو، مجھے تو لگ رہا ہے کہ ہماری موت بھی بدترین قسم کی ہو جائے گی۔‘‘ میرا لہجہ حتمی تھا۔

کافی دیر بعد عمران نے ایک گہری سانس لی اور ہارے ہوئے انداز میں بولا۔ ’’تم پر میرا کوئی زور نہیں ہے جگر! میں نے تو اس پہلی رات کو ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ تم موٹر سائیکل سے اتر کر جہاں چاہے جا سکتے ہو۔ تم اس وقت اتر جاتے تو بہتر ہوتا۔ بہرحال، اب بھی میں تمہیں زبردستی نہیں روکوں گا۔ ہاں، اتنا ضرور چاہوں گا کہ میری وجہ سے تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو۔ مجھے بس تین چار دن کا وقت دو۔ میں سراج کے حوالے سے میڈم سے بات کروں گا۔ مجھے میڈم سے اس بات کی مکمل گارنٹی چاہیے کہ سراج یا مجید مٹھو کے چیلے چانٹے تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔‘‘

’’لیکن میں دو تین دن سے زیادہ کسی صورت یہاں نہیں رکوں گا۔‘‘ میرا لہجہ ایک بار پھر دوٹوک تھا۔

’’ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔‘‘ عمران نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ’’جہاں تک ثروت والا مسئلہ ہے... اس میں، میں نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ میں اس وعدے پر قائم ہوں۔ ابھی پرسوں بھی حاجی صاحب سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مکان کی رقم مل گئی ہے۔ دو چار دن میں ناصر جرمنی سے وہ اکاؤنٹ نمبر بھیج دے گا جس میں ڈرافٹ جمع ہونا ہے۔ جیسے ہی اس کا سراغ لگا، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے جو میری قسمت میں ہے، وہ ہو جائے گا۔ میں اپنے گھر والوں کی سلامتی داؤ پر لگا کر ثروت کو تلاش نہیں کرسکتا۔‘‘

اس طویل گفتگو کے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ سہ پہر کو عمران مجھے بتائے بغیر ایک سرخ کار میں کہیں چلا گیا اور دو ڈھائی گھنٹے بعد واپس آگیا۔ وہ کار خود ڈرائیو کر کے گیا تھا۔ رات کو میں لگژری بیڈ پر لیٹا دیر تک سوچ بچار کرتا رہا۔ مجھے عمران اور میڈم کی گارنٹی کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آگئی تھی کہ میرا مستقبل بھی ثروت اور ناصر بھائی کے مستقبل سے ملتا جلتا ہے۔ مجھے بھی اب ہجرت کرنا تھی۔ ہجرت جو صدیوں سے ظلم و جبر کے ردِعمل میں کی جاتی ہے۔ اس کے بہت سے درجے ہیں۔ کچھ عظیم ہجرتیں، عظیم مقاصد کے لیے کی گئیں۔ کچھ معمولی ہجرتیں، مجھ جیسے معمولی لوگوں نے معمولی مقاصد کے لیے کیں۔ اب یہ بات تو طے تھی کہ سیٹھ سراج کے ہاتھوں میرے زدوکوب ہونے والا واقعہ اب بھی لوگوں کے ذہنوں سے مٹے گا اور نہ میرے اپنے ذہن سے۔ اس لیے اپنے گھر واپس جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں اپنے ذہن میں جو منصوبہ بندی کررہا تھا، وہ یہ تھی کہ عمران اور اس کی خطرناک مصروفیات سے پیچھا چھڑانے کے بعد میں اپنے گھر والوں کے ساتھ جنوبی پنجاب یا پھر سندھ کے کسی شہر میں منتقل ہو جاؤں گا۔ چار چھ ماہ تک خاموشی سے حالات کا جائزہ لوں گا اور اگر صورتِ حال سازگار نظر نہیں آئی تو مکان وغیرہ فروخت کردوں گا۔ کرائے کا مکان کہیں بھی لیا جا سکتا تھا... عاطف اور فرح کی پڑھائی بھی ایسی نہیں تھی کہ انہیں تعلیمی ادارہ تبدیل کرنے میں دشواری ہوتی۔

دو دن میں اسی ڈگر پر سوچتا رہا اور مجھے اپنی منصوبہ بندی میں خاصا وزن محسوس ہوا مگر تیسری صبح ایک بار پھر اندیشے دل میں گھر بنانے لگے۔ عمران نے یہ بات تو ٹھیک ہی کہی تھی کہ میں اس سارے چکر میں ملوث ہو چکا ہوں۔ تو کیا میں ملوث ہونے کے باوجود ان خطرناک لوگوں سے دور رہنے میں کامیاب ہوسکوں گا؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا میں عمران کے بغیر تحفظ محسوس کرسکوں گا؟

میں اس شخص پر لاشعوری طور پر بے پناہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ کسی وقت مجھے یوں لگتا کہ یہ شخص ہر وہ کام کرسکتا ہے جسے کرنے کا مصمم ارادہ کرلے۔ تو کیا ’’کن فیکون‘‘ جیسی خداداد صلاحیت رکھنے والے شخص کی پُرخلوص دوستی سے محروم ہونا

گُر کی بات

ایک احمق شخص اپنی بیوی کو گُر کی باتیں سکھا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ’’اپنے ہاتھوں کو گرم پانی سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے پانی کو محسوس کر کے دیکھ لو۔‘‘

دیوانہ

پہلا۔ ’’وہ اس قدر دیوانہ تھا کہ بالآخر اسے اسپتال جانا پڑا۔‘‘

دوسرا۔ ’’کیوں، کیا ہوا تھا؟‘‘

پہلا۔ ’’ہونا کیا تھا اس نے سگریٹ پی کر مین ہول میں پھینک دی اور پھر جوتے سے اسے بجھانے کی کوشش کر ڈالی۔‘‘

دانش مندی تھی؟

صبح ناشتے پر میں نے عمران کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی دھندلاہٹ تھی... اس نے ناشتا بھی ٹھیک سے نہیں کیا اور خلافِ معمول پھر سو گیا۔ عجیب جادو تھا اس شخص میں۔ وہ ہر کس و ناکس کو اپنے دائرۂ اثر میں لے لیتا تھا۔ شاید میں بھی اس کے دائرۂ اثر میں آچکا تھا۔ اس کی پُرخلوص محبت سے محروم ہونے کا سوچ کر مجھے اپنے دل کی رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ کیا تھا؟ کون تھا؟ کہاں سے آدھمکا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

رات کو میں نے فون پر والدہ، فرح اور عاطف سے بھی بات کی۔ میرے اندیشوں کے برخلاف والدہ اور فرح وغیرہ پریشان نہیں تھے بلکہ میں نے پہلی بار ان کے لب و لہجے میں طمانیت محسوس کی۔ والدہ نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ تین روز پہلے عمران خود انہیں اس نئے گھر میں چھوڑ کر گیا ہے۔ والدہ نے کہا کہ وہ یہاں زیادہ تحفظ اور اطمینان محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے عمران کی بہت تعریف کی اور کہا۔ ”ایسے دوست قسمت سے ملتے ہیں تابی! عمران کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ تمہیں تمہاری پریشانیوں سے نکال لے گا۔ بڑا اعتماد ہے اس کے اندر۔ تم تو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہو لیکن اس نے کچھ باتیں بتائی ہیں۔“

اتنے میں فرح نے والدہ سے فون لے لیا اور بولی۔ ”تابش بھائی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں، عمران بھائی بڑے اچھے ہیں۔ انہوں نے یہاں ہماری ہر سہولت کا خیال رکھا ہے۔ سگے بھائیوں کی طرح میرا ماتھا چوم رہے تھے۔ لگتا ہے کہ ان کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔ ایسے لوگ سیٹھ سراج اور تھانے دار اشرف جیسے لوگوں سے اچھی طرح نمٹ سکتے ہیں۔ ویسے وہ بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق ”خفیہ پولیس“ سے ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟“

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عمران نے خفیہ پولیس والا شوشہ یہاں بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی کوئی بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہاری کلاسز کا کیا ہوگا؟“

”میں کل گئی تھی بھائی! اب اگلے ہفتے جاؤں گی۔“

”کیسے گئی تھیں؟“

”جانا تو ڈرائیور کے ساتھ تھا مگر اس وقت اتفاق سے عمران بھائی خود آگئے۔ کہنے لگے، چلو آج میں جاؤں گا اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ۔ راستے میں ”بگ اسٹور“ سے ڈیڑھ دو ہزار کی چاکلیٹس لے دیں۔ کہنے لگے کہ واپسی پر ڈرائیور لینے آئے گا، ساتھ میں گارڈ بھی ہوگا مگر ان گارڈز کو دیکھ کر پریشان نہیں ہونا۔ یہ صرف تمہاری شان و شوکت بڑھانے کے لیے ہیں۔ تسلی دے رہے تھے کہ چھوٹی چھوٹی پریشانیاں ہیں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر ان گارڈز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بہت اچھے ہیں۔ ان کے ساتھ ہوتے ہوئے عجیب سی سیکیورٹی محسوس ہوتی ہے۔“

فرح نے عمران کے زخمی ہاتھ کے بارے میں بھی پوچھا کہ انہیں کیسے چوٹ لگی ہے؟ کیا انہوں نے کسی سے مار پٹائی کی ہے؟ میں نے بس گول مول جواب دیا۔ میں اسے کیا کیا بتاتا۔

اس موقعے پر والدہ نے ایک بار پھر میری بہن فرح سے فون لے لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”میں نے تیرے لیے بڑی دعائیں مانگی ہیں تابی! رو رو کر اللہ سے کہا ہے کہ وہ تیری مشکلیں آسان کرے... تیری مدد کرے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میری دعائیں قبول ہوئی ہیں... تیرے اس دوست کی شکل میں اللہ نے تیرے لیے مدد بھیجی ہے۔ تم اس کی دوستی سے منہ نہ موڑنا۔ وہ تیرے بارے میں کچھ دکھی سا لگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، تابی مجھ سے کچھ ناراض ہے۔ کیا تمہارے درمیان کوئی بات ہو گئی تھی؟“ والدہ نے بڑے درد سے پوچھا۔

”نن... نہیں امی! بس یونہی کہہ دیا ہوگا اس نے۔“

”دیکھ تابی!“ والدہ نے عجیب لہجے میں کہا۔ ”تیرے بارے میں میرے دل سے جو آواز آتی ہے نا، وہ کبھی جھوٹی نہیں ہوتی۔ میں نے بہت دفعہ آزمایا ہے۔ اب بھی میرے دل سے آواز آرہی ہے کہ تیرا یہ دوست تیرے اور ہم سب کے لیے نیک شگون ثابت ہوگا۔ اس کی دوستی پر شک نہ کرنا۔“

میں حیران رہ گیا۔ والدہ نے ایک مختصر سی رفاقت کے بعد عمران کے بارے میں ایسا بیان دے دیا تھا۔ مجھے والدہ کے وجدان پر یقین تھا۔ وہ اس خاص لب و لہجے میں جب بھی کچھ کہا کرتی تھیں، وہ کسی نہ کسی شکل میں پورا ہو جاتا تھا۔

ٹیلی فون پر بات ختم کرنے کے بعد بھی میں دیر تک والدہ کے لہجے پر غور کرتا رہا۔ میرے اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز بھی والدہ کے خیال کی تائید کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب عمران کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی بے لوث و بے لاگ دوستی ایک تیز اثر نشے کی طرح تھی اور یہ نشہ کچھ ہی عرصے میں میرے رگ و پے میں سرایت کر کے میری ”ناقابلِ مزاحمت ضرورت“ بن گیا تھا۔ بے لوث دوستی کا لفظ ہم ہزار ہا بار استعمال کرتے ہیں مگر اس لفظ کو اصل معنی عمران نے دیے تھے۔ مجھے لگا کہ میں اس پہلی رات کی طرح آج

بھی اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوں اور اب اس موٹر سائیکل سے کبھی اتر نہیں سکوں گا۔

اگلے روز میڈم نے لال کوٹھی کے شان دار بیسمنٹ میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس میں سیٹھ سراج، عارف خان، شیر محمد شیرا اور شیرے کا ساتھی بختیار بھی شامل تھا۔ یہ پارٹی ایک طرح سے اہم ملازمین کے درمیان ”کوآرڈی نیشن“ قائم کرنے کے لیے تھی۔ غیر متوقع طور پر اس میں چھوٹی میڈم یعنی نادیہ نے بھی شرکت کی۔ اس پارٹی میں میڈم صفورا نے پھر اپنی بات دُہرائی۔ اس نے کہا کہ اب عمران اور اس کے دونوں ساتھی ہمارے اسکواڈ کا حصہ ہیں۔ ہمیں اب اپنی ساری پرانی رنجشیں بھلا کر اور مل کر کام کرنا ہے۔ ہمیں اپنے گلے شکوے دور کر کے اپنے دل صاف کر لینے چاہئیں۔

میڈم نے خاص طور سے مجھے اور سیٹھ سراج کو ساتھ ساتھ بٹھایا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”دیکھو تابش! جب نیا تعلق بنانا ہو تو پرانی باتیں بھلانا پڑتی ہیں۔ مجید مٹھو، سراج کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ اس کی موت جس طرح ہوئی، وہ ہم سب جان گئے ہیں۔ سراج کے لیے یہ ایک بڑا صدمہ ہے، بالکل اسی طرح جس طرح تمہارے لیے تمہاری منگیتر کا اغوا تھا۔ بے شک سراج کے صاحب زادے کی وہ ایک سنگین غلطی تھی اور اس غلطی کے اثرات دور تک گئے۔ بہرحال، اب یہ غلطیوں کو کھلے دل سے معاف کر دینے کا وقت ہے...“

میڈم نے اس طرح کی اور بھی کئی باتیں کیں۔ اس نے اس بات کی تصدیق کی کہ سراج کا بیٹا واجی، پاکستان سے باہر جا چکا ہے اور وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ بھی ہے۔ آخر میں میڈم نے مجھے مجبور کیا کہ میں سیٹھ سراج سے ایک بار پھر خلوصِ دل سے گلے ملوں۔

میں نے ایسا کرنے سے پہلے ایک نگاہ عمران پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر موافق تاثرات تھے۔ میں نے سیٹھ سراج سے معانقہ کیا لیکن ایک بار پھر لگا کہ صرف سینے سے سینہ ملا ہے، دل سے دل نہیں۔

تین چار ملازم لڑکیاں تتلیوں کی طرح ہمارے اردگرد چکرا رہی تھیں۔ ان میں سے دو وہ بھی تھیں جو خاص ہماری خدمت پر مامور تھیں۔ ان میں سے ایک ملیح چہرے والی لڑکی کا نام سارہ تھا۔ وہ زیادہ تر عمران کے اردگرد ہی منڈلاتی رہتی تھی۔ اب بھی اس کم عمر لڑکی نے جسم کو نمایاں کرنے والا ہوش رُبا لباس پہنا ہوا تھا اور ہمارے اطراف میں چکرا رہی تھی۔ بیسمنٹ میں دبیز قالین بچھے تھے۔ ایک طرف بار تھا۔ چمکیلی بوتلیں اور شفاف گلاس گردش کر رہے تھے۔ بار کے سامنے رقص گاہ تھی۔ پس پردہ مدھم آواز میں میوزک چل رہا تھا اور فلور پر ایک لڑکی مسلسل اپنے پُرشباب جسم کو تھرکا رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے وہ تھرکتی تھرکتی نشست گاہ میں بھی آجاتی تھی اور حاضرین کو گلاس، سوڈا اور سگریٹ وغیرہ سرو کرتی تھی۔

یہ سارا فائیو اسٹار سے کہیں اوپر کا ماحول تھا۔ میڈم نادیہ کچھ خاموش سی تھی۔ بہرحال، تقریب میں حصہ لے رہی تھی۔ دیگر حاضرین کی طرح وہ بھی مسلسل پیگ لے رہی تھی... بلکہ اس معاملے میں وہ سب سے آگے دکھائی دیتی تھی۔ عمران نے اس خوش گوار ماحول سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔“

”بولو... بولو۔ بغیر اجازت کے بول سکتے ہو۔“ صفورا نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”یہ خوشی کا موقع ہے میڈم! ہم نے ایک دوسرے کی غلطیوں کو درگزر کر کے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ کیوں نہ اس موقعے کی مناسبت سے سلیم کو بھی معاف کر دیا جائے۔“

میڈم صفورا نے نادیہ کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً تنک کر بولی۔ ”دشمن اور غدار میں فرق ہوتا ہے... اور سلیم لنگڑا غدار ہے۔“

”مگر میرے خیال میں اس کو کافی سزا مل چکی ہے میڈم نادیہ! ہم پرسوں بھی پورا ایک گھنٹا اس کے چلانے کی آواز سنتے رہے ہیں۔“

”تم اپنے طور پر کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کافی سزا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ کچھ بھی نہ ہو۔“ نادیہ مخمور انداز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا۔

میڈم صفورا نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، اس بارے میں پھر بات کریں گے مگر جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا، سلیم سے کوئی مار پیٹ نہیں ہوگی... ٹھیک ہے نادو؟“ میڈم نے نادیہ سے تصدیق چاہی۔

وہ جز بز نظر آرہی تھی تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کھانا شان دار تھا۔ میں نے سیٹھ سراج کو ایک دفعہ پہلے بھی کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جیسے، کھانے پر باقاعدہ حملہ کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ویسی ہی حریص چمک ابھرتی تھی جیسی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے۔

کھانے کے بعد ایک بار پھر شراب کا دور چلا۔ اس دور میں عمران نے بھی بیئر کے ایک دو چھوٹے پیگ لیے۔ میڈم نادیہ بلانوشی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اندرونی اضطراب کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ

اول فول بھی بول رہی تھی۔ بڑی بہن میڈم صفورا کسی کام کے لیے باہر گئی تو نادیہ اور بھی کھل گئی۔ وہ تھر کنے لگی اور گاہے بہ گاہے شرابیوں کے انداز میں ہاتھ لہرا لہرا کر بات کرنے لگی۔

اس نے میڈونا کے ایک جذبات انگیز انگلش گانے کے چند بول سنائے پھر ایک جوک سنایا جس کا تعلق سرکس کی گھما گھمی سے تھا۔ وہ عمران کے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور اپنے سگریٹ کا دھواں جان بوجھ کر اس کی طرف چھوڑ رہی تھی۔ پھر وہ اپنا گلاس بھرنے کے لیے خود ہی اٹھی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔ گرتے ہوئے اس کا ہاتھ عمران کے کندھے سے ٹکرایا اور اس کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ عمران کی گردن پر بجھ گیا۔ عمران تڑپ کر پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ عارف خان نے نادیہ کو سنبھال کر اٹھایا۔

نادیہ نشے کی حالت میں افسوس کا اظہار کرنے لگی۔

"اوہ سوری... ویری ویری سوری۔ اوہ! تمہاری تو گردن جل گئی۔" وہ اس کی گردن پر پھونکیں مارنے لگی۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے یا اتفاقاً ہو گیا ہے...

عمران کی گردن پر سرخ داغ نظر آ رہا تھا۔ نادیہ نے بہکے ہوئے انداز میں اپنے ٹشو پیپر سے اس داغ کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ "میں معافی مانگتی ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا... اوہ نو... نہیں ہونا چاہیے تھا۔ واٹ کین آئی ڈو ناؤ؟ اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو بھی میں تیار ہوں۔ یہ لو... یہ لو سگریٹ... تم بھی مجھے سگریٹ لگا سکتے ہو... جہاں چاہے لگا سکتے ہو۔" اس نے اپنی گردن آگے کر دی اور سگریٹ عمران کے ہاتھوں میں تھمانے کی ناکام کوشش کی۔

"اوہو، پکڑو نا... پلیز ہولڈ اِٹ۔" وہ بہکی آواز میں بولی۔ "اچھا گردن پر نہیں لگانا چاہتے تو جہاں جی چاہے لگا لو... اس نے اپنی ٹی شرٹ کے بٹن تیزی سے کھول دیے..." وہ واقعی دُھت ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آدھ بجھا سگریٹ زبردستی عمران کے ہاتھ میں تھمانے اور اسے اپنے عریاں جسم سے لگانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ لگتا تھا کہ تقریب کے دیگر حاضرین نادیہ کی ایسی حرکتوں کے عادی تھے۔ ان میں سے اکثر کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

پتا نہیں کہ یہ قضیہ کیا رنگ اختیار کرتا کہ اسی دوران میں میڈم صفورا لمبے ڈگ بھرتی اندر آ گئی۔ اس وقت نادیہ شرابی لہجے میں عمران کو مخاطب کر کے بول رہی تھی۔ "بڑے مغرور ہو تم۔ کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو... کیا میں تمہارا احسان اپنی طرف رکھ لوں گی؟ ہرگز نہیں، ناٹ ایٹ آل... تم بھی مجھے سگریٹ لگاؤ۔ ابھی لگاؤ... نہیں تو... نہیں تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔ اس طرح... لائیک دیٹ۔" اس نے شیمپین کی بڑی بوتل تڑاخ سے دیوار پر توڑ دی۔

"نادو... کیا کر رہی ہو؟ ہوش کرو۔" میڈم صفورا چلّائی۔

نادو جواب دوسری بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی، ذرا ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے سرخ آنکھوں سے بڑی بہن کو دیکھا۔ تند و تیز لہجے میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ بولنے سے پہلے ہی بند کر لیا۔ میڈم دوبارہ گرجی۔ "ختم کرو یہ تماشا۔ کیوں اتنی شراب انڈیلتی ہو اپنے اندر... کیوں بیڑا غرق کر رہی ہو اپنا؟"

نادیہ نے باغی نظروں سے بڑی بہن کی طرف دیکھا۔ تاہم کچھ کہے بغیر ہی پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی آدھ پون گھنٹے تک پارٹی چلتی رہی۔ سیٹھ سراج کی موجودگی مجھے سخت بے چین کر رہی تھی۔ بہرحال، میں نے جیسے تیسے وقت گزار لیا۔ میرا ذہن مسلسل الجھا ہوا تھا۔ رات کو بھی میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ایک بے نام تذبذب نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ عمران کا ساتھ چھوڑنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا، دوسری طرف اس کی خطرناک مصروفیات کا ساتھ دینا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا۔ رات دو ڈھائی بجے کے لگ بھگ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں بستر پر لیٹا تھا۔ عمران اٹھ کر میرے پاس آ گیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دو دن سے کافی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

سگریٹ سلگا کر بولا۔ "تابی! لگتا ہے ابھی تک الجھن میں ہو؟"

مجھے لگا جیسے اس نے میرے دل میں جھانک لیا ہے۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا۔ "کیسی الجھن؟"

"یہی الجھن کہ چلا جاؤں یا نہ جاؤں۔ میری حماقتوں کا ساتھ دینا مشکل نظر آ رہا ہے۔ دوسری طرف مجھ پر ترس بھی آ رہا ہے۔ ہے نا یہی بات؟" وہ اپنے مخصوص انداز میں میری طرف جھک کر بولا۔ لبوں پر اداس لیکن وہی مقناطیسی مسکراہٹ تھی۔

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

اس نے دو لمبے کش لے کر کہا۔ "اچھا ایسا کرتے ہیں کہ فال نکالتے ہیں... دیکھتے ہیں کہ تمہارے چلے جانے کے حق میں فیصلہ آتا ہے یا نہ جانے کے حق میں۔"

"کیسی فال؟"

"بھئی ہم جس طرح کے ہیں، ہماری فال بھی ویسی ہی ہو گی۔ میں اکثر ریوالور سے ہی فال نکالا کرتا ہوں اور

میری فال اکثر ٹھیک نکلتی ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ دس پندرہ فٹ کی دوری پر اقبال اپنے بیڈ پر درد کی دو گولیاں کھا کر سویا پڑا تھا۔

"یار! تمہاری پہیلیوں جیسی باتوں سے مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔"

"اس میں پہیلی والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" اس نے کہا اور کھلنڈرے انداز میں قمیص کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ یہ عمران کا اپنا ہی ریوالور تھا۔ کل ہی میڈم نے اسے واپس کیا تھا۔ ساتھ میں ایک موبائل بھی دیا تھا۔

عمران نے بڑے اطمینان سے ریوالور کے چیمبر میں ایک گولی ڈالی... اور مسکراتے ہوئے ریوالور کی نال اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ لی۔ ایسا کرنے سے پہلے اس نے ریوالور کی چرخی کو دو تین بار گھما دیا تھا۔ "گولی چل گئی تو چلے جانا۔ نہ چلی تو اپنے ارادے پر نظرثانی کرنا۔" عمران نے عجیب وجدانی لہجے میں کہا۔

پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بہرحال، گولی نہیں چلی اور عمران کا ہاتھ جو گولی چلنے کی صورت میں نہایت شدید طور پر زخمی ہو سکتا تھا، محفوظ رہا۔

اس نے جادوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

میں خاموش رہا۔ اس نے سگریٹ کے دو تین گہرے کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور ریوالور میری گود میں ڈال دیا۔ ہولے سے بولا۔ "ویسے... میں نے ریوالور میں جو گولی ڈالی، وہ اکیلی نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟"

وہ جواب دینے کے بجائے مسکراتا رہا اور نیا سگریٹ سلگا لیا۔ میں نے ریوالور کا چیمبر کھول کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ چرخی میں چار گولیاں موجود تھیں، بس دو خانے خالی تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ تین گولیاں پہلے سے ریوالور میں موجود تھیں۔

"کبھی کبھی مجھے تمہاری ذہنی حالت پر شک ہوتا ہے۔" میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

"عقل اور عشق دو متضاد چیزیں ہیں جگر... جب غیبی اشارے لینے ہوں تو پھر عقل کے بجائے جنون سے کام لینا پڑتا ہے۔"

میں حیرت سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ رات کے ان خاموش لمحوں میں لگژری بیڈ روم کی کھڑکیوں سے باہر تیز ہوا چل رہی تھی، کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھا کسی داستانی کردار کی طرح مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وجدان کی روشنی تھی۔ ایسا وجدان جو بے حد پختہ یقین کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں میرے لیے فیصلہ کرنا بہت آسان ہو گیا اور میرا فیصلہ تھا کہ میں عمران کے ساتھ رہوں گا اور دیکھوں گا کہ پردۂ غیب سے میرے لیے کیا ظہور میں آتا ہے۔ بہرحال، اپنے اس فیصلے کے بارے میں، میں نے عمران کو اگلی صبح ہی بتایا۔

وہ میرے فیصلے سے بہت خوش تھا... پتا نہیں کیوں؟ اگر معروضی انداز سے دیکھا جاتا تو وہ میرے لیے ہر طرح سودمند تھا جبکہ میں اس کے لیے ہر طرح بے سود۔ پھر بھی وہ مجھے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

"یار عمران! اگر تم چاہتے ہو کہ میرا دماغ ٹھیک کام کرتا رہے اور میں نفسیاتی مریض نہ بن جاؤں تو پھر مجھے پہیلیوں میں نہ الجھایا کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو اور میڈم سے تمہاری کیا باتیں طے ہوئی ہیں؟"

ہم دونوں گراسی لان میں بیٹھے تھے۔ اقبال کو ہلکا بخار تھا اور وہ بیڈ روم میں ہی لیٹا ہوا تھا۔

"تمہیں کس بات کا کنفیوزن ہے؟"

"مجھے تو لگتا ہے کہ بس کنفیوزن ہی کنفیوزن ہے۔ کوئی بات بھی ٹھیک سے میرے پلّے نہیں پڑ رہی۔ تم نے معاملات کو بہت الجھا دیا ہے۔"

"اچھا، ایسے کرتے ہیں کہ تم مجھ سے ایک ایک بات پوچھتے جاؤ، میں بتاتا جاتا ہوں۔"

میں نے کہنیوں کے بل نرم گھاس پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔ "مجید مٹھو اگر میڈم صفورا کا بندہ تھا تو وہاں جہلم میں کیا کر رہا تھا؟"

"بے شک وہ میڈم کا بندہ تھا مگر اس نے بتایا ہی تھا کہ ابرار صدیقی سے بھی اس کی علیک سلیک ہو چکی ہے اور ابرار صدیقی اسے کبھی کبھار اپنے ساتھ ٹیکسلا اور مردان وغیرہ بھی لے کر جاتا تھا۔"

"وہاں جہلم میں مجید کیا کر رہا تھا؟"

"ابرار صدیقی آج کل جہلم میں ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ وہیں پر صدیقی کا کوئی پیر طریقت بھی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو پیر صاحب کے ہاں کوئی محفل ہوتی ہے جو ساری رات جاری رہتی ہے اور کبھی کبھی دوسری رات تک بھی چلتی ہے۔ ابرار صدیقی کو اس محفل میں شریک ہونا تھا۔ اس کا خاص ملازم سلطان فلیٹ کی حفاظت کرتا تھا۔ صدیقی کو اس

بندے پر بے پناہ بھروسا ہے مگر ہوا یہ کہ جس رات صدیقی کو محفل میں شریک ہونا تھا، اسی روز سلطان کو اپنے ایک ضروری کام کے لیے واپس لاہور آنا پڑ گیا۔ دراصل سلطان کی کمی پوری کرنے کے لیے ابرار صدیقی نے مجید مٹھو کو جہلم بلایا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ فردوس پلازا کے اس فلیٹ میں وہ خاص ''پیس'' موجود ہے اس لیے صدیقی فلیٹ کی خاص حفاظت کر رہا ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے لیکن یہاں ایک ڈبل گیم ہوا اور اس گیم کا پتا میڈم اور اس کے ایک دو خاص بندوں کے سوا اور کسی کو نہیں۔ مجید مٹھو نے اس فلیٹ میں تقریباً چھتیس گھنٹے گزارے اور اس دوران میں وہ فلیٹ میں مسلسل اس ''پیس'' کو تلاش کرتا رہا۔''

''کیوں؟''

''میڈم نے اسے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ دراصل میڈم اس پیس کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی۔ بے شک وہ ساتھ ساتھ قادرے کی بہن کنول کا چکر بھی چلا رہی تھی مگر اسے اس چکر کے ناکام ہونے کا خدشہ بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے طور پر فلیٹ میں پیس تلاش کرانے کی کوشش کی مگر اس بھرپور کوشش میں ناکام ہوئی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ پیس اس فلیٹ میں موجود نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نوّے فیصد سے زیادہ امکان ہے کہ وہ اسی فلیٹ میں موجود ہے مگر ابرار صدیقی نے اسے اپنے ڈھنگ سے کہیں چھپا رکھا ہے۔ مجید مٹھو سر توڑ کوشش کر کے بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکا۔''

''تو تم اسے کیسے ڈھونڈو گے؟''

''جادو کی چھڑی سے... اپنا اپنا طریقۂ کار ہوتا ہے شہزادے۔''

''پھر وہی بجھارتیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''دراصل ابھی خود میرے ذہن میں بھی بات واضح نہیں ہے۔ ایک آزمودہ طریقے کو پھر سے آزمانا چاہ رہا ہوں۔ یہ جو اپنا آئن فلیمنگ ہے نا، جیمز بانڈ کا رائٹر، شاید اس نے اپنے کسی ناول میں اس طرح کا کام کیا تھا... یا پھر شرلاک ہومز کی کوئی کہانی تھی... ہاں یاد آیا، یہ جو آئن فلیمنگ ہے نا یہ تایا جی کا بڑا گہرا یار رہا ہے۔ دونوں نے اکٹھے ہی فلمیں دیکھنی شروع کی تھیں۔ پھر جب دونوں افغانستان میں تھے تو اکٹھے ہی روزانہ ساحل پر چہل قدمی کیا کرتے تھے...''

''افغانستان میں سمندر؟'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''نہیں ہے؟ اوہ! شاید پھر کسی اور ملک کی بات کی ہو گی انہوں نے یا پھر ہم سے چھپایا ہوگا۔ دراصل تائی جی کو تایا کا آئن فلیمنگ اور الفریڈ ہچکاک وغیرہ سے ملنا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ تو دیوانی تھیں اپنے شوکت صدیقی اور ابن صفی کی۔ بلکہ ابنِ صفی کو تو انہوں نے اپنا منہ بولا بھائی بھی بنایا ہوا تھا... ایک مرتبہ ایسا ہوا...''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ نہیں بتانا تو نہ بتاؤ... خوامخواہ دماغ مت کھاؤ۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ ایک بار پھر مسکرا کر پٹری پر واپس آگیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''سوری یار! بات کرتے ہوئے زبان پھسل جاتی ہے۔ اصل میں ابھی خود میرے ذہن میں بھی کوئی واضح نقشہ نہیں بنا۔ میں کل تک تمہیں پوری تفصیل بتا دوں گا۔ پوری تفصیل بتانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لے جانا تو اقبال کو تھا لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو، وہ جہلم میں باؤنسر کھا کر ریٹائرڈ ہرٹ ہو چکا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دے سکو تو مجھے بہت خوشی ہوگی... اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں' یہ کوئی ایسا خطرناک کام نہیں ہے۔ جو کچھ ہوگا بڑے ہموار اور پُرامن طریقے سے ہوگا۔ میڈم نے پہلی شرط ہی یہ رکھی ہے کہ انہیں کسی طرح کا خون خرابا نہیں چاہیے۔ وہ اپنے ہاتھ بالکل صاف رکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم بھی ہاتھ بالکل صاف رکھ کر ہی کام کرتے ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تم مجید مٹھو کی بات کر رہے ہو۔ یار! کم از کم تم تو ایسی بات نہ کہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جو کچھ ہوا، اس کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا۔ اس نے ہماری گاڑی کو سائڈ ماری اور خود کھائی میں گرا پھر آگ بھی اس کی غلطی سے لگی۔''

''اچھا، اب اس بحث کو چھیڑنے سے کیا فائدہ... میری سمجھ میں ایک اور بات نہیں آرہی۔ ایک طرف تو میڈم یہ چاہتی ہے کہ ابرار صدیقی سے اس کا تعلق خراب نہ ہونے پائے، دوسری طرف ''پیس'' کے لیے بھرپور ٹرائیاں بھی مار رہی ہے؟''

''اسی کو تو لالچ کہتے ہیں جگر! بہرحال، یہ کوشش جو ہم کرنے والے ہیں، اس سے میڈم کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہم اپنے طور پر کریں گے۔ میں نے اپنی طرف سے میڈم کو

ضمانت دی ہے کہ کوشش کامیاب ہو یا ناکام، دونوں صورتوں میں اس معاملے میں اس کا نام نہیں آئے گا۔''

''یہ ضمانت تم کیسے دے سکتے ہو؟ اگر اپنی کوشش کے دوران میں تم پکڑے گئے اور ابرار صدیقی کے لوگوں نے تمہیں مار مار کر دنبہ بنا دیا تو تمہیں سب کچھ بتانا ہی پڑے گا اور اگر تم نہ بتاؤ گے تو میں بتا دوں گا۔''

اس نے فوراً میرے دونوں گال کھینچ کر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ ''چلو، کم از کم ایک بات تو ثابت ہوئی کہ تم میرے ساتھ جاؤ گے۔ دوسری بات پکڑے جانے والی اور دنبہ بننے والی تو اس پر میں ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم دنیا کے جدید اور نہایت پیچیدہ قسم کے ڈپریشن کا شکار ہو۔ تمہارے ذہن میں یہ خداداد صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ تم معمولی قسم کے کاموں میں سے نہایت غیر معمولی قسم کے خطرات ڈھونڈ نکالتے ہو۔ لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بالکل صحت مند ہو جاؤ گے۔''

''میں اب بھی صحت مند ہوں، تمہاری ذہنی حالت کا مسئلہ ہے۔ تم آگ میں چھلانگ لگاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔''

''میرے جگر! یہاں کوئی آگ ہے اور نہ ہم اس میں چھلانگ لگا رہے ہیں۔ دیکھنا، یہ ''پیس'' والا معاملہ بالکل سیدھے سادے طریقے سے حل ہو جانا ہے۔''

''تمہارے سارے معاملے سیدھے سادے طریقے سے ہی حل ہوتے ہیں۔ تم بالکل سیدھے سادے طریقے سے لال کوٹھی میں گھسے... بالکل سیدھے سادے طریقے سے مٹھو کا پیچھا کیا اور اب اسی سیدھے سادے طریقے سے یہاں پھنسے ہوئے ہو۔''

''جگر! تم کہانی کو درمیان سے دیکھ رہے ہو۔ جب تک کہانی مکمل نہیں ہو جاتی اس پر تبصرہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتے ہیں تمہاری کہانی کا اینڈ بھی۔'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا اور گھاس پر چت لیٹ گیا۔ دھوپ میں نرمی تھی۔ دور اوپر گہرے نیلے آسمان پر چیلیں تیر رہی تھیں اور بلند پرواز کبوتر اپنی سفید جھلک دکھا کر غائب ہو رہے تھے۔ ایک بار میں نے ثروت سے پوچھا تھا۔ ''اگر خدانخواستہ ہمیں وقت نے جدا کر دیا تو کیا کرو گی؟'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی۔ ''کسی سنسان چھت پر چت لیٹ کر نیلے آسمان کو دیکھا کروں گی اور سوچا کروں گی کہ تم کہیں بھی ہو لیکن ہو تو اسی آسمان کے نیچے۔ اسی نیلی چھتری تلے کہیں موجود ہو اور ایک دن مجھ سے آن ملو گے...''

کیا وہ واقعی کہیں دور دیس میں اس آسمان کو دیکھتی تھی اور میرے بارے میں سوچتی تھی؟ میرے دل کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ میں اپنے اردگرد سے کٹ کر بہت دور، بہت اوپر چلا گیا۔ میں نے آسمان کی نیلاہٹ کو مخاطب کیا، پرندوں کو اور مغرب کی طرف بہنے والی ہوا کو پکارا اور کہا... میرا پیغام اس تک پہنچا دینا۔ میں اس کو بھولا نہیں ہوں۔ ہر پل یاد کرتا ہوں۔ ملن کی آس میرے دل میں مری نہیں ہے۔ اس سے کہنا کہ میرا انتظار کرے۔

☆☆☆

رات تاریک اور سرد تھی۔ میں اور عمران مہران گاڑی پر جہلم شہر کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ ہماری دائیں جانب جہلم کے پُل کی روشنیاں تھیں جبکہ بائیں طرف جہلم شہر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ یہ رات کے نو ساڑھے نو بجے کا عمل تھا۔ تاہم تیز سرد ہوا اور بارش کے چھینٹوں کی وجہ سے سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نظر نہیں آتا تھا۔

بے شک عمران کئی بار کہہ چکا تھا کہ ہم جس کام کے لیے جا رہے ہیں اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے... مگر میں جانتا تھا کہ عمران کے ہر کام میں خطرہ موجود ہوتا ہے۔ شاید وہ اور اقبال کوئی ایسا کام کرتے ہی نہیں تھے جس میں خطرہ نہ ہو۔

''کیا محسوس ہو رہا ہے؟'' عمران نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہی جو تم چاہتے ہو۔ دل کی دھڑکن تیز ہے۔ ہتھیلیوں پر پسینا آرہا ہے۔''

''جس کام میں دل کی دھڑکن تیز نہ ہو... ہتھیلیوں پر پسینا نہ آئے اور خون جوش نہ مارے، وہ بھی کوئی کام ہوتا ہے یار! یہ خطرے... رسک اور مصائب ہی ہوتے ہیں جو ردِعمل کے طور پر بندے کی زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ بے عمل زندگی روکھی پھیکی ہوتی ہے۔ وہ کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ ایسی زندگی کے بارے میں ہی اپنے معظم علی صاحب فرما گئے ہیں نا کہ اس سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔''

''معظم علی کون؟''

''یار! وہی اپنے ٹیپو سلطان صاحب۔''

''ٹھیک ہے، اب اپنے تایا جی کا شجرۂ نسب ٹیپو سلطان سے جوڑ دو۔''

''دیکھا نا، اب تم ایک دم فائیو اسٹار ہوتے جا رہے ہو۔ باتیں تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہیں۔''

باتیں کرتے کرتے اس نے ایک دم گاڑی کو بائیں

طرف نیم پختہ راستے پر موڑا اور گاڑی شہر کی ایک نواحی بستی کی طرف بڑھنے لگی۔ جلد ہی ہم ایک متوسط درجے کی بستی میں داخل ہوئے۔ درختوں میں گھرے ہوئے ایک کشادہ مکان کے قریب جا کر عمران نے گاڑی روک لی... دروازے پر عنایت علی کے نام کی بوسیدہ سی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ عمران اور میں گاڑی سے اتر آئے۔ ہم دونوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر گول ٹوپیاں تھیں اور پاؤں میں پشاوری چپل۔ میں نے کوٹ پہن رکھا تھا جبکہ عمران نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔

عمران نے کال بیل بجائی۔ تھوڑی دیر بعد پکی عمر کا ایک کوتاہ قد شخص برآمد ہوا۔ وہ اپنے حلیے سے پوٹھوہاری لگتا تھا۔ اس نے ہمیں سرتاپا گھورا اور محتاط لہجے میں بولا۔ ”ہاں بھئی، کیا بات ہے؟“

”آپ ہی کا نام عنایت علی ہے؟“ عمران نے جہلمی لب و لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، میں ہی ہوں۔“

”آپ سے کچھ کام ہے جی۔“

”پر پتا تو چلے آپ آئے کہاں سے ہیں اور کس نے بھیجا ہے آپ کو؟“

”ایسا ہی سمجھ لیں جی... ایک دو بار لاہور کے مجید مٹھو نے آپ کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ آپ... گٹا وغیرہ خرید تے ہیں۔“

گٹا کا لفظ سن کر عنایت علی چونک گیا۔ اس نے ایک بار پھر عمران کو سرتاپا گھورا پھر ہم دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ عمران راستے میں ہی مجھے بتا چکا تھا کہ گٹا اور گڈی وغیرہ کے الفاظ یہ لوگ نوادر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عنایت علی کے گھر کا صحن کافی وسیع تھا۔ یہاں شہد کی مکھیوں کے بوسیدہ ڈبے پڑے تھے۔ ایک طرف دو تین سال پرانے ماڈل کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ عنایت علی ہمیں کمرے میں لے آیا۔ بلب کی روشنی میں ایک شیشے کی الماری سب سے نمایاں دکھائی دی۔ اس میں بہت سی نایاب چیزیں پڑی تھیں۔ پرانے سکے، بدھا کے سوکھے ہوئے ہیڈ، مہریں اور کچھ برتن وغیرہ۔ لگتا تھا کہ عنایت علی یہاں تنہا رہتا ہے۔ ابھی رات کے صرف دس ہی بجے تھے مگر اس چار دیواری میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عنایت علی نے دہکی ہوئی انگیٹھی ہمارے قریب کھسکا دی اور ہم سے سوال جواب شروع کر دیے۔ اس انٹرویو کے لیے عمران پہلے ہی تیار ہو کر آیا تھا۔ اس نے اپنا تعلق روہتاس کی ایک قریبی بستی ماگھی پورا سے بتایا۔ اس نے میرے بارے میں بتایا کہ میں اس کا پھوپھی زاد شراکت احمد ہوں۔ مجھے دمے اور شدید سر درد کی شکایت ہے۔ مجھے سول اسپتال میں دکھانے کے لیے جہلم شہر آیا تھا۔ اس نے سوچا کہ شہر تو جا ہی ہے، کیوں نہ کسی معقول بندے سے گٹے کی فروخت کی بات بھی کر لی جائے۔ اس کے پاس مجید مٹھو کا دیا ہوا ایڈریس موجود تھا اس لیے یہاں چلا آیا۔

پتا نہیں کہ یہ عنایت نامی بندہ عمران کی باتوں سے کس حد تک قائل ہوا؟ بہر حال، اس کے لب و لہجے میں کچھ نرمی ضرور آگئی۔ اس نے عمران سے کہا۔ ”مجید مٹھو کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے تمہیں؟“

عمران نے چہرے پر سوگواری طاری کر لی۔ ”ہاں جی... بڑا دکھ ہوا ہے۔ ہمارے علاقے میں اخبار وغیرہ تو جاتا نہیں، مجھے تیسرے چوتھے روز ایک بندے سے خبر ملی تھی۔ پتا نہیں کہ کیا ہوا مجید بھائی کے ساتھ۔ بہر حال، یہ بات تو پکی ہے کہ وہ حادثہ شادثہ نہیں تھا۔ ان کو مارا ہے جی کسی نے...“

کچھ دیر مجید کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ اس دوران میں ایک لڑکا چائے لے کر آگیا۔ عنایت نے بتایا کہ یہ اس کا بھتیجا ہے۔ ابلے ہوئے انڈے کا نصف حصہ منہ میں رکھنے کے بعد عنایت علی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ”کیا چیز ہے تمہارے پاس؟“

عمران نے بھی ”سڑڑڑ“ کی نامعقول آواز کے ساتھ چائے کی ایک طویل چسکی لی اور بڑی دھیمی آواز میں بولا۔ ”عنایت بھائی! میری بات کا غصہ نہ کرنا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ اگر میری ملاقات بڑے بھائی صیب... میرا مطلب ہے کہ صدیقی صیب سے ہو جاتی تو اچھا تھا۔“

عنایت علی کی پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھری تاہم اس نے اپنا کاروباری لہجہ برقرار رکھا اور بولا۔ ”تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں میرے بارے میں مجید مٹھو نے بتایا تھا۔ اگر اس نے بتایا ہے تو پھر یہ بھی بتایا ہوگا کہ صدیقی صاحب کے لیے جو کچھ خریدتا ہوں، میں ہی خریدتا ہوں۔ وہ خود اتنے زیادہ مصروف ہیں کہ ایسے کاموں میں نہیں پڑ سکتے۔“

”دراصل مجھے پتا چلا تھا کہ وہ آج کل جہلم میں ہی رہ رہے ہیں اس لیے...“

”یار! تمہیں اپنی چیز بیچنی ہے یا صدیقی صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو اتروانی ہے؟“ اس بار عنایت علی کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہ فوٹو اتروانے پر بھی تیار ہو جائیں۔“ عمران نے بتیسی نکالی۔ اس کے انداز میں غیر معمولی اعتماد تھا۔

اس انداز کی وجہ سے عنایت علی نے اپنی بڑی بڑی پُراسرار آنکھوں سے ایک بار پھر عمران کا تنقیدی جائزہ لیا اور قدرے چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”... لیکن پتا تو چلے تمہارے پاس مال کیا ہے؟“

”میں تو چاہتا تھا کہ مال بھی بڑے بھائی صیب کو ہی دکھاؤں لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ آپ بھی تو بھائی صیب ہی ہیں۔“ وہ دیہاتی انداز میں بولا۔

اس نے اپنی گرم چادر کے اندر ہی اندر رازداری سے ہاتھ گھمایا اور بغلی جیب میں سے ایک چیز نکال کر باہر رکھ دی۔ یہ بڑی احتیاط سے ایک فلالین کے کپڑے میں لپیٹی گئی تھی اور میں جانتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک آرٹ پیس تھا۔

دراصل یہاں آنے سے پہلے عمران نے جو تھوڑی سی تیاری کی تھی، اس میں دو تین چیزوں کا حصول بھی تھا۔ ایک تو یہی پیس آف گندھارا آرٹ تھا۔ یہ تقریباً نو انچ لمبا شیر کا خوب صورت مجسمہ تھا۔ اس پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ دو چھوٹے نگینے تھے۔ شیر کی دُم کا آخری حصہ ”امتدادِ زمانہ“ نے توڑ ڈالا تھا پھر بھی یہ ایک خوب صورت پیس تھا۔ کل میڈم صفورا نے ہی یہ پیس عمران کو کہیں سے لا کر دیا تھا۔

عمران نے بڑی آہستگی سے فلالین کا نیلا کپڑا شیر کے مجسمے پر سے کھسکایا... جیسے شائقین کا اشتیاق بڑھانے کے لیے اسٹیج پر سے آہستہ آہستہ پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ بلب کی زرد روشنی میں شیر کا مجسمہ عیاں ہوا تو میں نے عنایت علی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک ابھرتے دیکھی۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش نمودار ہوئی اور میں نے اس کی انگلیوں کو بے ساختہ مجسمے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ایک قدر شناس نرمی کے ساتھ اس نے نو انچ لمبے مجسمے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس کی سانس کی لَے چڑھ گئی ہے اور آنکھوں میں دبی دبی بے تابی کروٹ لے رہی ہے۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر قریب رکھا ٹیبل لیمپ آن کیا اور اس کی تیز روشنی میں ماہرانہ انداز سے پیس کا جائزہ لینے لگا۔

”کہاں کا ہے؟“ عنایت علی نے پوچھا۔

”تخت بائی کا۔ ایک مقامی بندے سے خریدا ہے۔“ عمران نے جواب دیا۔

”کتنے میں چھوڑو گے؟“

”آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں جی۔ ایسا گٹا (پیس) بار بار سامنے نہیں آتا۔ آپ انصاف سے جو دیں گے، ہم لے لیں گے۔“

”پھر بھی کوئی آئیڈیا تو ہوتا ہے نا ہر بندے کا۔“

”پچھلے سال ایسا ہی ایک گٹا میرے چاچے کے پُتر ہاشم نواز نے بیچا تھا، لاہور کے ایک خاں صیب کو... وہ پورے چالیس ہزار روپے میں گیا تھا۔“

”چالیس ہزار... یہ تو بہت ہے یار!“ عنایت علی نے کاروباری لہجہ اختیار کیا۔

”بہت تو نہیں ہے جی۔ مسئلہ بس اتنا ہے کہ ہم اَن پڑھ لوگ ہیں۔ آگے تک نہیں جا سکتے۔ ہماری پہنچ بس آپ لوگوں تک ہوتی ہے۔ ورنہ اتنا تو ہمیں بھی پتا ہے کہ جو سودا آپ ہزاروں میں اٹھاتے ہیں، وہ آگے جا کر لاکھوں میں بلکہ کبھی کبھی کروڑوں تک بھی چلا جاتا ہے۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری صادق محمد۔“ عمران نے اسے اپنا نام یہی بتایا تھا۔ ”اب اتنی بھی لوٹ نہیں مچی ہوئی۔ ہمیں سو طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پولیس... کسٹم اور ٹاؤٹ وغیرہ، پتا نہیں کس کس کی جیب گرم کرنا پڑتی ہے، تب کہیں جا کر چار پیسے ہاتھ آتے ہیں۔ اور اگر کہیں پکڑ دھکڑ ہو جائے تو ساری اگلی پچھلی کمائی نکل جاتی ہے۔ تم لوگ تو گرم چادر لپیٹ کر آتے ہو اور جیب گرم کر کے نکل جاتے ہو۔ باقی ساری مصیبتیں تو ہماری ہوتی ہیں۔“

عنایت کے لہجے نے عمران کو بھی لہجہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ”ٹھیک ہے صیب جی! یہ تو من مرضی کا سودہ ہے۔ اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو رہنے دیں۔ ہم پھر بھی آپ کے خادم رہیں گے۔ جب کوئی شے ہاتھ لگے گی، آپ کو سلام کرنے آجائیں گے۔“

”لیکن یار! اس اتنے سے گٹے کے لیے چالیس ہزار تو بہت بڑی رقم ہے۔“

”میں نے چالیس ہزار کب کہا ہے صیب جی۔ میں نے تو آپ کو بتایا ہے کہ ایسا گٹا پچھلے سال چالیس میں بکا تھا۔ اب اگر آپ انصاف کی بات کریں تو اس کی قیمت پچاس سے کم نہیں ہے۔ اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں، یہ ایک گٹا نہیں ہے... بالکل اسی سائز اور شکل کے آٹھ گٹے اور ہیں۔“

”آٹھ گٹے؟“ عنایت علی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”اسی لیے تو سرکار... آپ سے کہا تھا کہ بڑی سرکار سے بات کرا دیں۔ یہ ساڑھے چار پانچ لاکھ کا سودا ہے۔ اگر ہم خوش ہو کر جائیں گے تو پھر بھی آپ کی خدمت کرتے

رہیں گے۔''

''باقی گٹے کہاں ہیں؟'' عنایت نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''وہ تو پاس نہیں ہیں۔ یہ سیمپل آپ کے سامنے ہے۔ باقی بھی بالکل اسی طرح کے ہیں۔ بس چھوٹی موٹی ٹوٹ پھوٹ ہے سب میں۔''

عنایت علی چند سیکنڈ تک پُرسوچ انداز میں اپنا گھڑا سا سر ہلاتا رہا۔ وہ اب اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ''بڑی سرکار'' سے رابطہ کرنا ضروری ہے۔

اس نے عمران سے دو تین سوال مزید پوچھے پھر موبائل فون نکالا اور ابرار صدیقی کا نمبر ملایا۔ وہ ابرار سے بات کرنے لگا۔ اس نے ابرار کو ہماری آمد کے بارے میں بتایا۔ ہمارے نام بتائے اور ہمارے مال کی تفصیل بتائی۔ ''جی ہاں... جی جی... کہتے ہیں کہ آٹھ پیس اور ہیں۔ بالکل یہی سائز ہے... ایک ہی ''سورس'' سے ملے ہیں... جی جی... قیمت زیادہ بتا رہے ہیں۔ آپ سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔''

عنایت علی نے پندرہ بیس منٹ خاموش رہ کر دوسری طرف سے دی جانے والی ہدایات سنیں پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے جناب! میں لے آتا ہوں ان کو۔ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ او کے جی!''

فون بند کر کے وہ بولا۔ ''صدیقی صاحب عام طور پر اس وقت ملتے نہیں ہیں لیکن آج جلدی گھر آ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ ٹیکسی پکڑنے اور وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹا تو لگ ہی جانا ہے۔''

کچھ ہی دیر بعد ہم عنایت علی کے گھر سے روانہ ہو رہے تھے۔ ہماری کار عنایت علی کے دروازے سے بس پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی مگر ہم اس کے پاس سے بیگانوں کی طرح گزر گئے۔ عمران کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس بارے میں اس نے کچھ تو مجھے بتایا تھا اور کچھ ابھی تک نہیں بتایا تھا۔ میں اس کے بیمار پھوپھی زاد شراکت کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھا۔ میری بیماری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اس نے میری ایک کلائی کی ورید میں ''کینولا'' بھی لگوا رکھا تھا۔ اسے ٹیپوں سے میری کلائی کے ساتھ چپکایا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مجھے اسپتال میں انجکشن وغیرہ لگتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عمران کے پاس ایک تقریباً پانچ انچ لمبا اسٹائلش سا سگریٹ لائٹر بھی تھا۔ مجھے پتا تھا کہ عمران بہت کم سگریٹ پیتا ہے اور وہ مستقل طور پر لائٹر وغیرہ اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ اب اگر یہ لائٹر اس کی جیب میں موجود تھا تو اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔

ہم تقریباً دو فرلانگ تک پیدل ہی چل کر شہر کی اس نواحی بستی سے نکل آئے اور سڑک پر سے ٹیکسی لے لی۔ اس ٹیکسی نے..... آدھ گھنٹے میں ہمیں ہمارے جانے پہچانے علاقے میں پہنچا دیا۔ یہ وہی فردوس پلازا والا علاقہ تھا۔ ابرار صدیقی کا لگژری فلیٹ اسی پلازا میں تھا۔ یہیں سے ہم نے چند روز پہلے مجید مٹھو کا پیچھا کیا تھا۔ اس وقت ہم نے اس پلازا کو صرف دیکھا تھا، آج ہم اس کے اندر داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔

اب رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ کڑکتی سردی میں سڑکیں سنسان نظر آ رہی تھیں۔ عنایت علی ہمیں لے کر اس شان دار عمارت میں داخل ہوا اور بذریعہ لفٹ چوتھی منزل پر آ گیا۔ ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کا فلیٹ اسی فلور پر تھا۔

اس فلور پر داخل ہوتے ہی ہمیں ایک سیکیورٹی گارڈ کا سامنا کرنا پڑا... دوسرے گارڈ سے فلیٹ کے آبنوسی دروازے کے سامنے ملاقات ہوئی۔ عنایت علی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اس کے باوجود ''میٹل ڈی ٹیکٹر'' کے ذریعے ہمیں چیک کیا گیا اور جیبیں وغیرہ ٹٹولی گئیں۔ آخر ہم تین بیڈ رومز والے اس وسیع فلیٹ میں داخل ہو گئے... کھڑی ناک اور عقابی آنکھوں والے ایک خطرناک صورت شخص نے ہمیں نشست گاہ میں بٹھایا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ یہی صدیقی کا خاص کارندہ سلطاناں ہے۔ وہ بے حد چوکس اور تیز طرار شخص دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کے جسم سے عجیب طرح کی بُو نکلتی محسوس ہوئی، جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی جانور ہو۔ ہمارے ساتھ اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے ابرار صدیقی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ابرار صدیقی ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے ایک طرف مانگ نکال کر بال بنائے ہوئے تھے۔ تاہم ڈاڑھی خودرو دکھائی دیتی تھی اور خاصی لمبی تھی۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ عمر یہی کوئی پینتیس سال رہی ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں نہایت چمکیلے دانوں والی ایک چھوٹی سی تسبیح بھی تھی جو اس نے ہم سے مصافحہ کرنے کے بعد سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔

عنایت علی نے بڑے مؤدب انداز میں ابرار صدیقی سے ہمارا مختصر تعارف کرایا۔ اس دوران میں ابرار صدیقی بس اپنا سر ہلاتا رہا۔ وہ کچھ چپ چپ دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں بھی سرخی مائل تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی یہ کیفیت موجودہ صورتِ حال کی وجہ سے ہے۔ وہ کنول پر فریفتہ تھا اور اس سے شادی کرنے کی پوری پلاننگ کر چکا تھا مگر اب اس کی یہ

ساری پلاننگ ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہوا، آناً فاناً ہوا تھا۔ کنول اپنی والدہ سمیت روپوش ہو چکی تھی... اور تو اور کنول کا بھائی قادر بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

تعارف ختم ہوا تو ابرار صدیقی نے اپنی گونج دار آواز میں ہم سے دو چار سوال پوچھے۔ عمران ان سوالوں کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ابرار کا اہم سوال یہی تھا کہ مجید مٹھو سے ہمارا رابطہ کب اور کہاں ہوا تھا؟ عمران نے اس کا تسلی بخش جواب دیا۔ ابرار نے ہمیں ''پیس'' دکھانے کے لیے کہا۔

عمران نے ایک بار پھر دبے دبے جوش کے ساتھ گرم چادر کے اندر اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور جڑاؤ شیر کا مجسمہ، فلالین کے کپڑے سے نکال کر ابرار صدیقی کے سامنے کر دیا۔

ابرار نے بہ ظاہر عام نظروں سے مجسمے کو دیکھا مگر اس کے چہرے پر شوق کی جو ایک چمک ابھری تھی، وہ پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ وہ ماہرانہ انداز میں ''پیس'' کے زیر و بم پر اپنی انگلیاں چلا کر دیکھتا رہا، تب جیب سے عینک نکالی اور اپنا رخ روشنی کی طرف کر کے مزید باریک بینی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ ہمارے لیے کسی طرح کا تکلف کرے گا... لہٰذا جب اس نے ملازم کو چائے کا کہا تو مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اس گٹے یا ''پیس'' کی اصل قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ عین ممکن تھا کہ جس چیز کا سودا ہم سے چالیس پینتالیس ہزار میں کیا جا رہا تھا، وہ آگے چل کر دس پندرہ لاکھ یا اس سے بھی زیادہ کی قیمت پاتی۔

اسی دوران میں ابرار صدیقی کے بیش قیمت موبائل فون پر کال آ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور مدھم آواز میں بولا۔ ''جی حضرت...'' اس کا انداز مؤدبانہ تھا۔ قیافہ لگایا جا سکتا تھا کہ دوسری طرف ابرار صدیقی کا وہی پیر و مرشد ہے جس کا تذکرہ مجید مٹھو نے اپنی موت سے قبل کیا تھا۔

ابرار صدیقی کہہ رہا تھا۔ ''جی حضرت... تلاش تو ہو رہی ہے جی... پوری کوشش کر رہے ہیں۔ بس آپ خصوصی دعا کیجیے گا۔ جی ہاں... جی ہاں... بھائی کا بھی کوئی پتا نہیں چلا۔ وہ سب اکٹھے ہی نکلے ہیں کہیں... نہیں حضرت... سراج یا میڈم خود تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کم از کم میری عقل تو یہی کہتی ہے... یہ کوئی تیسری پارٹی ہے جی...'' پھر ابرار صدیقی بات کرتے کرتے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے بولنے کی بس مدھم آواز ہم تک پہنچتی رہی۔ الفاظ اب سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ایڈووکیٹ مولانا ابرار صدیقی صاحب اپنی گم گشتہ محبوبہ کا تذکرہ فرما رہے تھے اور دوسری طرف ان کے پیر و مرشد صاحب تھے۔ لگتا تھا کہ اس پیر و مرشد صاحب کو ابرار صدیقی کی زندگی میں خاص الخاص اہمیت حاصل ہے۔ نشست گاہ کی دیوار پر نہایت قیمتی فریم میں ایک بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص تھا۔ لمبی ڈاڑھی تھی لیکن ساتھ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ اس کی بھویں غیر معمولی طور پر گھنی تھیں اور ان بھوؤں کے نیچے لمبوتری آنکھوں میں خاص چمک تھی۔

میں نے نہایت مدھم آواز میں عنایت علی سے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

''حضرت صاحب ہیں... بڑے صاحب کے مرشد۔'' اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

حضرت صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا ایک نفیس سا کڑا نظر آ رہا تھا۔ ایسا ہی کڑا ابھی میں نے ابرار صدیقی کی کلائی میں بھی دیکھا تھا۔

دو چار منٹ بعد ابرار صدیقی واپس آ گیا۔ وہ اب قدرے پُرسکون نظر آتا تھا۔ اس نے پوری توجہ کے ساتھ نو عدد گٹوں کے بارے میں ہم سے بات چیت شروع کی۔ عمران نے یہ کہہ کر ابرار صدیقی کی دلچسپی میں اضافہ کیا کہ اس کے پاس ایک قدیم اسٹوپا کا ٹوٹا ہوا حصہ بھی ہے۔ اس قریباً چار مربع فٹ کے ٹکڑے پر تصویریں کندہ ہیں۔ اور وہ یہ ٹکڑا بھی نہایت مناسب قیمت پر اس کے حوالے کر سکتا ہے۔

چائے کے بعد ابرار صدیقی نے عنایت علی کو تو واپس روانہ کر دیا تاہم عمران کے ساتھ اس کی بے تکلف گفتگو جاری رہی۔ ابرار صدیقی جیسے نہایت گھاگ شخص کو مطمئن کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر عمران یہ کام بہ خوبی کر رہا تھا۔ نو عدد گٹوں کی قیمت کے بارے میں بھی عمران نے تکرار کا انداز اختیار نہیں کیا اور بڑے کھلے دل سے یہ معاملہ ابرار صدیقی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اس نے کہا۔ ''صیب جی! ہم غریب لوگ تو بس عزت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ آپ نے جو عزت دی ہے، اس سے پیسے پورے ہو گئے ہیں۔ باقی سودے میں چالیس پچاس ہزار روپے اوپر نیچے ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

فرق پڑنا بھی کیا تھا؟ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ نو گٹے موجود ہی نہیں ہیں۔ بس یہ ایک ہی گٹا تھا جو عمران نمونے کے طور پر یہاں لے کر آیا تھا... اور یہ بھی ابرار صدیقی کو شیشے میں اتارنے کا ایک حربہ تھا۔

جو پروگرام ہم طے کر کے نکلے تھے، اس کے مطابق

ہمیں یہاں ابرار صدیقی کے شان دار اپارٹمنٹ میں رات گزارنے کی کوشش کرنا تھی۔ مجھے ایک مریض کی حیثیت سے اپنے ساتھ لانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ میرے لیے عمران کی ہدایت تھی کہ جب ہم یہاں سے جانے والے ہوں گے تو میری طبیعت اچانک خراب ہو جائے گی۔ سر شدت سے چکرانے لگے گا۔ مجھے کچھ دیر آرام کی ضرورت پڑے گی۔ امید تھی کہ اس موقعے پر ابرار صدیقی اخلاق کا مظاہرہ کرے گا اور ہمیں اتنی رات گئے جانے سے روک لے گا۔ لیکن بیماری کے بہانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ باتوں میں رات کے دو بج گئے۔ باہر موسم بھی سخت سرد اور ابر آلود تھا۔ گاہے بہ گاہے چھینٹے پڑنے لگتے تھے۔ ابرار صدیقی کو گوارا نہیں ہوا کہ ہم اتنے قیمتی گٹے کے ساتھ اتنی رات گئے واپس جائیں۔ اس نے رات کا باقی حصہ ہمیں فلیٹ میں ہی گزارنے کی آفر کی جو عمران نے دو بار انکار کرنے کے بعد بڑی انکساری سے قبول کر لی۔

نشست گاہ کے ساتھ ایک چھوٹا کمرا اس اپارٹمنٹ کے مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں بھی قالین موجود تھا۔ ٹی وی، گیس ہیٹر، اٹیچ باتھ اور دیگر سہولتیں بھی مہیا تھیں۔ اس کمرے کی ایک دیوار پر بھی حضرت جی کی بڑی سی پورٹریٹ آویزاں تھی۔ ایک ملازم نے ہمارے سونے کا انتظام کر دیا۔

ہم ڈبل بیڈ پر ایرانی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے مگر سونا کس کافر کو تھا۔ ہم یہاں جاگنے کے لیے آئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اب اس مشن کا اہم ترین مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ وہ نایاب "فاسٹنگ بدھا" اسی اپارٹمنٹ میں کہیں موجود تھا جس کے لیے بہت سے لوگ دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ دو فٹ طویل گٹا انہی در و دیوار میں کہیں چھپایا گیا تھا اور ایسے اچھے طریقے سے چھپایا گیا تھا کہ مجید مٹھو دو بار بھرپور کوشش کرنے کے باوجود ناکام رہا تھا۔ مجید مٹھو ایسے معاملوں میں نہایت ماہر سمجھا جاتا تھا۔ عمران کو میڈم سے معلوم ہوا تھا کہ مجید ایک خاندانی نقب زن تھا۔ کسی چار دیواری میں گھس کر وہاں سے کسی شے کو نکال لانے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ اس نے اس اپارٹمنٹ میں خوب تگ و دو کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

رات آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر سرد ہوا کا شور تھا۔ اس اپارٹمنٹ کا نہایت خطرناک رکھوالا سلطاناں ہمارے کمرے سے باہر موجود تھا اور جاگ رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ بوقتِ ضرورت وہ ہر بڑے سے بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔ فضا میں سنسنی سی تیرنے لگی۔

میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔ "اب تو بتا دو کہ کیا کرنا ہے؟"

"بس تیار ہو جاؤ۔" وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں مقامی فائر بریگیڈ کو فون کرنا ہے کہ فردوس پلازا کے ٹاپ فلور پر رہائشی اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی ہے۔"

"یہ جھوٹ بولنے کا مقصد؟"

"یار! جھوٹ کون بول رہا ہے؟ سچی سچی بات کریں گے۔"

"مگر آگ کہاں ہے؟"

"آگ بھی لگ جائے گی یار! اتنے بے تاب کیوں ہو رہے ہو؟ اور یہ بھی کوئی ضروری تو نہیں ہوتا نا کہ آگ لگنے کے بعد ہی فائر بریگیڈ کو اطلاع دی جائے۔ اکثر فائر بریگیڈ والے لیٹ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سیانے لوگ پہلے ہی فائر بریگیڈ کو کال کر لیتے ہیں۔"

عمران کی باتوں پر ہنسی تو نہیں آ سکتی تھی تاہم مجھے اس بے پناہ اعتماد کا احساس ضرور ہوا جو وہ نہایت پُرخطر لمحات میں بھی اپنے اندر موجود رکھتا تھا... اور اس کا یہی غیر معمولی اعتماد تھا جو مجھ جیسے ماٹھے شخص کو بھی اب بتدریج ایک نئے سانچے میں ڈھال رہا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اب مجھے بھی اس سنسنی خیزی میں کچھ لطف آنے لگا تھا۔

اس نے مجھے سرگوشیوں میں کچھ ہدایات دیں۔ یہ ہدایات سن کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ بوقتِ ضرورت واقعی شاطر ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہ ایک نہایت بولڈ قدم اٹھانے جا رہا تھا۔ میں نے پُراندیش لہجے میں سرگوشی کی۔ "لیکن عمران! یہاں اردگرد بھی تو اپارٹمنٹ ہیں... اگر کسی دوسرے اپارٹمنٹ کو نقصان پہنچا تو؟"

"یار! فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کے لیے آتے ہیں، کوئی لُڈی ڈانس تو پیش نہیں کرنا ہوتا انہوں نے۔ پھر بھی اگر تھوڑا بہت نقصان ہو بھی گیا تو کوئی بات نہیں۔ اِٹ اِز پارٹ آف دی گیم۔ ہاں، کوئی جانی نقصان نہیں ہونا چاہیے اور انشاءاللہ ہم ہونے بھی نہیں دیں گے۔"

قریباً تین چار منٹ بعد ہم حرکت میں آ گئے۔ سب سے پہلے عمران نے اپنے موبائل پر مقامی فائر بریگیڈ کا نمبر ملایا اور انہیں گھبرائے ہوئے لہجے میں اطلاع دی کہ فردوس پلازا کے بالائی اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ تاہم یہ اطلاع دیتے ہوئے عمران نے اپنا لہجہ اتنا بلند نہیں ہونے دیا تھا کہ آواز کمرے سے باہر جاتی۔

اس کے فوراً بعد اس نے دوسرا اسٹیپ لیا۔ گیس ہیٹر بند کر دیا لیکن گیس دوبارہ کھول دی۔ گیس کی بُو تیزی سے

کمرے میں پھیلنے لگی۔ جب کافی گیس پھیل گئی تو ہم دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے نکلتے عمران نے ایک اور کام کیا۔ اس نے اپنے لائٹر سے کھڑکی کے پردوں کو شعلہ دکھا دیا۔ بھک بھک کی آواز سے بیڈ روم نے آگ پکڑ لی... یہ ایک ہلا دینے والا منظر تھا۔

"آگ... آگ!" ایک ملازم کے چلّانے کی آواز سنائی دی۔

پھر میں نے سلطان کا دُھواں دھار چہرہ دیکھا۔ وہ پھٹی نظروں سے بھڑکتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ تب وہ عجیب خوف زدہ انداز میں دہاڑا اور اس نے تڑپ کر ایک قریبی دیوار سے آگ بجھانے والا گیس سلنڈر اتار لیا۔

"کیا ہوا سلطاناں؟" کسی قریبی کمرے سے ابرار صدیقی کی چلّاتی ہوئی گونج دار آواز ابھری۔

"آگ صاحب جی!" سلطاناں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

اس نے بڑی دلیری سے آگے بڑھ کر آگ پر گیس پھینکی تاہم آگ کا پھیلاؤ اس سلنڈر کی کارکردگی سے کہیں زیادہ تھا۔

اسی دوران میں، میں نے دیکھا کہ عمران نے اپنے پانچ انچ لمبے لائٹر کو اس خاص انداز سے استعمال کیا جس کے بارے میں وہ مجھے بتا چکا تھا۔ ایک بٹن پش کر کے اس نے لائٹر کو کامن روم میں پھینک دیا۔ کامن روم میں آگ نہیں لگی مگر وہاں اتنی تیزی سے دھواں پھیلا کہ یہی لگا جیسے پورا اپارٹمنٹ آگ کی زد میں آ گیا ہے۔ یہ دھواں اس خاص قسم کے لائٹر سے برآمد ہو رہا تھا۔ جیسا کہ عمران نے مجھے بتایا تھا، ایسے لائٹر سرکس میں شعبدے بازی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ پورے اپارٹمنٹ میں ایک دم تہلکہ مچ گیا۔

پلاننگ کے مطابق میں اور عمران ابرار صدیقی کی طرف بڑھے۔ وہ یقیناً سوتے میں اٹھا تھا۔ اس کے بدن پر صرف شلوار اور بنیان تھی۔ بنیان میں اس کی موٹی لیکن ٹھوس توند نمایاں نظر آتی تھی۔ افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے یہ توند بُری طرح دہل رہی تھی۔

"آگ لگ گئی ہے صیب جی... آگ!" عمران دہشت زدہ آواز میں چلّایا۔

عمران کا یہ بے معنی فقرہ صرف دہشت بڑھانے کے لیے تھا، ورنہ اندھے کو بھی دکھائی دیتا تھا کہ اپارٹمنٹ آگ کی لپیٹ میں ہے۔

ابرار صدیقی عالمِ وحشت میں ناچ کر رہ گیا۔ پہلے اس نے موبائل پر غالباً فائر بریگیڈ کو کال کرنے کی کوشش کی پھر اس کو ادھورا چھوڑ کر اپنے بیڈ روم کی طرف گیا۔ اب شعلے اس بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ابرار صدیقی بُری طرح کھانستا ہوا اپنے بیڈ پر چڑھ گیا۔ وہ دو بڑے کشن اوپر نیچے رکھ کر بیڈ پر کھڑا ہوا تو اس کا ہاتھ چھت کی اندرونی سیلنگ تک پہنچنے لگا۔ یہاں خانے دار ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ صدیقی نے ایک دو سیکنڈ تک ان خانوں کا جائزہ لیا جیسے مطلوبہ خانہ گن کر ڈھونڈ رہا ہو۔ تب اس نے ایک خانے کے ایک کونے کو مخصوص جھٹکے سے اوپر کی طرف دبایا۔ یہ تقریباً دو فٹ مربع کا خانہ باقی چھت سے علیحدہ ہو کر اوپر چلا گیا۔ صدیقی نے کھانستے ہوئے اندھا دھند اس خانے میں ہاتھ چلایا۔ کوئی چیز اس نے زور لگا کر باہر کھینچ لی، یہ پولیتھین میں لپٹی ہوئی تھی... یقیناً یہ وہی دو فٹ اونچا فاسٹنگ بدھا تھا۔ میڈم صفورا اور مجید مٹھو وغیرہ کے بقول ایک نایاب اور بے داغ پیس آف آرٹ!

ابرار صدیقی نے اس نادر اینٹیک کو ہر آنکھ سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کسی کو اس کی ہوا تک نہیں لگنے دے رہا تھا لیکن آج وہ ہمارے سامنے اس "پیس" کو اس کے خفیہ ٹھکانے سے نکال رہا تھا۔ وہ اور اس کا پیس بری طرح دھوئیں میں لپٹے ہوئے تھے۔ بستر پر سے اترنے سے پہلے اس نے یہ پیس بدست خود عمران کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

"لائیے... لائیے۔" عمران نے خلوصِ دل سے کہا۔

صدیقی سے پیس لینے کے بعد عمران نے مجھے تھما دیا۔ وہ وزنی تھا مگر اتنا بھی نہیں جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ بدھا کے اس مجسمے نے شاید آلتی پالتی مار رکھی تھی۔ نیچے سے اس کا پھیلاؤ کافی زیادہ تھا۔

عمران نے صدیقی کو بیڈ سے اترنے میں مدد دی۔ کھانس کھانس کر صدیقی کا بُرا حال تھا۔ ہم نے اپنے چہرے کپڑے میں لپیٹ رکھے تھے اس کے باوجود ہم بھی کھانس رہے تھے۔ میں نے ابرار صدیقی کو عمران کے سہارے ڈبل بیڈ سے اترتے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے۔ بظاہر یہی لگا کہ ابرار صدیقی تیورا کر اوندھے منہ گر گیا ہے یا شاید اسے ٹھوکر وغیرہ لگی ہے۔ تاہم یہ امکان بھی تھا کہ عمران نے اسے ضرب لگائی ہو... اور مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق اسے لمبا لٹا دیا ہو۔ اس بات کا اعتراف عمران نے پانچ چھ دن بعد کیا کہ اس نے ابرار صدیقی کی گردن پر ضرب لگائی تھی۔

"چلو۔" صدیقی کے گرتے ہی عمران نے تیز سرگوشی کی اور پولیتھین میں لپٹا مجسمہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ دو ملازم کھانستے

ہوئے ہماری طرف لپک رہے تھے۔ ''صیب جی کو دیکھو...وہ گر گئے ہیں۔'' عمران نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا... آگ اب مہمان خانے سے نکل کر کامن روم تک پہنچ گئی تھی۔ فرنیچر دھڑا دھڑ جلنا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت جی کی تصویر آگ کی زد میں آنے کے بعد اوندھے منہ سلگتے ایرانی قالین پر گری۔ سلطاناں EXTINGUISHER کے ذریعے آگ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کسی قاسم نامی ساتھی کو مخاطب کر کے دہاڑ رہا تھا۔ ''قاسو...قاسو! فون کر فائر بریگیڈ کو...'' اس کی آواز خوف سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔

ہم اپارٹمنٹ سے باہر نکلے۔ پورے پلازا میں ہلچل مچ چکی تھی۔ بوکھلائے ہوئے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ دو چوکیدار EXTINGUISHER لیے متاثرہ اپارٹمنٹ کی طرف لپک رہے تھے۔ ہم ان کے پہلو سے گزر کر سیڑھیوں پر آ گئے۔ بکھرے بالوں والی ایک نوجوان لڑکی جو شاید کچھ دیر پہلے اپنے شوہر کے ساتھ بستر میں اچھا وقت گزار رہی تھی، بستر کی چادر میں لپٹی سیڑھیوں پر موجود تھی۔ چادر سیڑھیوں کے جنگلے میں پھنس گئی تھی۔ وہ جھٹکے دے کر چادر کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خوش قسمتی سے چادر پھٹ گئی اور لڑکی آزاد ہو کر قلانچیں بھرتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

اردگرد سے لوگوں کے چلاّنے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ سیکنڈ فلور پر ہم نے ایک موٹی تازی خاتون کو دیکھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی اور دو چھوٹے بچوں کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر سیڑھیاں اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ آگ سے بہت دور تھی مگر لگتا تھا کہ سب سے زیادہ خطرہ اسی کو ہے۔

''آپا جی کی مدد کرو یار!'' عمران نے کہا۔

میں نے خاتون کا ایک بچہ اٹھا لیا۔ چند سیکنڈ بعد ہم گراؤنڈ فلور پر تھے۔ یہی وقت تھا جب فائر بریگیڈ والوں کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گئے تھے... ہم فردوس پلازا سے باہر نکلے۔ بہت سی راہ چلتی گاڑیاں سڑک کے کناروں پر رک چکی تھیں۔ اردگرد کی عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھل رہے تھے۔ ٹاپ فلور کے اپارٹمنٹ میں لگی ہوئی آگ کی جھلکیاں سڑک سے بھی نظر آتی تھیں۔

ہم نے ہلکی ہلکی پھوار میں تیزی سے دو سڑکیں کراس کیں اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ عمران پچھلی نشست پر تھا اور فاسٹنگ بدھا کا نادر مجسمہ اس کی گود میں تھا۔ ایک بھی گولی چلائے بغیر، کسی بھی شخص کو شدید زخمی کیے بغیر، بلا کسی بڑے جھگڑے کے... یہ فاسٹنگ بدھا عمران نے حاصل کر لیا تھا۔ اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ مسائل کو الگ طریقے سے دیکھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت اس میں موجود تھی۔ اس صلاحیت کو اس کی غیر معمولی بے خوفی سے مزید تقویت ملتی تھی۔

ٹیکسی نے ہمیں بیس منٹ میں واپس اسی رہائشی کالونی میں پہنچا دیا جہاں عنایت کے گھر کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ اسے ابھی فردوس پلازا کی آتشزدگی کی خبر ہوئی تھی یا نہیں؟

عمران نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بدھا کو بڑے احترام سے پچھلی نشست پر بٹھا کر اس پر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ جیسے ساڑھے چار ہزار سال پہلے خاموش تھا، آج بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ ابدی خاموشی... جس میں زندگی، نروان اور کائنات کے ہزارہا راز پوشیدہ تھے۔ بدھا آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ آگے کو نہ گرے، عمران نے اس کے آگے دو کشن رکھ دیے تھے۔

''ایک تو تمہاری چمڑی میں ڈر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گاڑی اس گھر سے اتنا قریب کھڑی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اب تو جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''آئندہ جب بھی مولانا ابرار صدیقی صاحب کے اپارٹمنٹ میں آگ لگانے کا پروگرام بنے گا، میں گاڑی ساتھ والی گلی میں کھڑی کیا کروں گا۔ اب خوش؟''

میں منہ بنا کر رہ گیا۔

ہمارے گوجرانوالہ تک پہنچتے پہنچتے اجالا ہو گیا۔ یہ ایک ابر آلود صبح تھی۔ ہم نے کامونکی قصبے کے پاس ایک چھپر ہوٹل پر رک کر کڑک چائے پی اور بسکٹ وغیرہ کھائے۔ یہاں رکنے کا ہمیں ایک اور فائدہ ہو گیا۔ فردوس پلازا میں ہونے والی آتشزدگی کی مختصر خبر بھی ایک نیوز چینل پر مل گئی۔ اسکرین پر چلنے والی ایک پٹی کچھ یوں تھی۔

''جہلم شہر کے ایک پلازا میں آتشزدگی... ایک فلیٹ جل گیا۔ دوسرے کو جزوی نقصان پہنچا۔ فائر بریگیڈ نے وقت پر پہنچ کر آگ پر قابو پا لیا۔ کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔''

عمران نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''یار! یہ ہمارے فائر بریگیڈ والوں کی کارکردگی کچھ اچھی نہیں ہوتی جا رہی؟''

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ قریب بیٹھے ایک پٹھان ٹرک ڈرائیور نے کہا۔ ''خو، ام نے تو یہ دیکھا ہے کہ فائر بریگیڈ کی اپنی گاڑی کو بھی آگ لگ جائے تو گاڑی والے آگ بجھانے میں پانچ دس منٹ کا دیری ضرور کرتا ہے۔ خو، یہ پلازے کا مالک کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہوگا۔''

سب ہنسنے لگے۔ عمران نے بھی اس ہنسی میں شرکت کی۔

ہم صبح نو بجے کے لگ بھگ سیکیورٹی کے دو مرحلوں سے گزر کر لال کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ ہم ابھی تک اسی دیہاتی لباس میں تھے۔ کوٹھی میں میڈم صفورا بہت بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ عمران نے راستے میں ہی موبائل پر اسے اپنی آمد اور اپنی کامیابی کی اطلاع دے دی تھی۔

جب ہماری گاڑی پورچ میں رکی تو میڈم صفورا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس کی بے تاب نگاہ سب سے پہلے گاڑی کی پچھلی نشست کی طرف گئی جہاں کمبل نما کپڑے کے نیچے بدھا موجود تھا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ بدھا پر جھپٹے گی اور بے تاب ہو کر اسے اپنی گود میں اٹھا لے گی لیکن پھر اس نے سنبھالا لیا اور اپنا رکھ رکھاؤ برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔

اس نے دبے دبے جوشیلے انداز میں ہماری خیریت دریافت کی۔ پھر اس کے اشارے پر دو ملازمین نے کمال احتیاط کے ساتھ بدھا کا دو فٹ اونچا مجسمہ کار میں سے نکالا اور اندرونی کمروں کی طرف بڑھے۔ ہم بھی ساتھ ہی تھے۔ مجسمے کو لال کوٹھی کے ایک خاص کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں دو بڑی بڑی میزیں تھیں، ان پر کچھ بصری آلات پڑے تھے۔ ایک ایکسرے مشین جیسی چیز تھی... دو تین جدید اسٹل کیمرے تھے۔ فرش پر آسٹروٹرف جیسی شے بچھی تھی۔ بدھا کے مجسمے کو بے حد احتیاط کے ساتھ ایک میز پر رکھ دیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ملازمین باہر چلے گئے۔ اب وہاں ہمارے اور میڈم کے سوا اور کوئی نہیں تھا... ''ویل ڈن عمران!'' میڈم نے ایک بار پھر دبے دبے جوش سے کہا۔ ''تم نے خوش کر دیا۔''

''تھینک یو میڈم... اور دیکھ لیں، وعدے کے مطابق کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اگر ہوا ہوگا تو تھوڑا بہت مالی نقصان ہوا ہوگا۔''

''ہاں، میں نے ابھی نیوز دیکھی ہے۔ ایک دوست سے بھی بات ہوئی ہے۔ فلیٹ کے دو کمرے ہی زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ صدیقی کو قریبی اسپتال لے جایا گیا تھا مگر طبی امداد کے بعد فارغ کر دیا گیا ہے۔ گرنے سے اس کے چہرے پر تھوڑی بہت چوٹ آئی ہے۔''

''صدیقی وغیرہ کا عام تاثر کیا ہے؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''ابھی یہ تو معلوم نہیں ہو سکا مگر سنا ہے کہ وہ مقامی تھانے میں نامعلوم افراد کے خلاف ڈکیتی یا چوری وغیرہ کا پرچہ درج کرانے کا سوچ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صدیقی کا دھیان اسی پارٹی کی طرف جا رہا ہے جن کی وجہ سے اسے اس مجسمے... کو لاہور سے جہلم لے جانا پڑا تھا۔ یہ غنڈا ٹائپ لوگ ہیں۔ لاہور میں بھی یہ صدیقی کے گھر کے گرد منڈلاتے رہے ہیں۔'' میڈم کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک تھی۔

بات کرتے ہوئے بھی میڈم کی نظریں مسلسل بدھا کا طواف کر رہی تھیں۔ تب اس کے ہاتھ پُرشوق انداز میں پولیتھین کے کور کی طرف بڑھے۔ کور کو بڑے سلیقے سے پن وغیرہ لگائی گئی تھیں۔ میڈم نے ان پنوں کو خود اتارا۔ نیچے سیلوفین کی کورنگ تھی۔ کورنگ کو قینچی سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا۔ نیچے بدھا تھا۔ میں فائن آرٹ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ فنِ سنگ تراشی و مجسمہ سازی سے بھی کوئی خصوصی لگاؤ نہیں ہے مگر پتا نہیں کیا بات تھی، بدھا کے اس زبردست مجسمے نے مجھے بھی غیر معمولی طاقت سے اپنی طرف کشش کیا۔ وہ فاقہ زدہ بدھا کی تصویر کشی کرتا ہوا، آرٹ کا ایک نہایت اعلیٰ و نفیس نمونہ تھا۔ جسم کا ہر نشیب و فراز، ہر رگ پٹھا اور ہڈی... ایک ایک تفصیل اپنی جگہ باکمال تھی۔ بے شک وہ ماہر ترین ہاتھوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کی اضافی خوبی یہ تھی کہ اس میں کہیں ٹوٹ پھوٹ نہیں تھی۔ یہ ایک دھاتی مجسمہ تھا۔

''ونڈرفل... واٹ اے بیوٹی۔'' میڈم نے مسحور کن انداز میں اسے چھوا۔ اس کی آنکھوں میں پُراشتیاق چمک تھی۔

پھر اس نے ٹیبل کے گرد موجود چند روشنیاں آن کیں اور جدید کیمرے سے مجسمے کی کئی تصویریں کھٹا کھٹ اتار لیں۔ وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

تب وہ شاہانہ انداز سے ایک لگژری صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک ایک بیش قیمت سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس کے بکھرے بکھرے بال پیشانی پر بھی جھول رہے تھے اور خوب صورت نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً ایک بھرپور عورت تھی۔ اپنی جسمانی کشش اور پُروقار انداز کے سبب وہ نادیہ سے بڑی ہونے کے باوجود کسی بھی مرد کو بہ آسانی اپنی طرف کشش کر سکتی تھی۔ نادیہ ایک شور مچاتی پھلجڑی کی طرح تھی... آنکھوں میں چبھنے والے عجیب و غریب رنگ چھوڑتی ہوئی لیکن میڈم صفورا ڈنر ٹیبل پر جلتی ہوئی ایک خاموش شمع کی طرح تھی۔ بہت دیر تک روشن رہنے والی... گہری... اور

پُرسکون! اس کے بے حرکت شعلے میں بھید پوشیدہ تھے۔
فرطِ جذبات سے میڈم صفورا کا چمکیلا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ کسی شہزادی کے سے انداز میں بولی۔ ''اس خوشی کے موقعے پر مانگو عمران... کیا مانگتے ہو؟''
میڈم صفورا کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ عمران سے کسی ایسی خواہش کی توقع کررہی ہے جس سے کوئی مالی فائدہ حاصل ہوسکتا ہو مگر عمران نے جو کہا، وہ شاید میڈم صفورا کے گمان میں نہیں تھا۔ وہ انکساری سے بولا۔ ''آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کس چیز کی کمی ہے میڈم!... لیکن آپ کی پیشکش سے فائدہ نہ اٹھانا بھی بے ادبی ہوگی۔ میں آپ سے... سلیم کے بارے میں گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ بے شک اس کی غلطی بڑی ہے لیکن آپ اس کی جان بخشی کردیجیے۔''
میڈم صفورا نے حیران نظروں سے عمران کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں بہت خیال ہے اپنے دوست کا؟''
''مجھے اپنے ہر دوست کا بہت خیال رہتا ہے میڈم!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔
''اچھی عادت ہے۔'' میڈم نے کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ بے خیالی میں عمران کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر مسکرائی اور بولی۔ ''ٹھیک ہے مین! سلیم کو معاف کردیا جائے گا... اور کچھ؟''
''بہت بہت شکریہ میڈم۔''
''اب ایک خواہش ہماری بھی ہے۔'' میڈم نے کہا۔
''جی فرمائیں۔''
''ٹھیک ہے، جمناسٹک اور سرکس وغیرہ تمہارا شوق ہے۔ تم اس شوق کو پورا کرو لیکن تمہارا باقی کا وقت ہمارا ہونا چاہیے۔ آج میں بہت خوش ہوئی ہوں تمہاری پرفارمنس سے۔''
''او کے... آپ اس بارے میں تفصیل سوچ لیں پھر جیسا آپ کہیں گی، ویسا کرلیں گے۔''
''سوچنا کیا ہے؟ شام کو سرکس میں تین گھنٹے تمہارے، باقی سب ہمارے... اور یہ ڈیل تمہاری ہی شرائط پر۔''
''ہمارا کنکشن اوپن تو نہیں ہوسکتا۔''
''ظاہر ہے کہ فی الحال نہیں ہوسکتا۔ براہِ راست ہمارا تعلق نظر نہیں آئے گا لیکن ہم ہر وقت رابطے میں رہیں گے۔ جس طرح کی سہولتیں تمہیں درکار ہیں، مجھے بتادو۔ یہاں کسی قریبی آبادی میں اچھی رہائش گاہ، ایک دو گاڑیاں، ملازم وغیرہ جو کچھ چاہو مہیا ہوسکتا ہے۔ ویسے تو میں مارا ماری اور لڑائی جھگڑے کی قائل نہیں ہوں مگر اپنا دفاع بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ چھوٹے اسلحے کے دو تین لائسنس میں تمہیں دو چار دن میں دلا سکتی ہوں...''
اسی دوران میں میڈم صفورا کا موبائل جاگ اٹھا۔ دوسری طرف کوئی ایسا شخص تھا جو عمر میں میڈم سے بڑا تھا اور وہ کسی حد تک اس کی عزت کرتی تھی۔ شاید وہ کوئی آرکیالوجسٹ تھا۔ میڈم اس سے بات کرتے کرتے اس خاص کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو کافی جلدی میں تھی۔ اس نے ہم سے کہا کہ اب ہم جاکر آرام کرسکتے ہیں، وہ شام کی چائے پر پھر ہم سے ملاقات کرے گی۔

☆☆☆

ہم اپنے کمرے میں واپس آگئے۔ خاصی تھکاوٹ ہورہی تھی لیکن جن حالات سے گزر کر ہم واپس لاہور پہنچے تھے، وہ مسلسل ذہن میں اودھم مچارہے تھے۔ ہم نے ایک پُرہنگام رات گزاری تھی۔ اپارٹمنٹ میں آگ کا بھڑکنا اور پھر صدیقی کا افراتفری میں ''فاسٹنگ بدھا'' کو چھت کے خفیہ خانے سے نکالنا، اس کے بعد اس کا قالین پر بے دم ہوکر گرجانا۔ یہ مناظر ترتیب وار ذہن کے پردے پر حرکت کررہے تھے۔
ہم نے اقبال کو کارگزاری سنائی۔ بہت مدھم لہجے میں بات کررہے تھے ہم... بلکہ اس گفتگو کو سرگوشیاں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ شک بجا طور پر ہمارے ذہنوں میں موجود تھا کہ اس مہمان خانے میں ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کی جاتی ہے۔
میں نے عمران سے کہا۔ ''بے شک سلیم کی رہائی بھی اہم ہے لیکن میڈم بڑی فراخ دلی سے آفر کررہی تھی۔ شاید وہ تمہیں کوئی اس سے بھی بڑا انعام دینا چاہتی تھی۔''
''یہ لوگ ہمیں کیا دے سکتے ہیں جگر! یہ تو خود بھک منگے ہیں۔ لالچ کا کشکول لے کر دربدر پھر رہے ہیں۔'' عمران نے سرگوشی کی۔ ''میں نے وہی مانگا جو میرے دل نے کہا۔ بس یہی کافی ہے... اور ویسے بھی آج میں اتنا خوش ہوں کہ خود ہزاروں لاکھوں لٹا سکتا ہوں۔ مجھے کسی سے کچھ مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟''
''کس بات کی خوشی ہے؟''
''بتاؤں؟''
''تو کیا اس کے لیے ہمیں کوئی پرمٹ وغیرہ دکھانا پڑے گا؟'' اقبال نے کہا۔
''اس کا تعلق تم سے نہیں، لہٰذا تم اپنی چونچ بند رکھو۔'' عمران نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''چلو آؤ باہر۔''
اقبال کو جز بز چھوڑ کر ہم باہر لان میں آگئے اور گیندے کے پھولوں سے گھری ہوئی ایک روش پر پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔

میں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ دل میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ ایک دم ڈرامائی انداز میں بولا۔ ''تمہاری ثروت بی بی کا پتا چل گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے حاجی صاحب کا فون آیا ہے۔ میں نے انہیں اپنا نیا نمبر دیا ہوا تھا۔''
''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں بھونچکا رہ گیا۔
''وہی جو تم سن رہے ہو اور لال گلابی ہو رہے ہو۔'' وہ مسکرایا۔ ''تمہاری ثروت بی بی اب کوئی لاپتا شے نہیں ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم اس کے شہر اور اس کے گھر کے دروازے پر دستک دے سکتے ہیں۔''
میرے سینے میں جیسے ایک دم ہزاروں گلاب کھل اٹھے۔ دل کے افق سے امید کی سنہری کرنیں پھوٹیں اور ان پھولوں کو منور کرگئیں لیکن ابھی ذہن سے شکوک کے بادل پوری طرح چھٹے نہیں تھے۔ میں نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔ ''کہیں تم مذاق تو نہیں کررہے؟''
وہ فلمی انداز میں بولا۔ ''اگر تمہاری محبت مذاق ہے تو میں مذاق کررہا ہوں۔ اگر رات کو سرہانے پر گرنے والے تمہارے آنسو مذاق ہیں تو میں مذاق کررہا ہوں... اور اگر تمہارا یہ سوکھے پتے جیسا چہرہ مذاق ہے... تو ہاں... میں مذاق کررہا ہوں۔''
''کہاں رہتے ہیں وہ لوگ؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔
''یہاں، میرے دماغ میں۔'' اس نے انگلی سے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا۔
''یہ کیا بات ہوئی؟''
''یار! تم نے فلم ''سونے کی تلاش'' نہیں دیکھی۔ اس میں گریگوری پیک نے یہی ڈائیلاگ بولا تھا تو اس کی جان بچی تھی۔ اس نے بدمعاشوں کو بتایا تھا کہ سونے تک پہنچنے کا نقشہ یہاں اس کے دماغ میں ہے۔ اسی طرح تمہاری ثروت بی بی تک پہنچنے کا نقشہ بھی یہاں میرے دماغ میں ہے۔ اپنے گریگوری پیک نے اپنی جان بچائی تھی اور میں اپنا اور تمہارا یارانہ بچانا چاہتا ہوں۔ تمہیں سب کچھ بتادیا تو تم مجھے... لات مار کر اکیلے ہی نکل جاؤ گے جرمنی... اور چھاپ لو گے ثروت بی بی کو۔ تمہارا فائیو اسٹار ولیمہ کھانے کی حسرت مجھ بدنصیب کے دل میں ہی رہ جائے گی۔''
''یار عمران! بے پَر کی نہ اڑاؤ۔ مجھے بتاؤ کیا واقعی ہم اب ثروت اور ناصر بھائی تک پہنچ سکتے ہیں؟''
''ایک سو ایک فیصد!'' وہ جادوئی انداز میں مسکرایا۔ ''بس یہاں جو تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، وہ کرلیں پھر نکل چلیں گے... ان لال کوٹھیوں کو ''بائی بائی'' اور بہن بہن کرکے۔''
''تھوڑا سا کام کیا؟''
''یار! بڑے بے مروت ہو۔ جو بندہ ہماری دوستی اور محبت کی وجہ سے یہاں پھنسا ہوا ہے، اسے نکالنا نہیں ہے یہاں سے؟''
''ہاں، وہ تو ضروری ہے۔''
''تو بس... اس کے بعد یہ دونوں میڈ میں جائیں اور پولیس جانے... اور میرا تایا جانے۔''
''کیا مطلب؟''
''بھئی، ہم تینوں نے کوئی ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ان دونوں بہنوں کو جیل وغیرہ پہنچانے کا۔ ہمارے پاس جو ثبوت شبوت ہیں وہ پولیس کے حوالے کردیں گے۔ مزید چھان بین کرنا ان لوگوں کا کام ہوگا۔ اگر یہ دونوں میڈ میں اور صدیقی وغیرہ واقعی غیر قانونی کاموں میں ملوث ہیں تو پھر بچ نہیں سکیں گے۔''
''تمہارا مطلب ہے پولیس بڑی دیانت داری سے ان لوگوں کو پکڑ کر جیلوں میں ڈال دے گی؟''
''نہیں... نہیں۔ صرف پولیس یہ کام نہیں کرسکتی، ساتھ میں تایا جی بھی تو ہوں گے۔ تایا جی کا مطلب ہے میڈیا۔ تمہیں پتا ہے نا کہ تایا جی ایک نیوز چینل بھی چلاتے ہیں اور آج کل خبروں کی تلاش میں ان کی بُری حالت ہورہی ہے۔''
عجب درویشانہ سوچ تھی اس کی۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے پیسے وغیرہ کا ذرّہ بھر لالچ نہیں ہے۔ میڈم صفورا جس طرح اس کی مداح ہورہی تھی، وہ اس سے کوئی بڑے سے بڑا فائدہ حاصل کرسکتا تھا... بلکہ صرف ''فاسٹنگ بدھا'' کو صدیقی کے قبضے سے نکال کر یہاں لانے کے عوض بھی وہ کافی موٹی رقم لے سکتا تھا۔ میڈم جب صدیقی سے فاسٹنگ بدھا کا سودا کررہی تھی تو یقیناً ایک خطیر رقم اسے آفر کررہی ہوگی۔ یہ خطیر رقم اب عمران کی جیب میں بھی آسکتی تھی مگر اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ شاید اس نے یہ سب کچھ خوبرو کنول اور فیاض کی جان کا صدقہ سمجھ کر کردیا تھا۔
رات گئے تک سلیم کی رہائی کے سلسلے میں کشمکش چلتی رہی۔ قرائن سے لگتا تھا کہ چھوٹی میڈم اپنی بات پر اڑی ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سلیم اس کا ملازم ہے اور اس کے ساتھ غداری کا مرتکب ہوا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں جو فیصلہ کرے گی وہ خود کرے گی۔ دوسری طرف میڈم صفورا کو اپنے وعدے کا پاس تھا اور وہ چھوٹی بہن کو قائل کررہی تھی۔ شاید وہ اسے بتارہی تھی کہ بڑے فائدے حاصل کرنے کے لیے چھوٹے موٹے کمپرومائز کرنے پڑتے ہیں۔

ہماری معلومات کے مطابق سلیم کی حالت خاصی پتلی تھی۔ وہ لال کوٹھی کے تہ خانے میں تھا۔ اسے بُری طرح ٹارچر کیا گیا تھا۔ تفصیل کے مطابق چھوٹی میڈم نادیہ نے اسے عریاں کر کے بدست خود ربڑ کے ایک ایسے پائپ کے ذریعے پیٹا تھا جس کے گرد لوہے کا باریک تار لپٹا ہوا تھا۔ اس مار نے سلیم کا گوشت کئی جگہ سے ادھیڑ ڈالا تھا۔ گرنے سے اس کی کنپٹی پر بھی چوٹ لگی تھی جس کے سبب اسے اپنا جسمانی توازن قائم رکھنا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ بس ہمیں اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ یہ معاملہ کسی حد تک طے ہو گیا۔ میڈم صفورا نے انٹرکام پر عمران کو اطلاع دی کہ صبح سلیم ان کے پاس آ جائے گا۔

عمران کی خواہش تھی کہ سلیم ناشتے پر ہمارے ساتھ ہو لیکن نو دس بجے تک وہ انیکسی میں نہیں آیا۔ عمران نے میڈم صفورا کے فون پر رابطہ کر کے اس سے پوچھا۔ صفورا نے جواب دیا۔ ”میں تو اس وقت ایک پراپرٹی کے لیے رائے ونڈ روڈ پر آئی ہوئی ہوں۔ بہرحال، سلیم ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔“

ہم نے ناشتا سلیم کے بغیر ہی کیا تاہم اس کے فوراً بعد وہ پہنچ گیا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی۔ وہ پہلے ہی لنگڑا کر چلتا تھا، اب کچھ اور بھی ڈگمگا رہا تھا۔ دو گارڈز نے اسے دونوں طرف سے تھاما ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ہم تینوں نے اسے بڑی آہستگی کے ساتھ گلے لگایا۔ گرم جوشی سے گلے لگاتے تو وہ یقیناً تکلیف سے کراہنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔ ”میں جانتا ہوں کہ مجھے آپ کی کوششوں کی وجہ سے چھوڑا گیا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔“ وہ بولا۔

”کیوں جوتے مارتے ہو یار!“ عمران بولا۔ ”تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، ہماری وجہ سے ہوا۔ ہم تمہاری طرح آنکھوں میں آنسو لے کر ایک ہزار بار بھی تمہارا شکریہ ادا کریں تو یہ کم ہے... خیر... ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب سب اچھا ہو گا۔“

ابھی عمران کی بات منہ ہی میں تھی کہ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ پھر چھوٹی میڈم نادیہ کسی بگولے کی طرح انیکسی میں داخل ہوئی۔ پانچ گارڈز اس کے ہمراہ تھے۔ وہ نشے میں دھت نظر آ رہی تھی۔

آتے ساتھ ہی اس نے چلّا کر پوچھا۔ ”یہ کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟“

جو دو گارڈز سلیم کو لے کر آئے تھے، ان میں سے ایک بولا۔ ”بڑی میڈم نے فون پر بولا تھا جی۔“

”بکواس کرتے ہو۔“ وہ گرجی۔ ”بڑی میڈم نے بولنا ہوتا تو مجھ سے بولتی۔“

”بڑی میڈم کہتی تھیں جی کہ بات ہو گئی ہے۔ اس لیے...“

”کوئی بات نہیں ہوئی ابھی۔“ وہ پھر دہاڑی۔ ”کیا سمجھتے ہو تم لوگ... اس باسٹرڈ کو میں ایسے ہی چھوڑ دوں گی؟ اس نے غداری کی ہے۔ ہماری پیٹھ میں چھرا مارا ہے۔“ پھر وہ پلٹ کر اپنے گارڈز سے بولی۔ ”لے چلو اس کتے کو۔“

”ٹھہرو!“ عمران مشتعل گارڈز اور سلیم کے درمیان آ گیا۔

”تم پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ تمہیں بھی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ تم۔“ نادیہ چلّائی اور اس نے شرابی انداز میں عمران کو پیچھے دھکیلا۔

نادیہ کے گارڈز نے سلیم کو کھینچا۔ عمران نے سلیم کا دوسرا بازو پکڑ لیا۔ وہ بے چارہ عمران اور گارڈز کے درمیان بے بسی کی تصویر نظر آنے لگا۔ گارڈز نے اپنی رائفلیں ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ ان میں انچارج گارڈ شیرا بھی شامل تھا۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

عمران نے جیب سے موبائل نکالا اور بولا۔ ”اس طرح زور آزمائی کرو گے تو سب کا نقصان ہو گا۔ میں میڈم صفورا کو کال ملاتا ہوں۔“

”میڈم سے کال ملا کر بتا دینا اسے سب کچھ۔“ نادیہ زہریلے انداز میں پھنکاری۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ پھر اس نے گارڈز کو اشارہ کیا۔ وہ سلیم کو بے دردی سے کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس موقعے پر میں نے دیکھا کہ اقبال کا بھی پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ وہ آگے بڑھا مگر عمران نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ غالباً وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے میڈم صفورا سے بات کرنا چاہتا تھا اور یہ عین دانش مندی تھی۔

گارڈز سلیم کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔ سلیم کا چہرہ زرد تھا اور وہ بے چارگی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران نے پکار کر کہا۔ ”گھبراؤ نہیں سلیم! یہ ابھی چھوڑیں گے تمہیں۔“ وہ میڈم صفورا کو کال ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا اور ہم دونوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم سلیم کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ اب ہم اسے نہیں دیکھ سکیں گے... عمران کال ملا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سرخی اسے ایک بالکل مختلف روپ دے رہی تھی۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

چوٹ

رضوانہ منظر

بڑھتے قدم ہوں یا زبان سے نکلے الفاظ...... کبھی پلٹ کر واپس نہیں آتے...... ایک نیکلس کی گمشدگی کا قصہ جس کی چوری نے سنگین نوعیت اختیار کر لی تھی۔

وہ صیاد جو اپنے ہی جال میں پھنس چکا تھا...... سراغرسانی پر مبنی مختصر تحریر

جونی نپے تلے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ آگے جانے والی عورت اس سے خوف زدہ ہے اسی لیے وہ تاریک کاریڈور میں بار بار مڑ کر جونی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اَن جانا سا خوف تھا۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً یہ سمجھ رہی تھی کہ جونی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اسی خیال نے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ جس وقت وہ دونوں ایک ساتھ ”پروفیشنل سینٹر“ کی عمارت میں داخل ہوئے تو عورت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے پیچھے آنے والا شخص اسی کے تعاقب میں ہے۔

پروفیشنل سینٹر میں زیادہ تر کاروباری اداروں کے دفاتر تھے۔ اس وقت بیشتر بند ہو چکے تھے مگر اس عمارت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ان دفاتر میں کسی بھی وقت آیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے سینٹر میں ایک نائٹ رجسٹر رکھ دیا گیا تھا۔ سینٹر میں آنے والوں کو اس میں دستخط کرنے اور آمد و روانگی کا ٹائم لکھنا ہوتا تھا۔ اس عورت نے نائٹ رجسٹر میں اپنا نام لکھا، دستخط کیے، اپنی آمد کا وقت لکھا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

جونی نے بھی رجسٹر میں اپنے کام کا اندراج کیا، دستخط کیے اور عورت کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ عورت نے لفٹ میں جونی کی طرف ایک بار بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ اب اسے نظر انداز کر رہی تھی تاکہ اپنے خوف پر قابو پا سکے۔

''17 ویں منزل پر جانا ہے۔'' جونی نے لفٹ آپریٹر سے کہا تو اس عورت نے چونک کر جونی کی طرف دیکھا۔ عورت کو بھی اسی فلور پر جانا تھا، اور یہ سوچ کر اس کا سانس رکنے لگا کہ یہ شخص اسی کے پیچھے ہے۔

چند لمحوں میں 17 ویں منزل پر لفٹ رُک گئی۔ دروازہ کھلا اور عورت نے لفٹ سے نکلتے ہی آگے کی طرف دوڑ لگا دی۔ پختہ فرش پر اس کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ گونج رہی تھی۔ چلتے چلتے اس نے مڑ کر ایک بار پھر جونی کی طرف دیکھا تو گرتے گرتے بچی۔ جونی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت کو کیسے سمجھائے کہ وہ اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہے لہٰذا اس سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

جونی نے آگے بڑھتے ہوئے دونوں طرف دفاتر کے دھندلے شیشے کے دروازوں پر پڑے ہوئے نمبرز پر نظر ڈالی۔ نمبر بھی خاصے دھندلے ہو چکے تھے۔

کاریڈور کے اختتام پر وہ عورت بائیں طرف مڑ گئی جبکہ جونی بھی اسی طرف گھوم گیا۔ جونی نے اس عورت کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اب وہ بے حد خوف زدہ لگ رہی تھی۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ کسی بھی لمحے وہ چیخ سکتی ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی ایک دفتر کی طرف گھومی جس کے دروازے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ عورت نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور جونی کی طرف گھوم کر دیکھنے لگی۔ مگر جونی اس پر سرسری نظر ڈالتا ہوا اس کے قریب سے ہو کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے روشن دروازے پر ڈاکٹر سیڈار کا نام لکھا دیکھا۔ عورت حیران بھی تھی اور کچھ مطمئن بھی ہو چکی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جونی اس کے تعاقب میں نہیں ہے۔

جونی آگے بڑھتا رہا۔ تمام دروازے تاریک تھے۔ صرف آخری والا روشن تھا۔ اس نے مسرت سے اپنی دونوں جیبوں کو تھپتھپایا۔ ایک میں پستول تھا جسے استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور دوسری جیب میں چالیس ہزار ڈالر کی مالیت کے ہیروں کا نیکلس تھا۔ یہ نیکلس مخمل کی ایک ڈبیا میں تھا۔ اسے وصول کرنے سے پہلے جونی نے اچھی طرح چیک کیا تھا۔ وہ یہ نیکلس پہنچانے ہی یہاں آیا تھا۔

روشن دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھنے کے بعد جونی نے مڑ کر دیکھا۔ عورت ابھی تک اس دروازے پر کھڑی اس کی طرف تکے جا رہی تھی جس پر وہ رکی تھی۔ جونی نے کڑی نظروں سے اسے گھورا تو وہ ہڑبڑا گئی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ دروازہ بند ہونے کے بعد جونی نے ایک بار پھر خالی کاریڈور کی طرف دیکھا اور مطمئن ہونے کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

بیرونی کمرے میں ایک لڑکی استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود تھی۔ جونی کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک لہرائی اور ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جونی کے گلے لگ گئی۔

''تم صحیح وقت پر آئے ہو، ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔'' لڑکی نے مترنم آواز میں کہا۔ ''وہ ساتھ لائے ہو؟''

''ہاں۔'' جونی نے جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیسا ہے؟ بہت خوب صورت ہے نا؟'' لڑکی نے پُرشوق لہجے میں کہا۔

جونی نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں موجود ہیرے کی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایلس! وہ تمام ہیرے اس ہیرے سے کافی بڑے اور قیمتی ہیں۔''

''جونی! آئندہ ایسا مت کہنا۔'' لڑکی نے برا ماننے کے انداز میں کہا۔ ''میرے لیے یہ انگوٹھی دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے... جانتے ہو کیوں...؟ اس لیے کہ یہ تم نے دی ہے... یہ تمہاری محبت کی نشانی ہے۔''

جونی اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

''ارے! تمہارے ہونٹوں پر میری لپ اسٹک کا نشان لگ گیا...'' یہ کہہ کر ایلس نے اپنے بیگ میں سے خوشبودار ٹشو پیپر نکالا مگر اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ حیرت سے جونی کے پیچھے دیکھ رہی تھی۔ جونی کی تمام حسیں بیدار ہو گئیں۔ ضرور اس کے پیچھے کوئی موجود تھا۔ اس نے مڑنے کی کوشش کی ہی تھی کہ اس کے سر کے عقبی حصے پر کوئی بھاری چیز لگی... اور جونی، ایلس کی بانہوں میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔

☆☆☆

جب اسے ہوش آیا تو احساس ہوا کہ وہ کسی نرم چیز پر لیٹا ہوا ہے پھر سر کے عقبی حصے میں درد کی شدید لہر اٹھی تو اس کے حلق سے کراہ نکل گئی۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آنکھوں پر کوئی بوجھ ہے۔ آخر اس نے ہمت کر کے آنکھیں کھول دیں

مگر تیز روشنی کی وجہ سے فوراً ہی بند کر لیں۔

پھر کچھ لوگوں کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑیں مگر اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ آوازیں بہت دور سے آ رہی ہوں۔

''اوہ میرے خدا! یہ کیا ہوا؟'' ایک آواز آئی۔

''پتا نہیں... میں نے انہیں اسی طرح پایا تھا۔'' کسی نے جواب دیا۔

''ارے... یہ ہوش میں آ رہا ہے پیٹ!'' کسی نے جونی کے پپوٹوں کو حرکت کرتے دیکھ کر کہا۔

پھر دو تین آدمیوں نے مل کر جونی کو اٹھایا تو جونی کے حلق سے کراہ نکل گئی۔

''آرام سے... ہرب!'' دوسری آواز نے کہا۔ ''شاید یہ زخمی ہے... ممکن ہے اسے دماغی چوٹ آئی ہو۔ ڈاکٹر سیڈار کے کمرے میں روشنی ہے۔ میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ اسے جلدی لے آؤ۔'' ایک آواز نے کہا۔ پھر وہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔

کچھ دیر بعد ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی اور بہت سی آوازیں آنے لگیں۔ جونی نے محسوس کیا جیسے وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا اور ابھی ہوش میں آیا ہے۔ کوئی شخص نہایت نرمی سے اس کے جسم کو ٹٹول رہا تھا، اس کا معائنہ کر رہا تھا... وہ ہاتھ جیسے ہی جونی کے سر کے عقبی حصے تک پہنچا تو جونی کے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں۔ اس کا جسم جھٹکے لینے لگا۔

''اوہ! اس کے سر کے پچھلے حصے میں کافی شدید چوٹ ہے۔'' کسی نے کہا۔ ''اسے اٹھا کر کاؤچ پر لٹاؤ... پھر میں اسے دیکھتا ہوں۔''

جونی نے محسوس کیا کہ چند ہاتھوں نے اسے اٹھا کر کسی نرم اور آرام دہ کاؤچ پر لٹا دیا ہے۔ پھر کسی نے اس کے زخم کا معائنہ کیا۔ پہلے جونی نے تکلیف محسوس کی پھر یہ احساس ختم ہو گیا۔ شاید وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جب اسے دوبارہ ہوش آیا تو تکلیف میں خاصی کمی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ گھنٹوں سوتا رہا ہے۔ کسی کی نرم انگلیوں نے اس کے چہرے کو چھوا تو اس نے زبردستی آنکھیں کھول دیں۔ یہ اسی عورت کا چہرہ تھا جو کاریڈور میں جونی سے خوف زدہ ہو کر بھاگ رہی تھی مگر اب اس کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' عورت نے ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا۔

''ٹھیک ہوں...'' جونی نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

''مجھے پہچانا؟'' عورت نے کہا۔ ''میرا نام لزا ہے... لزا سلیٹ! میں وہی ہوں جو تمہارے آگے آگے پروفیشنل سینٹر میں داخل ہوئی تھی۔ تم میرے پیچھے تھے۔''

''مگر میں تمہارا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔'' جونی نے کہا۔

''تمہیں یاد ہے میں ڈاکٹر سیڈار کے دفتر میں گئی تھی؟'' لزا نے پوچھا تو جونی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''میری تم سے ایک درخواست ہے!'' لزا بولی۔ ''اگر تم نے میری بات مان لی تو تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''کیا بات ہے؟'' جونی نے پوچھا۔

''بس تم یہ بات بھول جاؤ کہ تم نے مجھے ڈاکٹر سیڈار کے دفتر میں جاتے دیکھا تھا۔'' لزا نے عاجزی سے کہا۔ ''اس کی وجہ؟'' جونی نے کہا۔

''میرا شوہر سلیٹ ایک حاسد قسم کا مرد ہے۔'' لزا نے کہا۔ ''میں اور ڈاکٹر سیڈار اچھے دوست ہیں۔ شادی سے پہلے بھی میری اور اس کی دوستی تھی۔ اسی لیے سلیٹ، ڈاکٹر سے جلتا ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو گیا کہ میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی تو وہ ایک قیامت برپا کر دے گا۔'' لزا نے یہ کہہ کر مڑ کر دیکھا اور بولی۔ ''اس وقت تم میرے شوہر سلیٹ کے دفتر میں ہو... یہاں آنے سے پہلے میں ڈاکٹر سیڈار کے پاس گئی تھی... بس تمہیں یہی بات چھپانی ہے... میری خاطر...''

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹیس	ہوم اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ	ایئر ٹکٹنگ	بوتیک فیشن	آٹو سروسنگ
ریڈیو ٹی وی وی سی آر مکینک	الیکٹریشن	ڈرافٹس مین	ڈرائنگ ٹیچنگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹوگرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن
امپورٹ ایکسپورٹ	شمسی تعاملی	مُہرسازی	سلمنگ بیوٹی	حکمت	اردو ادب
موٹر سائیکل مرمت	لائبریرین	کمپیوٹر	کوکنگ بیکنگ	لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر (جدید زراعت)	میڈیکل ایڈ	آئل پینٹنگ	ڈینٹل مکینک
پولٹری ڈیری فارمنگ	نیوز رپورٹر	فلاور میکنگ	پبلک ریلیشن آفیسر

یہ تمام کورسز اُردو میں سینکڑوں تصاویر اور ڈایاگرام کے ساتھ پرنٹڈ کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک لڑکے لڑکیوں کو گھر پر کراتے ہیں۔ کورس کے دوران اور سند لینے کے بعد بھی مکمل راہنمائی ایک وقت میں ایک کورس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ جوابی لفافے کے ساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237
جی پی او، اسلام آباد

جونی خاموشی سے لزا کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔ ''میری بات مانو گے نا؟ باہر پولیس بھی آچکی ہے... کہیں ایسا نہ ہو کہ تم انہیں یہ بات بتا دو کہ میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔''

''پولیس؟'' جونی نے حیرت سے کہا۔ ''پولیس کیوں آئی ہے؟'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور آگے بڑھا۔

لزا نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں رکا۔ اٹھتے ہی اسے چکر آگیا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ دوسرے کمرے میں روشنی تھی۔ خاصے لوگ جمع تھے۔ فرش پر ایلس چت پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرہ سفید ہو چکا تھا۔ اس کے سینے پر کوئی چمک دار سی چیز پڑی تھی۔ وہ غالباً کوئی سلاخ تھی۔

''ایلس!'' جونی زور سے چیخا اور اس کا جسم آگے پیچھے ڈگمگانے لگا۔ کسی نے جلدی سے اسے تھام لیا اور دوسرے آفس میں لے گیا۔ اسے ایک کاؤچ پر لٹا دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے پاس ایک اسمارٹ سا آدمی آیا اور بولا۔ ''میرا نام لیفٹیننٹ فوسٹر ہے... تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟''

''ہاں... وہ میری منگیتر تھی۔'' جونی نے کہا۔

''اوہ!'' فوسٹر نے افسردگی سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ وہ...'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور چند لمحوں بعد بولا۔ ''اس لڑکی کا قاتل باہر موجود ہے... وہ کون ہے، میں یہی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں، اور جلد ہی اسے بے نقاب کر دوں گا۔''

جونی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ چپ چاپ لیفٹیننٹ فوسٹر کی طرف دیکھتا رہا۔

''تم مسٹر سلیٹ کو ہیروں کا ایک نیکلس ڈیلیور کرنے والے تھے؟'' فوسٹر نے کہا۔

یہ سنتے ہی جونی نے جلدی سے اپنی جیبیں تھپتھپائیں۔ نہ اس کی جیب میں پستول تھا اور نہ وہ مخملی ڈبیا جس میں وہ بیش قیمت نیکلس تھا۔ وہ فوسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ غائب ہو چکا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' لیفٹیننٹ فوسٹر نے کہا۔ ''میں تمہاری تلاشی لے چکا ہوں۔ تمہارا پستول میرے پاس ہے... اب تم مجھے شروع سے پوری بات بتاؤ۔''

☆☆☆

جونی نے شروع سے آخر تک پوری کہانی سنا دی۔ لیفٹیننٹ نے درمیان میں اسے بالکل نہیں ٹوکا۔ جب جونی خاموش ہو گیا تو لیفٹیننٹ فوسٹر نے کہا: ''باہر والے کمرے میں چار افراد ہیں۔ تمہارے اور اس مقتولہ لڑکی کے علاوہ یہ چاروں افراد اس فلور پر تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے تم پر بھی حملہ کیا تھا اور تمہاری منگیتر پر بھی... اس ایک شخص نے ہی اس لڑکی کو قتل کیا ہے اور وہ بیش قیمت نیکلس بھی اڑا لیا ہے۔''

''کیا واقعی قاتل چور باہر موجود ہے؟'' جونی نے فوسٹر سے سوال کیا۔

''ہاں۔'' لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔ ''کیونکہ ان کے سوا اور کوئی یہاں نہیں تھا۔ لفٹ میں کوئی نہیں آیا... سیڑھیوں والا حصہ لوہے کی گرل والا دروازہ لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ لفٹ آپریٹر کا کہنا ہے کہ نہ کوئی لفٹ کے ذریعے اوپر آیا ہے اور نہ نیچے گیا ہے۔ ہم نے پوری عمارت کی تلاشی لے لی ہے... یہاں صرف یہی چار افراد ہیں... انہی میں قاتل بھی ہے۔''

''یہ چار افراد کون ہیں؟'' جونی نے پوچھا۔

''مسٹر اور مسز سلیٹ، ڈاکٹر سیڈار اور پیٹ ہمینس! پیٹ ایک انشورنس ایجنٹ ہے۔''

''تو پھر... تم نے ان لوگوں سے کچھ معلوم کیا؟''

''ہم نے ان سب کی تلاشی لے لی ہے۔ ہم نے ڈاکٹر سیڈار اور پیٹ کے علاوہ سلیٹ کے دفتر کو چھان مارا ہے مگر نہ تو نیکلس ملا اور نہ اس کا کوئی سراغ!''

''ممکن ہے نیکلس اب تک باہر پہنچا دیا گیا ہو؟'' جونی نے خیال ظاہر کیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' لیفٹیننٹ فوسٹر نے جواب دیا۔ ''ہم نے تمام دروازے لاک کرا دیے ہیں۔ تمام راستے بند کر دیے ہیں... ہماری پہلی ترجیح اس لڑکی کے قاتل کی تلاش ہے۔ اس کے بعد ہم نیکلس کے چور کو ڈھونڈیں گے۔''

''ایلس کس طرح مری ہے؟'' جونی نے رندھی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''وہ سیسے کا ایک عام سا پائپ ہے جس پر سنہرا رنگ کیا گیا ہے۔ اس پائپ کو ایک موٹے سے کپڑے میں لپیٹا گیا تھا اسی سے تمہارے سر پر وار کیا گیا تھا اور اس لڑکی کو ڈاک کے لفافے کھولنے والی عام اور سادہ سی چھری سے ہلاک کیا گیا ہے۔ یہ چھری اس لڑکی کی میز کی ہی ہے۔''

''اب کیا ہوگا؟'' جونی نے پوچھا۔

''میں تمہارے سامنے ان چاروں کو بلا کر بات کروں گا۔ تم بھی سننا۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔''

لیفٹیننٹ فوسٹر نے کہا اور لزا اور اس کے شوہر سلیٹ کو اندر بلا لیا۔ لزا نے سوالیہ نظروں سے جونی کی طرف دیکھا تو جونی

اسے نظر انداز کر کے اس کے شوہر کو دیکھنے لگا۔ سلیٹ بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس کی آواز بھی خاصی بھاری تھی۔

اس نے آتے ہی لیفٹیننٹ فوسٹر سے احتجاج کیا۔ ''میں پولیس کے ساتھ تعاون کر رہا ہوں، پھر بھی میری مجرموں کی طرح تلاشی لی جا رہی ہے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن یہ سلوک میری بیوی کے ساتھ تو نہیں ہونا چاہیے۔''

فوسٹر نے اس کے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے ان لوگوں کا جونی سے تعارف کرایا تو سلیٹ نے ہمدردی سے کہا۔ ''تم... تم سے ہی تو ایلس کی شادی ہونے والی تھی نا...؟''

جونی نے اقرار میں سر ہلایا تو سلیٹ نے افسردگی سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے... وہ لڑکی اکثر تمہارا ذکر کرتی تھی... میں نے اس کے کہنے پر تمہاری فرم کو اس کے لیے نیکلس ڈیلیور کرنے کا آرڈر دیا تھا۔ کاش! میں ایسا نہ کرتا۔''

''تو گویا تم نے مرنے والی کی سفارش پر وہ نیکلس خریدا تھا؟'' لیفٹیننٹ نے سوال کیا۔

''ہاں... وہ چاہتی تھی کہ اس کے منگیتر کو کوئی بونس وغیرہ مل جائے۔'' سلیٹ نے کہا۔ ''حالانکہ یہ نوجوان اس فرم کا کوئی سیلز مین نہیں ہے۔ بہرحال، میں نے ایلس کی فرمائش پر ہی اس فرم سے رابطہ کیا تھا کہ وہ یہ نیکلس مجھے بھجوا دے۔''

''مسٹر سلیٹ!'' فوسٹر نے کہا۔ ''تم نے سب سے پہلے جونی اور ایلس کو دیکھا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاؤ۔''

سلیٹ نے ناگواری سے کہا۔ ''میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ میں نے استقبالیہ کمرے میں شور کی سی آواز سنی۔ میں نے گھنٹی بجائی تاکہ ایلس سے اس شور کی وجہ معلوم کر سکوں مگر جب ایلس نے جواب نہیں دیا تو میں باہر نکلا۔ مجھے یہ دونوں فرش پر پڑے نظر آئے۔ ایلس کے سینے میں خط کھولنے والی چھری دھنسی ہوئی تھی۔ اور یہ نوجوان بے ہوش تھا...''

یہ کہہ کر سلیٹ خاموش ہو گیا جیسے واقعات کو یاد کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ''اچانک پیٹ کمرے میں آ گیا۔ میں نے اسے ڈاکٹر کو بلانے کو کہا اور بعد میں ہم نے پولیس کو فون کر دیا۔''

چند لمحے لیفٹیننٹ فوسٹر چپ چاپ سلیٹ کو دیکھتا رہا۔ پھر سر ہلا کر لزا کی طرف متوجہ ہوا۔

''مسز سلیٹ! میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم اپنے شوہر کے آفس میں آنے سے پہلے ڈاکٹر سیڈار کے کمرے میں کیوں گئی

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

مئی 2010ء

سالگرہ نمبر 2 کی رعنائیاں

زندگی ایک ہیرے کے مانند ہے جسے انسان خود تراش کر خوبصورت بناتا ہے **انجم انصار** کے کچھ ایسے کرداروں کی تلاش و جستجو کی کتھا

عالیہ بخاری اور **قیصرہ حیات** کے سلسلے وار ناول

کوئی بات کہہ دینے کا لمحہ گزر جائے تو زمانوں کی تلافی بھی بے سود ثابت ہوتی ہے...... کچھ یہی رنگ لیے **شیریں حیدر** کی یادگار تحریر

رشتے ناتے بھی کچے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں۔ ٹوٹ جائیں تو انہیں جوڑ نہیں جا سکتا گرہ ضرور لگ سکتی ہے۔ رشتوں کی ڈور میں الجھا **یاسمین نشاط** کا ناولٹ

کچھ مکمل اور کچھ ادھوری خواہشیں یادوں کے رنگ لیے ہر لمحہ ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔ سالگرہ کے حوالے سے کچھ ایسی ہی خواہشوں اور یادوں کا تذکرہ لیے **شائستہ زریں** کا دلچسپ سروے

عدنان صدیقی سے **رضوانہ پرنس** کی دلچسپ باتیں

"دل والے دلہنیا لے گئے"

میں **شعیب ملک** اور **ثانیہ مرزا** کی شادی کا مکمل احوال **عظمیٰ آفاق** کے قلم سے

اس کے علاوہ

عطیہ عمر، اقبال بانو، سکینہ فرخ، سیما بنتِ عاصم، عروسہ عالم، خالدہ نسیم اور **عاطفہ فاروق** کی دلچسپ تحریریں

آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

تھیں؟'' لیفٹیننٹ نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ ''اور تم نے جونی سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کرے؟'' لزا نے خونی نظروں سے جونی کی طرف دیکھا مگر جونی نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

''لیفٹیننٹ! یا تو جونی خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے یا بہت بڑا جھوٹا ہے۔'' لزا نے مکاری سے کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم ڈاکٹر سیڈار سے پوچھ لیتے ہیں... مگر اس سے پہلے ہم پیٹ سے معلوم کریں گے۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے گیا تھا۔ اگر تم وہاں تھیں تو اس نے تمہیں ضرور دیکھا ہوگا۔'' فوسٹر نے کہا۔

''ضرور ضرور...'' لزا نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر میں واقعی ڈاکٹر کے پاس تھی تو پیٹ ضرور بتا دے گا۔'' لزا نے یہ کہہ کر اپنے شوہر سلیٹ کی طرف دیکھا جو کبھی لیفٹیننٹ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنی بیوی کو۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔ لزا نے کھا جانے والی نظروں سے جونی کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے فوسٹر کو پوری بات بتا دی ہے۔

''لیفٹیننٹ! تم مجھ سے تو سوال پہ سوال کیے جا رہے ہو مگر اس شخص سے کچھ نہیں پوچھ رہے جس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کا نشان ابھی تک نمایاں ہے۔'' لزا نے اچانک چیختے ہوئے کہا۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' فوسٹر نے غصے سے کہا۔ ''یہ پولیس کی تفتیش ہے کوئی مذاق نہیں ہے۔ تم خوامخواہ چیخ کر مجھے مرعوب کرنے کی کوشش مت کرو۔ سیدھی طرح بتا دو کہ تم ڈاکٹر کے آفس میں کیوں گئی تھیں؟''

''اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' لزا نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی اس کا شوہر گویا پھٹ پڑا۔ اس نے لزا کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''مگر مجھے اس سے غرض ہے... تم وہاں کیوں گئی تھیں؟''

''سلیٹ! تم بھی پاگل ہو گئے...؟'' لزا بولی۔

''میں تمہارا شوہر ہوں۔'' سلیٹ نے چیختے ہوئے کہا۔ ''تم سے یہ پوچھنے کا پورا حق رکھتا ہوں کہ تم ڈاکٹر کے کمرے میں کیوں گئی تھیں۔ میں بے وقوف ہوں جو میں نے اتنی بڑی رقم خرچ کر کے تمہارے لیے ہیروں کا نیکلس خریدا تھا؟ اس طرح میں نے اپنی دانست میں یہ کوشش کی تھی کہ تم ڈاکٹر کا خیال دل سے نکال کے میری وفادار بن جاؤ... اس غریب لڑکی نے مجھ سے سفارش کی تھی کہ اگر میں نے وہ نیکلس اس کے منگیتر جونی کے ذریعے خریدا تو اس کا بھلا ہو جائے گا مگر نیکلس میں نے تمہارے لیے خریدا تھا اور اس کے بدلے تمہاری وفا چاہتا تھا لیکن... مجھے خوشی ہے کہ وہ نیکلس چوری ہو گیا۔ اچھا ہوا جو تم جیسی بے وفا عورت کو نہیں ملا۔ ویسے بھی ابھی میں نے کون سا اس کی وصولیابی کی رسید پر دستخط کیے تھے۔ بہرحال، یہ ضرور ہوا کہ تمہارے چہرے سے نقاب اتر گیا اور تمہاری اصل صورت سامنے آگئی۔ مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا، اب ثبوت بھی مل گیا ہے۔''

''جہنم میں جاؤ تم بھی... اور وہ نیکلس بھی!'' لزا نے غصے سے کہا۔

''تم دونوں لڑائی جھگڑا بند کرو۔'' لیفٹیننٹ فوسٹر نے سخت لہجے میں حکم دیا۔ ''یہ تمہارا آپس کا مسئلہ ہے۔ اس پر اپنے گھر جا کر لڑنا۔ یہاں تفتیش ہو رہی ہے، اس میں مشکلات پیدا نہ کرو۔''

یہ کہہ کر فوسٹر نے ایک نظر جونی کی طرف دیکھا، لزا اور اس کے شوہر سلیٹ کو باہر جا کر انتظار کرنے کی ہدایت کی۔ ان کے جانے کے بعد لیفٹیننٹ نے پیٹ اور ڈاکٹر سیڈار کو اندر بلا لیا۔

☆☆☆

پیٹ دُبلا پتلا سا آدمی تھا جبکہ ڈاکٹر سیڈار کوئی جوکر لگ رہا تھا۔

''پیٹ! جب تم ڈاکٹر کو لینے اس کے کمرے میں گئے تو وہ اکیلا تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟'' فوسٹر نے پہلا سوال کیا۔

''میں صرف بیرونی کمرے تک گیا تھا۔ وہاں ڈاکٹر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔'' پیٹ نے جواب دیا۔ ''اندر والے کمرے میں کوئی تھا یا نہیں، یہ مجھے نہیں معلوم۔''

''تم کیا کہتے ہو ڈاکٹر سیڈار؟'' فوسٹر نے گھوم کر ڈاکٹر سے سوال کیا۔

''میں اکیلا تھا۔'' ڈاکٹر نے آہستگی سے کہا۔

''لزا... میرا مطلب ہے سلیٹ کی بیوی تمہارے ساتھ نہیں تھی؟'' فوسٹر نے سوال کیا تو ڈاکٹر نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''مگر وہ اعتراف کر چکی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ تھی!'' لیفٹیننٹ نے کہا تو ڈاکٹر نے پھر انکار کر دیا۔

''ڈاکٹر! پولیس کے کام میں الجھن پیدا مت کرو۔'' فوسٹر نے کہا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تمہارا یہ جھوٹ تمہیں کس مشکل میں ڈال دے گا۔ لزا اور اس کا شوہر دونوں تسلیم کر چکے ہیں کہ وہ تمہارے کمرے میں تھی مگر تم مسلسل انکار کر رہے ہو۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟''

''سلیٹ... شکی مزاج انسان ہے۔'' ڈاکٹر سیڈار نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ میرے سچ بولنے کی وجہ سے لزا کے لیے کوئی مشکل کھڑی ہو جائے۔ وہ پاگل انسان اس کی زندگی عذاب بنا دے گا۔''

''تم اور لزا شادی سے پہلے دوست تھے؟''

''ہاں۔'' سیڈار نے کہا۔

اچانک لیفٹیننٹ فوسٹر، پیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''تم نے سلیٹ کو اس لڑکی اور جونی کے قریب کھڑے دیکھا تھا۔ یہ دونوں فرش پر پڑے تھے۔ تم اپنے کمرے سے اس کمرے میں کیوں گئے تھے؟''

''میں نے شور کی آواز سنی تھی تو صورتِ حال معلوم کرنے باہر آ گیا تھا۔''

''تمہیں نیکلس کے بارے میں معلوم تھا؟'' لیفٹیننٹ فوسٹر نے پیٹ کو بہ غور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں، سلیٹ نے میرے ذریعے اس نیکلس کا انشورنس کرایا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ نیکلس آج سلیٹ کو ملے گا۔'' پیٹ نے کہا۔

''اس نیکلس کے چوری ہونے سے تمہیں نقصان ہو گا؟'' فوسٹر نے پوچھا۔

''مجھے تو نہیں... البتہ میری کمپنی کو ضرور ہو گا مگر اس کے لیے پولیس تفتیش کی رپورٹ درکار ہو گی۔'' پیٹ نے جواب دیا۔

''تم ریس کھیلتے ہو... گھوڑوں پر رقمیں لگاتے ہو؟'' فوسٹر نے پیٹ سے کہا۔ ''یہ خاصا مہنگا شوق ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ نیکلس میں نے چوری کیا ہے؟'' پیٹ نے کہا تو لیفٹیننٹ کوئی جواب دیے بغیر مسکرا کر ڈاکٹر کی طرف گھوم گیا اور اس سے کہا۔ ''تم اپنے آفس میں دیر تک کیوں تھے؟ کام زیادہ تھا یا تمہیں لزا کے آنے کا انتظار تھا؟''

''مجھے لزا کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا... وہ جس وقت میرے کمرے میں داخل ہوئی تو گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ کوئی شخص اس کا پیچھا کر رہا ہے۔'' ڈاکٹر سیڈار نے جواب دیا۔ ''اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ شخص اس کے شوہر کے آفس میں گیا ہے... اس کے بعد ہم باتیں کرنے لگے تو پیٹ آ گیا... میں نے لزا کو اندر والے کمرے میں بھیج دیا اور اپنا بیگ لے کر پیٹ کے ساتھ چل دیا۔ یہ میری غلطی تھی۔ مجھے لزا کو چھپانا نہیں چاہیے تھا۔ بہر حال، میں نے ایلس اور جونی کا معائنہ کیا۔ ایلس مر چکی تھی مگر یہ نوجوان زندہ تھا۔ اس کے سر پہ چوٹ آئی تھی۔ اگر چوٹ ذرا سی بھی مزید شدید ہوتی تو اس کا زندہ بچنا بھی مشکل ہو جاتا۔''

''ٹھیک ہے... تم دونوں جا سکتے ہو۔'' لیفٹیننٹ فوسٹر نے کہا تو وہ چلے گئے۔

''میں بھی جا رہا ہوں۔'' جونی نے اٹھتے ہوئے کہا تو لیفٹیننٹ فوسٹر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

جونی کے سر میں تکلیف تھی۔ ایلس کی لاش گویا اب بھی اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سارے واقعات ایک ایک کر کے کسی فلم کی طرح اس کے سامنے چلنے لگے۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں بھی گونج رہی تھیں جو اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں سنی تھیں۔ پھر ایک آواز اسے یاد آئی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے فوراً ہی لیفٹیننٹ فوسٹر سے رابطہ کیا۔ فوسٹر خاصا جھنجلایا ہوا تھا۔

''جونی! آرام سے سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔'' فوسٹر نے کہا مگر جونی نہیں مانا۔

''لیفٹیننٹ! صبح تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ سارا کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت پروفیشنل سینٹر جانا ہے۔'' جونی نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ہم ایلس کے قاتل کو بھی پکڑ لیں گے اور ہیروں کا نیکلس بھی برآمد کر لیں گے۔''

☆☆☆

چند منٹ بعد وہ دونوں سلیٹ کے آفس میں بیٹھے تھے۔ لیفٹیننٹ فوسٹر بہت غصے میں تھا۔ جونی نہ صرف اسے زبردستی پروفیشنل سینٹر لایا تھا بلکہ فوسٹر نے اس کے کہنے پر سینٹر کے گارڈ سے چابیوں کا پورا گچھا بھی لے لیا تھا۔ گارڈ کے پاس ہر دفتر کی فاضل چابی تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ دونوں نہایت آرام سے سلیٹ کے دفتر میں آ گئے تھے۔

''مجھے ایلس کے قاتل کا پتا چل گیا ہے۔'' جونی نے کہا۔

''کون ہے وہ؟'' فوسٹر نے پوچھا۔

''یہ بہت ہوشیاری سے تیار کیا گیا منصوبہ تھا۔'' جونی نے کہا۔ ''قاتل کا کسی کو قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو دھات کا پائپ کپڑے میں لپیٹ کر لایا تھا تا کہ اپنے شکار کو بے ہوش کر کے اس نیکلس کو اڑا لے۔ نہ جانے لفافے کھولنے والی چھری اس نے ایلس پر کیوں استعمال کر ڈالی۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ چھری کسی کو ہلاک کر سکتی ہے۔''

''یہ سب چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہو اور ایلس کا قاتل کون ہے؟'' فوسٹر نے کہا۔

''جس وقت ایلس میری بانہوں میں تھی۔'' جونی نے کہا۔ ''اسی وقت اس نے چونک کر میرے پیچھے دیکھا تھا۔ گویا اس نے حملہ آور کو دیکھ لیا تھا۔ حملہ آور مجھے بے ہوش کر کے نیکلس حاصل کرنا چاہتا تھا مگر..... ایلس نے اسے دیکھ لیا تھا اس لیے حملہ آور کو مجبوراً اسے قتل کرنا پڑا۔''

''آخر وہ ہے کون؟'' فوسٹر نے کہا۔

''اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا ہو گا۔'' جونی نے جواب دیا۔ ''صبح ہوتے ہی قاتل تمہاری گرفت میں ہو گا... اور وہی نیکلس کا چور بھی ہے۔''

☆☆☆

وہ رات تھی کہ گزر کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہ فوسٹر کی زندگی کی طویل ترین رات بن گئی تھی۔ خدا خدا کر کے صبح کے آثار نمودار ہوئے تو جونی نے اٹھ کر سلیٹ کے دفتر کے دروازے میں جھری پیدا کی اور اس میں سے باہر جھانکنے لگا۔ لیفٹیننٹ بھی ساتھ ہی تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ آنے شروع ہوئے۔ وہ اپنے اپنے آفس میں جا رہے تھے۔ پھر ڈاکٹر سیڈار نظر آیا۔ وہ اپنے آفس کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ پھر سلیٹ اور پیٹ نظر آئے۔ دونوں ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ دونوں نے راستے میں رک کر کوئی بات کی، پھر پیٹ اپنے آفس میں چلا گیا اور سلیٹ نے اپنے آفس کی طرف قدم بڑھا دیے۔ جیسے ہی سلیٹ نے اپنے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا، جونی نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اسے سامنے دیکھ کر سلیٹ حیران رہ گیا۔ کبھی وہ لیفٹیننٹ کو دیکھتا اور کبھی جونی کو۔

''مسٹر سلیٹ! اندر آ جاؤ... تھوڑی دیر میں تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔'' جونی نے کہا تو سلیٹ الجھن آمیز نظروں سے ان دونوں کو دیکھتا ہوا اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

جونی نے دروازے میں جھری پیدا کی اور ہال کی طرف دیکھنے لگا۔

''آؤ لیفٹیننٹ!'' اس نے یکایک پُرجوش لہجے میں کہا اور دروازہ کھول کر تیزی سے آگے بڑھا۔ لیفٹیننٹ فوسٹر اس کے ساتھ تھا۔ سامنے ہی مردانہ ٹوائلٹ تھا۔ جونی نے لیفٹیننٹ سے سینٹر کی چابیوں کا گچھا لیا اور اس میں سے ایک چابی منتخب کر کے ٹوائلٹ روم کے دروازے میں لگائی۔ دروازہ کھل گیا... تو... اندر کا منظر بھی صاف نظر آنے لگا۔ پیٹ فرش پر جھکا ہوا تھا اور بیسن کے نیچے کچھ ٹٹول رہا تھا۔

ان دونوں کو دیکھتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ جونی نے اسے ایک طرف دھکیلا اور بیسن کے نیچے ہاتھ ڈال دیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں وہ مخملی ڈبیا تھی جس میں ہیروں کا نیکلس تھا۔ یہ وہی ڈبیا تھی جو رات کو جونی مسٹر سلیٹ کے پاس لا رہا تھا۔

''دیکھ لیا لیفٹیننٹ؟'' جونی نے کہا تو لیفٹیننٹ نے گھور کر پیٹ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

''میں... محض... اندازے... سے... تلاش کر رہا تھا۔'' پیٹ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس سے پہلے کہ میں کامیاب ہوتا... تم... لوگ پہنچ گئے... میں...''

''پیٹ! جھوٹ مت بولو۔'' جونی نے کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں...''

''تم جھوٹے ہو... پہلے تم نے میری منگیتر ایلس کو قتل کیا۔ اس کے بعد یہ نیکلس اس بیسن کے نیچے چھپا دیا۔'' جونی غرایا۔

پیٹ ہکا بکا سا جونی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی زبان بند ہو چکی تھی۔

''جب میں نیکلس لے کر سلیٹ کے آفس کی طرف جا رہا تھا تو تم اپنے آفس میں اندھیرا کیے کھڑے تھے اور میری نگرانی کر رہے تھے۔ بعد میں جب ایلس میری بانہوں میں تھی تو تم اندر داخل ہوئے۔ ایلس نے تمہیں دیکھ لیا۔ اس لیے تم نے اسے ہلاک کر دیا اور اس سے پہلے مجھے بے ہوش کر کے نیکلس لے اڑے... یہ نیکلس تم نے مردانہ ٹوائلٹ میں چھپا دیا اور واپس آ کر ڈراما کرنے لگے مگر تمہاری زبان سے نکلے ہوئے جملے نے ہی تمہیں پھنسوا دیا۔ وہ جملہ میں نے سن لیا تھا۔ بعد میں، میں نے تمہاری آواز پہچان لی۔ تم نے کہا تھا۔ 'اس کے دماغ پر چوٹ آئی ہے۔' تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے دماغ پر چوٹ آئی ہے؟ ہم دونوں تو فرش پر پڑے تھے۔ ظاہر ہے وہ چوٹ تم نے ہی لگائی تھی اسی لیے تم اس کے بارے میں جانتے تھے۔'' یہ کہہ کر جونی خاموش ہو گیا۔ اور افسردہ نظروں سے پیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

''مسٹر پیٹ! تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔'' آخر لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''میں تمہیں ایلس کے قتل اور ہیروں کے نیکلس کی چوری کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔''

جونی نے دروازہ کھولا اور اپنے آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

*

پہلا رنگ

جوشِ وحشت

اسما راشاھد

بساطِ وقت پر کچھ لوگ اپنے آپ کو سب سے بڑا شاطر سمجھتے ہیں ...... لیکن وقت کی غلام گردشیں اپنا محور بدلتی ہیں تو بازی پلٹنے میں دیر نہیں لگتی ...... ہر چال مات میں بدل جاتی ہے ...... ایسے ہی چند کرداروں کے گرد گھومتی کہانی جس کا ہر کردار جذبات و جنوں کی الگ الگ حدوں میں مقید تھا۔

محبت کی دلفریب دنیا کے متضاد عکس جہاں محبت کی رنگینی رفتہ رفتہ سنگینی میں ڈھل رہی تھی

وہ دونوں گھٹنوں کے گرد ہاتھ لپیٹے، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی وہ بالکل خاموش بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا، کم وبیش اس کی یہی کیفیت تھی۔ اسے تقریباً دو ماہ پہلے یہاں لایا گیا تھا، تب سے اب تک وہ اسی طرح گم صم تھا۔

اس پر دو افراد کے قتل کا الزام تھا... اور دلچسپ بات یہ تھی کہ دوسرا قتل اس نے جیل میں ہی کیا تھا جہاں وہ پہلے قتل کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا۔ بتایا جاتا تھا کہ یہ قتل اس نے شدید جنون کے عالم میں کیا تھا۔

مزید دلچسپ اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ پہلا قتل کرنے سے قبل اسے معاشرے کا ایک معزز فرد تسلیم کیا جاتا تھا۔ لوگ اسے ایک تعلیم یافتہ اور ذی ہوش انسان کے طور پر جانتے تھے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس شخص کے اندر ایک سفاک اور جنونی قاتل چھپا ہوگا... وہ سب تو اس شخص کو ایک مسیحا کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔

☆☆☆

آئینے کے سامنے بال سنوارتے ہوئے اس نے ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لیا۔ قدِ آدم آئینے میں دکھائی دینے والا عکس اسے یہی باور کرا رہا تھا کہ ہمیشہ کی طرح وہ آج بھی بہت ہینڈسم اور خوب صورت دکھائی دے رہا ہے۔ زیرِ لب مسکراتا، وہ باہر نکل آیا۔

اپنی دلکشی پر اسے بڑا ناز تھا... اور اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ پر وہ بڑی توجہ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں بھی جاتا، لڑکیاں اس کے اردگرد پروانہ وار منڈلانے لگتی تھیں۔ اس کا دل اس معاملے میں تھا بھی بہت نرم... لہٰذا وہ کسی لڑکی کو مایوس نہیں کرسکتا تھا!

اس سلسلے کی ابتدا اس کے لڑکپن میں قدم رکھتے ہی ہو گئی تھی۔ یوں تو پڑوس کی تقریباً سب ہی نوجوان لڑکیاں دل ہی دل میں اس پر فدا تھیں لیکن ان میں سے چند ذرا شرمیلی واقع ہوئی تھیں اور چند ایسی تھیں جو اپنی معمولی شکل وصورت کی بنا پر اس کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار تھیں۔

لہٰذا وہ سب خود بہ خود مقابلے سے گویا خارج ہو گئی تھیں اور میدان دو خوب صورت اور طرح دار لڑکیوں کے ہاتھ رہا تھا۔ وہ بے چارہ ان دونوں ہی کا دل نہیں توڑ سکتا تھا... سو اس نے ان دونوں کا دل رکھ لیا اور وہ دونوں اپنی اپنی جگہ دل و جان سے اس کی دلداری میں محو ہو گئیں۔ خرابی اس وقت ہوئی

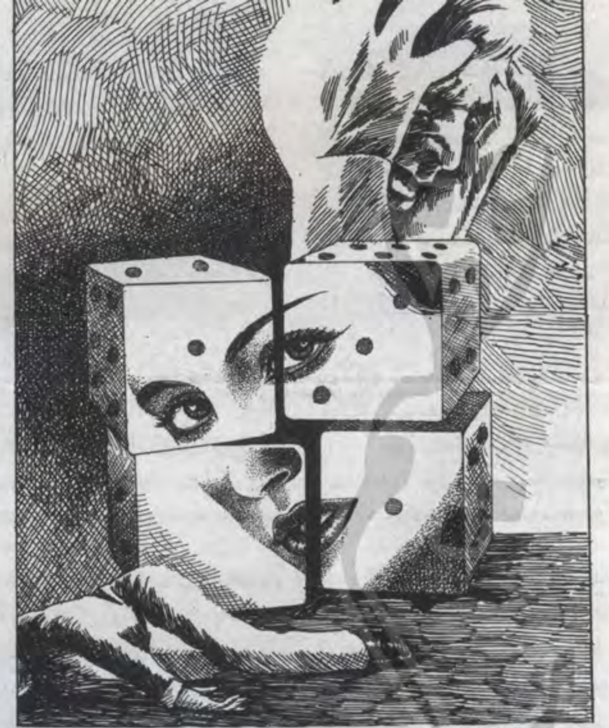

جب ان دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں پتا چلا۔

جواد نے ان دونوں کو خوب بے وقوف بنایا تھا۔ دونوں لڑکیوں کا تعلق اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا۔ وہ اس کی خالی جیب کو نوٹوں سے وقتاً فوقتاً بھرنے کے علاوہ قیمتی تحائف بھی اس کی نذر کرتی رہتی تھیں۔ پول کھلنے کے بعد جواد اپنا دامن بچا کر صاف نکل گیا۔ اس نے ڈھٹائی کے ساتھ کہہ دیا کہ تم لوگ خود میرے پیچھے پڑی تھیں... بہتری اسی میں ہے کہ اب خاموش رہو، ورنہ منہ کھلنے کی صورت میں بدنامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

لڑکیاں چونکہ جواد کی کم ظرف اور بھونرا صفت فطرت سے واقف ہو چکی تھیں لہٰذا انہوں نے خاموشی میں ہی اپنی عافیت جانی۔ یوں یہ معاملہ ٹل گیا۔

جواد کی ہمت بڑھ چکی تھی... اسے اپنی سابقہ گرل فرینڈز کی نوازشوں کا کچھ ایسا چسکا لگ چکا تھا کہ رفتہ رفتہ وہ اس میدان کا کھلاڑی بنتا چلا گیا۔ اس کا باپ ایک معمولی مل مزدور تھا، اس کی تنخواہ بھی اتنی معمولی تھی کہ ان کا گزارہ بمشکل کھینچ تان کر ہوتا تھا۔ جواد نے اپنا بچپن معمولی چیزوں کے لیے ترستے ہوئے گزارا تھا۔ لہٰذا اب اس کی نت نئی محبوبائیں اس کی خواہشات پوری کرنے کا ذریعہ بنتی تھیں۔

اس کا باپ خود اَن پڑھ تھا لیکن جواد کو وہ اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا تاکہ وہ معاشرے میں کوئی معزز مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے۔ اس کی تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ اوور ٹائم بھی کیا کرتا تھا۔

اس معاملے میں جواد بھی حیرت انگیز طور پر اپنے والد کی توقعات پر پورا اترا تھا۔ اس کی ماں کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے۔ جہالت اور غربت کے ماحول میں پرورش پانے کے باوجود وہ ایک سمجھ دار اور سلیقہ شعار عورت تھی۔ وہ خوبصورت بھی بہت تھی، جواد اپنی ماں پر ہی گیا تھا۔

وہ بلا کا ذہین بھی تھا... اپنے تمام تر منفی رجحانات اور سرگرمیوں کے باوجود وہ پڑھائی میں اول نمبر پر رہتا تھا۔ اس کا شمار ایسے طالبِ علموں میں ہوتا تھا جو کتابی کیڑا نہیں ہوتے بلکہ اپنی خداداد ذہانت کے بل پر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

پری میڈیکل کے امتحان میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی تھی لہٰذا میڈیکل کالج میں داخلہ ملنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اگر مسئلہ تھا تو اخراجات کا... اس نے ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیں لیکن باپ کا اوور ٹائم اور اس کی ٹیوشنز کا

معاوضہ ملا کر بھی اخراجات کے لیے ناکافی تھا۔
اس مرحلے پر بھی جواد کی گرل فرینڈز ہی اس کے کام آئیں۔ ان کا تعلق ظاہر ہے کہ دولت مند گھرانوں سے تھا۔ یوں جواد اس مرحلے میں بھی سرخرو ٹھہرا۔
ہاؤس جاب کے دوران، جواد کی ظاہری خوبیوں سے متاثر ہو کر ایک سینئر لیڈی ڈاکٹر اس کے بے حد قریب آگئی تھی۔ اس نے حسبِ سابق کھلے دل کے ساتھ سمیرا کو خوش آمدید کہا۔ سمیرا سچے دل سے اسے چاہنے لگی تھی لیکن جواد پر اس کی چاہت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ دوسری لڑکیوں کی طرح اس نے سمیرا کو بھی محض جسمانی اور مالی آسودگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہی سمجھا۔
اسپتال کی کئی نرسیں بھی دل ہی دل میں اس پر بری طرح فدا تھیں۔ جواد ان سب کی کیفیت سے اچھی طرح واقف تھا... اپنی قوتِ تسخیر پر بھی اسے بڑا ناز تھا کہ وہ جسے اشارہ کرے گا، وہی اس کی جانب دوڑی چلی آئے گی۔
خود اس کا دل سحر نامی ایک نرس کی جانب مائل تھا... وہ دنیاوی لحاظ سے تو دولت مند نہیں تھی لیکن حسن کی دولت سے بلاشبہ مالا مال تھی۔ چونکہ جواد، اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوگیا تھا لہٰذا اس نے اپنا اصول توڑتے ہوئے خود اس کی جانب پیش قدمی کی۔ اس کا اصول یہ تھا کہ اس کی دوستی کا شرف پانے والی لڑکی خواہ بہت زیادہ خوبصورت اور کم عمر ہو یا نہ ہو لیکن دولت مند ضرور ہو... یہی وجہ تھی کہ اس نے ڈاکٹر سمیرا کو اپنے جال میں پھانسا تھا جبکہ وہ عام سی شکل وصورت کی مالک تھی اور عمر میں بھی اس سے چند سال زیادہ ہی تھی۔
وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک ہی اسپتال کی ڈاکٹر اور ایک نرس کے ساتھ بیک وقت محبت کا کھیل کھیل رہا تھا۔ سحر کو وہ جب چاہتا، موقع محل دیکھ کر اپنے گھر بلا لیتا تھا۔ اپنی ماں کو وہ ایسے موقعوں پر کسی نہ کسی بہانے گھر سے باہر روانہ کر دیا کرتا تھا۔
سحر اس کے بلاوے پر گویا کچے دھاگے سے بندھی چلی آتی تھی۔ وہ گلے گلے جواد کی محبت میں ڈوب چکی تھی۔ اس کے لیے جواد کے کسی مطالبے سے انکار کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ لہٰذا وہ شادی کے وعدے پر مسلسل اسے فریب دے رہا تھا۔
''کبھی کبھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے جواد!'' سحر نے تنہائی کی ایک ملاقات کے دوران اس سے کہا۔ ''آخر ہم کب تک اس طرح ملتے رہیں گے... اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو؟''
''تم خوامخواہ وسوسوں کا شکار ہونے لگتی ہو۔'' جواد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوں نا تمہارے ساتھ... پھر تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟''
''میں چاہتی ہوں کہ آپ جلد سے جلد مجھ سے شادی کرلیں۔'' سحر نے کہا۔
''تمہیں کتنی بار یقین دلایا ہے کہ ہاؤس جاب مکمل کرتے ہی میں تم سے شادی کرلوں گا۔'' جواد نے ہلکی سی ناگواری کے ساتھ کہا۔ ''کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟''
''یہ بات نہیں ہے جواد!'' سحر نے جلدی سے کہا۔ ''آپ پر تو مجھے خود اپنے آپ سے زیادہ اعتبار ہے لیکن مجھے وقت اور حالات پر اعتبار نہیں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کچھ ہوجائے گا۔ کوئی نہ کوئی ایسی انہونی ہوجائے گی کہ میں آپ سے جدا ہوجاؤں گی۔''
''کچھ نہیں ہوتا... بس تم وہم میں نہ پڑو!'' جواد نے اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور سحر ہمیشہ کی طرح اس کی قربت کے سحر میں کھوگئی۔

☆☆☆

آٹھ سالہ علینا، بالکل گم صم سی بہت سی خواتین کے درمیان گھری بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا تھا، اس کا ننھا سا ذہن اسے تسلیم نہیں کر پا رہا تھا۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ اس کی ماما کا انتقال ہوگیا ہے اور وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہے۔
وہ سوچ رہی تھی کہ اس کی ماما تو اس سے بہت پیار کرتی تھیں، پھر بھلا وہ اسے چھوڑ کر کیسے جاسکتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میں اپنی لاڈلی کے بنا ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔
علینا اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد اس کی ماں ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہوگئی تھی اور پھر یہ مرض آہستہ آہستہ اس کو اپنے شکنجے میں جکڑتا گیا۔ یہ سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک چلتا رہا اور بالآخر ایک روز وہ کام کرتے کرتے بے ہوش ہو کر ایسی گری کہ پھر ہوش میں نہ آسکی۔
ایک ہفتے تک کوما میں رہنے کے بعد وہ اسی کیفیت میں چل بسی۔ علینا کے والد بیوی کی بیماری اور پھر موت کے بعد سخت شاک کی کیفیت میں تھے، لہٰذا وہ بھی بیٹی پر توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔
علینا کی والدہ کی موت اور پھر تدفین کو دوسرا روز ہوچکا تھا۔ ان کے ہاں کچھ رشتے دار ابھی تک ٹھہرے ہوئے تھے چونکہ گھر سنبھالنے کے لیے وہاں کوئی عورت موجود نہیں تھی، لہٰذا وہ لوگ چند روز کے لیے رک گئے تھے۔
علینا کے والد چپ چاپ، سر تھامے ایک جانب بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی ایک رشتے دار خاتون، علینا کو ساتھ لیے ان کے پاس آئیں۔
''بیٹا... اب تم کب تک یونہی پتھر کا بت بنے بیٹھے رہو گے؟'' انہوں نے علینا کے والد کو مخاطب کیا۔ ''دیکھو، تمہاری پھول سی بچی بے چاری کیسی کملا گئی ہے۔ اسے تمہاری ضرورت ہے۔''
علینا کے والد نے اس کی جانب دیکھا اور ایک آہ بھرتے ہوئے بولے۔ ''میری تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں، کیا نہ کروں؟''
''تم اپنی بچی پر توجہ دو۔'' خاتون نے کہا۔ ''اس طرح تمہارا دکھ بھی کچھ کم ہوگا اور اس بچی کی حالت بھی سنبھلے گی۔ بالکل گم صم ہو کر رہ گئی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ نہ تمہارے والدین حیات ہیں اور نہ تمہاری بیوی کے... ورنہ وہ تم دونوں کو سنبھال لیتے یا کم از کم تمہاری ایک بہن ہی ہوتی... لے دے کے ایک بھائی اور بھاوج ہیں تو وہ کسی کام کے نہیں... تدفین ہوتے ہی اپنے گھر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ بھائی اور اس کی بچی کا کیا ہوگا۔''
''ان کا اپنا گھر بار اور بچے ہیں خالہ!'' علینا کے والد نے آہستگی سے کہا۔ ''اور کوئی کب تک کسی کا ساتھ دے سکتا ہے؟''
''ٹھیک کہا تم نے میاں!'' خاتون نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آج کل کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ اب تو تم دونوں باپ، بیٹی ہی ایک دوسرے کا سہارا ہو اور گو کہ یہ موقع تو نہیں ایسی بات کہنے کا لیکن... میرا مشورہ ہے کہ تم جلد دوسری شادی کر لینا۔''
خاتون کا مشورہ اپنی جگہ درست تھا... ان حالات میں اس مسئلے کا کوئی اور حل نہیں تھا لیکن ان خاتون کے مشورے کے پس منظر میں دراصل اپنی غرض چھپی تھی۔
ان کی ایک بیٹی ڈاکٹر تھی... لیکن اب تک اس کی شادی نہیں ہو پائی تھی۔ اس وقت اچانک ہی ان کے دل میں یہ خیال وارد ہوا تھا کہ اگر ان کی بیٹی، سمیرا کی شادی کامران... یعنی علینا کے والد سے ہوجائے تو بہت اچھا رہے گا۔ کامران ہر لحاظ سے ایک اچھا انسان تھا اور پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھا۔

☆☆☆

سمیرا اچھی لڑکی تھی۔ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ اور طبیعت میں خلوص تھا۔ اس کی منگنی اس کے والد کے دوست کے بیٹے سے اسی وقت ہوگئی تھی جب وہ میڈیکل کے پہلے سال میں تھی۔ اس کا منگیتر ذیشان بھی ڈاکٹر تھا۔ اس کے والدین کی خواہش تھی کہ ان کی بہو بھی ایک ڈاکٹر ہو... لہٰذا ان کی نظرِ انتخاب سمیرا پر پڑی۔
اس رشتے میں دونوں جانب سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی... سو یہ رشتہ جلد ہی طے پا گیا۔ ذیشان چند ماہ بعد ایف آر سی ایس کرنے کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔
گو کہ یہ ایک طے شدہ منگنی تھی اور اس میں عشق ومحبت کا کوئی چکر نہیں تھا لیکن سمیرا بالکل کسی عام مشرقی لڑکی کی طرح ذیشان کے تصور سے دلی طور پر وابستہ ہوگئی تھی۔
شروع شروع میں تو کبھی کبھار، انگلینڈ سے ذیشان کا فون آجایا کرتا تھا۔ بالآخر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ ذیشان کے گھر والوں کا رویہ بھی کچھ کھنچا کھنچا سا ہوگیا۔ ان میں وہ پہلی سی گرم جوشی باقی نہیں رہی تھی۔ سمیرا اور اس کے والدین اس صورتِ حال پر سخت پریشان تھے۔ پھر ایک دن وہی ہوا جس کا انہیں ڈر تھا... ذیشان کے والد نے بالآخر ایک روز یہ اقرار کرلیا کہ اس نے انگلینڈ میں شادی کرلی ہے۔
سمیرا اور اس کے والدین کے لیے یہ واقعہ کسی سانحے سے کم نہیں تھا... خاص طور پر سمیرا بہت زیادہ دل برداشتہ ہوئی تھی۔ اس وقت وہ میڈیکل کے آخری سال میں تھی۔ اس نے اپنی ساری توجہ تعلیم کی جانب مرکوز کرلی اور دل ہی دل

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی بنا پر پوشیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہوگئے تھے کے لیے اپنے تجربہ و تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک نسخہ آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ نسخہ ہر دو واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پہ سرخی ہاتھ پیروں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپ کو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائیں گی جن کے لیے آپ ایک مدت سے محروم ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپ کو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

میں شادی نہ کرنے کا عہد کرلیا۔

اس کے بعد اس کے کئی رشتے آئے لیکن سمیرا نے شادی سے انکار کردیا۔ اس کے والدین کو اس کی بہت فکر تھی کیونکہ اس کی عمر نکلی جارہی تھی۔

پھر اچانک وہ خوش دکھائی دینے لگی... ایسا لگتا تھا کہ اس کی زندگی پر چھایا ہوا جمود ٹوٹ گیا۔ اس کی زندگی میں یہ تبدیلی لانے والا کوئی اور نہیں، ڈاکٹر جواد تھا۔ اس نے سمیرا جیسی سنجیدہ اور محتاط لڑکی کو شیشے میں اتار لیا تھا... اور وہ جو دل ہی دل میں شادی نہ کرنے کا عہد لیے بیٹھی تھی، آہستہ آہستہ جواد کی جانب مائل ہونے لگی۔

بالآخر ایک وقت وہ آیا جب اسے جواد کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال محسوس ہونے لگا۔ اس کی خوشی سمیرا کو اپنی خوشی اور اس کا دکھ، اپنا دکھ محسوس ہونے لگا۔ وہ بنا کہے اس کی پریشانیوں کو بھانپ جاتی اور بالآخران کا کھوج لگا کر ہر طرح سے اس کی مدد کرتی۔ روپے پیسے کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی لہٰذا وہ دل کھول کر جواد پر خرچ کرتی اور اس کی ضرورتوں کو جان کر، اکثر و بیشتر کچھ نہ کچھ رقم اس کی جیب میں ڈال دیتی۔

وہ جانتی تھی کہ جواد کچھ عرصے بعد مکمل طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے گا۔ اس کے بعد اسے یقین تھا کہ وہ دونوں شادی کرلیں گے۔

اس نے جواد کو اپنے والدین سے بھی ملوایا تھا، انہیں تو ہر حال میں بیٹی کی خوشی عزیز تھی لیکن اس کی ماں کو وہ لڑکا کچھ ٹھیک نہیں لگا۔ ان کی جہاں دیدہ نظروں کو اس کی محبت اور اس کا خلوص، کچھ بناوٹی سا محسوس ہوا۔

یہی وجہ تھی کہ انہیں کامران کا رشتہ، سمیرا کے لیے بے حد مناسب محسوس ہوا تھا جو بیوی کی موت کے بعد بالکل تنہا رہ گیا تھا اور انہیں اور ان کی بیٹی کو کسی سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ سمیرا کی ماں نے سوچ لیا تھا کہ وہ بیٹی کو اس سلسلے میں قائل کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

☆☆☆

وہ اتوار کا روز تھا۔ کئی روز کی گرمی کے بعد اس روز اتفاق سے موسم بھی بہت اچھا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔ سمیرا کچھ ضروری شاپنگ کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ واپسی پر اچانک اس کا دل چاہا کہ جواد سے ملے اور اس نے بلا ارادہ اپنی گاڑی کا رخ جواد کے گھر کی جانب موڑ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت وہ گھر پر ہی موجود ہوگا اور آرام کررہا ہوگا۔

سمیرا سوچ رہی تھی کہ اسے اٹھا کر اپنے ساتھ آؤٹنگ کے لیے لے جائے گی۔ فون کرنے کے بجائے وہ اچانک پہنچ کر اسے حیران کرنا چاہتی تھی۔

سمیرا نے اپنی گاڑی گلی کے موڑ پر پارک کی اور جواد کے مکان کی جانب چل دی۔ گلی میں کچھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ سمیرا نے اس ڈر سے کہ کہیں وہ ان کی بال کی زد میں نہ آجائے... کال بیل کا بٹن زور سے دبایا۔

چند لمحوں کے بعد اسے اندر سے جواد کی آواز سنائی دی، وہ اونچی آواز میں بڑبڑاتا ہوا دروازے کی جانب آرہا تھا۔ سمیرا کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آرہا ہوں... آخر ایسی کیا مصیبت آگئی جو اتنی بے صبری کے ساتھ بیل...'' جواد نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا اور سمیرا کو دیکھتے ہی باقی فقرہ اس کے منہ ہی میں رہ گیا۔

سمیرا کو دیکھ کر ایک دم اس کے اوسان خطا ہوگئے تھے... اس نے تو یہ سمجھ کر دروازہ کھولا تھا کہ اس کی ماں آئی ہوگی۔ سمیرا، جواد کی اس کیفیت کو اس کی حیرانی پر محمول کرتے ہوئے مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔

''اب مجھے اندر بھی آنے دوگے یا اسی طرح آنکھیں پھاڑے کھڑے رہوگے؟'' سمیرا نے اندر کی جانب رخ کرتے ہوئے کہا۔

جواد گویا ایک دم ہوش میں آکر اس کے پیچھے لپکا مگر وہ تب تک اس کمرے کے اندر داخل ہوچکی تھی جہاں سحر پہلے سے موجود تھی۔

☆☆☆

ماں کے بغیر علینا کو اپنا گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ گوکہ پاپا نے اس کے لیے ایک ملازمہ کا بندوبست کردیا تھا جو چوبیس گھنٹے ان کے گھر پر ہی رہتی تھی لیکن اس کا دل کسی طور نہیں بہلتا تھا۔

جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ سمیرا آنٹی اس کی مما بن کر اس کے گھر آنے والی ہیں، وہ بہت خوش تھی۔ سمیرا آنٹی اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس کی مما اپنے آخری دنوں میں اسی اسپتال میں داخل تھیں جہاں سمیرا آنٹی جاب کرتی تھیں۔ وہاں انہوں نے اس کی مما کا بہت خیال رکھا تھا۔ سفید کوٹ میں ملبوس سمیرا کو دیکھ کر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی بڑی ہوکر انہی کی طرح ڈاکٹر بنے۔

کامران کو بھی سمیرا اچھی لگتی تھی۔ اسے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اس بات کا خیال اس کے دل میں ضرور تھا کہ ایک معروف ڈاکٹر ہوتے ہوئے سمیرا گھر اور بچی کو پورا وقت نہیں دے پائے گی... مگر سمیرا کی ماں نے کچھ اس انداز سے بات کی تھی کہ وہ مطمئن ہوگیا تھا اور اس نے اپنی رضامندی دے دی تھی۔

سمیرا کی ماں نے کامران کو تو قائل کرلیا تھا لیکن اپنی بیٹی کو سمجھانے میں کامیاب نہیں ہو پائی تھیں۔ سمیرا بھی اپنی جگہ غلط نہیں تھی، آخر اس کے ساتھ دو مرتبہ دھوکا ہوا تھا... وہ دونوں مرتبہ پوری طرح پُرخلوص تھی مگر اس کے خلوص کا اس بُری طرح مذاق اڑایا گیا تھا کہ وہ مرد ذات سے متنفر ہوگئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر شادی نہ کرنے کا عہد کرلیا تھا اور اپنے خول میں بند ہوگئی تھی۔ بالآخر کامران نے مایوس ہوکر کہیں اور شادی کرلی۔

جواد نے اس کے ساتھ جو کیا تھا، وہ کبھی اسے بھلا نہیں سکتی تھی۔ اسے پہنچنے والا صدمہ ناقابلِ تلافی تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جواد کے دلکش اور وجیہہ چہرے کے پیچھے اتنا گھناؤنا کردار چھپا ہوگا۔

سمیرا کے ساتھ جو بیتی سو بیتی... مگر اسے سحر کے لیے بھی بہت دکھ تھا۔ وہ نادان اور کم عمر لڑکی، جواد کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ جواد کی اصلیت معلوم ہونے پر اس نے خواب آور گولیاں کھا کر اپنی جان دے دی تھی۔

مگر جواد نہ جانے کس مٹی کا بنا تھا... ایک معصوم لڑکی کی جان جانے کا اسے ذرا بھی قلق نہیں تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس قدر سنگین جرائم پر بھی جواد کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی تھی۔ سمیرا نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اور دوسرے اسپتال میں اپنا ٹرانسفر کروالیا۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا... لیکن اس گزرتے وقت نے جواد کے اندر کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں کی، ماسوائے اس کے کہ اب اس کی عمر کچھ بڑھ گئی تھی اور وہ مزید پختہ کار ہوگیا تھا۔

اس کی دلکشی اور وجاہت اب بھی اسی طرح قائم تھی بلکہ اب اس میں بظاہر کچھ وقار سا بھی آگیا تھا۔ لڑکیاں اب پہلے سے بھی جلد اس پر اعتبار کرلیتی تھیں۔ مگر اسے اب تک کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی تھی جو اسے اس قدر پسند آجاتی کہ وہ اس سے شادی کرلیتا۔ نہ جانے اس نے کتنی لڑکیوں کی زندگی تباہ کی تھی۔

اس کی ماں بھی اس کی بے اعتدالیوں اور بے راہ روی سے تنگ آچکی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اب وہ شادی کرلے۔ اپنی غیر ذمے دارانہ حرکتوں کے سبب جلد یا بدیر اسے ہر وہ اسپتال چھوڑنا پڑتا تھا جہاں وہ جاتا تھا۔

اب تک وہ کتنے ہی اسپتال تبدیل کرچکا تھا لیکن جب بھی وہ کسی نئے اسپتال میں جاتا تو انتہائی پُرجوش ہوا کرتا۔ اسے اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے نئے مواقع جو ملتے تھے۔

بالآخر ایک روز نیا اسپتال جوائن کرنے پر اسے وہ لڑکی نظر آگئی جسے دیکھ کر اسے لگا کہ جیسے اس کی تلاش ختم ہوگئی ہے۔

آج اسے وہی دن اور وہی منظر یاد آرہا تھا جب اس نے پہلی بار علینا کو دیکھا تھا۔ گلاب کی کلی کی طرح اَن چھوئی اور نکھری نکھری سی... اس کی عمر جواد کے مقابلے میں بہت کم تھی لیکن وہ اب بھی اپنے رکھ رکھاؤ کے باعث نوجوان ہی دکھائی دیتا تھا۔

سوا سیر

جب میں نے اسے ڈرائیور رکھا تو اس کی عادات کے مطالعے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بہت تندخو اور جھگڑالو قسم کا انسان ہے۔ کوئی گاڑی اگر اس کے قریب سے تیزی سے گزرتی تھی تو یہ اس کا پیچھا کرتا تھا اور پھر اس کے برابر پہنچ کر کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر اس کے ڈرائیور کو برا بھلا کہتا تھا یا اگر کوئی راہ گیر چلتے چلتے کھڑی گاڑی کو ہاتھ لگا دیتا تو یہ اس کے گلے پڑ جاتا تھا۔ ایسے مواقع پر وہ میری موجودگی کا بھی خیال نہیں کرتا تھا اور یہ نہیں سوچتا تھا کہ اگر بات بڑھی تو اس کی زد میں اس کے علاوہ میں بھی آؤں گا مگر ایک روز یوں ہوا کہ ایک تیز رفتار گاڑی ہماری گاڑی کو کٹ مار کر تیزی سے آگے نکل گئی جس سے ایک بڑا حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس دفعہ میں نے اس سے کہا کہ گاڑی کا پیچھا کرو چنانچہ اس نے گاڑی کا پیچھا کیا مگر اس کی گاڑی کے ڈرائیور نے یہ دیکھ کر کہ اس کا پیچھا کیا جارہا ہے، خود ہی گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کردی صرف یہی نہیں بلکہ اس کا ڈرائیور بھی جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں، دروازہ کھول کر گاڑی کے باہر آگیا۔ میرا ڈرائیور اس کے پاس گیا، اس سے بہت عقیدت کے ساتھ مصافحہ کیا، پھر ہنس ہنس کر اس سے کچھ باتیں کیں اور پھر اس سے معانقہ کرکے واپس اسٹیئرنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا تم تو بہت غصیلے آدمی ہو، مگر آج تم ایک ایسے شخص کے ساتھ بہت لجاجت سے باتیں کررہے تھے جو ہماری جان لینے پر تلا ہوا تھا۔ کہنے لگا جناب، وہ بہت غلط قسم کا آدمی تھا، مجھے تو اس کی مونچھوں ہی سے اندازہ ہوگیا تھا مگر جب میں نے نیفے کے قریب سے اس کی قمیص ابھری ہوئی دیکھی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ ہے۔ جناب! مجھے اپنی جان کی پروا نہیں، میرے نزدیک سب سے پہلے آپ کی جان ہے چنانچہ جھگڑا کیے بغیر واپس آگیا۔

ولید بلال کی جستجو، عطاالحق قاسمی کی کتاب ''ہنسنا رونا منع ہے'' سے اقتباس

اس اسپتال میں بھی آتے ہی وہ یہاں کی تمام خواتین میں مقبول ہوگیا... بالکل اسی طرح کہ... وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کرلیا!

☆☆☆

آذر نے ایک گہری سانس لی اور چلتے چلتے ذرا ٹھہر کر اردگرد کے مناظر پر ایک نگاہ ڈالی۔ تاحد نظر برف کی سفید چادر پھیلی ہوئی تھی... خوش گوار سی ٹھنڈک کے ساتھ طمانیت کی ایک لہر اس نے اپنے رگ وپے میں اترتی محسوس کی۔ یکایک کچھ سریلی چیخوں نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ کچھ فاصلے پر چند لڑکیاں اور لڑکے ایک دوسرے پر برف کے گولے بنا بنا کر پھینک رہے تھے۔ ایک دوسرے کو نشانہ بنانے کی کوشش میں وہ پھسل پھسل کر گررہے تھے اور قہقہے لگارہے تھے۔

شرارتی نوجوانوں کے اس ٹولے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بے اختیار مسکرادیا... اسی لمحے ایک خوب صورت سی لڑکی نے مڑکر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آذر سے نسبتاً کم فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ سرخ کوٹ اور اونی ٹوپی میں ملبوس اس لڑکی کا دلکش چہرہ، بھاگ دوڑ کے باعث کچھ تمتمایا ہوا سا تھا۔ آذر کو مسکراتا پاکر وہ بھی مسکرائی اور اپنا ہاتھ ہلایا۔

آذر ایک لمحے کو ذرا گڑبڑایا مگر پھر اس نے بھی جھینپے ہوئے سے انداز میں اپنا ہاتھ لہرایا اور سر جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس لڑکی سے پہلے بھی کئی بار اس کا سامنا ہوچکا تھا۔ وہ بھی یقیناً اسی کی طرح برف باری کے مناظر سے لطف اندوز ہونے اور سیروتفریح کے لیے مری آئی ہوئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ اپنی فیملی اور دوستوں کے ساتھ وہاں آئی تھی جبکہ آذر بالکل تنہا تھا۔

اس وقت وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہورہا تھا کہ بھلا اسے ان لوگوں کی جانب اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکنے اور ہونقوں کی طرح مسکرانے کی کیا ضرورت تھی...! وہ لڑکی اس کے بارے میں نہ جانے کیا سوچتی ہوگی... کہ شاید وہ اکثر وبیشتر ان کی تاک میں ہی رہتا ہے۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ مری جیسی مختصر جگہ پر اس طرح کے اتفاقات، عام سی بات تھی اور آذر کی سوچ کے برعکس وہ پیاری سی لڑکی خود اس کی توجہ کی منتظر رہا کرتی تھی۔ آذر جیسا خوبرو، ہینڈسم اور مہذب دکھائی دینے والا نوجوان ہر لڑکی کے خوابوں کا شہزادہ ہوتا ہے مگر آذر جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اسے صنفِ نازک کے نازک احساسات کا ذرا سا بھی ادراک نہیں تھا۔

اس کے لیے تو بس اس کا فن... اس کا کام ہی سب کچھ تھا۔ اس وقت بھی اُمید بھری دو سیاہ آنکھیں اس کی جانب نگراں تھیں مگر وہ ان سب باتوں سے بے خبر کہیں دور پہنچ چکا تھا... اس کی فنکارانہ نظریں، شیشے جیسی چمکتی برف پر نہ جانے کون کون سے انوکھے اور دل فریب عکس تلاش کرچکی تھیں۔

گوکہ اسے چھٹیاں منانے کے لیے مری بھیجا گیا تھا مگر اس کا ذہن ہمہ وقت کسی نہ کسی حسین منظر کو یادداشت میں قید کرنے... یا کوئی نہ کوئی حسین پیکر تراشنے میں مصروف رہتا تھا۔

وہ ایک مجسمہ ساز اور مصور تھا۔ دس سال کی مسلسل محنت اور شبانہ روز کوششوں کے بعد آج اٹھائیس سال کی عمر میں وہ اس مقام پر تھا کہ فن کی دنیا میں اس کی ایک پہچان بن چکی تھی... اور وہ ایک کامیاب مجسمہ ساز اور مصور کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔

وہ آگے بڑھتے بڑھتے ایک بار پھر ٹھہر گیا، اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی اِسٹک اس نے برف پر ٹکائی اور برف پوش وادی کے حسین نظاروں میں کھوگیا۔ اس کی ذہنی رُو بھٹک کر اس طرف جانکلی جب تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ایک ممتاز صنعت کار نے اپنے سیکریٹری کے ذریعے ایک پورٹریٹ بنوانے کے لیے اس سے رابطہ کیا تھا۔

آذر کے ذہن میں دولت مند... لوگوں کے بارے میں کچھ اچھا تاثر نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے افراد محض نمودونمائش کی خاطر آرٹسٹوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں، جبکہ آرٹ کی الف، ب سے بھی انہیں واقفیت نہیں ہوتی۔ وہ کسی ایسے شخص کے لیے کام کرنا نہیں چاہتا تھا جو آرٹ کی قدر و قیمت سے واقف نہ ہو اور اس کے ساتھ بھی اسی طرح رعونت سے پیش آئے جس طرح اپنے کسی عام ورکر سے پیش آتا ہو۔

بیشتر فنکاروں کی طرح وہ بھی اپنی دیوپیکر ''انا'' کے آگے بے بس تھا، لہٰذا اس نے صنعت کار کے سیکریٹری کو ٹالنے کی کوشش کی، اس پر وہ شخص بہ نفسِ نفیس اس کے گھر آپہنچا... اس کا نام سلطان خان تھا۔

آذر یوں اسے اپنے سامنے پاکر بوکھلا سا گیا... مگر سلطان خان نے مختصر سی ملاقات میں آذر کے تمام خدشات دور کردیے اور اس پر یہ ثابت کردیا کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ وہ نہ صرف آرٹ کا قدرداں تھا بلکہ اس معاملے میں اس کی معلومات کا دائرہ بھی خاصا وسیع تھا۔

وہ آذر سے اپنی بیوی کا پورٹریٹ بنوانا چاہتا تھا اور آذر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرکے ہی اس تک پہنچا تھا۔ چنانچہ آذر کے پاس انکار یا ٹال مٹول کی کوئی وجہ باقی

نہیں رہی اور اس نے مطلوبہ پورٹریٹ پر کام شروع کردیا۔

اس کے بعد آنے والے وقت نے یہ ثابت کیا کہ سلطان خان کی آمد اس کی خوش قسمتی ہے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اپنے بنوائے ہوئے پورٹریٹ کے عوض آذر کو بھاری معاوضہ ادا کیا بلکہ اس سے مزید کئی پینٹنگز اور مجسمے بھی بنوائے۔ اس سے جہاں آذر کے مالی حالات میں خاصی بہتری آئی، وہاں آرٹ کے ناقدین بھی اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔

کئی اخبارات اور رسالوں میں انٹرویو شائع ہوئے اور پھر مختلف چینلز سے پیش کیے جانے والے کئی ٹی وی شوز میں بھی اسے مدعو کیا گیا۔ اس سے آذر کی شہرت میں گویا چار چاند لگ گئے اور وہ بین الاقوامی طور پر پہچانا جانے لگا۔ کام تو وہ گزشتہ نو سالوں سے کررہا تھا لیکن صحیح معنوں میں شناخت اسے اب ملی تھی۔

وہ بے حد مصروف رہنے لگا۔ کام کے دوران اسے دن رات کی تمیز بھی نہیں رہتی تھی اور نہ ہی کھانے پینے کا ہوش... گھر میں اس کے علاوہ تھا بھی کون جو اس کا خیال رکھتا؟ والدین فوت ہوچکے تھے، ایک بڑی بہن تھی ماریا جس کی شادی ہوچکی تھی۔ وہی اس کی خبرگیری رکھتی تھی۔

ایک شام ماریا اس سے ملنے آئی تو وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر، اپنے اسٹوڈیو میں ایک مجسمے پر کام کررہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اس قدر محو تھا کہ اسے ماریا کے آنے کا پتا بھی نہیں چلا۔

ماریا کے پاس فلیٹ کی چابی موجود تھی۔ لہٰذا وہ جب چاہتی، آجاتی تھی اور آذر کے بے ترتیب گھر کو ترتیب دینے کے علاوہ اس کے لیے کچھ کھانا بناکر فریزر میں رکھ جاتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ آذر اس وقت بھی کام میں مشغول ہوگا۔ لہٰذا وہ سیدھی اسٹوڈیو میں چلی آئی۔ حسبِ توقع آذر کو اس کی آمد کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک منٹ تک یونہی خاموش کھڑی اس کی جانب دیکھتی رہی... آذر کا چہرہ ستا ہوا اور اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی... آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے حلقے اس کی بے خوابی کی گواہی دے رہے تھے۔

بھائی کی حالت دیکھ کر ماریا کے دل میں تاسف کی ایک لہر اُبھری... اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''بہت ہوگیا یہ کام وام... رحم کرو اپنے آپ پر!''

آذر چونک کر اس کی جانب پلٹا۔ ''اوہ، تم کب آئیں؟''

''میں پچھلے کئی منٹ سے یہاں کھڑی ہوں لیکن تمہیں تو کوئی ہوش ہی نہیں۔'' ماریا نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''غصہ نہیں کرو مائی ڈیئر سسٹر... بس تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔ ''تب تک تم ذرا دو کپ کافی بناکر لے آؤ پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

ماریا اسے گھورتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کافی کے دو مگ ٹرے میں رکھے واپس آئی۔

''تم نے آج کھانا بھی کھایا یا نہیں؟'' ماریا نے اس کے سامنے کافی کا کپ رکھتے ہوئے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر بے بسی کے ساتھ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یاد نہیں... شاید کھایا ہو۔''

''اچھا، اب شرافت سے یہاں آکر بیٹھ جاؤ... مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' ماریا نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''خدا خیر کرے... آخر بات کیا ہے؟'' آذر ایک تولیا سے ہاتھ صاف کرتا ہوا اس کے پاس صوفے پر آبیٹھا۔ ''کہیں جیجاجی سے کوئی جھگڑا وگڑا تو نہیں ہوا؟'' اس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔

ماریا نے اسے گھورا۔ ''ان سے تو نہیں... لیکن اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو تم سے آج ضرور جھگڑا ہوجائے گا۔''

''ایسا غضب نہ کرنا سسٹر!'' وہ ایک دم سے سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ کہ میں نے کب تمہاری کوئی بات ماننے سے انکار کیا ہے؟''

''ہاں، ہاں... تم سے زیادہ سعادت مند بھائی تو اس روئے زمین پر نہیں ہوگا۔'' ماریا نے خفگی سے کہا۔

''گویا تمہیں کوئی شبہ ہے؟'' آذر نے بڑی آزردگی کے ساتھ کہا۔

''مذاق میں مت ٹالو۔'' ماریا نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ بات کہہ رہی ہوں کہ تمہیں چھٹی کی اشد ضرورت ہے۔''

''ابھی تو مجھے بہت کام کرنا ہے سسٹر!'' آذر نے سر

تحفہ

ایک صاحب ملبوسات کی دکان میں داخل ہوئے اور سیلز مین سے زنانہ سوٹ دکھانے کے لیے کہا۔

سیلز مین نے ایک نظر ان کے سراپا پر ڈالی اور پوچھا۔ ''آپ کو اپنی بیگم کے لیے سوٹ لینا ہے یا کچھ عمدہ سے سوٹ دکھاؤں؟''

ارسال: عروج عارف، کراچی

کھجاتے ہوئے کہا۔ ”چھٹی کا بھلا کیا سوال؟“

”جان ہے تو جہان ہے۔“ ماریا نے کہا۔ ”اس طرح کام کرتے رہے تو خدانخواستہ تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو سکتا ہے۔“

”کہتی تو تم ٹھیک ہو۔“ آذر نے پُرخیال انداز میں گال کھجاتے ہوئے کہا۔ ”سوچوں گا اس بارے میں۔“

”سوچوں گا نہیں... بس، تم اسی ہفتے کسی پہاڑی مقام پر جا رہے ہو۔“ ماریا نے قطعی لہجے میں کہا۔

”میری پیاری مگر تھوڑی سی احمق ہمشیرہ... بھلا دسمبر کے مہینے میں چھٹیاں منانے کون پہاڑوں پر جاتا ہے؟“ آذر نے کہا۔ ”تم چاہتی ہو کہ میں نمونیا یا پھر فلو میں مبتلا ہو جاؤں؟“

اس کی اداکاری پر ماریا کو ہنسی آگئی۔ دونوں بہن بھائی میں بہت انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ باوجود اس کے کہ دونوں کے مزاج جداگانہ تھے، دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور محبت کرتے تھے۔ ماریا، آذر سے دو سال بڑی تھی لیکن بالکل کسی نانی اماں کی طرح اس کا خیال رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

”میں نے ساری معلومات کر لی ہیں... تم کسی بھی روز کی فلائٹ سے اسلام آباد اور پھر وہاں سے مری جا سکتے ہو۔ تمہارا بیگ بھی میں تیار کر دوں گی۔“ ماریا نے گویا ساری بحث ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”بس تم فوراً سیٹ کنفرم کرا لو۔“

”میں جانتا ہوں کہ جب تم کوئی فیصلہ کر لیتی ہو تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔“ آذر نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

ماریا فاتحانہ انداز میں مسکرائی... آذر جانتا تھا کہ یہ اس کی محبت کا ہی ایک انداز ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ آذر کی برسوں سے تمنا تھی کہ وہ برف باری کے موسم میں کسی ہل اسٹیشن پر جائے اور قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہو... مگر اس کی یہ خواہش کسی نہ کسی وجہ سے التوا کا شکار ہوتی چلی آ رہی تھی۔ اب وہ بہتر پوزیشن میں تھا لہٰذا اس نے بہن کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ماریا کے شوہر کو چھٹی نہیں مل سکتی تھی، لہٰذا ان دونوں کا ساتھ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور شوہر کو اکیلا چھوڑ کر ماریا جانا نہیں چاہتی تھی۔ آذر خود بھی ان دونوں کی زندگی میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے ناچار وہ اکیلا ہی مری کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں برف باری کا آغاز ہو چکا تھا۔ مری پہنچنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اب تک ایک کمرے میں بند رہ کر اس نے خود پر ظلم کیا تھا... فطرت کے حسین نظاروں کے درمیان پہنچ کر وہ اپنی تمام تر فنکارانہ حِسیں بیدار ہوتی محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے روز، صبح وہ سو کر اٹھا تو برف باری شروع ہو چکی تھی۔ اپنے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر وہ، چہار سو روئی کے گالوں کے مانند اڑتی برف کو دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اس کے اندر کے فنکار نے اسے اکسایا تو وہ اپنے بیگ سے ایک پیڈ نکال کر لایا اور دور تک دکھائی دینے والے اس حسین منظر کا اسکیچ بنانے لگا۔

حسبِ عادت وہ اپنے کام میں اس قدر محو ہو گیا تھا کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس وقت وہ اپنے اسٹوڈیو میں نہیں بلکہ مری میں، ہوٹل کے ایک کمرے میں کھڑا ہے۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دینے والے منظر کا ایک حصہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا۔

وہ کمرا لاک کر کے باہر نکل آیا... اسکیچ پیڈ اور ڈرائنگ پین اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ایک مناسب جگہ پر ٹھہر کر اپنا اسکیچ مکمل کیا اور پیڈ کو جیب میں رکھ لیا۔ پھر اس کی نگاہیں دور سے چمکتی ہوئی ایک پہاڑ کی دودھیا چوٹی پر جا ٹھہریں۔ چوٹی پوری طرح برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ آذر کا دل اسے اونچائی پر جا کر دیکھنے کو مچل اٹھا۔

جس مقام پر وہ کھڑا تھا، وہ قدرے نیچا تھا۔ اس کے علاوہ چند اونچے اونچے درخت بھی اس نظارے کی راہ میں حائل تھے۔ آذر چڑھائی چڑھنے لگا اور بالآخر اس نے اوپر پہنچ کر ہی دم لیا۔ برف باری اب تھم چکی تھی۔

اونچائی پر کھڑے ہو کر اس نے ایک گہری سانس لی اور اردگرد نظریں دوڑانے لگا۔ سرخوشی و مسرت کی ایک تیز لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنے احاطے میں لے لیا... بے اختیار وہ دو قدم مزید آگے بڑھ گیا۔ جوش کے عالم میں اسے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ وہ بالکل پہاڑی کی نگر پر پہنچ چکا ہے اور ذرا سی بے احتیاطی کے باعث پھسل کر نیچے گر سکتا ہے۔

لیکن وہ ہر جانب سے بے پروا... مکمل طور پر اس منظر کے حُسن میں کھویا ہوا تھا۔ یکایک اسے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے اسکیچ پیڈ کا خیال آیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیڈ نکالنا چاہا مگر نہ نکال پایا۔ گو کہ جیکٹ کی وہ جیب خاصی بڑی تھی پھر بھی پیڈ اس میں کہیں اٹک گیا تھا۔ اس نے جھنجلا کر ایک جھٹکے سے پیڈ نکالنا چاہا جس کے نتیجے میں وہ اپنا توازن کھو بیٹھا... یکایک اس کا پاؤں سلپ ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا... سیکڑوں فٹ نیچے گہرائی میں گرتا چلا

گیا۔

یہ سب کچھ صرف ایک لمحے میں وقوع پذیر ہوا تھا اور دوسرے ہی لمحے دنیا اس کی نگاہوں کے سامنے تاریک ہو گئی۔

جب اسے ہوش آیا، تب بھی اسے اپنے اردگرد تاریکی سی محسوس ہوئی۔ اس کے ذہن اور نگاہوں کے سامنے ایک گہری دھند سی چھائی ہوئی تھی... اس نے گھبرا کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اس لمحے اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔

دفعتاً درد کی ایک تیز لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے سانس لینے میں بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی... وہ وحشت زدہ سا ہو گیا اور یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

یقیناً وہ کوئی حادثہ ہی رہا ہو گا جس نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا... مگر کس طرح؟

وہ کار میں سفر کر رہا تھا... کسی ٹرین میں تھا یا ہوائی جہاز میں؟

مگر بے سود... اس کا ذہن اب تک خواب آور دواؤں کے زیرِ اثر تھا۔ ناچار اس نے ذہن پر زور دینے کی کوشش ترک کر کے اپنی ایک ٹانگ کو کسی انجانے سے خدشے کے تحت خفیف سی جنبش دی... اس کے بعد دوسری ٹانگ کو ہلایا۔

خدا کا شکر تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بہرحال صحیح و سلامت تھیں۔

اسی لمحے اسے نزدیک سے ایک بھاری اور بارعب سی آواز سنائی دی۔ ”اوہ... اسے ہوش آ رہا ہے۔“

آذر نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو اسے یوں محسوس ہوا گویا اس کی پلکیں من من بھر کی ہو گئی ہوں۔ خاصی کوشش کے بعد بالآخر وہ آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

وہ کسی آرام دہ بستر پر دراز تھا جس کے سرے پر سفید لباس میں ملبوس دو ہیولے موجود تھے۔ ان میں سے ایک اسے اپنے آپ پر جھکتا ہوا محسوس ہوا۔

”میں کہاں ہوں؟“ آذر نے وہ تاریخی سوال دُہرایا جو ہر پرانا فلمی ہیرو اس قسم کی سچویشن میں مبتلا ہونے کے بعد دُہرایا کرتا ہے۔

”آپ اسپتال میں ہیں مسٹر آذر!“ اسی آواز نے کہا جسے وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ ”اور خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں... ورنہ اس حادثے میں آپ کی گردن بھی ٹوٹ سکتی تھی۔“

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ آذر نے آواز کی جانب رخ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا... درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

”تمہارا دایاں شانہ فریکچر ہے... مگر فکر کی کوئی بات نہیں، کل صبح ہم مزید ایکس ریز لیں گے اور ضروری ہوا تو دوبارہ اسے آپریٹ کریں گے۔“ اسی شخص نے جواب دیا جو غالباً ایک سرجن تھا۔

”اوہ، میرا بازو!“ آذر کی کپکپاتی ہوئی آواز محض ایک سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں بے یقینی تھی اور چہرے کی رنگت کچھ اور زرد پڑ گئی تھی۔ ”مجھے تو ابھی بہت کام کرنا ہے۔“ اس نے بہ مشکل تمام کہا۔

سرجن کے اشارے پر ایک نرس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے خشک ہونٹوں کو پانی سے تر کیا۔

”حوصلہ رکھو، ینگ مین... میں سرجن عابد ہوں۔“ اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”ہم اپنی سی پوری کوشش کریں گے کہ تم جلد ہی پہلے جیسے ہو جاؤ۔“

”تھینک... یو سر!“ آذر نے آہستہ سے کہا۔

”ویسے یہ تو بتائیں کہ آپ اس قدر خطرناک پہاڑی مقام پر کیا کر رہے تھے؟“ سرجن عابد نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ”جبکہ قدرت کے حسین نظاروں کا لطف تو اس خطرناک اور پھسلواں نگر پر چڑھے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے۔“

”اوہ!“ یکایک جیسے آذر کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور اسے سب کچھ یاد آ گیا کہ کس طرح وہ اپنے فنکارانہ تجسس سے مجبور ہو کر اس خطرناک مقام تک جا پہنچا تھا... پھر اس نے اپنی جیب سے پیڈ نکالنا چاہا تھا اور... اس کے بعد کیا ہوا تھا، اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

یہ تو بعد میں اسے معلوم ہوا کہ پاؤں پھسلنے کے باعث وہ سیکڑوں فٹ گہرائی جا گرا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ وہ کوئی بہت خطرناک اندھی کھائی نہیں تھی اور وقت بھی دن کا تھا... مزید اچھی بات یہ ہوئی کچھ لوگوں نے اسے پھسل کر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک فیملی تھی جو سیر و تفریح کی غرض سے آئی ہوئی تھی۔

یکایک آذر کا دل تاسف سے بھر گیا... اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا۔ اسے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس قدر بے پروا ہو گیا تھا۔

اس نے سختی سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں... معذوری کا خوف اپنی جگہ تھا لیکن وہ تو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ

اگر وہ ٹھیک نہ ہوسکا تو داہنے بازو کے بغیر تصویریں کیسے پینٹ کرے گا... اور کیونکر وہ مجسمے تراش پائے گا جنہیں دیکھ کر لوگ بے اختیار کہہ اٹھتے تھے کہ ان میں تو بس جان پڑنے کی دیر ہے۔

آذر کا فن اس کے لیے اس کی جان تھا... اور جب جسم سے جان ہی نکل جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟

☆☆☆

ماریا کو جب یہ خبر ملی تو اس نے رو رو کر بُرا حال کرلیا۔

''یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے... ساری غلطی میری ہے۔ میں نے ہی اسے مجبور کیا تھا کہ وہ کسی پہاڑی مقام پر جائے... اور پھر اکیلا ہی اسے بھیج دیا، خود اس کے ساتھ بھی نہیں گئی۔ کتنی احمق ہوں میں... وہ ٹھیک تو ہو جائے گا نا بابر؟'' اس نے روتے روتے اپنے شوہر کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''انشاء اللہ، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' بابر نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ حادثہ تو کبھی بھی اور کہیں بھی پیش آسکتا ہے۔ تم اپنے آپ کو الزام مت دو اور خدا کا شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی۔''

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے... لیکن اگر اس کا ہاتھ ٹھیک نہ ہوسکا تو کیا ہوگا بابر؟ اپنے فن کے بغیر تو وہ بالکل اُدھورا ہے اگر ایسا ہوا تو وہ جیتے جی مر جائے گا... یہ قسمت بھی عجب کھیل کھیلتی ہے۔ اب جبکہ ہم سب اپنی اپنی جگہ خوش اور مطمئن تھے... آذر نے ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر کامیابی حاصل کرلی تھی، اپنا ایک نام اور مقام بنالیا تھا... اور ہم، آپ کی پروموشن اور ٹرانسفر کے بعد لاہور جانے والے تھے...'' بات اُدھوری چھوڑ کر وہ سسکنے لگی۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا... بس تم دعا کرتی رہو۔'' بابر نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ وہ ایک سلجھا ہوا اور تحمل مزاج انسان تھا لیکن اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی بیوی کو کن الفاظ میں تسلی دے۔ آخر معاملہ اس کے اکلوتے اور چہیتے بھائی کا تھا۔ ''ہر کام میں خدا کی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ ہمارے یہاں سے جانے کے بعد اس کی زندگی میں بھی تبدیلی آجائے۔ ابھی تو وہ اپنے ہر کام کے لیے تم پر انحصار کرتا ہے۔ بعد میں ہوسکتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ پر دھیان دینے لگے... گھر سے باہر نکلے، دوستیاں بنائے... اور بالآخر شادی پر رضامند ہوجائے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں۔''

ماریا نے خلوصِ دل سے کہا۔ ''اور وہ بالکل ٹھیک ہوجائے... ورنہ میں اسے چھوڑ کر کس دل سے جاؤں گی؟''

بابر اسے تسلی دے کر اور اس کے آنسو پونچھ کر پنڈی روانہ ہوگیا جہاں ایک بڑے اسپتال میں آذر کو رکھا گیا تھا۔ ماریا بھی اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن بابر اسے سمجھا بجھا کر چھوڑ گیا تھا کہ چند دنوں کے بعد آذر کو اپنے ساتھ واپس لے کر آئے گا۔ وہ جانتا تھا کہ وہاں پہنچ کر ماریا کچھ کرنے کے بجائے رو رو کر آذر کو بھی پریشان کردے گی۔

ماریا دن میں کئی کئی مرتبہ بابر سے فون پر بات کرتی تھی... وہ ایک آدھ مرتبہ آذر سے بھی اس کی بات کروادیا کرتا تھا۔ وہ دونوں ہی اس کو تسلیاں دیا کرتے تھے مگر ماریا کے دل کو قرار نہیں تھا۔ اسے قرار اسی وقت آسکتا تھا جب وہ اپنی آنکھوں سے آذر کو صحیح سلامت دیکھ لیتی۔

فی الحال وہ اس بارے میں اچھی امید ہی رکھ سکتی تھی، سو اس پر قائم تھی مگر ایک ہفتے بعد جب آذر کراچی لوٹا، تب اسے اپنی یہ امید ڈانواں ڈول ہوتی محسوس ہوئی۔

آذر، بابر کے ہمراہ بائی ائر کراچی پہنچا، اس کے بعد ائرپورٹ ہی سے اسے ایک خصوصی ایمبولینس کے ذریعے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ماریا پہلے سے وہاں موجود تھی اور ان کا انتظار کررہی تھی لیکن اسے آذر سے ملنے کی اجازت نہیں ملی۔ پہلے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔

ماریا، ایمرجنسی کے آگے سپید چہرہ لیے ساکت کھڑی تھی۔ بابر ایک جانب بینچ پر تھکے تھکے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ بالآخر ایمرجنسی روم کا دروازہ کھلا اور سفید اوور آل پہنے، ایک دراز قد شخص اندر سے برآمد ہوا۔

''مسز...... بابر؟'' اس نے سوالیہ انداز میں ماریا کی جانب دیکھا۔ ماریا نے بہ دقت تمام اپنا سر اثبات میں ہلایا، تب وہ گویا ہوا۔

''اتنے طویل انتظار کے لیے معذرت چاہتا ہوں... لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آذر صاحب ابھی خواب آور دواؤں کے زیرِ اثر ہیں کیونکہ سفر کے باعث ان کی تکلیف کچھ بڑھ گئی تھی۔''

''وہ کیسا ہے؟ مجھے اس کی صحیح کیفیت بتائیے ڈاکٹر صاحب... پلیز!'' ماریا نے التجا کی۔ بابر بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے نزدیک آگیا تھا۔

جواب دینے سے پہلے ڈاکٹر نے ایک لمحے کے لیے اس کی جانب دیکھا... اور اسی لمحے اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اس عورت کو جھوٹی تسلی دے کر بہلایا نہیں جاسکتا۔

''جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر آذر ایک آرٹسٹ ہیں... تو ایسی صورت میں ان کے ساتھ واقعی بہت بُرا ہوا ہے۔'' ڈاکٹر نے متانت کے ساتھ کہا۔ ''ان کے شانے کا کمپاؤنڈ فریکچر، وقت کے ساتھ یقیناً ٹھیک ہو جائے گا... مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک عصب (NERVE) کو سخت نقصان پہنچا ہے... تو ہوسکتا ہے کہ... میرا مطلب ہے ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو... مگر یہ امکان بہرحال موجود ہے کہ مستقبل میں ان کے دائیں بازو اور ہاتھ پر کچھ اثر پڑے... لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ وہ اس وقت ملک کے سب سے بڑے اسپتال کے بہترین آرتھوپیڈک یونٹ میں ہیں اور ہم ان کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے، آگے اللہ مالک ہے۔''

''بہت... بہت شکریہ... ڈاکٹر صاحب!'' ماریا نے رُندھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا میں ایک نظر اسے دیکھ سکتی ہوں، صرف ایک منٹ کے لیے؟''

''ٹھیک ہے... آپ دیکھ لیجیے۔'' ڈاکٹر نے اس کے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''لیکن صرف دو منٹ... اور ان سے زیادہ بات کرنے کی کوشش مت کیجیے گا کیونکہ وہ غنودگی کے عالم میں ہیں۔''

ماریا جلدی سے اندر چلی گئی۔ آذر کو پٹیوں میں جکڑا... پاکر ایک لمحے کے لیے وہ صدمے کی کیفیت میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ بہ ظاہر وہ سویا ہوا تھا مگر نہ جانے کیسے اسے اپنے قریب ماریا کی موجودگی کا احساس ہوگیا... اس نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔

ماریا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ آذر نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ اس کے ہونٹوں ہی میں رہ گئے... غنودگی ایک بار پھر اس پر غالب آگئی۔

ماریا بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتی ہوں؟'' دفعتاً ایک نرم اور شیریں آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔

ماریا نے چونک کر نظریں اٹھائیں... اس کے سامنے ایک دراز قد اور دمکتی ہوئی رنگت والی، خوب صورت سی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سفید اوور آل پہن رکھا تھا۔

''سوری!'' ماریا ایک دم جھینپ سی گئی اور جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔

''کوئی بات نہیں۔'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے اگر میرا خیال غلط نہیں تو آپ مسٹر آذر کی بہن ہیں... جنہیں تقریباً دو گھنٹے پہلے یہاں لایا گیا تھا؟''

''جی ہاں!'' ماریا نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''آذر کو اس حالت میں دیکھنا میرے لیے ایک شاک سے کم نہیں تھا۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' لڑکی نے ماریا کے زرد پڑتے چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہ آپ میرے ساتھ کینٹین میں چل کر ایک کپ کافی پی لیں... دراصل میری ڈیوٹی آف ہوچکی ہے اور میں اسی طرف جارہی تھی۔''

''تجویز تو اچھی ہے۔'' ماریا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟''

''نہیں، میں فزیوتھراپسٹ ہوں اور میرا نام علینا احمد ہے... ویسے آپ فکر نہ کریں، میں اور میرا ڈپارٹمنٹ آپ کے بھائی کی ریکوری کے لیے بھرپور کوشش کریں گے اور وہ جلد ہی پہلے کی طرح فٹ ہوجائیں گے۔''

علینا کا رویہ اور اس کا خلوص، ماریا کے لیے اس وقت ایک نعمت سے کم نہیں تھا کیونکہ اسے غم گساری کی شدید ضرورت تھی۔ کینٹین جانے سے پہلے ماریا نے بابر سے علینا کا تعارف کرایا اور اس سے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا لیکن اس نے انکار کردیا۔

☆☆☆

علینا عمر میں ماریا سے تقریباً پانچ سال چھوٹی تھی لیکن آدھے گھنٹے کی گفتگو کے دوران دونوں کو یہ اندازہ ہوا کہ ان کے مزاجوں میں بہت مماثلت ہے۔ وہ بہت آسانی کے ساتھ ایک دوسرے سے گھل مل گئیں۔ اس دوران علینا نے ماریا کی زبانی آذر کے کام اور خود ماریا کے بارے میں بہت کچھ جان لیا۔ جب اس کی باری آئی تو اس نے زیادہ تر اپنے کام کے بارے میں بات کی... کہ کس طرح لوگوں کی خدمت کرکے اسے روحانی خوشی ملتی ہے... اور یہ کہ وہ آذر کی صحت یابی کے بارے میں کس قدر پُرامید ہے۔

کافی ختم کرنے کے بعد ماریا اٹھی تو علینا بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کینٹین سے باہر آتے ہوئے ماریا نے کہا۔

''معلوم ہے... تمہارا چہرہ ایسا ہے کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی آرٹسٹ پینٹ کرنے کے لیے بے چین ہوجائے... اگر تم مختلف حالات میں آذر سے ملی ہوتیں تو وہ فوراً تم سے یہ درخواست کر بیٹھتا۔'' وہ علینا کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔ ''مجھے یقین ہے کہ اسپتال کے سارے ڈاکٹرز تم پر فدا ہوں گے۔''

علینا اس کی جانب دیکھ کر شرمیلے سے انداز میں مسکرائی۔ اسے ماریا کی یہ بے تکلفی اور اپنایت اچھی لگی تھی۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ان میں سے ایک ڈاکٹر کے ساتھ میری منگنی بھی ہوچکی ہے۔''

''اچھا...!'' ماریا یہ جان کر ایک دم خوش ہوگئی۔ ''تب ہی میری بات پر تم اس قدر بلش ہوگئی تھیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور علینا کی جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''امید ہے تم سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ تمہاری کافی...اور اس سے زیادہ مجھے کمپنی دینے کے لیے شکریہ۔''

علینا کچھ دیر تک وہیں کھڑی ماریا کو 'شعبہ حادثات' کی جانب جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ پُرخلوص سی لڑکی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ علینا اس کے لیے اپنے دل میں رشک کے جذبات بھی محسوس کررہی تھی... کیونکہ جہاں وہ اس پر جان چھڑکنے والے ایک بھائی کی بہن تھی، وہیں شوہر بھی اس کا والہ وشیدا تھا! حیرت کی بات یہ تھی کہ بابر اور آذر میں بہت مشابہت تھی اور اکثر لوگ انہیں حقیقی بھائی سمجھتے تھے۔

وہ دل ہی دل میں ماریا کے حال کا اپنے مستقبل سے موازنہ کرتی ہاسٹل کی جانب چل دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ بھی شادی کے بعد اسی طرح خوش اور مطمئن رہے گی؟

علینا نے ایک سال پہلے اپنا فزیوتھراپی کورس اور انٹرن شپ مکمل کرنے کے بعد یہ اسپتال جوائن کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے یہیں ہاسٹل میں رہائش اختیار کرلی تھی کیونکہ جہاں وہ رہتی تھی' وہ جگہ اسپتال سے خاصے فاصلے پر تھی اور وہاں سے آنے جانے میں اس کے کئی گھنٹے صرف ہوجاتے تھے۔

لیکن اس کے ہاسٹل شفٹ ہونے کے پیچھے محض یہی ایک محرک کارفرما نہیں تھا... بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا...وہ اپنے چچا کے گھر رہتی تھی۔ وہ ابھی اسکول ہی میں تھی کہ شوگر کے مرض میں مبتلا اس کی ماں... چندروز شدید بیمار رہنے کے بعد اچانک چل بسی۔

ماں کے انتقال کے بعد علینا گویا بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ چند ماہ گزرتے ہی باپ نے ایک ایسی مطلقہ عورت سے شادی کرلی جس کے پہلے ہی دو بچے تھے... ایک بیٹا اور ایک بیٹی... دونوں عمر میں علینا سے کئی سال بڑے تھے۔

بہ ظاہر ان سب باتوں میں سے کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں تھی... بلکہ دیکھا جاتا تو علینا کے گھر کی تنہائی، رونق میں تبدیل ہوگئی تھی... مگر حقیقت یہ تھی کہ اس کے بعد وہ کچھ اور تنہا ہوگئی تھی۔ ان نئے آنے والوں نے اسے اپنانے کی قطعی کوشش نہیں کی... بلکہ اس کا وجود ان کی نظروں میں کسی کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔

علینا کے باپ کو اس کی نئی بیوی اور اس کی اولاد نے کچھ اس طرح اپنی دکھاوے کی محبت کے جال میں جکڑ رکھا تھا کہ اسے اپنی بیٹی دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔

وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی اور ایک فاضل سی ہستی بن کر رہ گئی تھی...اور دوسرے لوگ، پورے استحقاق کے ساتھ اس پر قابض ہوگئے تھے۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ اس کے انجینئر باپ کو شارجہ میں ایک بہترین ملازمت کی آفر ملی جو اس نے فوراً قبول کرلی... وہاں جانے کے کچھ عرصے بعد اس نے پوری فیملی کو وہاں بلوانا چاہا تو علینا کو اس کی تعلیم مکمل کرنے کے بہانے چچا کے گھر رہنے کے لیے بھیج دیا گیا جبکہ سوتیلی ماں اور اس کے بچے، بقول ان کے... مجبوراً شارجہ روانہ ہو گئے۔

چچا کے گھر اسے بادل ناخواستہ قبول کیا گیا تھا۔ چچی اور ان کے بچوں کا رویہ اکثر و بیشتر اسے یہ احساس دلاتا تھا کہ اسے زبردستی ان کے سروں پر گویا مسلط کردیا گیا تھا...اگر علینا کا باپ ان لوگوں کو ہر ماہ ایک معقول رقم نہ بھجواتا تو شاید وہاں اسے بادل ناخواستہ بھی قبول نہ کیا جاتا۔

بہرحال، وقت کسی نہ کسی طرح گزرتا رہا... علینا نے زیادہ تر اپنے آپ کو تعلیم کے حصول میں مصروف رکھا اور ہمیشہ اچھی پوزیشن حاصل کی اور اب وہ اس قابل تھی کہ اپنے پیروں پر خود کھڑی ہوسکتی تھی۔

چچا کی بیٹیاں بھی اب جوان ہوچکی تھیں لہٰذا چچی جلد از جلد ان کی شادیاں کرنے کی خواہش مند تھیں مگر پریشانی یہ تھی کہ لڑکیاں معمولی شکل وصورت کی مالک تھیں... جبکہ علینا ان کے مقابلے میں ایک ماہِ کامل سے کم نہیں تھی، اس لیے جو بھی رشتہ آتا تھا، وہ علینا کا طلب گار ہوتا۔ وہ صورت میں ہی نہیں بلکہ سیرت میں بھی ان سب سے آگے تھی۔

علینا، چچی کی بدلتی نظروں سے اچھی طرح واقف تھی اور ان کی مشکل بھی سمجھتی تھی... لہٰذا اسپتال جوائن کرتے ہی اس نے فاصلے کو بہانہ بنا کر ہاسٹل میں رہنے کا اعلان کردیا۔ یہ بہانہ بھی اس نے محض سب کے درمیان بھرم رکھنے کو بنایا تھا ورنہ اسے روکنے والا کون تھا... ان سب نے تو شاید اس کے رخصت ہونے پر سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا۔

اسپتال میں بھی اس کی آمد کسی ہلچل سے کم ثابت نہیں ہوئی تھی... اس کا حُسن تو سب کے لیے مرکزِ نگاہ تھا ہی مگر اس سے زیادہ اس کا پُرخلوص اور دوستانہ روّیہ باعثِ کشش تھا۔ وہ مریضوں، ڈاکٹروں، پیرامیڈیکل اسٹاف... سب سے ایک

ہی جیسا دوستانہ روّیہ رکھتی تھی۔ اس کے روّیے کے باعث کئی ڈاکٹرز خوش فہمی کا شکار ہوئے... لیکن آہستہ آہستہ انہیں یہ اندازہ ہوگیا کہ علینا سب کے لیے ایک جیسی ہے اور اس کا دل بالکل صاف وشفاف ہے۔ وہ ہر ایک کے کام آنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔

اس کے بعد وہ سب اس کے قابلِ اعتماد دوست بن گئے۔ صورتِ حال کے تبدیل ہونے کے بعد ان نرسوں اور لیڈی ڈاکٹرز نے بھی سکون کا سانس لیا جو کسی نہ کسی ڈاکٹر میں انٹرسٹڈ تھیں۔

شاید یہ صورتِ حال اور یہ فضا یونہی برقرار رہتی... اگر ڈاکٹر جواد ان کا اسپتال جوائن نہ کرتا۔

ڈاکٹر جواد بہت خوبرو اور ہینڈسم جوان تھا۔ اس کی باتوں میں جادو اور شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ علینا بے اختیار اس کی جانب کھنچتی چلی گئی۔ ڈاکٹر جواد کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا بلکہ وہ تو بقول اس کے ''لوایٹ فرسٹ سائٹ'' میں مبتلا ہوا تھا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد جواد، علینا کو اپنی ماں سے ملوانے اپنے گھر لے گیا۔ جواد کی ماں، علینا کو دیکھتے ہی اس پر فدا ہوگئی اور اس نے فوراً اپنی الماری سے ایک انگوٹھی لا کر علینا کی انگلی میں ڈال دی۔ اس روز وہ جواد کے ساتھ اسپتال لوٹی تو بہت خوش تھی۔ جواد نے فوراً ہی سب کے سامنے اپنی اور علینا کی منگنی کا اعلان کردیا۔

اسٹاف کے اصرار پر اس نے سب کو ایک پارٹی بھی دے ڈالی۔ سب نے ڈھیروں مبارک باد اور تحائف کے ساتھ اس پارٹی میں شرکت کی اور یوں ان کی منگنی نے گویا ایک باضابطہ صورت اختیار کرلی۔

علینا اس رشتے پر بہت خوش تھی۔ منگنی کے بعد تین چار ماہ تک اس نے گویا ہواؤں میں پرواز کرتے گزارے... جواد دل وجان سے اس پر فدا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ صورتِ حال میں تبدیلی آنے لگی۔

جواد نے چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے ٹوکنا شروع کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ علینا ہر کام اس کی مرضی کے مطابق کرے۔ وہ تو خود دل سے یہی چاہتی تھی کہ اس کی مرضی کے سانچے میں ڈھل جائے۔ اس نے کبھی جواد کی روک ٹوک اور تنقید کا برا نہیں مانا۔ وہ فوراً اپنی غلطی تسلیم کرلیتی، اس بحث میں کبھی نہیں پڑتی کہ وہ غلطی پر تھی یا نہیں۔

وہ آنکھیں بند کیے محبت کی شاہراہ پر دیوانہ وار آگے بڑھتی چلی جارہی تھی... جواد کی محبت پر اسے ایمان کی حد تک یقین تھا مگر تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے علینا کے یقین کی بنیاد کچھ ہل سی گئی۔

☆☆☆

جس وقت آٹھ سالہ ذیشان کو ایمرجنسی میں لایا گیا، وہ معصوم انتہائی تکلیف میں تھا۔ وہ گلی میں کھیل رہا تھا کہ ایک موٹرسائیکل والے نے اسے ٹکر ماردی۔ اس حادثے کے نتیجے میں ذیشان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

شدید تکلیف کے باوجود وہ چھوٹا سا بچہ رونے دھونے اور چیخنے چلّانے کے بجائے... بڑے ضبط اور حوصلے سے کام لے رہا تھا۔ اسٹاف کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے چپکے چپکے آنسو بہاتی اپنی ماں کو بھی تسلی دے کر مسکرانے پر مجبور کردیا تھا۔

ابتدائی علاج کے بعد فزیوتھراپی کا مرحلہ آنے پر جب ذیشان کو علینا کے پاس لایا گیا، تب تک اس کی شہرت علینا کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا ذیشان اور علینا کی دوستی ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی اور وہ دونوں جلد ہی بقول ذیشان ''پکے دوست'' بن گئے۔

ذیشان نے علینا کو اپنے گھر، اپنے والدین، اپنے دوستوں' اپنے اسکول اور یہاں تک کہ محلے والوں تک کے بارے میں سب کچھ بتایا۔ اس کا باپ ایک ٹیکسی ڈرائیور تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہ بڑا ہوکر ایک پائلٹ بنے۔

ذیشان نے علینا سے وعدہ کیا تھا پائلٹ بننے کے بعد وہ اسے اپنے جہاز پر بٹھا کر جہاں جانا چاہے گی، لے جایا کرے گا...اور کبھی کبھی اپنے ابو کی ٹیکسی پر بھی لفٹ دے دیا کرے گا۔

ذیشان کے ساتھ اپنے سیشن کے دوران وہ جس قدر ہنستی تھی، اتنا تو وہ کئی سالوں میں نہیں ہنسی تھی۔ جب تک وہ اسپتال میں رہا، علینا بے حد خوش رہی...اور جب وہ ضروری علاج کے بعد ڈسچارج ہوکر اسپتال سے چلا گیا، تب علینا نے اس کی کمی بے حد محسوس کی۔

ایک صبح جب وہ اپنی ڈیوٹی پر پہنچی تو اس نے ذیشان کی ماں کو کوریڈور میں اپنا منتظر پایا... وہ علینا کو ذیشان کی نویں سالگرہ پر مدعو کرنے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ ان لوگوں نے ذیشان کی صحت یابی اور اس کی سالگرہ کی خوشی میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا ہے اور صرف اپنے خاص خاص عزیزوں اور دوستوں کو اس موقعے پر مدعو کیا ہے۔

''ہم نے ذیشان کو بہت سمجھایا کہ آپ کو ہمارے گھر آنے میں بہت زحمت ہوگی لیکن وہ نہیں مانتا... اس نے ضد

پکڑ لی ہے کہ علینا باجی آئیں گی تو میں سالگرہ مناؤں گا، ورنہ نہیں۔'' ذیشان کی ماں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھلا کیوں زحمت ہوگی؟'' علینا نے کہا۔ ''میں آؤں گی اور ضرور آؤں گی۔''

''میڈم! ہم غریب لوگ ہیں... کچا پکا گھر ہے ہمارا... پھر ہمارے گھر کا تو راستہ ہی اس قدر خراب ہے اور گلیاں اتنی گندی ہیں کہ...'' ذیشان کی ماں شرمندگی کے عالم میں اسے گویا پہلے سے خبردار کرنا چاہ رہی تھی کہ آنے کے بعد کہیں اسے پچھتانا نہ پڑے۔

''آپ مجھے شرمندہ کررہی ہیں۔'' علینا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''راستہ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو، جب میرا بیسٹ فرینڈ وہاں رہتا ہے تو میرے لیے ایسی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ ذیشان سے کہہ دیجیے گا کہ میں اس کی برتھ ڈے پر ضرور آؤں گی۔''

ذیشان کی ماں اس کا جواب سن کر اس کا شکریہ ادا کرتی ہوئی شاداں و فرحاں لوٹ گئی لیکن جب جواد کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس کا موڈ سخت خراب ہوگیا۔

''تمہیں کیا ہوگیا ہے علینا؟'' جواد نے ناگواری کے ساتھ کہا۔ ''اسپتال تک تو ٹھیک تھا... مگر اب تم ان لوگوں کے گھر بھی جاؤ گی۔ تمہیں معلوم ہے وہ علاقہ کیسا ہے؟ آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال رکھا کرو۔''

علینا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا... اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں اور چہرے پر اس قدر سختی تھی کہ اس لمحے وہ پہچانا نہیں جارہا تھا۔

''میں اس معصوم بچے کو مایوس کرنا نہیں چاہتی۔'' اس نے مدافعانہ لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ''میں اس کی امی سے وعدہ کرچکی ہوں۔ اب اگر میں نہیں گئی تو اس معصوم کا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''تمہیں معلوم ہے... میں ممی سے وعدہ کرچکا ہوں کہ اس ویک اینڈ پر تمہیں ان سے ملوانے لاؤں گا۔ وہ کب سے تمہیں یاد کررہی ہیں اور تم نہ جانے کون کون سے فضول پروگرام بنائے بیٹھی ہو۔'' جواد کا لہجہ بہ دستور خاصا تلخ تھا۔

''لیکن تم نے پہلے تو مجھے یہ بات نہیں بتائی؟'' علینا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے... کیونکہ تم تو دل میں ٹھان چکی ہو کہ ان جھگیوں کی خاک چھان کر رہوگی تاکہ ان میں بسنے والوں کے دل نہ ٹوٹ جائیں... میں کیا محسوس کرتا ہوں، اس کی تمہیں کوئی پروا نہیں۔''

''جواد پلیز... ممی سے ملنے کے لیے تو میں برتھ ڈے میں شریک ہونے کے بعد بھی جاسکتی ہوں... دیکھو، وہ بچہ مجھے اپنی دوست سمجھتا ہے اور اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے؟ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔'' علینا نے کہا۔ یہ پہلا موقع تھا... جب اسے جواد کی کوئی بات واقعی بُری لگی تھی۔

''دوست...!'' جواد نے ایک طنزیہ سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''یہاں کون ہے جو تمہارا دوست نہ ہو اور تمہارا دم نہ بھرتا ہو۔''

علینا حیرت بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ اسے جواد سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس کی باتوں نے علینا کو بہت دکھ پہنچایا تھا۔ دوسری جانب جواد کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ سخت مایوس ہوا ہو۔ وہ دل شکستگی کے سے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔

اس کی صورت دیکھ کر علینا کا دل پھر سے موم ہوگیا... اس نے معافی مانگ کر کسی نہ کسی طرح جواد کو منالیا۔ یوں... بہ ظاہر فوری طور پر یہ معاملہ ٹل گیا لیکن جو خرابی ہونی تھی، وہ ہو چکی تھی۔

گوکہ وہ جواد سے بہت محبت کرتی تھی اور پوری طرح اس کے ساتھ مخلص تھی... اس کے باوجود وہ محسوس کررہی تھی کہ ان کے درمیان پہلی دراڑ پڑ چکی ہے۔

اس کے بعد بہت سی باتیں مزید ایسی ہوئیں جن سے ظاہر ہوا کہ جواد کی اور اس کی سوچ میں زمین و آسمان کا فرق ہے... ان چھوٹے چھوٹے اختلافات سے ان کے مابین فاصلے بڑھتے جارہے تھے۔

علینا کو یقین نہیں آتا تھا کہ اس قدر جاذبِ نظر دکھائی دینے والے اور اتنے قابل انسان کا دل اس قدر تنگ بھی ہو سکتا ہے۔

جواد چاہتا تھا کہ علینا بھی اسی طرح سوچے اور عمل کرے، جس طرح وہ چاہتا ہے... اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ایک قابل ڈاکٹر تھا لیکن مریضوں کے ساتھ اس کا رویہ بالکل مشینی سا ہوتا تھا... جذبات سے بالکل عاری!

اسے مریضوں کے ساتھ علینا کا دوستانہ اور ہمدردانہ رویہ بالکل پسند نہیں تھا... نہ ہی اسے یہ پسند تھا کہ وہ اسٹاف اور دوسرے ڈاکٹرز کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کرے اور ان کے فضول قسم کے مسائل میں اپنا سر کھپائے...!

اس کے خیالات سے واقف ہونے کے بعد علینا کو احساس ہورہا تھا کہ اس نے بھی عام لڑکیوں کی طرح نادانی

اور بے وقوفی کا ثبوت دیتے ہوئے آنکھیں بند کر کے ایک انجان شخص پر محض اس لیے اعتبار کر لیا کہ اس کا ظاہر خوب صورت تھا... جبکہ اس کے باطن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔

اب اس کی زندگی میں وہ موڑ آچکا تھا جہاں وہ سوچنے پر مجبور تھی کہ اسے کون سے راستے پر جانا ہے؟

کیا وہ یونہی آنکھیں بند کیے اسی راستے پر چلتی رہے یا پھر اپنا راستہ تبدیل کر لے؟

کسی بھی فیصلے پر پہنچنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ جواد سے شادی نہ تو اسے اپنے حق میں بہتر محسوس ہو رہی تھی، نہ ہی جواد کے حق میں... لیکن ایسا کوئی طریقہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ جس پر عمل کرتے ہوئے وہ جواد کو قائل کر سکتی کہ یہ رشتہ ان دونوں کے حق میں بہتر نہیں۔ یک طرفہ فیصلہ کر کے وہ جواد کو دکھ پہنچانا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی ایک اسپتال میں کام کرتے ہوئے یہ ممکن تھا۔

☆☆☆

آذر کو اپنے آپ پر بہ دستور غصہ تھا... اسے اندازہ تھا کہ اپنی بے پروائی کے باعث اس نے خود کو ایسا نقصان پہنچایا تھا جو شاید ناقابلِ تلافی تھا۔ وہ اپنے علاج کے سلسلے میں ڈاکٹروں سے بھرپور تعاون کر رہا تھا اور ان سے اس کی اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی۔

جب اس نے پہلی مرتبہ علینا کو دیکھا تو اسے اپنا غصہ ایک دم ٹھنڈا پڑتا سا محسوس ہوا... اس کی خوب صورتی یوں تو ہر دیکھنے والی آنکھ کو متاثر کرتی تھی لیکن آذر اسے ایک آرٹسٹ کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہر ہر انداز آذر کو اپنے دل میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس حسین چہرے کو کس زاویے سے پینٹ کرنا بہتر رہے گا؟

''السلام علیکم، مسٹر آذر!'' علینا نے اس کے نزدیک پہنچ کر سلام کیا تو وہ اپنی محویت سے چونکا۔ ''آج آپ کا پہلا فزیو تھراپی ٹریٹمنٹ ہو گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا میں آپ کو لے جانے کے لیے آئی ہوں۔''

''جی، ضرور!'' آذر نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''میں اسی طرح ہر صبح آپ کو فزیو تھراپی کے لیے لے جایا کروں گی... تقریباً دو ہفتوں تک یہ سلسلہ یونہی چلے گا۔ اس کے بعد امید ہے کہ آپ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا لیکن اس کے بعد بھی تھراپی کے لیے روزانہ آنا ہو گا۔'' علینا نے بتایا۔

آذر جواب میں محض سر ہلا کر رہ گیا... علینا نے آذر کی تمام رپورٹس اور ایکس ریز وغیرہ دیکھے ہوئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ اس کا دایاں بازو پہلے کی طرح کام کرنے لگے... مگر وہ اپنی سی پوری کوشش کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اس حقیقت سے بہ خوبی واقف تھی کہ ایک آرٹسٹ کے لیے اس کا آرٹ کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔

علاج کے دوران ہر گزرتے دن کے ساتھ، علینا اور آذر کے مابین ہم آہنگی بڑھتی جا رہی تھی... آذر کو ایک نرس کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ علینا کی منگنی، ڈاکٹر جواد کے ساتھ ہوئی تھی... یہ جان کر نہ معلوم کیوں اسے ایک خلش کا سا احساس ہوا... ڈاکٹر جواد ہفتے میں دو مرتبہ اسے دیکھنے آتا تھا۔ گو کہ وہ ایک خوش شکل اور ہینڈسم نوجوان تھا... مگر آذر کو اس کی شخصیت بالکل بے روح سی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی جوش، کوئی جذبہ اس میں نظر نہیں آتا تھا۔

بہرحال، وہ علینا کا منگیتر تھا... اور کم از کم یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ انگیجڈ ہے، آذر کو اس سے اپنے متعلق بات کرنے میں اور اپنے مسائل ڈسکس کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ علاج کے باوجود اس کے بازو میں کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔

''اپنے کام سے آپ کو بہت لگاؤ ہے، مس علینا؟''

ایک روز اپنے سیشن کے دوران آذر نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں... بالکل!'' علینا نے اس کے ناکارہ بازو کے پٹھوں کا مساج کرتے ہوئے جواب دیا۔

''خدانخواستہ، اگر کبھی آپ پر ایسا وقت آجائے کہ اپنی ہی کسی غلطی کی وجہ سے آپ اپنا کام جاری نہ رکھ پائیں تو آپ کیا کریں گی؟''

علینا نے ایک لمحے کے لیے بہ غور اس کے چہرے کی جانب دیکھا... اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس کے سوال کی تہ تک پہنچ گئی۔ اس وقت اس کا جواب آذر کے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ حوصلہ نہ ہارنے پائے۔

''میرا خیال ہے...'' اس نے پُرخیال انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں پوری کوشش کروں گی کہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو کسی دوسرے انداز میں استعمال کر سکوں... ہو سکتا ہے کہ میں لکھنا شروع کر دوں... یا پھر پڑھانا شروع کر دوں یا کچھ اور... بہرحال، میں اتنا جانتی ہوں کہ اگر آپ کے پاس کوئی خداداد صلاحیت ہے تو آپ اسے یونہی ضائع نہیں کر سکتے... کیونکہ یہ کفرانِ نعمت ہے۔''

اس کی بات سن کر آذر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔ ''لیکن میں تو اپنی حماقت کے باعث اپنا بازو گنوا چکا ہوں... پھر؟''

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟'' علینا جلدی سے بولی۔ ''ہو سکتا ہے کہ آپ کا بازو ٹھیک ہونے میں چند مہینے اور لگ جائیں... یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ...''

''لیکن ٹھیک یہ پھر بھی نہیں ہو گا... میں جانتا ہوں۔'' آذر کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''کچھ عرصہ پہلے اپنی کولیگز کے ساتھ مجھے ایک آرٹ گیلری جانے کا اتفاق ہوا تھا۔'' علینا نے اس کی کلائی اور بے حس و حرکت انگلیوں کا مساج کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں میں نے آپ کا بنایا ہوا ایک اسکیچ دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بہت متاثر ہوئی... وہ دوڑتے ہوئے ایک لڑکے کا مجسمہ تھا۔ میں آرٹ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی لیکن پھر بھی اندازہ کر سکتی ہوں کہ آپ نے کتنی محنت... اور کتنے مرحلوں سے گزرنے کے بعد اسے تیار کیا ہو گا۔ اگر آپ نے حوصلہ ہار دیا تو اپنے حیرت انگیز فن کو کس طرح آگے بڑھائیں گے؟''

آذر نے افسردگی کے عالم میں اپنا سر ہلایا۔ ''ایک ہاتھ سے بھلا میں کیا کر سکتا ہوں... اور وہ بھی بائیں ہاتھ سے؟ اس ایک ہاتھ سے نہ تو میں پینٹ کر سکتا ہوں اور... کوئی مجسمہ بنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''چلیں، مجسمہ سازی کو فی الحال رہنے دیں۔'' علینا نے محتاط انداز میں کہا۔ ''آپ کی بہن نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اسکیچز بھی بہت اچھے بناتے ہیں... تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ فی الحال آپ بائیں ہاتھ سے ہی اسکیچز بنانے کی پریکٹس کریں؟'' وہ بہ غور آذر کے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی کہ کہیں وہ اس کی بات کا کوئی غلط مطلب اخذ نہ کر لے... جن کیفیات سے وہ گزر رہا تھا، علینا کو بہ خوبی احساس تھا۔

''یہ خیال مجھے اس لیے آیا کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنا ہر کام لیفٹ ہینڈ سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔'' اس نے آہستگی کے ساتھ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں نہ آپ بھی یہ کوشش کر کے دیکھیں... آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' اپنی بات کے اختتام پر وہ خوش دلی کے ساتھ مسکرائی۔

''حرج تو واقعی کوئی نہیں۔'' آذر نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بلکہ اس طرح کم از کم کچھ وقت ہی کٹ جایا کرے گا۔''

علینا خوش ہو گئی۔ یہ بڑی خوش آئند بات تھی کہ آذر نے اس کی تجویز کو مثبت انداز میں لیا تھا، ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ حوصلہ ہار بیٹھتا۔

اسپتال میں وقت بڑی مشکل سے گزرتا... لیکن اب اسکیچز بناتے بناتے آذر کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ شروع شروع میں بائیں ہاتھ سے قلم پکڑنے اور کاغذ پر لکیروں کا جادو جگانے میں اسے خاصی دقت پیش آئی... کئی مرتبہ اس نے جھنجلا کر سب کچھ ایک طرف پھینک دیا... مگر پھر کچھ اس کی لگن اور کچھ علینا کی حوصلہ افزائی نے ساتھ دیا۔ اس نے اپنی کوشش ترک نہیں کی... یوں رفتہ رفتہ اس کے کام میں بہتری آتی چلی گئی۔

ساتھ ساتھ اس نے بائیں ہاتھ سے معمول کے دیگر کام بھی انجام دینا شروع کر دیے۔ کھانا بھی اب وہ خود اپنے ہاتھ سے ہی کھاتا تھا۔

علینا اس امپروومنٹ پر بہت خوش تھی... وہ تو تھی ہی ایسی... اپنے ہر مریض کے ساتھ جذباتی طور پر اس طرح وابستہ ہو جایا کرتی تھی کہ اس کی بہتری، اسے اپنی بہتری محسوس ہوتی تھی لیکن جواد کو اس کا یہ رویہ قطعی پسند نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مریض کو ایک مریض ہی کی طرح ٹریٹ کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ دلی طور پر وابستہ ہو جانا ایک ڈاکٹر کے حق میں اچھا نہیں ہوتا اور نہ ہی مریض کے حق میں۔

علینا بہ دستور جواد کے سلسلے میں الجھن کا شکار تھی پھر اچانک اس نے کافی دنوں کے بعد علینا سے باہر چلنے اور ساتھ کھانا کھانے کی فرمائش کی تو وہ رد نہ کر سکی۔ جواد کا اچھا موڈ دیکھ کر بہت سی خوش گمانیاں اس کے دل میں جنم لے رہی تھیں... کہ شاید اس نے اپنے رویے پر نظرِ ثانی کی ہو... اور اسے احساس ہو گیا ہو کہ اس نے علینا کا دل دکھایا ہے... اور یہ کہ اس کے نظریات کچھ ایسے درست نہیں تھے۔

شاید وہ اپنے سابقہ رویّے پر معذرت کرنا چاہتا تھا اور شاید کینڈل لائٹ ڈنر پر وہ تجدیدِ محبت کرنا چاہتا تھا۔

ایسے کتنے ہی ''شاید'' تھے جو اس کے دل کو امید کی ڈور سے باندھے کشاں کشاں... جواد کی جانب کھینچ رہے تھے۔

ریسٹورنٹ کے خواب ناک ماحول کو موسیقی کی دھیمی دھیمی لہریں، کچھ اور کیف آگیں بنا رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے مقابل وہ دونوں ہی خاموش بیٹھے تھے...

بالآخر جواد نے اس خاموشی کو توڑا۔ ''کچھ کہو گی نہیں؟'' اس نے چھری سے اسٹیک کا ایک ٹکڑا کاٹتے ہوئے کہا۔

''کیا کہوں؟'' علینا نے چونک کر اس کی جانب

دیکھا۔ ''تم تو جانتے ہو کہ میرے پاس تو صرف اسپتال کی اور مریضوں کی باتیں ہوتی ہیں۔'' وہ بے بسی کے سے انداز میں مسکرائی۔

''کوئی نئی بات ہوئی ہے کیا؟'' جواد نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

علینا اپنے آپ کو روک نہیں پائی... وہ آذر کے علاج کے سلسلے میں اپنی کامیابی کو جواد کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ گو کہ اس قسم کی باتوں پر پہلے بھی ان کے درمیان بدمزگی ہوتی رہی تھی لیکن ہر مرتبہ جب وہ اس کے مقابل ہوتا تو وہ سب کچھ بھول کر، اپنائیت کے ایک احساس کے تحت ایک بار پھر اپنی باتیں شروع کر دیتی تھی۔

''ہاں، میں تمہیں آذر کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''آذر کو تو تم جانتے ہو گے نا؟ وہی جو ایک معروف مجسمہ ساز اور مصور ہے۔''

''کیوں نہیں...'' جواد نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''اسے تو شاید پورا اسپتال جانتا ہے اور نرسوں میں تو وہ اس قدر مقبول ہے کہ جب بھی میں اسے دیکھنے گیا، ہمیشہ دو چار نرسوں کو بلاضرورت اس کے گرد منڈلاتے پایا۔''

علینا کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔ ''تم بھول رہے جواد کہ نرسیں اس کے گرد نہیں... تمہارے گرد منڈلاتی پائی جاتی ہیں... بہرحال، ایک بات طے شدہ ہے کہ وہ واقعی ایک زبردست آرٹسٹ ہے۔ میرے مشورے پر اس نے بائیں ہاتھ سے اسکیچز بنانے شروع کیے تھے اور کچھ ہی دنوں میں خاصی مہارت بھی حاصل کر لی۔ اب وہ پینٹنگ بھی شروع کرنے والا ہے... کتنی خوشی کی بات ہے نا... کہ ایک فنکار کا ٹیلنٹ ضائع ہونے سے بچ جائے؟''

جواد نے علینا کی جانب دیکھا... اس کے چہرے پر اندرونی جوش کا عکس جھلک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں ناگواری کی ایک لہر ابھری۔

''ہاں۔'' جواد نے ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اپنا دایاں بازو تو اپنی حماقت کے باعث وہ ضائع ہی کر بیٹھا۔ اس نقصان پر شاید ہی وہ خود کو معاف کر پائے۔''

''کر سکتا ہے۔'' علینا نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''اگر وہ پہلے کی طرح پینٹنگ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنی محرومی کو نہ بھلا سکے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' جواد نے بے پروائی سے کہا۔ ''ویسے وہ اسپتال سے کب تک ڈسچارج ہو رہا ہے؟''

''چند دنوں کے بعد۔'' علینا نے کہا اور پھر خوش ہوتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''معلوم ہے، سب سے پہلے وہ کیا پینٹ کرے گا... میرا پورٹریٹ... میں اس کے لیے پوز دوں گی۔''

''کک... کیا؟'' جواد کا منہ حیرت کے باعث ایک دم کھل گیا۔ ''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''کیوں... اس میں کیا ہے؟'' علینا نے سادگی سے کہا۔ ''اسپتال سے جانے کے بعد بھی اس کا علاج جاری رہے گا اور پینٹنگ بھی اس کی تھراپی کا ایک حصہ ہے۔ اس نے میرا پورٹریٹ بنانے کی درخواست کی تو میں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔''

''اور یہ پورٹریٹ کب اور کہاں بنایا جائے گا... میرا مطلب ہے کہ اس کے اسپتال سے جانے کے بعد...؟'' جواد نے گویا اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ... دراصل، پورٹریٹ کے لیے میں اس کی بہن کے گھر جایا کروں گی۔'' علینا نے محتاط انداز میں کہا۔ ''اس وقت، جب میں آف ڈیوٹی اور تم آن ڈیوٹی ہو گے۔''

وہ جواد کے بدلتے ہوئے تیور بھانپ چکی تھی... اسے توقع تھی کہ اس کا جواب سننے کے بعد وہ حسبِ معمول اسے جلی کٹی سنانا شروع ہو جائے گا... لیکن اس کا ردِعمل علینا کی توقع کے برعکس تھا۔

اس نے میز پر آگے جھک کر ایک دم علینا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ ''نہیں علینا... پلیز!'' اس نے التجا کی۔ ''ایسا مت کرنا... میں جانتا ہوں کہ وہ آرٹسٹ تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔ پورٹریٹ بنانے کے بہانے وہ تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے... میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''

علینا آنکھیں پھاڑے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ تو ایک بار پھر اس کا غصہ جھیلنے کی توقع کر رہی تھی مگر وہ آنکھوں میں وحشت بھرے، بے ربط لہجے میں نہ جانے کیا کہے جا رہا تھا۔

''کیا ہوا جواد... خود کو سنبھالو۔'' اس نے اپنے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں... میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آذر ایسا نہیں ہے ورنہ میں کم از کم پورٹریٹ کے لیے ہامی نہ بھرتی۔''

مگر جواد تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا... وہ تیزی سے بولا۔ ''علینا... بس، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم فوراً سے پیشتر شادی کر ڈالیں... بے شک میں نے پلان بنایا تھا کہ پہلے میں اپنا کلینک شروع کروں گا... لیکن منگنی کو زیادہ کھینچنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ آپس میں اختلافات جنم لینے لگتے ہیں... تم سمجھ

رہی ہو نا؟'' وہ گھگیایا۔

علینا ایک بار پھر حیرت کے عالم میں اس کا چہرہ تکنے لگی... جواد کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت تو وہ گویا اس کے منہ سے ہاں سننے کے لیے اس کے پاؤں تک چھونے کو آمادہ نظر آتا تھا۔ علینا کو پہلے بھی کئی مرتبہ یہ خیال آیا تھا کہ جواد کسی قدر غیر متوازن شخصیت کا مالک ہے... لیکن اس وقت تو وہ بالکل ایک نفسیاتی مریض دکھائی دے رہا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اب فیصلے کا لمحہ آن پہنچا ہے... یہی وقت تھا جب اسے جواد کو اس حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر وہ ایسا کرتی تو اسے فوری طور پر یہ اسپتال چھوڑنا پڑتا... اور فی الوقت وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ ہی منگنی توڑنے کے بعد ہر روز جواد کا سامنا کرنا ممکن تھا۔

''دیکھو جواد... شادی کوئی گڑیا گڈے کا کھیل نہیں۔'' اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے پاپا کے بغیر بھلا کیسے شادی کر سکتی ہوں... میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ چند ماہ بعد آنے والے ہیں تو بس...''

اس کی بات سنتے ہی یکا یک جواد کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے... غنیمت رہا کہ یہ بات فوری طور پر اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ علینا پہلے بھی اس بارے میں اسے بتا چکی تھی کہ ان کی شادی اس کے پاپا کی رسمی رضامندی کے بعد ہی ہو گی۔ انہوں نے فون پر بتایا تھا کہ اس سال کے آخر میں وہ پاکستان آئیں گے اور اس کے لیے ایک شان دار سا کلینک بھی بنوا کر دیں گے۔ علینا نے کہا تھا کہ اس کلینک کو وہ دونوں مل کر چلائیں گے۔ یہ بات جواد کے لیے خاصی باعثِ کشش تھی۔

☆☆☆

اس رات علینا کا زیادہ تر وقت بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتے ہی گزرا۔ اسے شدت کے ساتھ اپنی غلطی کا احساس ستا رہا تھا۔ جس تعلق کو وہ اب تک محبت سمجھتی آئی تھی،

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک لازوال تحریر

اندھیری رات کے مُسافر 325/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 150/-
ہم نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 380/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے 350/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد 200/-
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت 325/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یُوسف بن تاشفین 325/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 325/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 350/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 300/-
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 350/-
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمدؐ بن قاسم 300/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 180/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں ہندوؤں اور ان کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 280/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 325/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 150/-
گاندھی جی کی مہا آتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 225/-
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 325/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بُک ڈپو
061-4781781 022-2780128
051-35539609 021-2765086
042-37220879 041-2627568

وہ محض ایک گمان تھا... جواد کے ساتھ زندگی گزارنے کا خیال اب اسے محال محسوس ہو رہا تھا مگر آج اس کے رویّے نے اسے کچھ خوف زدہ بھی کر دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اس کا انکار نہ جانے کیا قیامتیں ڈھائے... یہ نہیں کہ اسے محض اپنی فکر تھی بلکہ وہ جواد کے لیے زیادہ فکرمند تھی۔ اس کا رویّہ اور اس کا انداز ہرگز نارمل نہیں تھا۔

آذر کے بارے میں اس کے خیالات جان کر وہ مزید اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ صبح جب آذر سے تھراپی کے سلسلے میں اس کی ملاقات ہوگی تب نہ جانے وہ اس کے ساتھ پہلے والا رویّہ برقرار رکھ پائے گی یا نہیں... باوجود کوئی غلطی نہ ہونے کے، وہ اپنے آپ کو چور سا محسوس کر رہی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ آذر غیر معمولی طور پر حساس ہے... ذرا سی بات بھی وہ فوری نوٹ کر لے گا۔

اس کا علاج ایسے مرحلے پر تھا کہ ذرا سی بات بھی بہت بڑی رکاوٹ کھڑی کر سکتی تھی... بلکہ اسے بہت پیچھے لے جا سکتی تھی۔ اس وقت سارا کھیل اس کی ہمت اور قوتِ ارادی کا تھا۔ اس مرحلے پر اگر وہ ہمت ہار بیٹھتا تو اس کی معذوری ہمیشہ کے لیے اس پر حاوی ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے درخواست کرنے پر علینا نے اسے پورٹریٹ کے لیے منع نہیں کیا تھا۔

صبح آذر اپنے فزیوتھراپی سیشن کے دوران زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ وہ کچھ الجھا الجھا اور اپنی سوچوں میں کھویا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ علینا نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہ بھی رات کو ٹھیک سے سو نہیں پایا تھا... لیکن اس کی بے چینی کی وجوہات مختلف تھیں۔ دو روز بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج ہو کر اپنی بہن کے گھر جانا تھا۔ ماریا نے شام کو اسے بتایا تھا کہ اس نے آذر کا سارا سامان اس کے فلیٹ سے اپنے گھر شفٹ کر لیا ہے۔

ماریا کا فلیٹ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بیڈروم ایک ہی تھا لہٰذا اس نے ڈرائنگ روم کا سارا سامان ٹی وی لاؤنج میں منتقل کر دیا اور ڈرائنگ روم میں آذر کا سامان سیٹ کر دیا تھا۔

”میں نے ڈرائنگ روم کے ایک حصے کو تمہارے بیڈ روم کے طور پر سیٹ کر دیا ہے۔“ ماریا نے خوشی خوشی اسے مطلع کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”اور دوسرے حصے میں تمہاری پینٹنگ وغیرہ کا سارا سامان اس طرح سجایا ہے کہ وہ بالکل تمہارا اسٹوڈیو دکھائی دے۔“

بہن کی بات سن کر آذر کے دل پر جیسے ایک گھونسا سا لگا... تو گویا اس کے ماضی کا وہ مختصر سا دور ختم ہو چکا تھا جس میں اس نے کامیابیاں اور شہرت سمیٹی تھی... زندگی کے اس نئے دور کا آغاز اس نے جس احساسِ طمانیت اور خودمختاری کے ساتھ کیا تھا، وہ اب یک دم عمر بھر کے احساسِ لاچاری میں بدل گیا تھا۔

یہ احساس اس کے لیے کسی جاں گسل عذاب سے کم نہیں تھا کہ معذوری کا شکار ہو کر وہ اپنی بہن کے لیے ایک بوجھ بن گیا تھا... وہ جانتا تھا کہ اس کے آرام کی خاطر وہ ہر تکلیف خوشی خوشی برداشت کر لے گی مگر وہ اس صورتِ حال پر سخت دل برداشتہ تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ رات بھر سو نہیں پایا تھا اور صبح اس کا ذہن سخت منتشر تھا... سیشن کے دوران وہ علینا کے خوب صورت چہرے کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس نے ناحق علینا سے پورٹریٹ بنانے کی بات کی... شاید یہ اس پُرخلوص سی لڑکی کے قیمتی وقت کا ضیاع ہی ثابت ہوتا۔

سیشن کے اختتام پر اس سے پہلے کہ وہ اپنے محسوسات کو زبان دے پاتا، علینا نے کہا۔

”میں بڑی بے صبری کے ساتھ منتظر ہوں کہ کب آپ گھر جائیں اور میرا پورٹریٹ بنانا شروع کریں۔“

”نہ جانے کیوں اب مجھے سب کچھ لاحاصل سا محسوس ہو رہا ہے۔“ آذر نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

”یہ غلط ہے... اب آپ پیچھے نہیں ہٹ سکتے آذر صاحب!“ علینا ایک لمحے کو چونکی مگر پھر اس نے بشاشت کے ساتھ کہا۔ ”شاید آپ کو میری بات غیر منطقی سی لگے لیکن میرا ایمان ہے کہ سچی لگن ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ میں اس کی کوئی سائنسی توجیہہ نہیں پیش کر سکتی مگر سائنس ہی تو سب کچھ نہیں... بہت ممکن ہے کہ آپ پوری طرح اپنے کام میں غرق ہوں اور... اچانک آپ پر انکشاف ہو کہ آپ کا سیدھا ہاتھ کام کرنے لگا ہے... مثلاً پینٹنگ کے دوران آپ کو کسی دوسرے برش یا ٹیوب اٹھانے کی ضرورت پیش آتی ہے اور آپ بے خیالی میں سیدھا ہاتھ بڑھا کر وہ چیز اٹھا لیتے ہیں...

”یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی عورت اولاد کی جانب سے مایوس ہو کر کوئی بچہ گود لے لیتی ہے اور پھر اچانک ایک روز اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود ماں بننے والی ہے۔“

علینا اس قدر جذب کے عالم میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی کہ آذر ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ معجزے آج بھی رونما ہو سکتے ہیں... بس شرط یہ ہے کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوا جائے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد علینا نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

اس کی باتوں نے اس لمحے آذر کے دل کو چھو لیا۔ اپنی بے یقینی اور ناامیدی پر وہ دل ہی دل میں شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ علینا کے عقیدے کی پختگی نے اس کے دل کو بڑا حوصلہ بخشا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ زیادہ دیر تک رنگوں اور کینوس سے جدا نہیں رہ پائے گا... بلکہ شاید یہ جدائی وہ کبھی نہ برداشت کر پائے۔

☆☆☆

آذر اسپتال سے رخصت ہو کر ماریا کے ساتھ اس کے گھر شفٹ ہو چکا تھا۔ ماریا نے اس کے کمرے کی ترتیب کچھ اس طرح رکھی تھی کہ اسے کسی چیز کی پریشانی نہ ہونے پائے۔ ماریا کے شوہر کی بھی یہی کوشش تھی کہ وہ گھر میں ایسی فضا قائم رکھے جس سے آذر کو ہر دم اپنائیت اور بے تکلفی کا احساس ہو... وہ بھی آذر کی حساس طبیعت سے بہ خوبی واقف تھا۔

ان دونوں کا ساتھ آذر کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھا... لیکن اس کے تنِ مردہ میں نئی روح پھونکنے والی ہستی علینا کی تھی۔ اگر وہ یہ خیال اس کے دل میں نہ ڈالتی کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے بھی کام لے سکتا ہے تو شاید وہ معذوری کو اپنا مقدر جان لیتا۔

صرف بائیں ہاتھ سے کام کرنا مشکل ضرور تھا لیکن چونکہ اس کے دل میں لگن قائم تھی، لہٰذا رفتہ رفتہ وہ اسکیچنگ اور پینٹنگ میں اپنی کھوئی ہوئی مہارت حاصل کرتا جا رہا تھا... فزیوتھراپی کے سلسلے میں اب بھی روزانہ ہی علینا سے اس کی ملاقات ہوتی تھی اور وہ بڑی خوشی سے اسے اپنی پیش رفت کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔

علینا اس کی کامیابیوں پر یوں خوش ہوتی تھی، گویا وہ اس کی اپنی کامیابی ہو... حقیقت بھی یہی تھی کہ یہ علینا کی کوششوں کا ہی ثمر تھا اور آذر کو بھی اس کا اعتراف تھا۔

یوں بالآخر وہ دن بھی آ پہنچا جب آذر کو علینا کا پورٹریٹ شروع کرنا تھا۔

”آئیے مس علینا!“ ماریا نے علینا کے لیے دروازہ کھولتے ہی کہا۔ ”ہم بڑی بے چینی کے ساتھ آپ کے منتظر تھے۔“ اس کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

”السلام علیکم!“ علینا نے فلیٹ کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آج آپ نے مجھے مس علینا کیوں بنا دیا... اور یہ آپ جناب کا تکلف؟“

”بھئی، آج آپ پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئی ہیں نا۔“ ماریا نے گویا اس کی ناسمجھی پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔

آذر سامنے ہی کھڑا تھا۔ جونہی علینا کی نظریں اس سے ملیں... اس کی آنکھوں میں اپنے لیے بے پناہ ستائش محسوس کر کے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

”میں آج پہلی مرتبہ آپ کو اسپتال کے سفید کوٹ کے بغیر دیکھ رہا ہوں۔“ آذر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے احساس ہو رہا ہے کہ آپ کو اس بے ڈھنگی چیز میں ملفوف رکھنا بہت بڑا جرم ہے۔“

تعریف کے اس انوکھے انداز پر علینا کو یک دم ہنسی

شکرگزاری

ہم دن میں کئی مرتبہ اپنے ملنے والوں سے رسماً پوچھتے ہیں۔ ”کیا حال ہے؟“ اور وہ رسماً جواب دیتے ہیں۔ ”اللہ کا شکر ہے۔“ نہ حال پوچھنے والے کو اس شخص کے حال سے کوئی خاص دلچسپی ہوتی ہے اور نہ عموماً حال بتانے والے کا حال اتنا اچھا ہوتا ہے جتنا اس کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے۔ بس ایک رسمِ دنیا ہے جو چلی آ رہی ہے!

مگر کچھ سادہ لوح ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن سے آپ حال پوچھ بیٹھیں تو وہ اپنی صحت کے حوالے سے پورا بلیٹن جاری فرما دیتے ہیں۔ ”کھڑے کھڑے چکر آتے ہیں، بلڈ پریشر نارمل نہیں ہو رہا، کل میں سودا سلف لینے بازار گیا تو دکان پر ہی گر پڑا اور ایک ہمسایہ اٹھا کر گھر لایا۔“

آپ اس کے جواب میں تاسف کا اظہار کرتے ہیں اور یہ تلقین بھی کہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور پھر جانے کے لیے ان سے اجازت طلب کرتے ہیں مگر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اب وہ آپ کو جانے دیں، آپ حال جو پوچھ بیٹھے ہیں چنانچہ وہ باقی ماندہ حال بھی سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ”چھوٹے بچے کو خسرہ نکلا ہوا ہے، بڑا بیٹا کل موٹر سائیکل کھمبے میں مار بیٹھا، ابھی موٹر سائیکل کی قسطیں بھی رہتی تھیں، چلو اللہ کا شکر ہے جان تو بچ گئی!“

رسماً تو دل میں ہم لوگ کئی دفعہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں سے یہ شکر صرف اس وقت ادا ہوتا ہے جب ہم کسی بڑے حادثے میں ہڈی پسلی تڑوا بیٹھتے ہیں۔ کچھ لوگ تو اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ”خالو جان کار کے حادثے میں فوت ہو گئے مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آنکھیں بچ گئیں۔“ انسان بھی اللہ کی عجیب مخلوق ہے، خوشی کے موقع پر رسمی اور غمی کے موقع پر اللہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے۔ لگتا ہے اسے حسن سلوک کچھ زیادہ راس نہیں آتا!

(اقتباس عطاالحق قاسمی کی کتاب ”ہنسنا رونا منع ہے“۔ تلاش و جستجو ولید بلال)

آ گئی... ”آپ نہیں جانتے کہ اس طرح نت نئے ملبوسات کے خرچے سے کتنی بچت ہو جاتی ہے۔“ اس نے کہا۔

ماریا ان دونوں کو کمرے میں بٹھا کر چائے لینے چلی گئی۔

”آپ بالکل ایزی ہو کر بیٹھیں۔“ آذر نے علینا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آج میں صرف مختلف زاویوں سے آپ کے اسکیچز بناؤں گا۔ اس کے لیے آپ کو ساکت ہو کر بیٹھنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں ایک آدھ منٹ کے لیے آپ کو کسی پوز کو قید کرنے کے لیے ساکت رہنے کو کہوں گا اور بس...“

”اوہ...!“ علینا نے گویا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سچ بتاؤں... میں تو آنے سے پہلے بڑی نروس ہو رہی تھی مگر یہ تو بڑا آسان کام محسوس ہو رہا ہے۔“

آذر اپنے گھٹنوں پر ایک اسکیچ بورڈ رکھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اسے آج بھی ایک ہاتھ سے کام کرنے میں بڑی الجھن محسوس ہوتی تھی اور وہ بھی بائیں ہاتھ سے... کبھی کبھی تو کسی معمولی کام کو انجام دینے میں بھی اسے کافی دیر لگ جاتی تھی مگر اس نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے رفتہ رفتہ، تحمل مزاجی کے ساتھ اسکیچ بورڈ پر کاغذ لگانے اور بورڈ کو متوازن رکھنے کی پریکٹس کر لی تھی۔

اس نے علینا کا اسکیچ بنانا شروع کر دیا۔ چند منٹوں کے بعد ماریا بھی ایک ٹرے میں چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے وہاں آن پہنچی۔ اس نے حسبِ عادت دوستانہ انداز میں علینا سے بات چیت شروع کر دی۔

علینا اپنی نشست سے ٹیک لگائے، چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بے فکری کے ساتھ ماریا سے گفتگو میں مصروف تھی... آذر خاموشی سے اسکیچ بنانے میں مصروف تھا۔

ہلکی پھلکی گفتگو اور خالصتاً گھریلو ماحول علینا کو بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا... اس وقت وہ اپنی ساری فکریں اور پریشانیاں بھول گئی تھی... حتیٰ کہ کچھ دیر کے لیے وہ جواد سے متعلق تمام تفکرات اور خدشات کو بھی بھلا بیٹھی تھی جن سے ان دنوں وہ ہر لمحہ دوچار رہتی تھی۔

”ذرا اسی پوز میں بیٹھی رہیے گا۔“ اچانک آذر نے مضطرب سے لہجے میں کہا۔ ”بس ایک سیکنڈ... ہلیے گا مت۔“

علینا بڑی فرماں برداری کے ساتھ ایک دم ساکت ہو گئی۔

”گڈ!“ چند لمحوں کے بعد آذر نے کہا۔ ”اب آپ آرام سے بیٹھیں۔ مجھے آپ کا یہ پوز بہت اچھا لگا تھا... آپ کا سر ذرا سا ماریا کی جانب جھکا ہوا اور آنکھوں میں مسکراہٹ کی جھلک!“

باتوں میں وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ علینا کو احساس ہی نہیں ہو سکا۔ اس دوران آذر اس کے چہرے کی آؤٹ لائن تقریباً مکمل کر چکا تھا۔ دفعتاً علینا کی نظر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی جانب گئی تو وہ ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”اوہو... اس قدر وقت گزر گیا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”مجھے تو آدھا گھنٹا پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔“

”ہمارا تو خیال تھا کہ آپ کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیں گے۔“ آذر نے کچھ مایوسی کے ساتھ کہا۔ ”لیکن آپ لیٹ ہو رہی ہیں تو خیر...!“

”کوئی بات نہیں... کھانا پھر کبھی سہی۔“ علینا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”تو پھر وعدہ رہا کہ آئندہ سٹنگ پر آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گی؟“ آذر نے پراُمید نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”پکا وعدہ!“ علینا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”دراصل آج کا کھانا میں جواد کے ساتھ کھانے کا وعدہ کر چکی ہوں۔“

”اوہ!“ ماریا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ”میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آپ کی منگنی ہو گئی... کیا جلد ہی شادی کا ارادہ ہے؟“

”نہیں... فی الحال ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ علینا نے کہا۔ ”ابھی تو میں لائف انجوائے کرنا چاہتی ہوں، اپنا پورٹریٹ مکمل کرانا چاہتی ہوں... اور اگر پورٹریٹ بنوانا اتنا ہی پُرلطف کام ہے تو میں اپنے سارے مریضوں کو اس کا مشورہ ضرور دوں گی۔“ وہ ہنسی اور انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

وہ تقریباً اڑتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتری... وہ جواد کو اپنی آج شام کی اس مصروفیت کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی تھی مگر چونکہ اب وہ ذرا لیٹ ہو چکی تھی، لہٰذا اسے پوری توقع تھی کہ وہ کرید کرید کر اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھے گا کہ آخر وہ تھی کہاں؟ اور اگر وہ اسے مطمئن نہ کر پائی تو اس قدر اُداس اور دل گرفتہ دکھائی دے گا جیسے اس نے کوئی قیامت ڈھا دی ہو... اور اگر اس نے سچ سچ بتا دیا، تب بھی کچھ ایسا ہی ردِعمل متوقع تھا۔

☆☆☆

علینا کے جانے کے بعد ماریا نے آذر کے بنائے ہوئے اسکیچز کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”بہت پیاری لڑکی ہے اور بالکل سادہ مزاج ہے... ہے نا؟“

”ہوں۔“ آذر نے غائب دماغی کے ساتھ جواب دیا۔ وہ اب تک اپنی ڈرائنگ میں کھویا ہوا تھا۔

”یہ تو بتاؤ کہ اس کا منگیتر کیسا ہے؟ تم تو اس سے ملے ہو گے؟“ ماریا نے پوچھا۔

”کون... ڈاکٹر جواد؟“ آذر نے اپنے تصورات کی دنیا سے باہر آتے ہوئے چونک کر کہا۔ ”ہاں... بہت گڈ لکنگ اور ہینڈسم ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے... مگر میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ وہ ہے کیسا؟“ ماریا نے گویا ڈاکٹر جواد کی خوب صورتی اور وجاہت کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا کیونکہ وہ ایک لیے دیے رہنے والا شخص ہے۔“ آذر نے کہا۔ ”اپنے مریضوں سے وہ زیادہ بے تکلف ہونا شاید پسند نہیں کرتا۔“

”اوہ!“ ماریا نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”علینا تو اس کے بالکل برعکس طبیعت کی مالک ہے... اس نے اپنے لیے ایسے شخص کو کیسے پسند کر لیا؟“

”اس کی مرضی بھئی... تمہیں اتنی تشویش کیوں ہو رہی ہے؟“ آذر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”تو کیا نہیں ہونی چاہیے؟“ ماریا نے ملامت آمیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”مجھے تو یہ ڈاکٹر جواد کچھ ٹھیک آدمی نہیں لگتا... اور تم نے دیکھا، علینا نے کس طرح قطعیت کے ساتھ کہا تھا کہ فی الحال اس کا شادی کا کوئی ارادہ نہیں... ہو سکتا ہے کہ وہ اس منگنی کو ہی توڑ دے۔“

”میرے خدا!“ آذر نے اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ خواتین کتنی جلدی فیصلے صادر کر ڈالتی ہیں... وہ بھی دوسروں کی زندگیوں کے بارے میں۔“

ماریا جواب میں اسے گھورتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

علینا ابھی راستے ہی میں تھی کہ اس کے موبائل پر جواد کا فون آ گیا۔ ”تیار ہو گئیں؟“ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ”میں تو تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔“

”ابھی نہیں۔“ علینا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”بس تھوڑی دیر میں۔“

”کیا تم کہیں باہر ہو؟“ جواد نے شاید ٹریفک کا شور سن لیا تھا۔

”ہاں... میں بس پانچ منٹ کے اندر ہاسٹل پہنچ جاؤں گی۔“ علینا نے محتاط انداز میں کہا۔

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم میرا انتظار کر رہی ہو گی؟“ جواد کے لہجے سے برہمی عیاں تھی۔ ”مگر تم تو نہ جانے کہاں گھومتی پھر رہی ہو۔“

”اگر دیر ہو گئی ہے تو آج کا ڈنر ملتوی کر دیتے ہیں۔“ علینا نے کہا۔

”نہیں، نہیں...“ جواد نے جلدی سے کہا۔ ”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“ علینا نے پوچھا۔

”بہت خاص!“ جواد نے کہا۔ ”تم ہاسٹل پہنچ کر جلدی سے تیار ہو جاؤ... تیار ہوتے ہی مجھے کال کر دینا، میں گاڑی میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”او کے!“ علینا نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

پہلے پہل تو اسے جواد کا اس طرح افراتفری کے عالم میں احکامات جاری کرنا بُرا نہیں لگتا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے وہ الجھن سی محسوس کرنے لگی تھی۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے افراتفری کے عالم میں الماری سے دوسرا لباس نکالا اور جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ اس مرتبہ اپنی تیاری میں اسے زیادہ اہتمام سے کام لینا تھا... کیونکہ جواد کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کہیں باہر جائے تو زیادہ سے زیادہ بنی سنوری اور خوب صورت دکھائی دے۔

آدھے گھنٹے بعد وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہاسٹل کے گیٹ کی جانب بڑھی۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا مگر اس نے گیٹ کے باہر جواد کی گاڑی کی جھلک دیکھ لی تھی، لہٰذا اس نے کال کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور باہر نکل گئی۔

گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر وہ جواد کے برابر سیٹ پر بیٹھی تو وہ چند لمحوں تک ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا پہلی بار دیکھا ہے؟“ علینا نے اس کی محویت پر جھینپتے ہوئے کہا۔

”جب بھی تمہیں دیکھتا ہوں، یوں لگتا ہے کہ جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“ جواد نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں واقعی دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں کہ اتنی خوب صورت لڑکی میری بیوی بننے جا رہی ہے۔“

”اب میری تعریفیں ہی کرتے رہو گے یا گاڑی بھی اسٹارٹ کرو گے؟“ علینا نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”ہم پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکے ہیں۔“

''ہاں...اس بات پر تو میرا موڈ سخت خراب تھا۔'' جواد نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہیں دیکھتے ہی میں سب کچھ بھول گیا۔''

ریسٹورنٹ پہنچ کر علینا نے پوچھا۔ ''وہ کون سی خاص بات ہے جو تم مجھ سے کرنا چاہتے تھے؟ جلدی سے بتاؤ، مجھے تو سخت بے چینی ہو رہی ہے۔''

''ایک تو تم لڑکیوں کو ہر بات کی بہت جلدی رہتی ہے۔'' جواد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک اہم بات ایسی ہے جس کی تم سے زیادہ مجھے جلدی ہے... حالانکہ یہ بھی خالصتاً لڑکیوں ہی کا شعبہ ہے۔''

''تم تو پہیلیاں بجھوانے لگے... کوئی بات نہیں، آرام سے بتا دینا... میں اصرار نہیں کرتی۔'' علینا نے شرارتی انداز میں اسے اکسایا۔

''میں تو کب سے تمہارے اصرار کا منتظر ہوں۔'' جواد نے یکایک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ مما کی طبیعت اب کچھ ٹھیک نہیں رہتی اور... اور وہ چاہتی ہیں کہ کم از کم ہمارا نکاح ہو جائے۔''

''کیا؟'' علینا اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

''اس میں اس قدر حیرانی کی کیا بات ہے؟'' جواد نے غور سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف نکاح کے لیے کہہ رہا ہوں، رخصتی ہم تمہارے پاپا کے آنے کے بعد ہی کریں گے۔ اس طرح میری ماں اور تمہارے والد... دونوں کی خواہش پوری ہو جائے گی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اس قدر جلدی کیوں ہے؟'' علینا نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''جبکہ ایسے فیصلے ہمیشہ سوچ سمجھ کر کیے جاتے ہیں۔''

''فیصلہ تم کر چکی ہو علینا۔'' جواد نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب تم پیچھے نہیں ہٹ سکتیں۔''

''جواد پلیز... مجھے مجبور نہ کرو۔ فی الوقت میں ایسا کوئی فیصلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' علینا نے عاجز ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں... مگر اس دو ٹکے کے آرٹسٹ کے فلیٹ پر جا جا کر تصویریں بنوانے کی پوزیشن میں ضرور ہو۔'' جواد نے گویا زہر میں بجھے لہجے میں کہا۔

اس کی بات پر علینا چند لمحوں کے لیے گنگ ہو کر رہ گئی۔ ''کک... کیا؟'' بہ مشکل تمام اس کے منہ سے نکلا۔ ''تو اس کا مطلب ہے کہ تم میری جاسوسی میں رہتے ہو؟''

''میں تمہاری فکر کرتا ہوں... اب تم اسے جاسوسی سمجھ لو یا کچھ اور۔'' جواد نے بہ دستور اسی لہجے میں کہا۔ ''یہ بات میں قطعی برداشت نہیں کر سکتا کہ آذر جیسا کوئی شخص تمہیں مجھ سے چھین لے۔''

علینا چند لمحوں تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تو بہتر یہی ہو گا کہ ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو... ہو سکتا ہے کہ میں تمہارا درست انتخاب نہ ثابت ہو سکوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم انکار کر رہی ہو۔'' جواد نے برہمی کے ساتھ کہا۔ ''تمہاری نظر میں ہماری منگنی کی بھی کوئی اہمیت نہیں؟''

''میں کوئی انکار کر رہی ہوں اور نہ اقرار۔'' علینا نے تحمل کے ساتھ کہا۔ ''میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہمیں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے... کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تاعمر پچھتانا پڑے۔''

جواد شاید پھر کوئی سخت بات کہنا چاہتا تھا مگر اسی وقت ویٹر آ گیا... اور وہ خاموش بیٹھا دل ہی دل میں کچھ منصوبے باندھنے لگا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج کی اس خوب صورت شام کا آغاز اس طرح ہو گا۔'' ویٹر کے ٹیبل سیٹ کر کے جانے کے بعد جواد نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو نہ جانے کیا کیا سوچ رکھا تھا۔''

پچھتاوے اور پشیمانی کے ایک عجیب سے ملے جلے احساس نے علینا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا... اس کا جی چاہ رہا تھا کہ فوراً وہاں سے اٹھ جائے... مگر وہ صورتِ حال کو مزید بگاڑنا نہیں چاہتی تھی لہٰذا اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''دیکھو، تم میری باتوں سے کوئی غلط مطلب اخذ کرنے کی کوشش مت کرو... میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیتی... میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ ہم دونوں پورے یقین کے ساتھ ایک دوسرے کو اپنی زندگی میں شامل کریں۔ جب ہم کسی کو چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی خامیوں اور کمزوریوں سے بھی سمجھوتا کرنا پڑتا ہے... لیکن مجھے ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود میں تمہارے معیار پر پوری اترنے میں کامیاب ہو سکی اور نہ تم اس پر سمجھوتا کرنے میں... اور یہی ہمارے تعلق میں بہت بڑی کمی ہے۔''

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے کہ میں تمہارے معیار پر پورا اترنے میں کامیاب نہیں ہو پایا۔'' علینا کی وضاحت کو خاموشی سے سننے کے بعد جواد نے کچھ اداسی اور بیزاری کی سی کیفیت میں کہا۔

اس کا یہی رویہ علینا کو دکھ پہنچاتا تھا... مگر وہ جانتی تھی کہ اسے کچھ سمجھانا اور قائل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ لہٰذا بات ختم کرنے کی غرض سے اس نے کہا۔ ''چلو، چھوڑو ان باتوں کو... تم اپنا موڈ ٹھیک کرو اور کھانا کھاؤ... سب ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

جواد نے ایک گہری سانس لی اور سر جھٹک کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ علینا بھی سر جھکا کر چند ایک لقمے حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کرنے لگی... دونوں اپنی اپنی جگہ آزردہ اور سوچوں میں گم تھے۔ علینا سخت الجھن میں گرفتار تھی کہ نہ جانے کون سا قدم اٹھانا درست ہے۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ ایک ہی جھٹکے میں تعلق توڑنا زیادہ تکلیف دہ عمل ہو گا لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا آہستہ آہستہ اور نرمی کے ساتھ دامن چھڑانے کا طریق کار بھی آخر میں جواد کو کچھ کم تکلیف نہیں پہنچائے گا... دوسری جانب جواد سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس سے کہاں غلطی ہوئی تھی؟ علینا جیسی سیدھی سادی لڑکی کے لیے یہ کیونکر ممکن ہوا کہ وہ اس کی شخصیت کے سحر سے باہر نکل کر کچھ سوچ سکے۔

'خیر جو ہوا سو ہوا...' وہ دل ہی دل میں منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ 'مگر اب میں کسی نہ کسی طرح اسے ٹھیک کر لوں گا!'

☆☆☆

اگلی صبح علینا بہ ظاہر اسی طرح چاق و چوبند اور خوش گوار موڈ میں تھی۔ جب آذر اپنی تھراپی کے لیے اس کے پاس پہنچا تو اس نے پہلے ہی کی طرح خوش مزاجی سے اس کا استقبال کیا لیکن آذر نے نوٹ کر لیا کہ وہ اندر ہی اندر کچھ ڈسٹرب ہے۔ اس کی ذہین اور باریک بین نگاہوں سے علینا کی پریشانی چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں تیرتی اُداسی کی وہ لہر دیکھ لی تھی جسے وہ چھپانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

علینا کی اس کیفیت کو محسوس کرتے ہی آذر کو نہ جانے کیوں یقین ہو گیا کہ اس کا ذمے دار ڈاکٹر جواد ہے۔ یکایک اسے ڈاکٹر جواد پر غصہ آنے لگا... اس شخص کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ علینا جیسی پیاری اور معصوم لڑکی کا دل دُکھائے۔ آخر وہ بے شمار لوگوں کے لیے ایک مسیحا کی حیثیت رکھتی تھی... خود اس کے لیے بھی وہ کسی آئیڈیل سے کم نہیں تھی۔

وہ اس وقت بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے ہچکچا رہا تھا کہ علینا اس کے لیے ان سب باتوں سے بڑھ کر مقام اور حیثیت رکھتی ہے... وہ چپکے چپکے، غیر محسوس انداز میں اس کے دل کی مسند پر براجمان ہو چکی ہے۔

تھراپی کے دوران ان کے درمیان بہت کم بات ہوئی لیکن تھراپی کے اختتام پر جب آذر اپنی جگہ سے اٹھا، تب یکایک ایک فوری خیال کے تحت علینا سے مخاطب ہوتے ہوئے مسکرایا۔ ''آج رات سات بجے ہم آپ کے منتظر رہیں گے۔'' اس نے انتہائی خوش دلی کے ساتھ کہا۔ ''دراصل ان دنوں ماریا کے اندر چھپا ممتا کا جذبہ پورے عروج پر ہے، لہٰذا اس نے تجویز کیا ہے کہ آپ کو اور مجھے بھرپور غذائیت والے کھانوں کی سخت ضرورت ہے... کیونکہ ہم محنت بہت کرتے ہیں اور اپنی غذا کا خیال بالکل نہیں رکھتے۔ سو آج اس نے ہم دونوں کی دعوت کا انتظام کیا ہے۔ وقت پر پہنچ جائیے گا، انکار بالکل نہیں سنا جائے گا۔ ہاں، یہ میرا وعدہ ہے کہ واپسی پر میں آپ کو لیٹ نہیں ہونے دوں گا۔''

اس کی طویل گفتگو کے اختتام پر علینا بے اختیار مسکرا دی... اور آذر نے دیکھا کہ اس کے خوب صورت نقوش کے پیچھے چھپا ہوا تناؤ ایک دم کم ہو گیا ہے۔ اس نے آذر سے وقت پر آنے کا وعدہ کر لیا۔

اسپتال سے گھر واپس جاتے ہوئے وہ ایک سپر اسٹور پر ٹھہرا۔ اب اس نے جوش میں آ کر علینا کا موڈ بدلنے کے لیے ماریا کی جانب سے دعوت تخلیق کر ڈالی تھی تو اس کے لیے خریداری بھی لازمی تھی۔ اس قسم کی خریداری کا اسے اچھا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔ شادی سے پہلے ماریا اکثر اسے لسٹ تھما دیا کرتی تھی اور اس کی شادی کے بعد وہ خود اپنے لیے خالصتاً گھریلو قسم کی شاپنگ کرتا رہا تھا۔ آج بھی اس نے اپنی مرضی سے بہت ساری چیزیں خرید ڈالیں... آخر وعدہ نبھانا تھا اور بہت خوبی کے ساتھ نبھانا تھا، لہٰذا اس نے ماریا کی پسند کا بھی خیال رکھا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو ماریا اس کے ہاتھ میں ڈھیر سارے شاپرز دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جب آذر نے اسے سارا واقعہ بتایا کہ کس طرح وہ اس کی جانب سے علینا کو مدعو کر بیٹھا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ زیادہ خوشی اسے اپنے بھائی کے چہرے پر چھائی ہوئی شفق کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ یہ راز پانے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ اس کا حساس اور سادہ دل بھائی علینا کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔

اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد ایک دبا دبا سا ڈر بھی ماریا کے دل میں سر اٹھا رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں

دعا گوتھی کہ خدا اس کے بھائی کی خوشیوں کو قائم رکھے۔ علینا بہر حال کسی اور سے منسوب تھی... مگر وہ جو کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

اس روز علینا کو بھی بے چینی سے شام ہونے کا انتظار تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد ایک بار پھر اسی اپنایت بھرے ماحول میں پہنچ جائے جہاں اسے بے حد سکون کا احساس ہوتا تھا۔ اسے کبھی ایسے ماحول میں رہنے یا جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا جسے صحیح معنوں میں ''گھر'' کا نام دیا جا سکتا... یہی وجہ تھی کہ اس چھوٹے سے گھر نے اسے اپنا اسیر کر لیا تھا۔

اس حقیقت کو بھی وہ بہ خوبی سمجھتی تھی کہ کسی مکان کو اس کے مکین ہی ''گھر'' میں بدل سکتے تھے... لہٰذا وہ اس گھر میں رہنے والوں کا جادو تھا جو اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

جب وہ تقریباً سات بجے ماریا کے گھر پہنچی تو اس کا چہرہ اس قدر دمک رہا تھا کہ آذر کو ایک بار پھر اس پر سے نظر ہٹانی مشکل ہو گئی۔ ماریا نے یہ بات نوٹ کر لی تھی اور علینا کچھ جھینپ سی گئی۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد علینا آذر سے مخاطب ہوئی۔

''میں آج بھی وہی ڈریس پہن کر آئی ہوں جو پچھلی مرتبہ پہنے ہوئے تھی۔'' اس نے کہا۔ ''اس بارے میں، میں آپ سے پوچھنا بھول گئی تھی کہ اس سے کوئی فرق پڑتا ہے یا نہیں؟''

''نہیں۔'' آذر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ پورٹریٹ صرف آپ کے چہرے کا ہے، اس میں آپ کے کپڑے دکھائی نہیں دیں گے... ویسے یہ بہت اہم نکتہ ہے اور شاید آپ کے علاوہ کسی اور کے ذہن میں یہ سوال نہیں آ سکتا تھا۔''

اس کے تعریفی انداز پر علینا ایک بار پھر جھینپ گئی... مگر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے تو آپ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس پورٹریٹ میں کتنے دن لگیں گے؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یا دس دن۔'' آذر نے جواب دیا۔ ''اسکیچ میں نے تیار کر لیا ہے، آج سے پینٹنگ کا آغاز ہوگا۔''

''اچھا!'' علینا نے کچھ تعجب سے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہی تھی کہ نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے گا۔''

''لگ بھی سکتا ہے۔'' آذر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل یہ کام کرنے والے پر منحصر ہے۔''

''ہاں، اس کے لیے میرے بھائی کی طرح جنونی ہونا ضروری ہے۔'' ماریا نے مسکراتے ہوئے محبت سے کہا۔ ''موصوف نے رات بھر جاگ کر اپنا کینوس اور پینٹنگ کا دوسرا سامان تیار کیا ہے۔''

''خیر... رات بھر تو نہیں جاگا۔'' آذر نے جلدی سے کہا۔ ''لیکن تمہیں کیسے معلوم؟''

''ماں جیسی بہنوں کو سب معلوم ہوتا ہے۔'' ماریا نے اتراتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اب کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے... پہلے کھانا اور بعد میں کام۔''

ماریا نے کئی ڈشیں بنائی تھیں۔ ''آپ تو زبردست کھانا بناتی ہیں بھئی!'' علینا نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''جتنا اچھا گھر آپ نے ڈیکوریٹ کر رکھا ہے، اس سے کہیں زیادہ آپ کے ہاتھ میں ذائقہ ہے۔''

''ان دونوں باتوں کا کریڈٹ دراصل بابر کو جاتا ہے۔ ان کی مدد اور حوصلہ افزائی کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں یہ سب پسند آیا۔'' ماریا کے لہجے میں ایک ایسا احساسِ تفاخر تھا جو چاہنے اور چاہے جانے والوں کا خاصہ ہوتا ہے۔

''کون کافر ہوگا جو یہ سب پسند نہیں کرے گا؟'' علینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو آپ پر سخت رشک آ رہا ہے اور اس بات کی خوشی ہو رہی ہے کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں جو مجھے آپ جیسے دوست ملے۔''

''ارے، یہ تو تمہاری محبت ہے۔'' ماریا نے خوش خلقی سے کہا۔ ''لیکن اگر اس موقعے پر بابر بھی ہوتے تو میں انہیں خوب چڑاتی کہ دیکھیں ایسے ہوتے ہیں قدر دان۔''

''ارے ہاں... میں تو آپ سے پوچھنا ہی بھول گئی کہ بابر بھائی کہاں ہیں؟'' علینا نے کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''کل بھی گھر پر نہیں تھے۔''

''وہ آفس کے کام سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔'' ماریا نے بتایا۔ ''ایک ہفتے میں آ جائیں گے۔''

کھانے کے بعد ماریا کافی بنا کر لے آئی... کافی پیتے ہوئے آذر اپنی پینٹنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہر مرتبہ جب بھی وہ کوئی نئی پینٹنگ یا اسکیچ شروع کرنے والا ہوتا تھا تو اسی طرح پُرجوش اور بے چین سا ہو جایا کرتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے ہیجان کو دبائے ہوئے بیٹھا تھا اور بہ ظاہر نارمل دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بات اسے کسی معجزے سے کم محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ایک بار پھر پینٹنگ کرنے کے

قابل ہو گیا ہے۔

گو کہ اس کے لیے وہ تقریباً تین ماہ سے انتھک محنت کر رہا تھا لیکن اپنی اس کامیابی کا کریڈٹ وہ بہر حال علینا کو دیتا تھا... آج وہ ایک حقیقی پورٹریٹ شروع کرنے والا تھا۔

یہی سب باتیں سوچتے ہوئے وہ کافی کا مگ میز پر رکھنے کے بعد جوش کے عالم میں ایک دم اٹھا تو یہ بھول گیا کہ اس طرح کے مفلوج بازو کا وزن اس کا توازن بگاڑ سکتا ہے... اس کا یہ بازو اب تک سلنگ میں ہی رہتا تھا۔

وہ ایک دم لڑکھڑایا تو اس کے نزدیک بیٹھی ہوئی علینا نے جلدی سے لپک کر اسے سہارا دیا۔ اس نے گھبراہٹ کے عالم میں علینا کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کا بایاں بازو علینا کے گرد حمائل تھا۔ اس لمحے ماریا کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔

مگر دوسرے ہی لمحے وہ پُرسکون ہو گئی۔ ان دونوں کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی جس سے ان دونوں کے درمیان ایک نازک مگر گہرے تعلقِ خاطر کا اظہار ہوتا تھا۔ ماریا کا دل خوشی سے جھوم اٹھا... کیا اس کی زندگی کی ایک بہت بڑی خواہش پوری ہونے کا وقت آن پہنچا تھا... جو اس نے اپنے عزیز ترین بھائی کے لیے کی تھی؟

گو کہ آذر نے اسی لمحے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن وہ دونوں ہی مزید کئی لمحوں تک ایک دوسرے کو اس طرح دیکھتے رہے جیسے پہلی مرتبہ ملے ہوں۔ شاید یہی وہ لمحہ تھا جب ان دونوں نے درحقیقت ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

خصوصاً علینا کے لیے تو یہ تجربہ بڑا عجیب اور حیران کن تھا... وہ کئی ماہ سے آذر کا علاج کر رہی تھی۔ روزانہ ہی اس کے بازو، شانے اور مفلوج ہونے والے ہاتھ کا مساج کرتی تھی، اسے چھوتی تھی... مگر آج اس کے لمس نے گویا اسے ایک نیا احساس بخشا تھا۔ آج اس لمس میں ایک تعلقِ خاطر اور اپنایت کا احساس تھا جو اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس لمحے سے پیشتر... وہ اب تک یہی باور کرتی آئی تھی کہ اس نے جواد سے آذر کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ سچ ہے۔ وہ اور آذر ایک دوسرے کی محبت میں ہرگز مبتلا نہیں ہوئے تھے... مگر اب؟

اب وہ یقین کے ساتھ اس بارے میں پہلے کی طرح جواد سے بات نہیں کر سکتی تھی... بلکہ جواد سے کیا، وہ خود اپنے آپ سے سامنا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کچھ خفیف ہوتے ہوئے اپنے آپ کو آذر کی گرفت سے آزاد کرایا۔

آذر کے لیے بھی وہ لمحہ کسی شاک سے ہرگز کم نہیں

پھیکا پکوان

سردار ببر سنگھ کی شادی کی تقریب ایک بڑے ہوٹل میں ہو رہی تھی جس میں بڑی تعداد میں سکھ شریک تھے۔ ہر طرف پگڑیوں کی بہار نظر آ رہی تھی۔

ایک نوجوان سکھ نے کھانے کی میز پر سجی پلیٹوں پر رکھے ہوئے رنگا رنگ ٹشو پیپر دیکھے تو اسے گمان ہوا کہ وہ بھی کوئی ہلکی پھلکی ڈش ہے۔

کھانے کا آغاز ہوتے ہی اس نے پلیٹ سنبھال کر ٹشو پیپر کو سمیٹ کر لقمہ بنایا اور اسے منہ میں رکھنے ہی والا تھا کہ قرب و جوار سے اس کے کئی سکھ رشتے دار بیک آواز بولے ''اوئے سردارا! اسے مت کھا...... ہم کھا چکے ہیں...... یہ بالکل پھیکا اور بے مزہ ہے!''

فور وھیل

سردار جی اس دن سرور میں تھے۔ سوچا کہ سانڈنی پر دلی کی سیر کی جائے۔ انہوں نے اپنے کیس سنوارے، کنگھا جیب میں رکھا، پگڑی سر پر جمائی، بائیں کلائی میں کڑا پہنا اور کرپان کندھے سے لٹکا کر سانڈنی پر سوار، شہر کی سیر کو چل دیے۔

وہ جدھر سے گزرے، بھگدڑ مچ گئی، ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو گیا، پولیس والوں کی دوڑ لگ گئی۔ آخر کار دو گاڑیوں میں سوار پولیس والوں نے چاندنی چوک کے علاقے میں انہیں روک لیا۔

بحث کا آغاز ہی بہت تلخ تھا۔ چند مکالموں کے بعد ایک افسر غرایا ''تمہارا چالان ہوگا!''

''کس جرم میں؟'' سردار جی نے غصے سے پوچھا۔

افسر ٹپٹا کر رہ گیا۔ اسے تعزیرات ہند کی کوئی ایسی دفعہ معلوم نہیں تھی جس کے تحت وہ سردار جی کو پھانس سکتا۔

سردار جی اسے مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ افسر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا ''چالان ہوگا...... تم بغیر ہیلمٹ سواری کر رہے ہو۔''

''پرے ہٹ......'' سردار جی نے حقارت سے کہا ''دیکھتا نہیں کہ یہ چار پیروں والی سواری ہے، ہیلمٹ دو پہیوں پر سفر کرنے والوں کے لیے ہوتا ہے...... یہ فور وہیل ہے...... فور وہیل!''

انتخاب: ولید بلال، کراچی

تھا۔ ایک مرتبہ اس نے لڑکیوں کے بارے میں ماریا کے سوالات سے تنگ آکر....... کہا تھا کہ جب بھی زندگی میں ایسا لمحہ آیا کہ جسے محبت کہتے ہیں... میں اسے پہچان لوں گا اور پھر وہ میرے لیے دنیا کی ساری باتوں سے بڑھ کر اہم ہو گی... یہاں تک کہ میرے کام سے بھی زیادہ!

اور اب اس قدر اچانک... اور غیر متوقع طور پر اس کی زندگی میں وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ اس لمحے کی پرورش شاید اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی جب اس نے پہلی بار علینا کو دیکھا تھا۔

اچانک یہ آگہی اس کے لیے ایک شاک ثابت ہوئی تھی کہ وہ محبت میں مبتلا ہو چکا ہے، وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جو پہلے ہی کسی اور سے منسوب تھی... ایک بہت ماہر اور قابل فزیوتھراپسٹ تھی، ایک روشن مستقبل اور اچھی زندگی کی مستحق تھی! وہ کسی بھی طرح اس کی زندگی کے کسی خانے میں فٹ نہیں تھا۔

وہ دونوں ہی اس صورتِ حال پر اپنی اپنی جگہ کچھ الجھے ہوئے اور سہمے سہمے سے تھے... ماریا نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی غرض سے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کچھ ہلکی پھلکی گفتگو کی اور پھر آذر، علینا کو ساتھ لے کر اپنے اسٹوڈیو میں آگیا تاکہ پینٹنگ شروع کی جا سکے اور ماریا کچن کی جانب روانہ ہو گئی۔

علینا ایک نشست پر پہلے والے انداز میں بیٹھ گئی اور آذر رنگوں اور برش کے ساتھ الجھنے لگا... علینا اپنی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی ورنہ وہ فوراً یہ بات نوٹ کر لیتی کہ آذر کا ہاتھ دھیرے دھیرے کپکپا رہا ہے۔

کچھ دیر بعد جب ماریا چائے لے کر وہاں پہنچی تو ان دونوں کی عجیب و غریب کیفیت دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا... بہرحال، اس کی ذرا سی کوشش سے ان کے درمیان پہلے والی فضا لوٹ آئی اور وہ ایک بار پھر ہنسنے بولنے لگے۔

☆☆☆

اگلی صبح اسپتال جاتے ہوئے علینا کچھ عجیب و غریب سے محسوسات کا شکار تھی۔ سب کچھ نہ جانے کیوں اسے اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا... شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ رات وہ صحیح سے سو نہیں پائی تھی اور نہ صرف یہ کہ اس کے سر میں شدید درد تھا بلکہ وہ دل ہی دل میں سخت تاسف اور شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

پچھلی رات ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنے موبائل پر جواد کا فون موصول ہوا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنے خیالات میں الجھی ہوئی تھی، لہٰذا جواد کے تفتیشی انداز پر کہ وہ اب تک کہاں تھی، وہ ایک دم سلگ کر رہ گئی... جواد کی اس ہفتے نائٹ ڈیوٹی تھی لہٰذا وہ اس کی جانب سے بے فکر تھی۔ اس کے علاوہ وہ اسے بتا چکی تھی کہ اس ہفتے اسے پورٹریٹ کے لیے آذر کے گھر جانا ہوگا۔

اس وقت بھی علینا نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اسے مطلع کر دیا کہ آج وہ آذر کی بہن کے گھر کھانے پر مدعو ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس فضول شخص کی خوب حوصلہ افزائی کر رہی ہو۔" جواد نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا تھا۔ "یہ جاننے کے بعد بھی کہ میں یہ سب کچھ پسند نہیں کرتا۔"

"ہاں۔" علینا نے بھی جواباً تلخ لہجے میں کہا۔ "کیونکہ تھراپی کرنا میرا کام ہے اور وہ میرا مریض ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب کچھ اس کے علاج کا ہی ایک حصہ ہے... اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں اپنے فرض سے کبھی غفلت نہیں برتتی۔" یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

اب وہ دل ہی دل میں متاسف تھی کہ اسے جواد سے اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ دوسری جانب وہ آذر کے بارے میں اپنے محسوسات پر خفت کا شکار تھی... نہ جانے دل اس کی جانب کیوں کھنچا جا رہا تھا اور وہ خود یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے؟

آذر کا اس روز دوسرا نمبر تھا۔ اس کی باری آنے تک وہ کچھ پُرسکون ہو چکی تھی لیکن آذر کی حالت دیکھ کر وہ ایک دم چونک سی گئی... وہ بالکل زرد اور برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" اس نے فوراً پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" آذر نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "لیکن یہ شانہ رات بھر درد کرتا رہا ہے۔"

"اوہو... پھر تو آپ رات بھر سو بھی نہیں پائے ہوں گے۔" علینا نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ "اس پینٹنگ کی خاطر، لگتا ہے کہ آپ نے اپنی جان کو زیادہ ہی مشقت میں ڈال دیا ہے۔"

"ارے نہیں۔" آذر ہنسا۔ "کوئی ایسی ناقابلِ برداشت تکلیف نہیں ہے اور جو تھوڑی بہت ہے وہ شام تک آپ کے دیے ہوئے پین کلرز سے دور ہو جائے گی۔ میں تو بے تابی کے ساتھ منتظر ہوں کہ کب شام ہو اور میں اپنی پینٹنگ پر مزید کام کر سکوں۔" اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "آج شام آپ آ رہی ہیں نا؟"

"آج آپ آرام کر لیتے تو اچھا تھا۔" علینا نے کہا۔

"میں تو ابھی یہاں سے جانے کے بعد سو جاؤں گا... لیکن آپ کے ساتھ واقعی زیادتی ہے کہ سارا دن کام کرنے کے بعد کئی گھنٹے کے لیے مزید پابند کر دیا جائے۔" آذر نے کچھ شرمندگی کے ساتھ کہا۔ "ایسے موقعوں پر ہم آرٹسٹ شاید کچھ خود غرض ہو جاتے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو وہاں آنے کے بعد وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔" علینا نے کہا۔ "اور آپ کام کرنے کے لیے اس قدر پُرجوش ہیں تو میں ضرور آؤں گی۔"

"اگر میں کہوں کہ آج بھی آپ ذرا جلدی آ جائیں اور کھانا ہمارے ساتھ ہی کھائیں؟" آذر نے جلدی سے کہا۔

"کھانا میں کھا کر آؤں گی۔" علینا نے کہا۔ "کل ماریا نے اتنا تکلف کر لیا تھا لہٰذا آج پھر انہیں پریشان کرنا مناسب نہیں۔"

"اگر ماریا کے بجائے کھانا میں بناؤں تو؟"

"تب تو میں واقعی کھانا کھا کر ہی آؤں گی۔" علینا نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ "کیونکہ مجھے اپنی جان عزیز ہے۔"

آذر بے ساختہ ہنسا تو یہ محسوس کر کے وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی کہ ان کے درمیان پہلے والی فضا ایک بار پھر لوٹ آئی ہے... کل رات والے واقعے کے بعد جو ایک تکلف سا ان کے درمیان حائل ہو گیا تھا، اس کے خاتمے پر وہ خوش تھی۔

تھراپی سیشن ختم ہونے پر وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکلا تو علینا بھی آہستگی کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے کے دروازے تک آ گئی۔ وہ بوجھل بوجھل قدموں سے خود کو گھسیٹتا ہوا جا رہا تھا۔ علینا کے دل میں یک دم یہ خواہش شدت کے ساتھ ابھری کہ وہ دوڑ کر جائے اور آذر کا بازو تھام کر اس کے ساتھ کہیں دور نکل جائے۔

آذر کو علم نہیں تھا کہ وہ دروازے پر کھڑی اسے دیکھ رہی ہے۔ اس طویل راہداری سے گزرتے ہوئے وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ کل رات بھر وہ اپنے آپ سے لڑتا رہا تھا اور بالآخر اس نے خود کو سچ کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ پینٹنگ ختم کرتے ہی وہ خاموشی کے ساتھ علینا کی زندگی سے نکل جائے گا۔ بالکل اسی طرح... جیسے وہ کبھی اس کی زندگی میں آیا ہی نہ تھا۔ یہ فیصلہ بہت مشکل تھا۔ اسے کھونے کا درد درحقیقت اس کے لیے اپنی

آمر

کہتے ہیں ایک جنرل اپنی حجامت کے بارے میں بہت وہمی تھے۔ ایک ہی حجام سے بال کٹواتے تھے۔ مارشل لا لگانے کے بعد بھی انہوں نے اپنے پرانے حجام کو پاس بلا لیا۔ کچھ سال گزر گئے تو بال کاٹتے وقت حجام نے عجیب و غریب گفتگو کرنا شروع کر دی۔ کبھی کہتا۔ "جناب! آپ الیکشن کب کروا رہے ہیں؟" کبھی پوچھتا۔ "جناب! عوام سڑکوں پر کیوں نکل رہے ہیں؟" کبھی سوال کرتا۔ "جناب! آپ مارشل لا کب ختم کریں گے؟" ایک دو دفعہ تو جنرل نے ہوں، ہاں کر کے جواب دیا مگر جب حجام کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ حجام ضرور کسی سیاسی پارٹی کا ایجنٹ ہے۔ حجام کو گرفتار کرا دیا گیا۔ خوب مار پیٹ کے بعد اسے پھر جنرل کے سامنے لایا گیا تو جنرل نے پوچھا۔ "ہاں! اب بتاؤ تم کس سیاسی پارٹی کے ایجنٹ ہو؟"

حجام نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جناب میری دس پشتوں میں کسی نے سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ میں کسی سیاسی پارٹی کا ایجنٹ کیوں بنوں گا؟"

جنرل نے پوچھا۔ "تو پھر تم بال کاٹتے وقت عوام، سیاست، الیکشن اور جمہوریت کی باتیں کیوں کرتے ہو؟"

حجام نے کہا۔ "وہ اس لیے جناب! میں عوام اور جمہوریت کا نام لیتا ہوں تو فوراً آپ کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں، مجھے کاٹنے میں آسانی رہتی ہے۔"

معذوری سے بھی زیادہ تھا لیکن اس درد کو برداشت کرنا بہرحال ناگزیر تھا۔

☆☆☆

چند گھنٹوں کی نیند لینے کے بعد شام کو آذر کافی حد تک تازہ دم ہو چکا تھا۔ اب وہ بے چینی کے ساتھ اس وقت کا منتظر تھا جب علینا کو وہاں پہنچنا تھا۔

اپنا پینٹنگ کا سامان سیٹ کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اس کی پہلی حقیقی پینٹنگ ہو گی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ ایک شاہکار ثابت ہو۔ اس کے رنگوں میں وہ اپنی محبت گھول دینا چاہتا تھا۔ اپنا تمام تر فن اور صلاحیتیں، وہ اس انداز میں کینوس پر اجاگر کرنا چاہتا تھا کہ وہ کینوس علینا کے حُسن سے جگمگا اٹھے۔

اور بالآخر ایک وقت ایسا آئے کہ یہ پینٹنگ اس کی پہچان بن جائے۔ اس کے مرنے کے بعد لوگ اسے دیکھ دیکھ کر کہیں کہ یہ تصویر تو واقعی مصور کی محبت کا شکار ہے۔

علینا، حسبِ وعدہ وقت پر پہنچ گئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھِل اٹھا… لیکن اس سے پہلے کہ علینا اس کی کیفیت پر غور کر پاتی، وہ جلدی سے بولا۔ ”شکر ہے آپ وقت پر آگئیں… میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ اس پینٹنگ کو مکمل کرنے کے لیے کتنا بے چین ہوں۔ آخر یہ میری نئی زندگی کا پہلا چیلنج ہے۔“

”چلیں پھر جلدی سے کام شروع کریں۔“ علینا مسکراتے ہوئے پوز بنا کر بیٹھ گئی۔

وہ ایزل کے آگے کھڑا ہو گیا… علینا کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ ہاتھ میں برش تھامے وہ پوری طرح تصویر کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے وجیہہ چہرے پر سوچ کی ہلکی ہلکی لکیریں چھائی ہوئی تھیں اور براؤن بال بچوں کی طرح ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔

معاً اس کے دل نے زور سے دھڑک کر گواہی دی کہ وہ پوری شدت کے ساتھ اس شخص کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ یہ کب اور کیسے ہوا… اور کچھ عجب نہیں تھا کہ وہ بھی اسی کیفیت کا شکار ہو۔

مگر اب تو شاید اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے یا نہیں… اس کے لیے تو یہی کافی ہے کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور بس…!

دل میں ایک عجیب قسم کی طمانیت اور ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا… آذر کا چہرہ اس کے دل میں کچھ اس طرح بس چکا تھا کہ اب اسے دیکھتے رہنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ گویا… دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار… جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔

وہ اپنے خیالوں میں گم، کسی مجسمے کے مانند بے حس و حرکت بیٹھی تھی اور آذر پورے ارتکاز کے ساتھ اسے پینٹ کرنے میں مصروف تھا۔

اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ وہ ساکت بیٹھے بیٹھے اکڑ چکی ہے… یہاں تک کہ آذر نے برش رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے احساس تک نہیں ہوا اور دو گھنٹے گزر گئے… علینا! آپ نے بھی مجھے نہیں ٹوکا۔“ وہ کچھ حیران اور کچھ شرمندہ سا دکھائی دے رہا تھا۔

”مجھے تو خود پتا نہیں چلا۔“ علینا نے پہلو بدلا اور پھر ہنستے ہوئے بولی۔ ”ہاں… مگر اب پتا چل رہا ہے۔“ اس نے اکڑی ہوئی گردن پر ہاتھ رکھا۔

آذر نے ایزل کو دور کھسکا دیا۔ ”آج تو میں نے اپنے آپ کو اچھا خاصا خود غرض اور ظالم ثابت کر ڈالا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ علینا نے کہا۔ ”لیکن کیا میں یہ تصویر دیکھ سکتی ہوں؟“

”ابھی نہیں… پلیز!“ آذر نے جلدی سے کہا۔ ”اگر ابھی آپ نے اسے دیکھ لیا تو شاید دوبارہ کبھی یہاں کا رخ نہ کریں… آپ کو اس کے مکمل ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا۔“ وہ مسکرایا۔

ماریا نے شاید ان دونوں کی باتوں کی آواز سن لی تھی، لہٰذا وہ اندر چلی آئی تاکہ ان سے پوچھ کر کھانا لگایا جا سکے۔

☆☆☆

ایک ڈاکٹر کے چھٹی پر جانے کی وجہ سے جواد اس ہفتے بھی نائٹ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ لہٰذا علینا اس پورے ہفتے کے دوران دور سے دو ایک مرتبہ محض اس کی جھلک ہی دیکھ پائی تھی۔ وہ شادی کے سلسلے میں جواد سے حتمی گفتگو کرنا چاہ رہی تھی لیکن اسے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

اب وہ جلد از جلد کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ اس بارے میں کسی سے بات کرے، کوئی ایسی ہستی ہو جس سے وہ مشورہ لے سکے۔ ایسے میں دو ہی نام اس کے ذہن میں آتے تھے… آذر اور ماریا!

لیکن اس کا پاسِ وفا اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ بہرحال، وہ اب تک جواد سے منسوب تھی۔

آذر بڑی لگن کے ساتھ اس کا پورٹریٹ بنانے میں لگا ہوا تھا اور علینا بڑی پابندی کے ساتھ ہر شام پورٹریٹ بنوانے کے لیے بیٹھتی تھی۔ ایسے میں اس کے چہرے پر چھائے ہوئے تاثرات دیکھ کر کوئی بھی بتا سکتا تھا کہ وہ گلے گلے تک کسی کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

آذر، علینا کی اس کیفیت کو اس تعلقِ خاص کی سرخوشی اور سرشاری پر محمول کرتا تھا جو اس کے منگیتر کے لیے مخصوص تھا۔ لہٰذا وہ محبت، دکھ اور جنون کے ملے جلے محسوسات کے تحت دن رات اس پورٹریٹ پر کام کر رہا تھا… یہاں تک کہ چھٹی شام کو اس پر انکشاف ہوا کہ وہ پورٹریٹ کو تقریباً مکمل کر چکا ہے۔

فنشنگ ٹچ دینے کے بعد اس نے طے کیا کہ آج وہ علینا کو یہ پورٹریٹ دکھائے گا… اسے بتائے گا کہ بالآخر اس کا انتظار ختم ہوا اور اب وہ پورٹریٹ اس کی نظروں کے سامنے تھا جسے رنگوں سے نہیں، خونِ جگر سے بنایا گیا تھا… اور… اور… بس… ایسے ہی کسی مقام پر آ کر اس کی سوچوں کی تان ٹوٹ جایا کرتی تھی۔

بہرحال، اس نے فون پر علینا کو اس بارے میں مطلع کر دیا۔ اس نے بڑی خوشی کے ساتھ اس خبر کو سنا اور وعدہ کیا

کہ جلد از جلد وہاں پہنچ جائے گی اور آج معمول سے زیادہ وقت ان کے گھر گزارے گی۔

آذر کافی دیر تک ایزل کو صحیح جگہ پر اس طرح سیٹ کرنے میں مصروف رہا کہ پورٹریٹ پر روشنی اس طرح پڑے کہ وہ بغیر کسی انعکاس یا پرچھائیں کے… بالکل صاف اور واضح دکھائی دے۔

خاصی دیر بعد بالآخر وہ مطمئن ہوا اور دیر تک پورٹریٹ کے سامنے کھڑا اسے دیکھتا رہا… پورٹریٹ بالکل ویسا ہی بنا تھا جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔

ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد علینا فریش ہونے کے لیے ہاسٹل کی جانب دوڑی… جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے اور حلیہ درست کرنے کے بعد وہ باہر نکلی۔ ابھی وہ کوریڈور ہی میں تھی کہ جواد کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

”علینا… کہاں بھاگی جا رہی ہو؟“ جواد نے اونچی آواز میں کہا۔ اس کی آواز اس وقت کسی کوڑے کے مانند علینا کو اپنی خوشیوں کے چہرے پر برستی محسوس ہوئی۔

”تم…؟“ اس نے ایک جھٹکے سے مڑ کر جواد کی جانب دیکھا۔ اسی لمحے علینا کو ڈاکٹر سمیرا کی باتیں یاد آگئیں… وہ اس روز کسی کام سے اس کے اسپتال آئی تھیں تو اس سے ملنے اس کے پاس چلی آئیں۔ وہ علینا کے والد کی رشتے دار تھیں۔ اور اس کی دوسری ماں بنتے بنتے رہ گئی تھیں۔ اس بات کا علینا کو اب بھی افسوس تھا۔ بہرحال، ڈاکٹر سمیرا اسے جواد کے بارے میں خبردار کرنے آئی تھیں۔ انہیں آج ہی معلوم ہوا تھا کہ وہ علینا کا منگیتر تھا۔ ان کی زبانی وہ جواد کے اصل کردار کے بارے میں جان کر ششدر رہ گئی… تب ہی سے سمیرا کی باتیں رہ رہ کر اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

”کہاں کھوئی ہوئی ہو…“ جواد نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ”آج میرا آف ہے… کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا؟“

”شاید بتایا ہو۔“ علینا نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ”دراصل آج میں بہت مصروف رہی کیونکہ ڈاکٹر فریحہ اپنی طبیعت خراب ہونے کے باعث آج ڈیوٹی پر نہیں آئی تھیں۔“

”اوہ…!“ جواد نے گویا اظہارِ ہمدردی کے طور پر کہا۔ ”چلو، کوئی بات نہیں… اب یہ بتاؤ کہ آج کہاں جانا پسند کرو گی؟“ اس کے لہجے میں ایک استحقاق تھا… ایک حکم تھا… گویا وہ علینا کی زندگی کا مالک تھا اور علینا کے پاس انکار کا حق موجود نہیں تھا۔

مشاعرہ

پشاور میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ جب شاعر نے غزل کا پچاسواں شعر مکرر پڑھا تو ایک خان صاحب لمبا سا ڈنڈا لے کر اسٹیج پر آگئے۔ شاعر گھبراتے ہوئے بولا۔ ”بس جناب آخری شعر سنانے والا ہوں۔“

خان صاحب نے شاعر کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خوچہ تم اپنا شاعری ماری پڑھو۔ ام کو یہ بتاؤ کہ تم کو یہاں لے کر کون آیا ہے۔“

”مقبولیت“

”جہاں کہیں بھی میرے انکل کے پہنچنے کی امید ہوتی ہے وہاں بہت بے تابی سے ان کا انتظار کیا جاتا ہے اور جب وہ پہنچتے ہیں تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ بہت ہردلعزیز ہیں؟“

”یہ تو مجھے معلوم نہیں… بہرحال وہ فائر بریگیڈ میں ملازم ہیں۔“

اسے اپنی قوتِ تسخیر پر بڑا ناز تھا… آج وہ یہی سوچ کر آیا تھا کہ علینا کو جلد از جلد شادی کے لیے رضامند کر کے ہی لوٹے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ علینا کا شادی سے گریز اور ایک فضول قسم کے مصور کی جانب اس کا جھکاؤ، ایک حماقت اور وقتی ابال کے سوا کچھ نہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اِک ذرا سی کوشش کی دیر تھی… اس کی شخصیت میں ایسا سحر اور باتوں میں ایسا جادو تھا کہ وہ اس کے ٹرانس سے باہر نکل ہی نہیں سکتی تھی۔

علینا، اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں تھی… اپنا یہ جادو اس سے پہلے وہ نہ جانے کس کس پر آزما چکا تھا۔ اسے فخر تھا کہ وہ کبھی بھی ناکام نہیں ہوا تھا… مگر وہ بس عام سی لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی علینا کی طرح نہیں تھی۔ لہٰذا اس سے ملنے کے بعد وہ ان سب کو بھلا چکا تھا۔ علینا کو پانے کے بعد اس کی تلاش گویا ختم ہو گئی تھی۔

اول تو علینا کا بے مثال حسن ہی اس کی سب سے بڑی سفارش تھا… حُسن، جواد کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ایک حسین بیوی کسی بھی مرد کی ترقی کے لیے قدم قدم پر معاون ثابت ہو سکتی ہے… پھر علینا جیسا معصوم حُسن تو اپنے آپ میں ایسی قوتِ تسخیر رکھتا تھا کہ جس سے وہ خود آگاہ نہیں تھی۔ جواد ان مردوں میں سے تھا جو بیوی کو اپنی ترقی کے لیے سیڑھی کے طور پر استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

دوسری خوبی علینا کی ذات سے وابستہ یہ تھی کہ وہ ایک

آسودہ حال باپ کی بیٹی تھی۔ اپنے ساتھ خاصی دولت تو لے کر آنے والی ہی تھی... مگر ساتھ ساتھ اس کے باپ کی مدد سے اسے اپنے ذاتی کلینک کا خواب بھی بڑی آسانی کے ساتھ پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک ہی جست میں بہت اوپر پہنچنے کا خواہش مند تھا اور اسی مقصد کے لیے اس نے علینا کا انتخاب کیا تھا۔ لہٰذا اب وہ اس سے دست بردار ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مگر علینا ان تمام باتوں سے بے خبر تھی... وہ نہیں جانتی تھی کہ اس معاملے سے نمٹنا اس کے تصور سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

جواد کی بات پر وہ کچھ ٹھٹک سی گئی۔ ''جواد! آج میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری!''

''کیوں نہیں جا سکتیں؟'' جواد نے حیرت سے کہا۔

''آج اپنے پورٹریٹ کے لیے میری فائنل سٹنگ ہے... اور آج میں پہلی بار اسے دیکھ سکوں گی۔'' علینا نے آہستگی کے ساتھ کہا۔ ''آذر میرا انتظار کر رہا ہوگا... میں اسے مایوس کرنا نہیں چاہتی۔ اس نے پورے ہفتے اس پورٹریٹ پر دیوانہ وار کام کیا ہے اور اس کے علاوہ میں اس کی بہن سے وعدہ کر چکی ہوں کہ آج رات کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں گی۔''

یہ سن کر جواد کا چہرہ ایک دم پتھرا سا گیا۔ ''تب پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ ''آخر میں تمہارا منگیتر ہوں... اور مجھے بھی اس نام نہاد تصویر کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے۔''

اس کی بات سن کر علینا دل ہی دل میں سخت پریشان ہو گئی۔ جواد کو اس اپنایت بھری اور دوستانہ فضا میں ساتھ لے جانے کا تصور ہی اس کے لیے محال تھا۔ وہ ایک ایسے بن بلائے مہمان کو ماریا اور آذر کے سروں پر مسلط کرنا نہیں چاہتی تھی جو انہیں سخت ناپسند کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جواد وہاں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرے گا جس کے باعث اسے ان دونوں کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے گی... لیکن اس سے بھی زیادہ وہ ان دونوں بہن بھائی کی دل آزاری کے خیال سے خائف تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواد سے کیا بہانہ بنائے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے انکار سے ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا... لہٰذا فی الوقت وہ کسی بھی مسئلے کو ٹالنا چاہتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر اس نے ایک درمیانی راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی ساتھ چلو لیکن ہم کھانے پر نہیں رکیں گے۔ کھانا ہم باہر کھائیں گے... بلاوجہ دیر ہو جائے گی اور پھر مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں بھی کرنی ہیں۔''

صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے وہ اسی قدر کوشش کر سکتی تھی کہ جواد کو جلد از جلد وہاں سے واپس لے آئے۔ اس کے بعد کھانے کے دوران اس سے صاف صاف بات کر ڈالے کہ ان دونوں کا ساتھ ممکن نہیں... لہٰذا وہ بغیر کسی تلخی کے... خوش گوار ماحول میں یہ منگنی ختم کرنا چاہتی تھی۔

اس کے بعد وہ آزاد ہوگی۔ تب وہ آذر کو سب کچھ بتا دے گی۔ اسے امید تھی کہ وہ سب کچھ سمجھ جائے گا۔

''شکر ہے کہ آج کے بعد پورٹریٹ وغیرہ کا یہ فضول سلسلہ ختم ہو جائے گا۔'' جواد نے اس کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''اپنے اس پیشنٹ کے لیے تم نے ضرورت سے زیادہ تردد کر ڈالا... یہاں تک کہ میری پروا بھی نہیں کی۔''

علینا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی کے ساتھ کار میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ فون پر بھی آذر کو اس بارے میں مطلع نہیں کر سکتی تھی۔

ڈور بیل کی آواز پر آذر نے ہی دروازہ کھولا۔ جواد کو علینا کے ساتھ دیکھ کر اس کے چہرے کی چمک ایک دم ماند پڑ گئی... آج کی شام اس کے لیے بہت خاص تھی اور علینا کو سخت تاسف تھا کہ اس نے آذر کی خوشی برباد کر ڈالی تھی۔

لیکن آذر نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور خوش خلقی کے ساتھ سلام دعا کرنے کے بعد انہیں اندر لایا۔ جواد بہ غور اس کی کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ اگر آذر کے دل میں علینا کے بارے میں کوئی احمقانہ خیال پل رہا ہے تو اسے دیکھ کر وہ ہوش کے ناخن لے اور کسی بھی قسم کی حماقت سے باز آ جائے۔

آذر اپنی اندرونی کیفیات کو چھپانے میں بڑی حد تک کامیاب رہا تھا مگر اس کے لیے وہ بہت ضبط سے کام لے رہا تھا... اس کی آرزو تھی کہ اس موقعے پر علینا کے علاوہ کوئی اور اس کے ساتھ نہ ہوتا... کیونکہ ہو سکتا تھا کہ یہ علینا سے اس کی آخری ملاقات ثابت ہوتی۔ آخر وہ اس کی زندگی سے دور جانے کا فیصلہ تو کر ہی چکا تھا۔

جب علینا نے اسے بتایا کہ جواد کو بھی یہ پورٹریٹ دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا اسی لیے وہ اسے بھی ساتھ لے آئی... تو اس نے خود پر جبر کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''آپ نے

بہت اچھا کیا، آخر ان کا پورا حق بنتا ہے کہ آپ کا پورٹریٹ دیکھیں۔''

مگر جواد نے آذر کی خوش اخلاقی کے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا تو علینا کچھ خفیف سی ہو گئی۔ عین اسی وقت ماریا وہاں پہنچ گئی اور اس نے اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں صورتِ حال کو سنبھال لیا... لیکن اندر ہی اندر وہ خود بھی بہت اَپ سیٹ تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ آذر اور علینا ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں جبکہ ایسے میں جواد جیسے شخص کا وجود اسے بہت کھٹک رہا تھا اور اس صورتِ حال پر وہ سخت دُکھی تھی۔

جواد اپنے بارے میں ان سب کے محسوسات سے بے خبر، اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا... اسے اگر پروا تھی تو صرف اپنی ذات کی۔

''چلو، اب اپنا پورٹریٹ سب کو دکھا بھی دو۔'' ماریا نے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مہمانوں کو اور کتنا انتظار کراؤ گے؟''

''ہاں... کیوں نہیں۔'' آذر نے گویا چونکتے ہوئے کہا۔ ''آئیے۔'' وہ ایزل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

دوسرے بھی اس کی تقلید میں ایزل کے آگے جا کر کھڑے ہو گئے جس پر ایک کپڑا ڈھکا ہوا تھا۔ آذر نے مسکراتے ہوئے کپڑا ہٹایا اور باری باری علینا اور ماریا کے چہرے پر نگاہ ڈالی... وہ دونوں ہی گویا اپنا سانس روکے کھڑی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں اس لمحے ستائش کی جو چمک تھی، وہ ستاروں کو بھی ماند کر رہی تھی۔

اس چمک کو دیکھتے ہی گویا آذر کو اپنے سوال کا جواب مل گیا... وہ دل ہی دل میں ان کا شکر گزار تھا کہ اس وقت انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ دونوں بہ خوبی سمجھ رہی تھیں کہ اگر اپنے محسوسات کو الفاظ دینے کی کوشش کی تو وہ اپنا اثر کھو بیٹھیں گے... اور یوں سارا تاثر زائل ہو جائے گا۔

مگر جواد بھلا کیوں خاموش رہتا... چند لمحوں تک وہ یوں ناقدانہ انداز میں پینٹنگ کا جائزہ لیتا رہا، گویا آرٹ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہو... مگر بالآخر اسے دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ تصویر واقعی بہت شان دار تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ابھی بول پڑے گی۔

''بہت اچھے بھئی آذر!'' جواد کی تعریف کا انداز بھی کچھ ایسا تھا جیسے احسان کر رہا ہو... اور خلافِ توقع آذر سے کوئی اچھا کام سرزد ہو گیا ہو۔

علینا نے آنکھوں آنکھوں میں اسے ٹوکنے کی کوشش کی... مگر وہ انجان بن گیا۔ ''اس تصویر میں واقعی میری منگیتر کی بہت مشابہت موجود ہے۔'' وہ کچھ عجیب بے ڈھنگے سے انداز میں ہنسا۔ ''میرا بڑا دل چاہ رہا ہے کہ اس کے لیے تمہیں ایک آفر دوں۔''

آذر بڑے تحمل کے ساتھ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا لیکن علینا سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ اس کی احمقانہ باتوں کو مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے پہلے جواد اسے اتنا برا کبھی نہیں لگا تھا جتنا اس وقت لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کو اپنے ساتھ یہاں لانے پر شاید خود کو کبھی نہ معاف کر پائے۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' اس نے جلدی سے کہا تا کہ جواد اپنی مزید بکواس جاری نہ رکھ سکے۔ وہ جانتی تھی کہ آفر دینے سے اس کا کیا مقصد ہے۔ وہ اس پینٹنگ کو خریدنے کی بات کرنا چاہتا تھا۔ علینا کو معلوم تھا کہ یہ بات آذر کے لیے بہت دکھ کا باعث ہوگی کیونکہ اس کی یہ تصویر محض ایک تصویر نہیں تھی بلکہ ایک نئی زندگی کی علامت تھی۔

''آئی ایم سوری!'' اس نے ماریا کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ''میں پھر آؤں گی۔''

ماریا نے تفہیمی انداز میں اس کا ہاتھ ہلکے سے دبا کر چھوڑ دیا۔

''مگر تم نے تو کہا تھا کہ آج تمہاری فائنل سٹنگ ہے۔'' جواد نے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تصویر میں شاید کچھ کام باقی ہے اسی لیے اس میں کچھ کمی سی نظر آ رہی ہے۔'' اس نے نیا شوشہ چھوڑا۔

علینا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا... مگر پھر اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تمہیں نہیں لگ رہا کہ بالوں پر مزید ایک ٹچ دینے کی ضرورت ہے۔'' جواد نے تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور شاید ناک پر بھی۔''

''آپ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' علینا کے بجائے آذر جلدی سے بول اٹھا۔ ''میں ایک فائنل ٹچ اور دے دوں گا۔''

آذر کے جواب پر جواد کی آنکھیں فاتحانہ انداز میں چمک اٹھیں۔

علینا نے معذرت خواہانہ انداز میں آذر کی جانب دیکھا مگر اس نے نظر انداز کر دیا... تب علینا نے جواد کا

بازو تھاما اور بولی۔ ”چلو جواد... ہمیں ڈنر پر بھی جانا ہے، دیر ہو رہی ہے۔“ اور اسے کھینچتی ہوئی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اس وقت اگر اسے پروا تھی تو صرف اس بات کی کہ کسی طرح جواد کو یہاں سے لے جائے۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جواد نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”کیا بات ہے... تم اس طرح وہاں سے کیوں بھاگ آئیں؟“

علینا اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بالآخر وہ چھلک ہی پڑے۔

”کیا ہوا... میرا تو خیال تھا کہ اپنا پورٹریٹ دیکھ کر تم بہت خوش ہو گی؟“ جواد نے علینا کو خاموش پا کر کہا۔

”خوش...!“ علینا نے استہزائیہ سے انداز میں کہا۔ ”خوش تو میں بہت ہوں کیونکہ تم نے اپنی باتوں سے مجھے آذر اور اس کی بہن کے سامنے نظریں اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا... لیکن ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کہ مجھے کسی ایک فیصلے پر پہنچنے میں آسانی ہو گئی۔“

”فیصلہ... کیسا فیصلہ؟“ علینا کی باتوں پر جواد کے کان کھڑے ہو گئے۔

”میں آج اور اسی وقت تم سے منگنی توڑ رہی ہوں۔“ علینا نے دل کڑا کر کے بالآخر کہہ دیا۔ ”میں اس معاملے کو اب مزید طول دینا نہیں چاہتی... اور فکر مت کرو، میں زیادہ دیر تمہاری نظروں کے سامنے نہیں رہوں گی... کل ہی اسپتال سے ریزائن کر دوں گی۔“

جواد چند لمحوں تک منہ کھولے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”اس وقت تم بہت جذباتی ہو رہی ہو... اس موضوع پر پھر بات کریں گے، ابھی میں تمہیں ہاسٹل چھوڑ دیتا ہوں۔“

”یہ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں ہے جواد۔“ علینا نے کہا۔ ”میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ بات کہی ہے۔ ہاں، تم سے منگنی کرنا میرا جذباتی فیصلہ ضرور تھا... اس غلطی کو میں تسلیم کرتی ہوں۔“

”تم کیا سمجھتی ہو کہ اتنی آسانی کے ساتھ مجھ سے جان چھڑا لو گی؟“ جواد نے اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح کے فیصلے یوں سرِ راہ نہیں کیے جاتے... اور پھر تم اکیلی یہ فیصلہ کیسے کر سکتی ہو؟“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں۔“ علینا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر تمہیں ایسا لگ رہا ہے کہ میں زیادتی کر رہی ہوں تو آئی ایم سوری... لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں گی کیونکہ اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں تمہاری ظاہری خوب صورتی پر فریفتہ ہو گئی تھی لیکن محبت کرنے اور محبت میں مبتلا ہو جانے کا فرق اب میری سمجھ میں آیا ہے۔ محبت میں مبتلا ہونے والے یہ نہیں دیکھتے کہ جسے وہ چاہتے ہیں، وہ کون ہے، کیا کرتا ہے اور کیسا دکھائی دیتا ہے۔“

”ہوں۔“ جواد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم آذر کے لیے اپنے دل میں ایسے ہی جذبات محسوس کرتی ہو؟“ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ایک سوالیہ نظر علینا کے چہرے پر ڈالی۔ ”ہے نا؟“

”ہاں۔“ علینا نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اعتراف کر لیا۔

”کیا وہ بھی اسی طرح تمہاری محبت میں مبتلا ہے؟“

”معلوم نہیں... اس نے کبھی مجھ سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔“

”ضرورت بھی کیا ہے۔“ جواد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”وہ دیکھ رہا ہے کہ تم خود ہی کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گرنے کو بے تاب ہو۔“

”جواد!“ علینا چلائی۔

”چلاؤ مت۔“ جواد نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اور کان کھول کر سن لو... اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں اتنی آسانی سے تمہیں اس مکار اور فلرٹ قسم کے معذور آدمی کے ساتھ زندگی برباد کرنے کی اجازت دے دوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے... اس شخص کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرے خواب مجھ سے چھینے اور میری زندگی تباہ کر ڈالے... اس سے پہلے میں خود اسے تباہ کر دوں گا... سمجھیں تم!“

علینا دم بہ خود آنکھیں پھاڑے اس کی جانب دیکھ رہی تھی... جواد کا یہ روپ اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آہستہ آہستہ، ایک ایک کر کے اس کی پرتیں اترتی جا رہی تھیں اور اصل چہرہ واضح ہوتا جا رہا ہے۔

اس کی باتوں سے علینا کے اعصاب شل ہوئے جا رہے تھے اور ذہن یک دم ماؤف سا ہو گیا تھا... مزید وہ نہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا لیکن علینا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا... یک دم ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی رکی تو اس نے چونک کر دیکھا... اس کا ہاسٹل آ چکا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ گاڑی سے اتری اور گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

علینا رات کو خواب آور دوا لینے کے باوجود بہ مشکل کچھ دیر ہی سو پائی تھی۔ صبح آنکھ کھلنے پر اسے اپنا سر خاصا بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا رات بھر جاگ کر اس نے سخت مشقت والا کوئی کام سرانجام دیا ہو۔

معاً اسے یاد آیا کہ گزشتہ رات، اپنی بے چین سی نیند کے دوران اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ کچھ عجیب اور بے ربط سا خواب تھا... اس نے دیکھا تھا کہ وہ ایک طویل اور سنسان راہداری میں تنہا چلی جا رہی تھی۔ راہداری نیم تاریک سی تھی، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نیم تاریکی میں راستہ تلاش کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔

اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اور آگے بڑھنا سخت دشوار محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ راہداری تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسے راہداری کے دونوں جانب بنے ہوئے دروازے دکھائی تو ضرور دے رہے تھے لیکن جب وہ کسی دروازے کی جانب بڑھتی تو قریب پہنچتے ہی وہ غائب ہو جاتا تھا...

بالآخر جس طرح اسکرین پر منظر تبدیل ہوتا ہے، اسی طرح اچانک منظر تبدیل ہوا اور علینا نے اپنے آپ کو قدیم طرز کی ایک عمارت کے دروازے پر کھڑا پایا... اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھل گیا۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد ایک اور دروازہ دکھائی دیا... اسی طرح کئی دروازوں سے گزرنے کے بعد اس نے خود کو ایک بڑے سے کمرے میں پایا۔ اس کمرے کے عین وسط میں ایک ایزل رکھا ہوا تھا۔

کمرے میں شاید مزید سامان موجود تھا لیکن وہ غیر نمایاں تھا۔ صرف وہی ایزل نمایاں انداز میں رکھا ہوا تھا اور اس کے اوپر ایک کپڑا ڈھکا تھا۔ علینا بے اختیار اس کی جانب بڑھی، نزدیک پہنچ کر اس نے ایزل سے کپڑا ہٹایا... اس کی نظروں کے سامنے اپنی تصویر موجود تھی۔ اس کا وہی پورٹریٹ جسے آذر نے پینٹ کیا تھا۔

وہ چند لمحوں تک یونہی مبہوت کھڑی تصویر کو تکتی رہی۔ دفعتاً ایک دھماکا سا ہوا اور اچانک اس کی تصویر کئی حصوں میں منقسم ہو گئی... اس نے سہمے ہوئے انداز میں اپنی تصویر کے ٹکڑوں کو دیکھا جو گویا سلو موشن انداز میں منتشر ہو رہے تھے اور اس کے بعد پھر خواب کا منظر تبدیل ہو گیا... لیکن علینا کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بعد اس نے کیا دیکھا تھا۔

کچھ دیر وہ اس خواب پر غور کرتی رہی لیکن جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اسے اپنی منتشر خیالی قرار دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی اسے اسپتال جانے کے لیے تیار ہونا تھا۔

اسپتال پہنچتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ آفس میں جا کر اپنا استعفا پیش کر دیا۔ استعفا دینے کے بعد علینا نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے شانوں پر سے بہت بھاری بوجھ اتر گیا ہے... حالانکہ اس نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا کہ چار ہفتوں کا نوٹس پیریڈ گزر جانے کے بعد وہ کیا کرے گی؟

فی الحال اس کے سامنے کوئی آپشن نہیں تھا لیکن وہ ہرگز فکرمند نہیں تھی۔ اسے اپنے خدا پر پورا بھروسا تھا کہ وہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی بہتر راستہ ضرور نکالے گا۔

اس وقت تو وہ آذر کی منتظر تھی کہ وہ تھراپی کے لیے آتا ہی ہو گا... اس انتظار میں اسے اس قدر لطف محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مگر آج خلافِ معمول وہ وقت پر نہیں پہنچا تو اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ آج کسی وجہ سے وہ لیٹ ہو گیا ہو گا۔ پھر جب یہ تاخیر طول پکڑنے لگی تو اس سے رہا نہ گیا اور اس نے آذر کے موبائل پر کال کی۔

لیکن یہ جان کر اسے سخت حیرت ہوئی کہ آذر کا موبائل بند تھا۔ یکایک اسے طرح طرح کے وہم ستانے لگے... کہیں ایسا تو نہیں کہ آذر کو راستے میں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو... وہ اپنے مضروب بازو کے بل پر کہیں گر پڑا ہو یا اس کا شانہ کسی چیز سے ٹکرا گیا ہو؟

یہ خیال آتے ہی وہ بُری طرح مضطرب ہو گئی۔ اس نے فوراً ماریا کے فلیٹ کا نمبر ملایا۔

”ماریا! شکر ہے کہ آپ مل گئیں۔“ رابطہ ہوتے ہی علینا نے جلدی سے کہا۔ ”میں علینا بات کر رہی ہوں... میں آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ آج آذر ابھی تک اسپتال نہیں پہنچے... آپ بتا سکتی ہیں کہ کیا بات ہے؟“

دوسری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی طاری رہی... پھر ماریا نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ شہر سے بہت دور چلا گیا ہے علینا!“ اس کی آواز میں بے حد اضمحلال تھا۔ ”میں نے اس سے بہت کہا کہ تم سے مل کر جائے یا جانے سے پہلے کم از کم فون پر بات ضرور کر لے لیکن وہ نہیں مانا۔ رات کو اس نے ایک بیگ میں چند کپڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں رکھیں اور علی الصباح، ٹرین کے ذریعے ایبٹ آباد کی جانب روانہ ہو گیا۔“

”کک... کیوں؟“ علینا نے بے تابی سے پوچھا۔

”کیا تم آج کسی وقت میرے گھر آ سکتی ہو؟“ ماریا

نے کہا۔ ''تب پھر اطمینان سے بات کریں گے۔''
''ہاں، ہاں... کیوں نہیں۔'' علینا نے جلدی سے کہا۔ ''میں شام کو ضرور آؤں گی۔''

رابطہ منقطع ہونے پر بھی علینا اسی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کی ساری جان کھینچ کر نکال لی تھی۔ وہ خود کو بے حد تنہا اور تہی داماں محسوس کر رہی تھی۔ ایسا کیوں ہوا تھا، اس بارے میں سوچتے ہوئے بھی اسے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

ڈیوٹی آف ہونے تک وہ میکانکی انداز میں اپنا کام انجام دیتی رہی۔ اس دوران کئی افراد اس سے ملنے آئے، ان کا تعلق اسپتال کے اسٹاف سے تھا۔ وہ سب اس کے استعفے پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ اسپتال میں یہ خبر بھی پھیل چکی تھی کہ ڈاکٹر جواد سے اس کی منگنی ٹوٹ چکی ہے۔

ڈیوٹی آف ہوتے ہی وہ فوری طور پر ماریا کے فلیٹ کی جانب روانہ ہوگئی۔ راستے بھر یہی خیال اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا کہ نہ جانے آذر کے اچانک اس طرح جانے کے پیچھے کیا محرک کارفرما تھا؟ علینا کو یہ سوچتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں اس کا سبب وہ خود تو نہیں تھی...!

ماریا کے دروازہ کھولتے ہی وہ سوالیہ انداز میں اس کی صورت تکنے لگی۔ ماریا نرمی کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے آئی اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ علینا سعادت مندی کے ساتھ وہاں بیٹھ گئی۔ ماریا دیکھ رہی تھی کہ اس وقت علینا کا پورا وجود گویا ایک ہی سوال کی گردان کر رہا تھا کہ آذر نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا... اس نے آخر ایسا کیوں کیا تھا؟

''میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔'' ماریا نے کہا تاکہ وہ اتنی دیر میں خود کو کچھ سنبھال سکے۔

لیکن علینا نے بڑی شدت کے ساتھ انکار میں سر ہلایا... اس میں مزید انتظار کی تاب نہیں تھی۔ ''مجھے کچھ نہیں چاہیے... آپ بس یہاں میرے پاس بیٹھ جائیں اور مجھے آذر کے بارے میں بتائیں... پلیز!''

علینا کا ایک ایک انداز چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ وہ بہت شدت کے ساتھ آذر کی محبت میں مبتلا ہے... ماریا بخوبی اس کے جذبات سمجھ رہی تھی۔

''تم اس سے بہت محبت کرتی ہو... ہے نا؟'' ماریا نے کہا۔

''ہاں۔'' علینا نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے اعتراف کیا۔ ''گو کہ میں خود کافی عرصے تک اس جذبے کو نہیں سمجھ پائی تھی لیکن جب آذر نے میرا پورٹریٹ بنانا شروع کیا، تب دھیرے دھیرے یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوتی گئی کہ میں شاید پہلے ہی دن ان سے متاثر ہوگئی تھی۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔'' ماریا نے دھیرے سے گویا خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

''آپ مجھے بتاتی کیوں نہیں کہ وہ کیوں چلے گئے؟'' علینا نے بے بسی کے ساتھ سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''میں تو انہیں بہت کچھ بتانا چاہتی تھی... میں نے کل رات جواد سے اپنی منگنی توڑ دی اور... اور آج صبح اسپتال سے ریزائن بھی کر دیا لیکن...''

''وہ بھی تم سے بہت محبت کرتا ہے علینا!'' ماریا نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ ''لیکن کل رات تمہیں جواد کے ساتھ دیکھ کر شاید اسے یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی کہ تم کسی اور کی امانت ہو اور وہ کسی بھی طرح تمہارے قابل نہیں۔''

''آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ بھی مجھ سے اسی قدر محبت کرتے ہیں... کیا یہ سچ ہے... مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''کیا اس کی بنائی ہوئی تصویر یہ بتانے کے لیے کافی نہیں؟'' ماریا نے ایزل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

علینا چند لمحوں تک دم بہ خود اس تصویر کو دیکھتی رہی... رات والا خواب ایک بار پھر اس کے ذہن کے پردے پر متحرک ہونے لگا۔ یکایک اسے یوں محسوس ہوا کہ اس نے آذر کو پانے سے پہلے ہی کھو دیا ہے اور یہ خیال آتے ہی اسے اپنا وجود کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوتا محسوس ہوا... بالکل اسی طرح جس طرح رات کو خواب میں اس کی تصویر کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔

''کہاں کھو گئیں علینا؟'' ماریا کی آواز اسے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لائی۔

''انہیں کم از کم ایک مرتبہ تو مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔'' علینا نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے اپنا سیل فون کیوں بند کر رکھا ہے؟''

''نیٹ ورک کا کچھ پرابلم ہے۔'' ماریا نے جواب دیا۔ ''آذر بتا رہا تھا کہ جس جگہ وہ جا رہا ہے، وہاں کوئی موبائل نیٹ ورک کام نہیں کرتا۔''

''آخر وہ گئے کہاں ہیں؟''

''مجھے خود ٹھیک سے نہیں معلوم۔'' ماریا نے کچھ بے بسی کے ساتھ کہا۔ ''ایبٹ آباد سے آگے شاید کسی دور دراز علاقے میں کوئی گاؤں ہے، وہاں اس کا ایک دوست رہتا ہے۔ وہ آرٹ کالج میں اس کے ساتھ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے آذر سے

بہت اصرار کے ساتھ اپنے گاؤں آنے کے لیے کہا تھا اور وہاں کا پتا وغیرہ بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ کل اتفاق سے اس کا فون آگیا... آذر نے کہہ دیا کہ وہ اس کے پاس پہنچ رہا ہے۔''

''تو کیا گاؤں میں فون کی سہولت موجود ہے؟'' علینا نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' ماریا نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ''کل اس کا دوست کسی کام سے شہر آیا تھا، اس نے وہیں سے آذر کو فون کیا تھا۔''

''آپ نے انہیں کیوں جانے دیا ماریا؟'' علینا نے شکستہ سے لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی ایسی جگہ جہاں رابطے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں... جبکہ ان کا علاج بھی ابھی مکمل نہیں ہوا۔''

''اس وقت اس کا یہاں سے دور چلے جانا ہی بہتر تھا۔'' ماریا نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ سوچ کر چپ ہوگئی کہ جب اس کی جذباتی کیفیت ذرا سنبھل جائے گی تو خود ہی واپس چلا آئے گا... اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے فون کرتا رہے گا اور رہ گیا علاج تو اس کے لیے اس کا کہنا تھا کہ اس کا بازو اب ٹھیک ہونے والا نہیں۔ یہی بہت ہے کہ وہ اب پینٹنگ کر سکتا ہے اور اس کے لیے وہ تمہارا بہت ممنون ہے کہ اس سے بہتر علاج ہو ہی نہیں سکتا۔ اس گاؤں میں بھی قدرتی نظاروں کی کشش ہی اسے کھینچ کر لے گئی ہے۔ وہاں رہ کر وہ ان حسین مناظر کو پینٹ کرے گا اور میرا خیال ہے کہ اس مصروفیت میں اس کا دل کچھ بہلا رہے گا۔''

''لیکن میں کیا کروں؟'' علینا نے بے چارگی آمیز جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں تو اپنی ساری کشتیاں جلا آئی ہوں... اور اب آذر کے بنا رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔'' اس نے سر جھٹکا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ بس... آپ مجھے ان کا پتا بتائیں، میں خود جا کر انہیں واپس لے آؤں گی۔''

''میرا بھائی بہت ضدی ہے۔'' ماریا نے اداسی آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ایک مرتبہ اگر وہ ایک فیصلہ کر لے تو پھر کوئی اسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ اگر وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ دنیا بھر کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔ تمہارے معاملے میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی طرح تمہارے لائق نہیں... اسے اپنی معذوری کا بہت احساس ہے لہٰذا میں نہیں سمجھتی کہ تمہارے بارے میں وہ اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی لائے۔''

''یہ جاننے کے بعد بھی کہ میں بھی انہیں اسی قدر چاہتی ہوں اور... اور ان کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں؟''

اس سے.......... پہلے کہ ماریا جواب میں کچھ کہہ پاتی... فلیٹ کی ڈوربیل یکبارگی ذرا سی بجی اور پھر کچھ عجیب سے دھماکے سنائی دیے۔ یوں محسوس ہوا جیسے دروازے کے عین باہر فائر ہوئے ہوں اور دوسرے ہی لمحے کوئی بھاری سی چیز دھم سے نیچے گری۔

علینا اور ماریا بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ماریا جلدی سے دروازے کی جانب بڑھی۔ علینا اس کے پیچھے پیچھے تھی... اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتی، ماریا دروازہ کھول چکی تھی۔

دروازہ کھولتے ہی ماریا اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی... علینا نے اس کے کندھے کے اوپر سے جھانکا اور باہر کا منظر دیکھتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔

دروازے کے آگے کوریڈور کے فرش پر کوئی شخص آڑھا ترچھا پڑا ہوا تھا۔ علینا جس جگہ کھڑی تھی وہاں سے اسے پہلو کے بل ٹیڑھے میڑھے پڑے ہوئے اس شخص کا پورا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ صرف اس کی ٹھوڑی اور دہانہ ہی دیکھ سکتی تھی لیکن باوجود اس کے کہ کوریڈور میں روشنی بہت مدھم تھی... وہ اس ملگجے سے اجالے میں بھی اس شخص کے سر کی جانب سے تیزی سے بہہ کر آتا ہوا گاڑھا گاڑھا خون بہ خوبی دیکھ رہی تھی جو ایک تالاب کی صورت میں اس کے نیچے جمع ہو رہا تھا۔

''ماریا... یہ... یہ کون ہے؟'' علینا نے ماریا کا شانہ ہلا کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا مگر وہ علینا کا ہاتھ لگتے ہی لہرائی اور بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑی۔

☆☆☆

علینا نے چلتے چلتے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا... وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بُری طرح رو رہا تھا... اور کبھی زور زور سے ہنس رہا تھا۔

اس کے دلکش اور وجیہہ چہرے کے نقوش اس لمحے کچھ اس طرح بگڑے ہوئے تھے کہ وہ انتہائی بدصورت دکھائی دے رہا تھا اور قابلِ رحم بھی... علینا کے خوب صورت چہرے پر تاسف کے سائے پھیل گئے۔

معاً اس کے برابر کھڑے ہوئے آذر نے اس کا بازو تھاما تو وہ چونک کر اس کی جانب پلٹی اور تھکے تھکے قدموں سے چلتی اس کے ساتھ عمارت سے باہر نکل آئی۔

وہ دونوں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر خاموش بیٹھے ہوئے اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے... گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا جو

سبک رفتاری کے ساتھ ان کی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ آذر اور علینا کی منزل ان کا گھر تھا... وہ گھر جوان کی آرزوؤں اور امنگوں کے مانند خوب صورت اور پُرسکون تھا۔

ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے مگر وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ... ''ہوتا ہے ایک غم ہماری خوشی کے ساتھ!'' تو ان کی خوشیوں پر بھی ایک گہن کا سایہ تھا۔

وہ دونوں ابھی جواد سے مل کر واپس آرہے تھے۔ جواد پاگل خانے میں داخل تھا... وہی ڈاکٹر جواد جو کبھی اپنے شعبے کا ماہر اور زمانہ طالب علمی کا ذہین ترین طالب علم مانا جاتا تھا۔

علینا، جواد کے اس انجام پر افسردہ تھی... وہ سوچ رہی تھی کہ کاش جواد اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کا منفی رخ پر استعمال نہ کرتا... مگر اس کے ذہن میں شاید ابتدا ہی سے کچھ کجی تھی... دماغی امراض کے ماہرین کے تجزیے کے مطابق وہ ہر معاملے میں شدت پسند واقع ہوا تھا۔ ہر اچھی چیز کو اپنی ملکیت بنانے کا خواہاں رہتا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ سہل پسند اور جلد باز بھی اتنا تھا کہ محنت کیے بغیر، کسی نہ کسی شارٹ کٹ کے ذریعے اپنی ہر طلب پوری کرنا چاہتا تھا۔ میڈیکل کی تعلیم بھی اس نے نہ جانے کیونکر مکمل کرلی تھی۔

وہ علینا کو بھی وہ اپنی ترقی کے لیے شارٹ کٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ جب علینا نے اس کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا اور منگنی توڑ دی تو اسے اپنی دسترس سے باہر جاتا دیکھ کر اس پر حقیقتاً دیوانگی طاری ہوگئی... وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا کہ کسی لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف جبراً اپنا نہیں بنایا جاسکتا۔

اس شام جب علینا، آذر کے جانے کی خبر سن کر تفصیلات جاننے کے لیے ماریا کے گھر کی جانب روانہ ہوئی تو جواد اس کے تعاقب میں تھا۔ یوں بھی وہ ہر وقت اس کی ٹوہ میں رہتا تھا اور اس وقت تو اس کی جھنجلاہٹ اور غصہ عروج پر تھا۔ علینا سے زیادہ اسے آذر پر غصہ تھا۔ ان دنوں وہ ہمہ وقت اسے قتل کرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا کیونکہ اس کی دانست میں علینا کو بہکانے اور راہ سے بھٹکانے والا وہی تھا۔

ماریا کی اپارٹمنٹ بلڈنگ پہنچنے پر علینا نے پارکنگ میں اپنی گاڑی پارک کی اور اوپر فلیٹ کی جانب روانہ ہوگئی۔ جواد نے اپنی گاڑی عمارت کے باہر ایک جانب کھڑی کر دی تھی اور اب اس میں بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟

اس کی چشمِ تصور اسے طرح طرح کے نظارے دکھا رہی تھی... مثلاً یہ کہ آذر اور علینا، دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے ہیں... آذر نے اپنا بازو علینا کے گرد حمائل کر رکھا ہے اور علینا کا سر آذر کے شانے پر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہیں اور پھر...

اس سے آگے سوچنا بھی اس کے لیے محال تھا۔ اس نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ یکا یک اس کے اندر وحشت کی ایک تند لہر ابھری... اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ گلوو کمپارٹمنٹ کھول کر اپنی گن نکالی جو ہمیشہ وہیں رکھی رہتی تھی۔

دل ہی دل میں یہ تہیہ کرتے ہوئے کہ آج وہ آذر کو کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑے گا... اس نے گن جیب میں رکھی اور گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ذہن پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔

جونہی اس نے ماریا کے فلیٹ کے زینے پر قدم رکھا، سیڑھیوں کی لینڈنگ پر اسے لائٹ بلیو سوٹ میں ملبوس آذر دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی گویا جواد کے پیروں میں بجلی بھر گئی... وہ زقندیں بھرتا اوپر پہنچا تو شام اور رات کے گلے ملتے، ملگجے سے اجالے میں اس نے آذر کو فلیٹ کے دروازے پر کھڑا پایا۔ جواد کا ہاتھ بے اختیار خودکار سے انداز میں اپنی جیب میں پہنچا اور جیسے ہی آذر نے ڈور بیل کے بٹن پر انگلی رکھی، جواد نے جیب سے گن نکال کر اس کے سر پر پے در پے کئی فائر کر ڈالے۔

گولیاں کھاتے ہی وہ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند نیچے گرا... تب جواد کو احساس ہوا کہ وہ آذر نہیں بلکہ کوئی اور شخص تھا لیکن قد و قامت سے بالکل اس جیسا ہی دکھائی دیتا تھا۔

وہ بدحواسی کے عالم میں پلٹا اور سیڑھیوں کی طرف بھاگا لیکن وہ چند سیڑھیاں ہی اتر پایا تھا کہ بدقسمتی سے اس کا ٹکراؤ بلڈنگ کے ایک چوکیدار سے ہوگیا جو کسی کام سے اوپر آرہا تھا۔ چوکیدار نے اس کے ہاتھ میں گن دیکھ کر اسے پکڑ لیا اور اس کے شور مچاتے ہی آناً فاناً بہت سے لوگ جمع ہو گئے... یوں جواد ہاتھ میں گن ہونے کے باوجود اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کر پایا۔

یہ بات بعد میں اسے معلوم ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھوں قتل ہونے والا شخص ماریا کا شوہر بابر تھا جو اسی روز صبح گیارہ بجے کے قریب لاہور کے دورے سے واپس پہنچا تھا اور اس وقت اپنے آفس میں ہونے والی ایک میٹنگ میں شرکت کرنے کے بعد گھر واپس آیا تھا۔

علینا نے اس وقت بڑے حوصلے سے کام لیتے ہوئے

اپنے آپ کو سنبھالا تھا۔ اس موقعے پر ماریا کے پڑوس میں رہنے والوں نے بھی بڑا تعاون کیا۔ ان کی مدد سے ہی علینا، ماریا کو سنبھالنے میں کامیاب ہو پائی تھی۔ آذر کو اطلاع پہنچانے کے لیے اس نے ماریا کے دیے ہوئے ایڈریس پر اسے ٹیلی گرام کیا... تب وہ چوتھے روز، صبح کے وقت پہنچنے میں کامیاب ہو پایا۔

جواد کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ جواد کی ماں کو یہ خبر ملی تو صدمے کے باعث اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور اس نے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔

جواد اپنی گرفتاری کے بعد بالکل چپ تھا۔ پولیس نے اس کا بیان لینا چاہا تو وہ ایک لفظ نہیں بولا اور ماں کے انتقال کی خبر سن کر بالکل ہی گم صم ہوگیا۔ اس پر مقدمہ چلا لیکن اس نے اپنے دفاع کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ جرم تو اس پر ثابت ہو چکا تھا لیکن اس کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر جیل بھیجنے کے بجائے اسے پاگل خانے بھیج دیا گیا کیونکہ اسے پاگل پن کے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔

ایک روز اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل کے احاطے میں کیے جانے والے کنسٹرکشن کے کام میں مدد کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ وہاں شاید کوئی نئی بیرک وغیرہ تعمیر کی جارہی تھی اور اسی سلسلے میں کھدائی کا کام جاری تھا۔ دوسرے قیدیوں کے ساتھ جواد کو بھی اس کام پر لگا دیا گیا۔ وہ ذرا سی دیر میں ہانپ گیا... اس نے تو بڑی تن آسان زندگی گزاری تھی۔ اسے بھلا ایسی مشقت کا تجربہ کہاں تھا۔

ان کی نگرانی کرنے والے گارڈ نے جواد کو سست پڑتے دیکھ کر کئی بار ٹوکا اور حسبِ عادت گالیوں سے بھی نوازا۔ گالیاں سن کر جواد نے خوں خوار نظروں سے اسے گھورا اور ہاتھ روک کر کھڑا ہوگیا۔ گارڈ بھلا ایک قیدی کے ایسے تیور برداشت کرنے والا کہاں تھا... اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا رولر زور سے گھما کر جواد کی کمر پر رسید کر دیا۔ جواد ایک دم طیش میں آگیا، اس نے پھاوڑا اٹھا کر گارڈ کے سر پر پے در پے کتنے ہی وار کر ڈالے۔ اس لمحے وہ بالکل جنونی اور وحشی دکھائی دے رہا تھا۔ اسے بڑی مشکل سے قابو کیا گیا۔ جس گارڈ پر اس نے حملہ کیا تھا، اس کا سر اس بری طرح سے پھٹا تھا کہ وہ زندہ نہ بچ پایا... جواد پر مسلسل کئی روز تک جنون کی سی کیفیت طاری رہی... یہاں تک کہ اسے پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھیج دیا گیا۔

اس دوران آذر اور علینا، سادگی کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ ان پر شادی کے لیے زور دینے والی ماریا بھی جوان کے ساتھ ہی رہنے لگی تھی۔ وہ دونوں بے حد اصرار کے ساتھ اسے اپنے گھر لے آئے تھے اور ماریا کے شوہر بابر کا غم ہی وہ غم تھا جو ان کی خوشیوں پر کسی گہن کی طرح سایہ فگن تھا۔

اس روز انہیں پاگل خانے سے فون موصول ہوا کہ جواد نے ان دونوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہ شدید بیمار تھا۔

علینا جانا نہیں چاہتی تھی لیکن آذر کے اصرار پر بالآخر وہ تیار ہوگئی... وہ حیران تھی کہ اس کے شریکِ حیات نے آخر کیسا دل پایا ہے کہ وہ اپنی بہن کی خوشیوں کے قاتل اور اپنے رقیب سے ملنے کو تیار ہوگیا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اسے جان سے مارنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور اس کے بدلے بابر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

لیکن آذر کا کہنا تھا کہ جواد کو اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے... اس کی شخصیت، اس کا کیریئر... اس کی زندگی... سب تباہ ہو چکا تھا۔ تو ایسے شخص سے بھلا کیسی دشمنی... مرے ہوئے کو بھلا کیا مارنا!

وہ دونوں جواد سے ملنے پہنچے تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ جواد کے بجائے جواد کا سایہ دکھائی دیتا تھا۔ زرد رنگت، پچکے ہوئے گال... اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور جسم گویا ہڈیوں کا ڈھانچا... اگر کوئی چیز سلامت تھی تو وہ اس کے گھنے بال تھے جن کے باعث اس کی شباہت کچھ برقرار تھی۔

علینا اور آذر کو دیکھتے ہی وہ رو رو کر اور گڑگڑا کر ان سے معافی مانگنے لگا... وہ دونوں تو پہلے ہی اس کی حالت دیکھ کر افسردہ تھے لہٰذا اسے معاف کرنے میں بھی انہوں نے دیر نہیں لگائی... لیکن جواد کو بڑی مشکل سے اس بات کا یقین آیا۔

یہ یقین آجانے پر کہ ان دونوں نے دل سے اسے معاف کر دیا ہے، وہ ایک بار پھر پاگلوں کی طرح کبھی رونے اور کبھی ہنسنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے سر کے بال بھی نوچتا جا رہا تھا۔

وہ دونوں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر خاموشی سے باہر نکل آئے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ چند روز سے زیادہ کا مہمان نہیں ہے۔ علینا کے ذہن میں رہ رہ کر یہ مصرع گونج رہا تھا:

''دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!''

رزقِ حلال

سلیم فاروقی

ایک واقعہ کبھی پے در پے مصیبتوں کا پیش خیمہ بن جاتا ہے... رزقِ حلال کی راہ میں سرگرم ایک نوجوان کی داستان... وہ حلال کمائی کا خواہش مند تھا... اور اسے اس خواہش کی قیمت بھی چکانی پڑ رہی تھی...

نیکی اور بدی کی راہ میں حائل رکاوٹیں جو ہر شخص کے قدم اکھاڑ دیتی ہیں۔ سر ورق کا تیز رفتار رنگ

بات اتنی معمولی بھی نہیں تھی کہ میں برداشت کر جاتا۔ بعد میں ہر سننے والے نے کہا کہ اتنی چھوٹی سی بات کے لیے اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اب میں سوچتا ہوں تو خود کو لعن طعن کرتا ہوں کہ بات معمولی نہ سہی لیکن مجھے اپنے غصے پر قابو پانا چاہیے تھا۔

ٹھہریے... میں ابتدا سے بتاتا ہوں کہ ہوا کیا تھا؟

میں ان دنوں فرسٹ ایئر کا طالبِ علم تھا۔ ابو ایک سرکاری آفس میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ گریڈ سترہ کا یہ عہدہ بھی انہیں تیس سال کی جان توڑ محنت کے بعد ملا تھا۔ ابو کو مجھ سے بہت سی اُمیدیں تھیں کہ میں پڑھ لکھ کر خاندان کا نام روشن کروں گا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں سی ایس ایس کا امتحان دوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ سی ایس ایس کیا ہوتا ہے؟ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ پڑھائی کی طرف میرا رجحان ہی نہیں تھا۔

یہ ستّر کی دہائی کی بات ہے۔ ہم لوگ ان دنوں حیدرآباد میں رہتے تھے۔ آج کل کی طرح زندگی میں اتنی آسائشیں نہیں تھیں۔ ان دنوں جس کے پاس موٹر سائیکل ہوتی تھی، وہ خاصا خوش حال سمجھا جاتا تھا۔ ہمارا گھرانا سات افراد پر مشتمل تھا۔ امی ابو تھے، مجھ سے بڑے ایک بھائی ذیشان تھے۔ پھر میں تھا، مجھ سے چھوٹی ایک بہن ثمرہ تھی۔ ذیشان بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ بھابی ثمینہ اور ذیشان بھائی کا چار سالہ بیٹا فرحان!

ذیشان بھائی کو پڑھنے کا شوق تھا لیکن اس وقت گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے۔ وہ حساس بھی ضرورت سے زیادہ ہی تھے۔ انہوں نے انٹر کرنے کے بعد حیدرآباد ہی میں چھوٹی سی ایک ملازمت کر لی۔ یوں وہ ابو کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ابو ان کے اس فیصلے پر بہت ناراض ہوئے لیکن ذیشان بھائی نے انہیں یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ میں پرائیویٹ تعلیم جاری رکھوں گا۔

بیٹا کمانے لگے تو ہر ماں کی پہلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اب اس کے سر پر سہرا سجا دیا جائے۔ امی بھی گویا تیار بیٹھی تھیں۔ جیسے ہی بھیا نے ملازمت شروع کی، امی اٹھتے بیٹھتے ان کی شادی کے نہ صرف خواب دیکھنے لگیں بلکہ ان کے لیے چاند سی بہو کی تلاش بھی شروع کر دی۔

بھیا نے بہت ہاتھ پیر مارے، غصے کا اظہار کیا، امی کی خوشامد بھی کی لیکن امی کسی طور نہ مانیں۔ یوں ثمینہ بھابی دلہن بن کر ہمارے گھر میں آ گئیں۔

بھیا جس کمپنی میں ملازمت کرتے تھے، وہ اسکول اور دفتر کی اسٹیشنری کا کاروبار کرتی تھی۔ خاصی بڑی فرم تھی۔ انہیں بڑے بڑے اداروں سے اسٹیشنری کی سپلائی کے ٹھیکے ملتے تھے پھر وہ کمپنی اسٹیشنری چھاپنے بھی لگی۔

وہاں ملازمت کر کے بھیا بھی اس کاروبار کے اسرار و رموز خاصی حد تک سمجھ گئے تھے۔

ابو ریٹائر ہوئے تو انہیں پراویڈنٹ فنڈ کی اچھی خاصی رقم ملی۔ اس دور میں تو ایک لاکھ بھی خاصی بھاری رقم ہوا کرتی تھی۔ ابو نے کچھ پیسا تو گھر کی مرمت اور توسیع میں لگایا، باقی پیسے بینک میں جمع کرا دیے۔

انہی دنوں بھیا کے ایک دوست نے انہیں مشورہ دیا کہ تم خود اپنا کاروبار کیوں نہیں کرتے؟ فی الحال چھوٹے پیمانے پر کرو، اللہ نے چاہا تو ایک ہی سال میں سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ اسٹیشنری کا بزنس تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔

ابو نے بھی ان کے دوست کے فیصلے کی تائید کی اور کہا کہ ابھی میرے پاس پیسا ہے، کل نہ جانے کیا حالات ہوں۔

پھر اسی دوست نے یہ مشورہ بھی دیا کہ کاروبار حیدرآباد کے بجائے کراچی میں کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

یہ بات بھی بھیا کے دل کو لگی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کراچی میں ہمارا دور یا نزدیک کا کوئی رشتے دار بھی نہیں رہتا تھا۔ وہاں قدم جمانے کے لیے بھیا کو بالکل نئے سرے سے شروعات کرنا تھی۔

یہ مسئلہ بھی بھیا کے ایک دوست نے حل کر دیا۔ وہ بھیا کے ساتھ ہی پڑھتا تھا لیکن ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھا۔

ان دنوں نارتھ ناظم آباد زیادہ آباد نہیں تھا۔ وہاں مکان نسبتاً کم کرائے پر مل جاتے تھے۔ بھیا کا وہ دوست بھی نارتھ ناظم آباد ہی میں دو کمرے کے ایک پورشن میں رہتا تھا۔ اس نے بھیا سے کہا کہ مکان کا آدھا کرایہ تم دے دینا۔ یوں تمہیں بھی سہولت ہو جائے گی اور مجھے بھی۔

بہت دوڑ دھوپ کے بعد اس نے لیاقت آباد کے علاقے میں بھیا کے لیے موقع کی ایک دکان بھی دیکھ لی۔

ابو کو بھیا کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ بھیا کو خود بھی اعتماد تھا کہ وہ یہ کاروبار بہت بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔ ابو نے پچیس ہزار روپے بھیا کے حوالے کر دیے۔ ان دنوں پچیس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی تھی۔

پھر بھیا کراچی روانہ ہو گئے۔ بھیا کے کاروبار سے

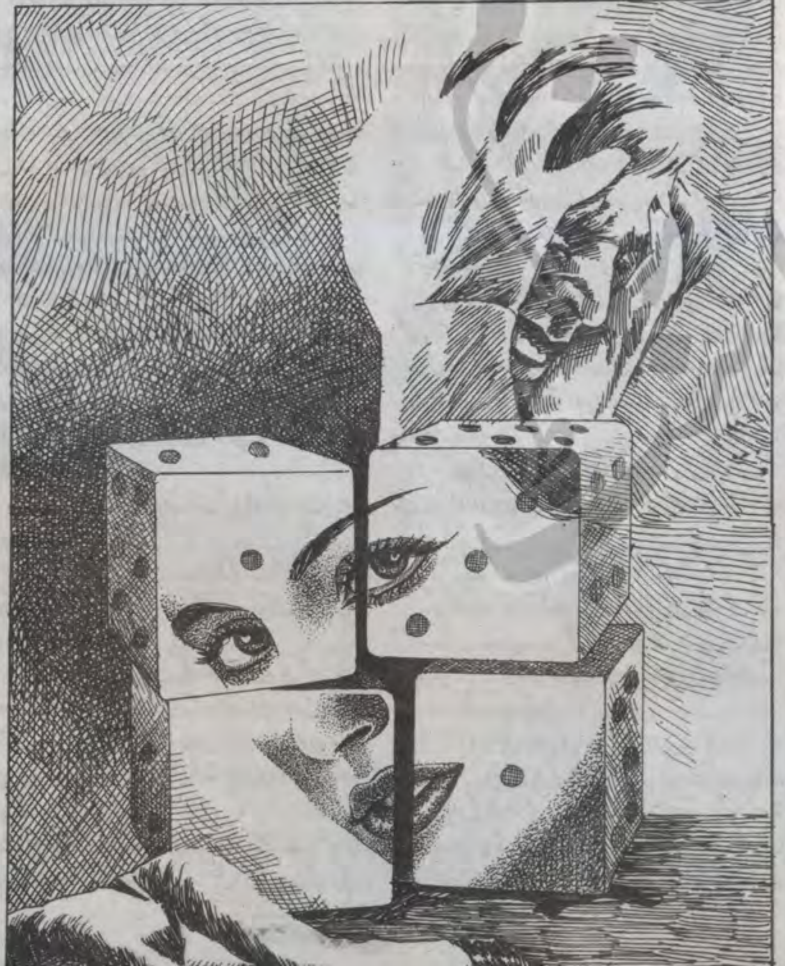

زیادہ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اب مجھے کراچی گھومنے کا موقع بھی ملے گا۔ آپ کو شاید حیرت ہوگی کہ میں نے اندرونِ سندھ کے بہت سے شہر تو دیکھے تھے لیکن کراچی، لاہور یا اسلام آباد جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

بھیا پابندی سے ابو کو خط لکھتے تھے اور مہینے میں ایک دفعہ ٹیلی فون بھی کرتے تھے۔ ٹیلی فون ہمارے گھر میں نہیں تھا بلکہ گھر سے کچھ فاصلے پر میڈیکل اسٹور میں تھا۔ میڈیکل اسٹور کے مالک نذیر انکل ابو کے پرانے دوست تھے۔ انہی کی وجہ سے بھیا سے مہینے میں ایک دفعہ بات ہو جاتی تھی ورنہ ٹیلی فون بھی اس دور میں خال خال لوگوں ہی کو نصیب تھا۔

☆☆☆

تین مہینے کے اندر اندر بھیا کا بزنس چل نکلا۔ میں بھی دو چار دفعہ کراچی کا چکر لگا آیا تھا۔ بھیا نے لیاقت آباد کے علاقے میں چھوٹی سی ایک دکان سے کاروبار کا آغاز کیا تھا۔

چھ مہینے بعد انہوں نے بھابی کو بھی کراچی بلا لیا۔ میں ہی بھابی کو لے کر کراچی گیا تھا۔ بھیا نے بتا دیا تھا کہ اب انہوں نے فیڈرل بی ایریا میں ہی نسبتاً بڑا اور اچھا مکان کرائے پر لے لیا ہے۔ انہوں نے مجھے گھر کا پتا اچھی طرح سمجھا دیا تھا اس لیے میں بہت آسانی سے وہاں پہنچ گیا۔

جمعے کا دن تھا اس لیے بھیا کی دکان بند تھی اور وہ گھر ہی پر تھے۔ ان دنوں اتوار ہی کو چھٹی ہوا کرتی تھی۔

بھیا کی دکان بھی اب خوب بھری بھری نظر آ رہی تھی۔ ان دنوں چونکہ سیزن تھا اس لیے دکان پر رش ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ نیا تعلیمی سیشن شروع ہوا تھا اس لیے دکان پر بچوں اور ان کے والدین کا رش ہر روز پہلے سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔

میں نے سوچا کہ جب تک میں کراچی میں ہوں، بھیا کا ہاتھ ہی بٹا دوں۔

بھیا نے مختلف اسکولوں سے رابطہ کر کے ان کے کورس کے الگ الگ بنڈل بنا رکھے تھے۔ اس میں کتابیں، کاپیاں، پنسل وغیرہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔

اس مرتبہ دکان بھی مجھے کچھ کشادہ لگ رہی تھی۔ بھیا نے بعد میں بتایا کہ میں نے اس کے ساتھ والی دوسری دکان بھی کرائے پر لے لی ہے۔ وہ دکان، پہلی والی دکان سے خاصی بڑی تھی۔ دونوں دکانیں مل کر تو اچھا خاصا بک اسٹور بن گیا تھا۔

بھیا، ابو کو بھی ہر ماہ پابندی سے رقم بھیجتے تھے۔ انہوں نے آنے جانے کے لیے ایک موٹر سائیکل بھی خرید لی تھی۔ گھر میں بھی ضرورت کی ہر چیز تھی۔ بھیا کی خوش حال زندگی دیکھ کر مجھے بھی دلی خوشی ہوئی۔

ایک دن بھیا مجھے دکان پر بٹھا کر خود مارکیٹ چلے گئے۔ دکان کی بہت سی چیزیں ختم ہو گئی تھیں۔ گاہکوں کا رش بھی اب اتنا نہیں تھا لیکن اب بھی کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبا، دفتروں کے بابو وغیرہ اسٹیشنری خریدنے آتے رہتے تھے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی بہت شدید تھی۔ گاہک بھی اِکّا دُکّا آ رہے تھے۔ دوپہر کے بعد تو مارکیٹ میں سناٹا چھا گیا۔

اچانک دکان پر درمیانے قد کا دبلا سا ایک آدمی آیا۔ اس کا جسم تو منحنی تھا لیکن آواز بہت پاٹ دار تھی۔

اس نے دکان میں اِدھر اُدھر جھانکا پھر کرخت لہجے میں بولا۔ ”ذیشان کہاں گیا؟“ اس کے انداز میں ایک رعونت تھی۔

مجھے اس کا لہجہ شدید ناگوار گزرا لیکن میں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ ممکن ہے وہ بھیا کا کوئی بے تکلف دوست ہو یا پھر کوئی پرانا گاہک ہو۔

میں نے تحمل سے جواب دیا۔ ”بھیا تو اس وقت مارکیٹ گئے ہیں۔“

”اچھا لا پچاس روپے نکال۔“ اس نے اسی طرح کرخت لہجے میں کہا۔

پچاس روپے کی رقم اس دور میں اچھی خاصی ہوتی تھی۔ میں ان دنوں صرف دس روپے لے کر حیدرآباد سے کراچی آتا تھا۔ چار روپے بس کا کرایہ تھا۔ دو روپے میں کراچی میں خرچ کرتا تھا اور دوسرے دن حیدرآباد لوٹ جاتا تھا۔

”پچاس روپے تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔“ میں نے کہا اور سوچا کہ ممکن ہے اس کا کوئی پچھلا حساب کتاب باقی ہو۔

”گلّے میں دیکھ۔“ وہ پھر درشت لہجے میں بولا۔

مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ”جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ پچاس روپے نہیں ہیں تو آپ۔۔۔ یقین کیوں نہیں کر رہے؟ بھیا سامان کی خریداری کے لیے سارا کیش لے گئے ہیں۔“

”آواز نیچی رکھ کے بات کر۔“ اس نے پھر اکھڑ لہجے میں کہا۔ ”اس پوری مارکیٹ میں کسی کی جرأت نہیں ہے کہ راجا سے اونچی آواز میں بات کرے۔ ذیشان آئے تو اسے بتا دینا کہ راجا آیا تھا۔ میں شام کو پھر آؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ مریل سا آدمی روانہ ہوا جیسے اپنے سوکھے پتلے جسم سے سامنے آنے والی ہر چیز کو روند ڈالے گا۔

شام کو بھیا آئے تو گاہکوں کے رش میں مجھے راجا کے بارے میں بتانا یاد نہیں رہا۔

دوسرے دن پھر اتفاق سے میں ہی دکان پر تھا۔ بھیا اس وقت کھانا کھانے گھر گئے ہوئے تھے کہ راجا پھر آ گیا۔ اس مرتبہ اس کے سر پر لاہوری ٹوپی بھی تھی جو اس نے خاصی ترچھی کر کے سر پر جما رکھی تھی۔ آنکھوں میں سُرمہ تھا اور بالوں میں اتنا تیل تھا کہ بہہ کر اس کی پیشانی پر آ گیا تھا۔ آج وہ جینز اور عجیب سی ایک شرٹ میں ملبوس تھا جس کے بازوؤں پر عجیب و غریب لیبل لگے ہوئے تھے۔

اس نے دکان میں متلاشی نظروں سے دیکھا پھر کرخت لہجے میں بولا۔ ”وہ ذیشان آج بھی نہیں ہے؟“

مجھے اس کے اندازِ گفتگو پر اچانک غصہ آ گیا اور میں نے کہا۔ ”آخر تیرا پرابلم کیا ہے؟“ میں نے ساری مروت اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ دیا۔

اس کی سرمہ لگی ہوئی آنکھوں میں حیرانی ظاہر ہوئی پھر وہ بپھر کر بولا۔ ”تو راجا کو نہیں جانتا؟“

”میں کسی راجا یا بادشاہ کو نہیں جانتا، اب یہاں سے چلتا پھرتا نظر آ۔“

”لگتا ہے زندگی سے تیرا دل بھر گیا ہے ورنہ کس کی مجال ہے کہ وہ راجا سے اس لہجے میں بات کر سکے؟“ اس نے مجھے انتہائی غلیظ گالی دیتے ہوئے کہا۔

میں نے کاؤنٹر پر لگا ہوا تختہ ہٹایا اور بہت پُرسکون انداز میں باہر نکل آیا، ورنہ اس کی گالی سے تو میرا دماغ ابھی تک سنسنا رہا تھا۔

پھر میں نے اس کا گریبان پکڑا اور اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میری انگلیوں کے نشانات اس کے بائیں گال پر ثبت ہو کر رہ گئے۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش میں گر گیا۔

میں نے بپھر کر کہا۔ ”آئندہ مجھے گالی مت دینا ورنہ تیرے ہاتھ پیر توڑ دوں گا۔ اب دفع ہو جا یہاں سے۔“

مارکیٹ کے تقریباً سارے دکان دار باہر نکل آئے تھے۔

اس کے جانے کے بعد ہمارے پڑوسی دکان دار مجیب صاحب نے کہا۔ ”ارے بیٹا! یہ کیا غضب کر دیا تم نے؟ جانتے ہو راجا کس کا آدمی ہے؟“

میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر خوف کے سائے تھے۔ میں نے جواب یا۔ ”میں نہیں جانتا کہ راجا کس کا آدمی ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو شخص مجھے ماں کی گالی دے، اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔“

”تم ایسا کرو کہ فوراً دکان بند کر کے گھر چلے جاؤ۔“ انہوں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”راجا، دلاور کا آدمی ہے اور دلاور یہاں کا سب سے بڑا غنڈا ہے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے بیٹا! میرا کہنا مان لو اور دکان بند کر کے چلے جاؤ۔“

”میں دکان بند کروں گا، نہ کہیں جاؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ یہ کہہ کر میں دوبارہ دکان میں آ گیا۔

اسی وقت پرانی سی ایک جیپ دکان کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں بدمعاش قسم کے کئی افراد سوار تھے۔ ان لوگوں میں راجا بھی تھا۔

”راجا کو تم نے مارا ہے؟“ پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور دیکھنے میں خاصا گھیم شحیم نظر آ رہا تھا۔

”ہاں، میں نے مارا ہے۔“ میں نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ”اس نے مجھے ماں کی گالی دی تھی۔ اسے سکھاؤ کہ دوسروں سے بات کیسے کی جاتی ہے۔“

”لگتا ہے تو اس مارکیٹ میں نیا ہے؟“ مونچھوں والے نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔ ”باہر نکل، میں بھی دیکھوں کہ تو کتنا غیرت مند ہے۔ تیری۔۔۔“ اس نے بھی مجھے گالی دی۔

میں بپھر کر دکان سے باہر نکلا تو مارکیٹ کے بقیہ دکان دار بہت عجلت اور خوف میں اپنی دکانیں بند کر رہے تھے۔

میرے باہر نکلتے ہی جیپ میں آنے والے بدمعاش اچھل کر باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہاکیاں اور ڈنڈے تھے۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ایک آدمی کو مارنے کے لیے اتنے آدمی؟ تو اگر واقعی دلیر ہے تو اکیلے مجھ سے مقابلہ کر لے۔“

مونچھوں والے کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ بپھر کر جیپ سے باہر آ گیا۔ وہ قد میں مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے اشارے سے اپنے آدمیوں کو روک دیا اور مجھ سے بولا۔ ”لگتا ہے تیری موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے۔“ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بڑا سا ایک چاقو نکالا اور اسے کھولا تو اس کی گراریوں کی آواز دور تک گونج کر رہ گئی۔

میری نظر اس کے چاقو والے ہاتھ پر تھی۔ مجھے اور کچھ تو نہیں سوجھا، میں نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا بچوں کا امتحانی گتا اٹھا لیا۔

مونچھوں والا آگے بڑھا اور اس نے دائیں ہاتھ سے مجھے تھپڑ مارنے کی کوشش کی۔ اس سے بچنے کے لیے میں بائیں طرف جھکا تو اس کا چاقو والا ہاتھ چل گیا۔ میں نے پھرتی سے امتحانی گتا آگے کر دیا۔

چاقو گتے میں لگا تو اس میں اچھی خاصی دراڑ پڑ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید حملہ کرتا، میں نے اس کی ناف پر زوردار لات رسید کر دی۔ اس کے منہ سے ''اوغ'' کی آواز برآمد ہوئی اور وہ پیٹ پکڑے ہوئے آگے کی طرف جھک گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کی ناف پر گھٹنے سے ایک اور وار کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جبڑے پر ایک گھونسا بھی رسید کر دیا۔

تکلیف کی شدت سے مونچھوں والے کا چہرہ مسخ ہو گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا۔

اس کی حالت دیکھ کر اس کے آدمی میری طرف لپکے لیکن اس نے اشارے سے انہیں روک دیا اور کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کوئی بیچ میں نہیں آئے گا۔ اس نے خان پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اس کی سزا بھی اسے میں ہی دوں گا۔''

اس کا چاقو زمین پر گر چکا تھا۔ اس دور میں چاقو ہی بدمعاشوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا تھا۔ اگر وہ لڑائی موجودہ دور میں ہو رہی ہوتی تو میں اب تک گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔

میں نے بڑھ کر اس کا چاقو اٹھا لیا۔ وہ ابھی تک جھکا ہوا تھا اور سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر بھرپور لات رسید کر دی۔ وہ الٹ کر گرا تو پھر نہ اٹھ سکا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس نے اشارے سے اپنے آدمیوں کو پھر روکا اور بولا۔ ''کوئی بیچ میں نہیں آئے گا۔ یہ خان کا شکار ہے۔''

اسی وقت پرانی سی ایک مورس آ کر رکی۔ گاڑی دیکھ کر سارے بدمعاش مجھے کچھ خوف زدہ سے نظر آنے لگے۔

گاڑی میں سے جو شخص برآمد ہوا، اس کی شخصیت بہت شان دار تھی۔ دراز قد اور کسرتی جسم... سرخ و سفید رنگت، سیاہ لمبے بال جو اس نے پیچھے کی طرف الٹ کر بنا رکھے تھے۔ اس نے بوسکی کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی پھر اس کی نظر خان پر پڑی جو ابھی تک زمین پر گرا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

اس نے سب سے پوچھا۔ ''خان کو کیا ہوا؟''

''اس لڑکے نے مارا ہے استاد!'' ان میں سے ایک آدمی نے جواب دیا اور اس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے وہ ابھی اسے مجھ پر حملہ کرنے کا حکم دے گا۔

''اس لڑکے نے مارا ہے... اس لڑکے نے؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''اس دبلے پتلے لڑکے نے خان کا یہ حال کر دیا۔ یہ اب ناکارہ اور نکما ہو گیا ہے۔'' اس نے خان کے پہلو میں ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''اسے جیپ میں ڈالو۔ اس لڑکے سے میں بعد میں نمٹوں گا۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی کہ میرے آدمی پر ہاتھ اٹھائے؟'' یہ کہہ کر وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔

خان کے آدمیوں نے ہی اسے جیپ میں ڈالا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

مجھے نہ جانے کیوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔

مارکیٹ کی تقریباً سبھی دکانیں بند ہو چکی تھیں اور اس وقت بھی شٹر گرنے کی مخصوص آوازیں آ رہی تھیں۔ وہاں کھڑے ہوئے ٹھیلے والے بھی سہمے ہوئے انداز میں وہاں سے بھاگ رہے تھے۔

ہمارے پڑوسی مجیب صاحب دکان بند کر چکے تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور تشویش زدہ لہجے میں بولے۔ ''جمی بیٹا! میری بات مان لو۔ ابھی دکان بند کرو اور گھر چلے جاؤ۔ بعد میں مارکیٹ کمیٹی والے دلاور سے بات کر کے معاملہ رفع دفع کرانے کی کوشش کریں گے۔''

''لیکن مجیب بھائی...''

''کوئی لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر تم مجھے بڑا سمجھتے ہو تو میری بات مان لو اور دکان بند کر کے گھر چلے جاؤ۔''

میں نے ان کے کہنے پر دکان بند کی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بھیا کھانے سے فارغ ہو کر گھر سے نکل ہی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے بولے۔ ''جمی! تم سے ذرا سا صبر نہ ہوا۔ میں بس آ ہی رہا تھا پھر تم کھانا کھانے آ جاتے۔''

''بات یہ نہیں ہے بھیا!'' میں نے کہا۔ ''پھر انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

تفصیل سن کر وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے اور بولے۔ ''وہ بہت خطرناک لوگ ہیں جمی! تمہیں ان سے الجھنے کی کیا ضرورت تھی؟ راجا پیسے ہی تو مانگ رہا تھا۔ دے دیتے اسے پچاس روپے۔''

''کس بات کے پیسے؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''دلاور مارکیٹ کی ہر دکان سے پچاس روپے بھتا وصول کرتا ہے۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے؟'' یہ باتیں کرتے ہوئے ہم گھر میں داخل ہو گئے۔ ''اچھا تم کھانا تو کھا لو۔'' بھیا نے کہا اور خود پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگے۔

میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں۔''

''تم کھانا کھاؤ، میں دیکھ لوں گا۔'' یہ کہہ کر بھیا دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ دلاور کے آدمی گھر تک پہنچ گئے ہیں۔ اگر انہوں نے بھیا کی بے عزتی کر دی تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکے گا۔ میرے کان دروازے کی آوازوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

''ارے ماجد صاحب آپ؟'' بھیا نے کہا۔ ''آیئے، اندر تشریف لے آئیں۔'' پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''جمی! ذرا ڈرائنگ روم کھولو۔''

میں نے ڈرائنگ روم کا بیرونی سمت کھلنے والا دروازہ کھول دیا۔ ڈرائنگ روم میں چار پانچ افراد داخل ہوئے۔ وہ اپنے حلیوں ہی سے کاروباری لوگ لگ رہے تھے۔

''ذیشان صاحب!'' ان میں سے ایک صاحب بولے۔ ''ہم نے بہت مشکل سے دلاور کو ایک شرط پر منایا ہے۔ ذرا اپنے بھائی کو تو بلائیں۔''

''جی، میں ہوں ان کا بھائی۔'' میں نے کہا۔

''جمی! یہ ماجد صاحب ہیں۔ مارکیٹ کمیٹی کے صدر ہیں اور مارکیٹ میں سب سے بڑی کریانہ کی دکان انہی کی ہے۔ یہ وحید صاحب ہیں اور یہ رشید اور رؤف صاحب۔'' انہوں نے چند لوگوں کا تعارف بھی کرایا۔ ''یہ سب لوگ مارکیٹ کمیٹی کے عہدے دار ہیں۔''

''تم نے... تم نے مارا ہے خان کو؟'' ماجد صاحب کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''جی ہاں، اس نے مجھے ماں کی گالی دی تھی۔ کیا آپ ماں کی گالی برداشت کر لیں گے؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''کیا نام بتایا تم نے؟''

''جی عرفان!'' میں نے کہا۔ ''ویسے لوگ عموماً مجھے جمی کہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''دیکھو عرفان میاں!'' ماجد صاحب نے کہا۔ ''خان نے تمہیں گالی دی تھی، تم نے اسے اس کی سزا دے دی ہے لیکن دلاور تمہاری اس حرکت پر بہت مشتعل ہے۔ تم جانتے ہو، اس نے کیا کیا ہے؟'' انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اس نے ہفتہ وار بھتے میں پچیس روپے کا اضافہ کر دیا ہے۔ اب ہم جو کچھ کمائیں گے، دلاور کو دے دیں گے تو خود کیا کمائیں گے؟''

''یہی بات تو میں ابھی بھیا سے کہہ رہا تھا۔ ہم اپنی محنت کی کمائی کسی دوسرے کو کیوں دیں؟''

''دلاور کہتا ہے کہ یہ تم لوگوں کی ایک طرح سے انشورنس ہے۔ ہماری دکان کو کبھی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ''ہم لوگوں نے دلاور کو اسی شرط پر منایا ہے۔ اس کی یہ بھی شرط ہے کہ تم سب کے سامنے اس کے آدمی سے معافی مانگو۔''

''کس بات کی معافی؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''پہل تو انہی لوگوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ میں دونوں میں سے اس کی کوئی بھی شرط ماننے کو تیار نہیں ہوں۔''

''ہم تم سے پوچھ نہیں رہے ہیں بلکہ بتا رہے ہیں۔'' ماجد صاحب نے کہا۔ ''اور پھر تم کون ہوتے ہو ان معاملات میں بولنے والے؟ کمیٹی کے ممبر ذیشان صاحب ہیں۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ تم خان سے معافی مانگ لو۔''

''میرا قصور ہوتا تو میں معافی بھی مانگ لیتا لیکن جب میری کوئی غلطی ہی نہیں ہے تو معافی کیسی؟''

''ہمارا کام صرف سمجھانا تھا۔ جب سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا ہے کاروبار تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمارا کاروبار تو خیر متاثر ہوگا ہی، ذیشان کا کاروبار تو بالکل تباہ ہو جائے گا۔ پھر دلاور ایسا آدمی ہے کہ وہ ذیشان کو کراچی کے کسی بھی علاقے میں کاروبار نہیں کرنے دے گا۔''

''کچھ بھی ہو جائے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس گھٹیا آدمی سے معافی نہیں مانگ سکتا۔ دلاور کی ہوس تو روز بہ روز بڑھتی جائے گی۔ اس نے ابھی پچھتر روپے کا مطالبہ کیا ہے، آئندہ وہ سو روپے بھی مانگ سکتا ہے۔''

''تو پھر ایسا کرو۔'' بھیا نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم واپس حیدرآباد چلے جاؤ۔ میں نے دو برس میں جو کاروبار جمایا ہے، وہ تم ایک ہی دن میں ختم کرنا چاہتے ہو؟''

''بھیا... میں... کیا میں اس کی گالی سن لیتا؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اور اگر آپ کو لگتا ہے کہ میرے جانے سے آپ کا کاروبار پھلے پھولے گا تو میں آج ہی بلکہ ابھی اور اسی وقت حیدرآباد جا رہا ہوں۔''

''ناراض کیوں ہوتے ہو جمی!'' بھیا نے کہا۔ ''کبھی کبھی مصلحت کے تحت ہمیں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

"آپ کریں برداشت۔" میں نے کہا۔ "آپ بدمعاشوں کو بھتے دیں، ان کی ہر جائز و ناجائز بات مانیں، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر میں ڈرائنگ روم سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا اور اپنے بیگ میں کپڑے ٹھونسنے لگا۔

"جمی!" بھابی نے کہا۔ "اتنے جذباتی مت ہو۔ مارکیٹ کا ہر دکان دار دلاور کو بھتا دیتا ہے۔ تمہیں تو کچھ اندازہ ہی نہیں ہے کہ تمہارے بھیا نے اس کاروبار کے لیے کیسے کیسے جتن کیے ہیں۔"

"میں تو اب جا ہی رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بھیا کا کاروبار ہے، وہی جانیں۔ میں تو صرف ان کی مدد... کی خاطر دکان میں بیٹھ گیا تھا۔"

"کیا تم مجھ سے بھی ناراض ہو؟" بھابی نے کہا۔

"میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "بلکہ مجھے تو خود سے شرمندگی ہے۔ مجھے اس معاملے میں بولنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"چاچو!" فرحان میرے پیروں سے لپٹ گیا۔ "آپ کیوں جا رہے ہیں؟"

"بیٹا!" میں نے کہا۔ "میں کچھ دن کے بعد پھر آ جاؤں گا۔ وہاں دادا جان بھی تو میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر کی طرف بڑھا۔ فرحان ایک دفعہ پھر میرے پیروں میں لپٹ گیا۔ "مت جائیں چاچو!"

اسی وقت بھیا بھی اندر آ گئے۔ شاید مارکیٹ کمیٹی کے لوگ چلے گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "جمی! تم کل چلے جانا۔ آج شام میں کسی وقت مارکیٹ کمیٹی اور دلاور کی میٹنگ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں تمہاری بھی ضرورت پڑے۔"

میں نے بیگ رکھ دیا اور جوتوں سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ زیادہ افسوس مجھے بھیا کے رویے پر تھا۔ وہ بھی دلاور کو غنڈا ٹیکس دینے پر آمادہ تھے اور اس سے پہلے بھی دیتے رہے تھے۔

شام کو مارکیٹ ہی میں ایک کھلی جگہ پر کرسیاں رکھ دی گئیں اور تمام دکان دار وہاں اکٹھے ہو گئے۔ وہ سب مجھے ناگواری سے دیکھ رہے تھے۔ میری وجہ سے نہ صرف ان کے کاروبار پر آنچ آ سکتی تھی بلکہ ان پر پچیس روپے بھتے کا اضافی بوجھ بھی پڑ گیا تھا۔ انہیں دلاور کا انتظار تھا۔

بھیا میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے اور وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ بار بار مجھے یہی سمجھا رہے تھے کہ دلاور کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات مت کر دینا کہ وہ پھر بھڑ جائے۔

تھوڑی دیر بعد دلاور کی پرانی گاڑی وہاں آ کر رکی۔ اس کے پیچھے پیچھے دو کھلے ہڈ کی پرانی ولیز جیپیں بھی تھیں جن میں اس کے مسلح بدمعاش سوار تھے۔

دکان داروں نے دلاور کے لیے خصوصی نشست کا انتظام کیا تھا۔ ماجد صاحب نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اس سے ہاتھ ملانا چاہا لیکن وہ انہیں نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھا اور راستے میں رکھی ہوئی ایک کرسی کو ٹھوکر مار کے ہٹاتا ہوا اپنی نشست تک پہنچا۔

ماجد صاحب نے اپنے طور پر چائے اور دیگر لوازمات کا بھی اہتمام کر رکھا تھا۔ دلاور کے بیٹھتے ہی انہوں نے کہا۔ "غفور! دلاور صاحب کو چائے پلاؤ۔"

"میں یہاں چائے پینے نہیں آیا ہوں۔" دلاور نے کہا۔ "اس سورما کو بلاؤ جس نے خان پر ہاتھ اٹھایا ہے۔"

بھیا کھڑے ہو کر جلدی سے بولے۔ "دلاور صاحب! وہ ابھی بچہ ہے، نا سمجھ ہے... اسے معاف کر دیں۔"

"تو بیٹھ جا۔" دلاور نے انتہائی حقارت سے کہا۔ "اور بھونکنا بند کر۔"

بھیا کی یہ تذلیل مجھ سے برداشت نہ ہوئی اور میں بھر کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ہوں جمی!" میں نے کہا۔ "میں نے ہی تمہارے اس سورما کو زمین چٹائی تھی۔" بھیا نے میرا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن میں ان کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ "بولو... کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے تیری جوانی پر رحم آ رہا ہے۔" دلاور نے کہا۔ "تو اگر خان سے معافی مانگ لے تو میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔"

"میری جوانی پر رحم کھانے کے بجائے تم خود پر رحم کھاؤ۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔ "خان نے مجھے ماں کی گالی دی تھی۔ اگر وہی گالی میں تمہیں دوں تو کیا تم برداشت کر لو گے؟"

دلاور بھر کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا..... وہ خاصا خوب رو جوان تھا اور اگر ڈھنگ کا لباس پہن لیتا تو کسی بھی طرح سے بدمعاش نہیں لگتا۔ اس کے اٹھتے ہی اس کے چمچے بھی ہاکیاں اور ڈنڈے لے کر میرے اردگرد پھیل گئے۔

"واہ دلاور صاحب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے، تم صرف نام ہی کے دلاور ہو۔ ایک آدمی کے لیے بیس آدمی لے کر آئے ہو؟ مزہ تو جب ہے کہ مقابلہ برابر کا ہو۔"

"تو نے بے خبری میں خان کو کیا مار لیا، خود کو ہیرو سمجھنے لگا ہے۔ میری تو چھوڑ، میرا ایک ہی آدمی تجھے چیونٹی کی طرح مسل دے گا۔"

"دلاور صاحب!" بھیا نے پھر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔"

دلاور آگے بڑھا اور بولا۔ "میں نے تجھے بھونکنے کو منع کیا تھا نا!" یہ کہہ کر اس نے بھیا کے منہ پر تھپڑ مارنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ درمیان ہی میں پکڑ لیا۔

دلاور نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا پھر چیخ کر بولا۔ "بھورے! اس کے ہاتھ پیر توڑ کر سارے کس بل نکال دے۔ اس مار پیٹ میں یہ مر بھی جائے تو فکر مت کرنا۔"

بھورا تڑپ کر آگے بڑھا۔ وہ درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ اس کا جسم کسرتی تھا اور اسم با مسمیٰ تھا۔ اس کے بال اور جلد کی رنگت واقعی بھوری تھی۔

بھورے نے اچانک کمر کے گرد لپٹی ہوئی سائیکل کی چین کھول لی۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔

بھورے نے اچانک سائیکل کی چین سے مجھ پر وار کیا۔ مجھے اس سے اتنی پھرتی کی امید نہیں تھی۔ بچتے بچتے بھی چین کا ایک حصہ میری کمر پر لگا اور میرے جسم میں گویا مرچیں سی بھر گئیں۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔

بھیا مسلسل چیخ رہے تھے۔ "ارے اسے چھوڑ دو۔ تم لوگ جو کہو گے میں مانوں گا۔ میرا بھائی مر جائے گا۔"

انہیں شاید مجیب بھائی اور دوسرے دکان داروں نے روک رکھا تھا ورنہ وہ اب تک میرے اور بھورے کے درمیان آ چکے ہوتے۔

بھورے نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر پھر وار کیا۔ اس مرتبہ سائیکل کی چین میرے بائیں ہاتھ پر لپٹ گئی۔ میں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کی۔ چین میری جیکٹ، شرٹ اور کلائی کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا جیسے میرا ہاتھ ناکارہ ہو گیا ہو۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بھورا واقعی آج مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں نے اسکول میں، گلی محلے میں، کالج میں لڑکوں سے بہت لڑائیاں کی تھیں۔ انہیں مارا بھی تھا اور ان سے پٹا بھی تھا لیکن ایسی خونی لڑائی کی نوبت نہیں آئی تھی جس میں دوسرے فریق نے گویا یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ یا تو وہ مجھے اپاہج کر دے گا یا جان سے مار دے گا۔

میری کلائی سے خون بہنے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ چین کے جھٹکے کے ساتھ میرا ہاتھ بھی کندھے سے اکھڑ گیا ہو۔

بھورے نے پھر وار کیا۔ اس مرتبہ سائیکل کی چین میرے بائیں کندھے پر پڑی لیکن یہ ضرب اتنی کاری نہیں تھی۔ اس کے باوجود میرے پورے جسم میں گویا آگ سی بھر گئی تھی۔

"بہت غیرت مند بنتا ہے نا تو!" بھورے نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "خان نے تجھے گالی دی تھی نا؟ میں بھی تجھے گالی دے رہا ہوں۔ تیری ماں..." اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی۔

"مجھے مار تیری بہن..." اس نے مجھے ایک اور وزنی گالی دی۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اتنے لوگوں کے سامنے اس نے مجھے ماں اور بہن کی گالیاں دی تھیں۔

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھ پر وار کیا لیکن میں لڑکھڑا کر ایک طرف ہو گیا۔ سائیکل کی چین زمین پر لگی۔ میں نے اس پر پاؤں رکھ دیا۔ بھورے کی مار سے نڈھال ہونے کے باوجود اس کی گالیوں نے میرے جسم میں گویا ایک نئی قوت بھر دی تھی۔ اس نے جھٹکا دے کر چین نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس پر سختی سے پاؤں جما دیا تھا۔ وہ اپنے ہی زور میں آگے جھک گیا۔ مجھے ایسی خوں ریز لڑائی کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا، نہ مجھے لڑائی بھڑائی کا کوئی تجربہ تھا لیکن اس وقت تو میں اپنی بقا سے زیادہ غیرت کی لڑائی لڑ رہا تھا۔ ماں کی گالی بچپن ہی سے میری کمزوری تھی۔ غصے کی زیادتی سے میں اپنے جسم کی تکلیف بھلا بیٹھا تھا۔

وہ جونہی آگے جھکا، میں نے اندھا دھند اس کے چہرے پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ گھونسا اس کی پیشانی پر پڑا اور اتنا شدید تھا کہ وہ نہ صرف لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف ہٹا بلکہ اس کا وہ خوفناک ہتھیار بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر وہی سائیکل کی چین اٹھا لی اور پوری قوت سے اس پر وار کیا۔ چین اس کی کمر پر پڑی اور کمر کی کھال ادھیڑتی ہوئی نکل گئی۔ پھر تو گویا مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ میں نے اندھے کی لاٹھی کی طرح سائیکل کی چین گھمانا شروع کر دی۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ وہ بھورے کو لگ بھی رہی ہے یا یونہی میں اسے ہوا میں لہرا رہا ہوں۔

ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب دو تین آدمیوں نے مجھے زبردستی روک دیا۔ ان میں بھیا اور مجیب بھائی پیش پیش تھے۔

بھورا زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا اور کئی جگہ کی کھال ادھڑ گئی تھی۔

اس کے دونوں شانے اور ٹانگیں بری طرح زخمی تھیں۔ وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔

دلاور کے آدمیوں نے پھر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن دلاور نے انہیں روک دیا۔ ''کوئی بیچ میں نہیں آئے گا۔'' وہ گرج کر بولا۔ ''اس بھورے کی یہی سزا ہے۔ کل کے اس لونڈے نے اسے مار مار کے ادھ موا کر دیا۔ کیا میں نے اسے اسی دن کے لیے رکھا تھا؟''

اچانک وہاں پولیس کی ایک موبائل وین آ گئی۔ اس میں ایک سب انسپکٹر اور چار مسلح سپاہی کود کر اترے۔

انسپکٹر گرج کر بولا۔ ''کیا ہو رہا ہے یہاں؟''

''انسپکٹر صاحب! دیکھیے اس بدمعاش نے بھورے کا کیا حال کر دیا ہے؟'' دلاور کے آدمیوں میں سے ایک بولا۔

''یہ... یہ... بھورا ہے؟'' انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔ وہ بھی شاید بھورے کو جانتا تھا۔ یقینی طور پر وہ اس کی دہشت سے بھی واقف ہوگا۔

انسپکٹر نے بھورے کا جائزہ لیا پھر اس نے مجھ پر نظر دوڑائی۔ چین ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔

''کیوں بھئی... تو نے کیوں مارا ہے بھورے کو؟''

''میں نے اسے مارنے میں پہل نہیں کی بلکہ اپنے دفاع میں اسے مارا ہے۔ پہل خود ان لوگوں کی طرف سے ہوئی تھی۔''

''میں پہلے یا بعد کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' انسپکٹر نے گرج کر کہا۔ ''مجھے صرف یہ بتا کہ تو نے اسے زخمی کیا ہے یا نہیں؟''

''ہاں، میں نے اسے زخمی کیا ہے۔''

انسپکٹر نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ بھورے کو فوری طور پر اسپتال لے جاؤ۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''دعا کرنا کہ یہ زندہ بچ جائے۔''

پھر اس نے دلاور کی طرف دیکھا۔ دلاور نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کوئی اشارہ کیا۔

انسپکٹر میری طرف بڑھا اور بولا۔ ''میں تجھے اقدامِ قتل میں گرفتار کر رہا ہوں۔'' اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔

اس نے پھرتی سے میری کلائی میں ہتھکڑی ڈالی اور چابی گھما کر اسے لاک کر دیا۔

''میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اپنے دفاع میں کیا ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''کیا اپنی جان بچانا جرم ہے؟ میں بھی تو زخمی ہوں۔ میرے زخم آپ کو نظر نہیں آ رہے ہیں؟''

''اوئے! تیرے زخم تو اب تھانے جا کر تفصیل سے دیکھوں گا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''اور تو مجھے قانون مت سکھا کہ میں نے اپنے دفاع میں اسے زخمی کیا ہے... چل بیٹھ گاڑی میں۔''

اس کے سپاہی نے یہ سن کر مجھے گاڑی کی طرف گھسیٹا۔

''تو کیسا دلاور ہے بزدل آدمی۔'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں دلاور سے کہا۔ ''غنڈوں اور بدمعاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ وہ پولیس کے کندھے پر رکھ کر بندوق نہیں چلاتے۔''

یہ سن کر مجھے گھسیٹنے والے سپاہی نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دیا اور دوسرے سپاہی نے میری کمر پر زوردار لات لگائی۔ میں اوندھے منہ موبائل وین میں گرا۔ میرا چہرہ اور ہاتھ تو وین میں تھے، باقی جسم باہر تھا۔ اس کم بخت سپاہی نے بھی اسی جگہ لات ماری تھی جہاں زخم تھا۔ میں تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا۔

''ارے میرے بھائی کو چھوڑ دو۔ یہ بے قصور ہے۔ سارا قصور تو اس بھورے کا ہے۔'' بھیا نے چیخ کر کہا۔ چیخ چیخ کر ان کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ کچھ لوگ بھورے کو طبی امداد کے لیے اسپتال لے گئے تھے۔

''تجھے بھائی سے بچھڑنے کا اتنا غم ہے تو گاڑی میں بیٹھ جا۔'' انسپکٹر نے اکھڑ لہجے میں کہا پھر پولیس کی موبائل وین وہاں سے روانہ ہو گئی۔

مجھے خود سے زیادہ فکر بھیا کی تھی۔ دلاور جیسا گھٹیا آدمی ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے بھرے مجمع میں نہ صرف اس سے تلخ اور توہین آمیز لہجے میں بات کی تھی بلکہ اس کے دو آدمیوں کو ادھ موا بھی کر دیا تھا۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ اس کی تو ساکھ بلکہ دہشت داؤ پر لگ گئی تھی۔

☆☆☆

حوالات میں مجھ سے پہلے بھی سات قیدی تھے۔ اس سیلن زدہ سیل کی لمبائی چوڑائی مشکل سے دس بائی دس فٹ ہوگی۔

ان میں سے تین آدمی یوں دیوار سے ٹیک لگائے پُرسکون انداز میں بیٹھے تھے جیسے اپنے گھر کے لان میں بیٹھے ہوں۔ بقیہ چار حوالاتی کچھ کھانے میں مصروف تھے۔ مجھے کانسٹیبل نے اندر دھکیلا تو وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے چہروں پر دہشت برس رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ بیٹھنے والے بھی چونک کر مجھے دیکھنے لگے لیکن ان کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

''ابے! کسی کی جیب کاٹتے ہوئے پکڑا گیا ہے کیا؟'' ان چاروں میں سے ایک نے تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''یا پھر کسی لڑکی کو چھیڑنے میں پکڑا گیا ہے؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس اسے گھور کر دیکھنے پر اکتفا کیا۔

''اوہو... لاٹ صاحب کے نخرے تو دیکھو۔'' ان میں سے ایک بولا۔ ''ابے! سیدھی طرح بتا تجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟'' میں نے کہا۔ ''کیا تم لوگ مجھے یہاں سے چھڑا دو گے؟ اپنے کام سے کام رکھو۔''

''ابے واہ! تیری تو زبان بھی خوب چلتی ہے۔ مجھے تو عادی مجرم لگتا ہے ورنہ پہلی دفعہ یہاں آنے والے تو اندر گھستے ہی رونا شروع کر دیتے ہیں۔''

''میں روتا نہیں بلکہ رلاتا ہوں۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

اسی وقت سنتری لاک اپ کے دروازے پر آیا اور بولا۔ ''جمی کون ہے؟ اسے صاحب بلا رہے ہیں۔''

''میں ہوں جمی۔'' میں نے کہا۔

سنتری لاک اپ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ باہر دوسرا سنتری موجود تھا۔ اس نے لاک اپ کا دروازہ بند کر دیا۔

''چل، تجھے صاحب نے بلایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہتھکڑی میری کلائی میں ڈال دی۔ ''ویسے یار! تو ہے جی دار آدمی... تو نے دلاور کے دو خاص آدمیوں کو مار مار کے ادھ موا کر دیا۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے۔'' کانسٹیبل باتونی تھا اور مسلسل بول رہا تھا۔ ''اس بھورے اور خان سے تو ہم لوگ بھی پریشان تھے۔''

وہ دل جلا آدمی تھا اور دلاور کو ناپسند کرتا تھا لیکن اپنی ملازمت کے ہاتھوں مجبور تھا۔

حوالات سے نکال کر وہ مجھے ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔

''تم لوگ مجھے بند کر کے بہت خوش ہو رہے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''میرا جرم اتنا بڑا نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، اپنے دفاع میں کیا ہے اور اس واقعے کا ایک نہیں بلکہ بیسیوں گواہ ہیں۔''

''اچھا...'' اس نے ''اچھا'' کو لمبا کر کے ادا کیا۔ ''اوئے! تو تو مجھے کسی وکیل کی اولاد لگتا ہے۔''

''اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرا وکیل پہلی ہی پیشی میں میری ضمانت کروا دے گا۔'' میں نے کہا۔

''پیشی... ضمانت!'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اوئے! وکیل تو جب یہاں آئے گا جب ہم نے تجھے گرفتار کر کے تیرا پرچہ کاٹا ہوگا۔ جب ہم نے تجھے گرفتار ہی نہیں کیا تو پھر کیسی ضمانت اور کیسی پیشی؟ وہاں موجود لوگوں میں سے کوئی ایک آدمی بھی یہ گواہی نہیں دے گا کہ تو ہمارے قبضے میں ہے۔ ہاں، ایک شرط پر ہم تجھے چھوڑ سکتے ہیں... تو دلاور سے پیر پکڑ کر معافی مانگ لے۔''

''پیر پکڑ کر معافی مانگ لوں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں اس کے پیر توڑ تو سکتا ہوں لیکن معافی نہیں مانگوں گا۔''

''میں تجھے دو گھنٹے دے رہا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ ''تو اچھی طرح غور کر لے۔ تیرا بھائی ہے، بھابی ہے۔ ان کا بیٹا ہے۔ تیری وجہ سے وہ سب بھی مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرے منہ پر اچانک زناٹے کا ایک تھپڑ مار دیا اور سنتری سے بولا۔ ''ابھی تو اسے لے جاؤ، رات میں اس کی خاطر تواضع کروں گا۔ یہ گڑگڑائے گا کہ میں دلاور کیا اس کے کتوں کے بھی پاؤں پکڑنے کو تیار ہوں۔''

سنتری نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ کوئی بھلا مانس تھا۔ اس نے نہ تو مجھے جھٹکا دیا، نہ ہی میری پیٹھ پر لات ماری۔

وہ آہستہ سے بولا۔ ''جمی صاحب! یہ حشمت خان جو کہے مان لیں۔ یہ انتہائی ظالم آدمی ہے۔ پھر اس نے تو ابھی تک آپ کے خلاف پرچہ تک نہیں کاٹا ہے۔ قانونی طور پر تو آپ یہاں ہیں ہی نہیں۔ یہاں موجود ملزمان پر رات کے وقت ہی تشدد کیا جاتا ہے اور ان سے اپنے مطلب کا بیان لے لیا جاتا ہے۔''

''لیکن یہ تو قانون کی کھلی خلاف ورزی ہے۔'' میں نے کہا۔

''قانون!'' سنتری تلخ انداز میں مسکرایا۔ ''قانون تو صرف غریب اور لاوارث لوگوں کے لیے ہے۔ آپ رات تک اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔ ویسے ابھی آپ کے بھائی یہاں آئے تھے۔ حشمت خان صاف مکر گیا کہ ہم نے عرفان عرف جمی نام کے کسی فرد کو گرفتار نہیں کیا۔ نہ اس نے مارکیٹ میں ہونے والے کسی واقعے کا اعتراف کیا۔''

اس وقت تک ہم لاک اپ تک پہنچ چکے تھے۔ دوسرے سنتری نے لاک اپ کا آہنی دروازہ کھول دیا۔

میں دوبارہ لاک اپ میں پہنچا تو دوسرے حوالاتی مجھے کچھ سہمے سہمے سے دکھائی دیے۔ ان میں سے وہ حوالاتی جو مجھے جیب کترا سمجھ رہا تھا، کھسک کر میرے نزدیک آیا اور بولا۔ ”جی صاحب! مجھ سے غلطی ہوگئی جو میں نے آپ کو اتنی باتیں سنا دیں۔ مجھے معاف کر دیں۔“

”معاف کر دوں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”لیکن تم نے کیا کیا ہے جو تم مجھ سے معافی مانگ رہے ہو؟“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ نے خان اور بھورے کی پٹائی کی ہے۔ انہیں اتنا مارا ہے کہ وہ ادھ موئے ہو گئے ہیں۔ انہیں اس حال میں پہنچانے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔“

اچانک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھنے والوں میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے پاس آ گیا۔ اسے دیکھ کر بقیہ چاروں حوالاتی بھی وہاں سے کچھ فاصلے پر سمٹ گئے۔

”تو تو واقعی نر بچہ ہے۔“ اس نے توصیفی انداز میں کہا۔ ”میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ تو کسی چوری چکاری یا جیب کاٹنے کے الزام میں آیا ہے لیکن تو تو اپنے ہی قبیلے کا آدمی ہے۔ میرا نام فیضو ہے۔ میں نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مجھ پر قتل اور ڈکیتی کے بارہ مقدمات ہیں۔ میں تجھے بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آج رات تو پولیس کے تمام الزامات کا اعتراف کر لینا۔ اس بیان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ کورٹ میں تو اپنے بیان سے مکر جانا۔“

”کورٹ کی نوبت ہی نہیں آئے گی فیضو!“ میں نے کہا۔ ”حشمت خان نے تو ابھی تک میرے خلاف ایف آئی آر تک درج نہیں کی ہے۔ قانونی طور پر تو میں یہاں موجود ہی نہیں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ حشمت خان تیرے گھر والوں سے سودے بازی کرنا چاہتا ہے۔“ فیضو نے کہا پھر وہ کچھ سوچ کر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”جب تو یہاں ہے ہی نہیں تو پھر یہاں کیا کر رہا ہے؟“

”میں سمجھا نہیں؟“ میں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

”یہاں سے فرار ہو جانا۔“ فیضو نے کہا۔ ”باہر میرے آدمی موجود ہیں۔ وہ تجھے پناہ دیں گے ورنہ اگر اس حشمت خان نے تیرے گھر والوں سے تگڑی رقم کا مطالبہ کر دیا تو وہ پوری نہیں کر پائیں گے اور حشمت خان تجھے کسی ویرانے میں لے جا کر گولی مار دے گا اور دلاور سے اپنا انعام وصول کر لے گا۔“

”ابے فیضو!“ دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے دوسرے آدمی نے اسے پکارا۔ ”کیا پٹی پڑھا رہا ہے لونڈے کو؟“

”اسے لونڈا مت کہو روشو!“ فیضو نے کہا۔ ”یہ نر بچہ ہے... نر! اس نے دلاور کے دو ایسے آدمیوں کو کتوں کی طرح مارا ہے جن کی دہشت سے پورا علاقہ لرزتا تھا۔“

اسی وقت لاک اپ کے دروازے پر وہی مہربان سنتری نظر آیا۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور سرگوشی میں بولا۔ ”حشمت خان اور دلاور تم پر بھورے کے قتل کا کیس بنانا چاہتے ہیں۔“

”کیا بھورا مر گیا؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”ابھی مرا تو نہیں ہے لیکن دلاور اسے مار دے گا۔ وہ جس پستول سے اسے ماریں گے، وہ دلاور لے کر آیا ہے۔ حشمت خان ابھی تمہیں بلائے گا اور پستول تمہیں پکڑانے کی کوشش کرے گا لیکن تم اسے ہاتھ بھی مت لگانا۔ ان لوگوں نے پستول پر تمہاری انگلیوں کے نشان لے لیے تو اسی پستول سے دلاور بھورے کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں اس کی لاش کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ اس طرح وہ تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا ہے۔“ اچانک کوریڈور میں بھاری بوٹوں کی آواز گونجی تو سنتری لہجہ بدل کر بولا۔ ”کھانا یا چائے مفت نہیں ملتی ہے کہ تو نے چائے کی فرمائش کر دی۔ چائے پینے کا اتنا ہی شوق ہے تو پیسے نکال۔“

اسی وقت دوسرا سنتری بھی وہاں آ گیا تھا۔ شاید اسی لیے پہلا سنتری اسے سنانے کے لیے ایسی باتیں کر رہا تھا۔

”چل اوئے! بہت عیش ہو گئے۔“ دوسرا سنتری بولا۔ اس کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کی صورت بھی مکروہ تھی۔ ”تجھے صاحب نے بلایا ہے۔“ پھر وہ پہلے سنتری سے مخاطب ہوا۔ ”غلام حسین! دروازہ کھول۔“

غلام حسین نے لاک اپ کا دروازہ کھولا تو دوسرا سنتری اندر آیا اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور بولا۔ ”اوئے! مجھے گھور کیا رہا ہے؟ ذرا رات ہونے دے پھر تیرے سارے کس بل نکال دوں گا۔ میرا تو نام ہی مولا بخش ہے۔ تو نے اسکول کے زمانے میں مولا بخش کا نام سنا ہوگا۔ میں وہی ماسٹروں والا مولا بخش ہوں۔“

میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ تو مجھے شکل سے بدبخت اور بدچلن لگ رہا ہے، تجھے مولا کیسے بخش سکتا ہے لیکن میری سوچ کا سلسلہ اس کی بھرپور لات نے توڑ دیا۔ اس نے خاصی قوت سے میری کمر پر لات ماری تھی۔ میں اچھل کر لاک اپ کے دروازے سے باہر آ گیا۔ میرے ساتھ ہی جھٹکے سے وہ بھی باہر آیا کیونکہ ہتھکڑی کی زنجیر اس

کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بری طرح دیوار سے ٹکرا گیا۔

”تیری تو...“

اس نے گالی دینا چاہی مگر میں نے چیخ کر کہا۔ ”گالی مت دینا ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تو مولا بخش ہے یا اللہ بخش۔“

اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ”بھونک لے، تھوڑی دیر اور بھونک لے... رات ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔“

حشمت خان کے کمرے میں دلاور کو دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ غلام حسین مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

”ہاں بھئی ہیرو! کچھ ہوش ٹھکانے آئے؟“ حشمت خان نے تحقیر آمیز انداز میں پوچھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”مجھے موقعِ واردات سے ایک ریوالور بھی ملا ہے۔“ حشمت خان نے کہا اور اپنی میز کی دراز کھول کر ایک ریوالور نکال لیا۔ اس وقت پہلی دفعہ میں نے غور کیا کہ حشمت خان نے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے۔ ”یہ ریوالور مجھے تیرا ہی لگتا ہے۔“

”میرے پاس ریوالور کیا چاقو تک نہیں ہے۔ میں نے تو کبھی ریوالور دیکھا بھی نہیں ہے۔“

”نہیں دیکھا ہے تو اب دیکھ لے۔“ اس نے ریوالور میری طرف بڑھایا۔

میں نے ہاتھ لگائے بغیر ریوالور دیکھا اور بولا۔ ”میں نے یہ ریوالور پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ چلتا کیسے ہے؟“

”اسے ہاتھ میں پکڑ۔“ حشمت خان نے گرج کر کہا۔ ”ابھی اندازہ ہو جائے گا کہ تو نے ریوالور استعمال کیا ہے یا نہیں؟ ہم تو ریوالور پکڑنے کے انداز سے معلوم کر لیتے ہیں کہ بندہ وہ ہتھیار چلا بھی سکتا ہے یا نہیں۔“

حشمت خان کی میز پر اس کا رومال بھی پڑا تھا۔ میں نے اچانک رومال اٹھایا اور وہ ریوالور پر ڈال کر اسے اٹھا لیا۔ پھر بولا۔ ”لو، اب لگاؤ اندازہ کہ میں نے اس سے پہلے کبھی ریوالور استعمال کیا ہے یا نہیں؟“

حشمت خان کے ساتھ ساتھ دلاور کے چہرے پر بھی مایوسی چھا گئی۔

میں نے اچانک ریوالور کا رخ حشمت خان کی طرف کر دیا اور بولا۔ ”یہ چلتا کیسے ہے؟“ میں نے رومال سمیت اس کے ٹریگر میں انگلی ڈال دی۔

حشمت خان بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”ارے، رکھ اسے... گولی چل جائے گی۔“

”گولی چل جائے گی؟“ میں نے ریوالور کا رخ دلاور کی طرف کر دیا۔ ”کیا اس میں گولیاں ہیں؟“ دلاور بھی گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ریوالور میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

”اوئے! تو قانون کا طالب علم تو نہیں ہے یا وکالت کر چکا ہے؟“ حشمت خان نے کہا۔

”کیا میں شکل سے تمہیں وکیل نظر آتا ہوں؟“ میں نے ان کی بوکھلاہٹ سے لطف لیتے ہوئے کہا۔

”مولا بخش!“ اس نے سنتری کو مخاطب کیا۔ ”اسے لے جاؤ... رات میں اس سے تفصیلی تفتیش کریں گے۔“

”ایک منٹ!“ دلاور نے کہا۔ ”یہ یاد رکھنا کہ تمہارے بھائی، اس کا بیٹا اور بیوی بھی ابھی یہیں ہیں۔“

اس نے ایک طرح سے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کوئی گڑبڑ کی تو وہ بھیا، بھابی اور فرحان کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

”چل اوئے!“ مولا بخش نے مجھے پھر دھکیلا۔

اس مرتبہ اس نے مجھے لات نہیں ماری۔ پہلی لات اسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ اس کا سر لاک اپ کے آہنی دروازے سے ٹکرایا تھا اور پیشانی پر اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔

مولا بخش نے مجھے ایک مرتبہ پھر حوالات میں بند کر دیا۔

فیضو کھسک کر میرے پاس آیا ور بولا۔ ”یہ پیسے رکھ لے اور سنتری سے کچھ کھانے کو منگا لے... تو کافی دیر سے بھوکا ہے۔“ اس نے سو کا ایک نوٹ میری طرف بڑھایا۔

”نہیں فیضو بھائی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ارے، رکھ لے۔ کیا بھوکا پیاسا مرنے کا ارادہ ہے؟ تجھے ابھی حالات سے لڑنا ہے اور آج کی رات تو یوں بھی تجھ پر بھاری ہوگی۔ یہاں حوالاتیوں پر تفتیش کے نام پر ساری رات تشدد ہوتا ہے۔“ اپنی گفتگو سے وہ مجھے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

میں نے اس کے اصرار پر نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”فیضو بھائی! تم مجھے پڑھے لکھے لگ رہے ہو۔“

”پڑھا لکھا!“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے بی اے کیا ہے لیکن اس تعلیم نے مجھے کیا دیا؟ فاقے، در در کی ٹھوکریں اور جرم کی یہ دنیا!“

اسی وقت مجھے غلام حسین پھر نظر آیا۔ میں نے اشارے سے اسے بلایا اور کہا۔ ”بھائی غلام حسین! مجھے کچھ

کھانے کولا دو۔ ہو سکے تو چائے اور دو گولیاں ڈسپرین کی بھی لے آنا۔'' میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

اس نے خاموشی سے پیسے لے لیے اور وہاں سے چلا گیا۔

ابھی اسے گئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک کانسٹیبل وہاں آیا اور بولا۔ ''جمی کون ہے؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میرے ساتھ ساتھ فیفو اور دوسرے حوالاتی بھی اسے دیکھنے لگے۔

''میں ہوں جمی!'' میں نے کہا۔

''چلو، تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھلوا کر اندر آ گیا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے ہتھکڑی لگا کر ایس ایچ او کے کمرے میں لے جایا گیا۔

''اس کی ہتھکڑی کھول دو۔'' حشمت خان نے کہا۔

کانسٹیبل نے جلدی سے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میں ایس ایچ او کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ رعونت بھی نہیں تھی جو مجھے ہر وقت نظر آتی تھی۔

اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''بیٹھو!''

یہ میرے لیے حیرت کا دوسرا دھچکا تھا۔ میں جھجکتا ہوا اس کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم نے تو صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ منگواتا ہوں۔''

''اس مہربانی کی وجہ تو بتا دو؟'' میں نے کہا۔ ''کیا میرے قتل کا پروگرام بنا لیا ہے؟ مارنے سے پہلے جانور کو بھی یونہی کھلاتے پلاتے ہیں۔''

''ارے نہیں... تم غلط سمجھے، میڈم نے تمہاری سفارش کی ہے۔ وہ خود آ رہی ہیں۔ تم اگر مجھے پہلے ہی بتا دیتے کہ تم میڈم کے آدمی ہو تو اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہی تو میں سوچ رہا تھا کہ ایسا کون جی دار پیدا ہو گیا جو دلاور کے آدمیوں سے ٹکرا گیا۔''

''میڈم!'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''میں تو کسی میڈم کو نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''او یار! اب مجھ سے تو مت چھپاؤ۔'' اس نے کہا۔

اسی وقت ایک سپاہی تیزی سے اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''سر جی! میڈم آ گئی ہیں۔''

حشمت خان جلدی سے کھڑا ہو گیا اور دروازے کی طرف لپکا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ ایک شعلہ جوالہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ خاصی خوب صورت عورت تھی۔ عمر تیس اور بتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے جینز اور ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میک اپ برائے نام تھا اس کی جلد بہت شفاف تھی اور اپنے گھنے بال اس نے پونی ٹیل میں باندھ رکھے تھے۔ پیروں میں جاگرز تھے جو ان دنوں پاکستان میں عام نہیں تھے۔ اس نے دھوپ کا جو چشمہ لگا رکھا تھا، وہ اس کی آنکھوں پر نہیں بلکہ پیشانی کے اوپری حصے پر ٹکا ہوا تھا۔

میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور میرا اب بھی یہی خیال تھا کہ حشمت خان نے کسی اور ملزم کے دھوکے میں مجھے غلطی سے یہاں بلا لیا ہے۔

''جمی صاحب! یہ میڈم زرین ہیں۔''

میں نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے اسے سلام کیا۔

اس نے مسکرا کر میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر حشمت خان سے بولی۔ ''جمی کے خلاف کس دفعہ کے تحت آپ نے ایف آئی آر درج کی ہے؟''

''میڈم! ابھی تک ایف آئی آر درج نہیں کی ہے۔'' حشمت خان نے یوں جواب دیا جیسے وہ میڈم کو نہیں بلکہ اپنے آئی جی کو جواب دے رہا ہو۔

''ٹھیک ہے پھر میں مسٹر جمی کو اپنی ذمّے داری پر یہاں سے لے جا رہی ہوں۔''

''لیکن میڈم!... وہ...''

''کیا لیکن؟'' میڈم کا خوب صورت چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''جمی کی گرفتاری کی کوئی انٹری ہے؟''

''نہیں میڈم! وہ دلاور صاحب نے کہا تھا...''

''شٹ اپ!'' میڈم نے چیخ کر کہا۔ ''دلاور نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں جمی کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''چلیے جمی صاحب!''

میں اس وقت اتنا حواس باختہ تھا کہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور خاموشی سے اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گیا۔ باہر نئے ماڈل کی مارک ٹو کھڑی تھی۔ اس دور میں وہی گاڑی اسٹیٹس سمبل تھی۔ گاڑی کے ساتھ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ میڈم کو دیکھ کر اس نے پھرتی سے عقبی نشست کا دروازہ کھولا تو میڈم نے مجھے بھی عقبی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں کسی روبوٹ کی طرح اس کے احکامات پر عمل کر رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی خوش گوار خنکی اور مہک کا احساس ہوا۔ ڈرائیور نے شاید ابھی کچھ ہی دیر پہلے گاڑی میں ایئر فریشنر کا اسپرے کیا تھا۔

ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی حرکت میں آ گئی۔

آہستہ آہستہ میرا کھویا ہوا اعتماد لوٹ رہا تھا۔ میں نے میڈم سے پوچھا۔ ''میم! میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں اور مجھے لاک اپ سے نکال کر کہاں لے جا رہی ہیں۔ بہر حال، آپ کا بہت شکریہ!''

''نو نیڈز آف تھینکس!'' میڈم نے خالص امریکن لہجے میں کہا۔ ''تم نے ملک سرفراز کا نام سنا ہے؟''

''جی ہاں، انہیں کون نہیں جانتا۔ وہ بہت معروف سیاست داں ہیں۔''

''میں ان کی پرسنل اسسٹنٹ ہوں۔'' میڈم نے یہ بتا کر مجھے مزید حیران کر دیا کہ وہ ملک سرفراز جیسے بڑے سیاست داں کی پی اے ہے مگر ابھی تک مجھے یہی الجھن تھی کہ آخر اسے مجھ سے کیا کام ہے اور وہ مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟ نہ تو میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی عہدے دار تھا، نہ کوئی بڑا اسٹوڈنٹ لیڈر!

''تم حیران ہو رہے ہو گے کہ مجھے تم سے کیا دلچسپی ہے؟ اصل میں دلاور نے علاقے کے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ علاقے کے لوگ، خاص طور پر تاجر برادری اس کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ تم واحد آدمی ہو جس نے دلاور کو ترکی بہ ترکی جواب دیا ہے۔''

''میں ملک صاحب کا بہت ممنون ہوں۔ کبھی موقع ملا تو ان کے اس احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا۔ فی الحال تو مجھے اجازت دیں۔ میرے بھیا اور بھابی بہت پریشان ہوں گے۔''

''چلے جانا، ضرور جانا... لیکن ابھی نہیں۔ میں تمہارے گھر اطلاع بھجوا دوں گی کہ تم خیریت سے ہو۔''

''مجھ سے بھلا ایسا کون سا کام ہے آپ کو؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''اصل میں یہ دلاور پہلے ملک سرفراز ہی کا کارکن تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے پر پرزے نکالنا شروع کیے اور سرکشی پر آمادہ ہو گیا۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ دلاور کو اس علاقے سے نکالنا ہے۔''

''سوری میڈم!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں کوئی پیشہ ور بدمعاش نہیں ہوں۔ میں تو متوسط طبقے کا ایک عام سا آدمی ہوں۔ دلاور کا مقابلہ کرنے کے لیے تو ملک صاحب کو بہت سے لوگ مل جائیں گے۔''

''لیکن تم جیسے نو آموز اور کم عمر لڑکوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

''مجھے دلاور اور اس کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ پلیز مجھے یہیں اتار دیں۔ میں خود ہی گھر چلا جاؤں گا۔''

''میں نے حوالات سے تمہیں اس لیے نہیں نکالا ہے کہ تم...''

''تو پھر مجھے واپس پولیس اسٹیشن لے چلیں اور پولیس کے حوالے کر دیں۔''

''اب یہ بھی نہیں ہو سکتا۔'' میڈم نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو پھر مجھے یہیں اتار دیں۔'' میں نے ناگواری سے کہا اور ڈرائیور سے بولا۔ ''گاڑی روکو!''

ڈرائیور نے بوکھلا کر گاڑی روک دی۔

اس سے پہلے کہ میڈم کچھ سمجھ سکتی، میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی۔

''نصیب خان! اسے پکڑو۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

نصیب خان اس کے ڈرائیور کا نام تھا۔

نصیب خان میرے پیچھے دوڑا لیکن اب وہ میری گرد کو بھی نہیں پا سکتا تھا۔

میں اندھا دھند بھاگا جا رہا تھا۔ مجھے تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ میں اس وقت کراچی کے کس علاقے میں ہوں۔ وہاں کے بنگلوں کی تعمیر اور تزئین و آرائش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خاصا پوش ایریا ہے۔

اس علاقے میں شاید سیوریج یا واٹر لائن پڑ رہی تھی۔ وہاں کئی سڑکوں پر کھدائی ہو رہی تھی اور سیمنٹ کے بڑے بڑے پائپ ابھی تک باہر ہی پڑے تھے۔

میں تیزی سے ایک پائپ میں گھسا اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد نصیب خان ہانپتا کانپتا وہاں پہنچا۔ میں پائپ میں مزید اندر کی طرف گھس گیا۔ اب مجھے صرف اس کی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔

اس نے وہاں کام کرنے والے مزدوروں سے پوچھا۔ ''ادر کوئی چھوکرا تو نہیں آیا؟ وہ خنزیر کا بچہ امارا میڈم کا پرس لے کر بھاگا ہے۔'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ایک لڑکا آیا تو تھا۔'' کسی مزدور نے جواب دیا لیکن وہ تو سیدھا نکل گیا تھا۔ اب تک تو وہ نہ جانے کہاں پہنچا ہوگا۔''

ڈرائیور بھاگتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ پے در پے مجھ پر کیسی افتاد پڑ رہی ہیں۔

دلاور سے تو دشمنی تھی ہی، اب یہ میڈم نہ جانے کہاں سے وارد ہو گئی تھی۔

میں کافی دیر تک اسی پائپ میں بیٹھا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میری جیب میں تو ایک پیسا بھی نہیں تھا۔ میرے پیسے اور گھڑی تو پہلے ہی تھانے میں چھین لیے گئے تھے۔ فیقو نے جو سو کا نوٹ دیا تھا، وہ میں نے غلام حسین کو کھانا لانے کے لیے دیا تھا لیکن اس کی واپسی کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کہ میڈم نازل ہو گئی تھی۔

اب آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ بھوک کے مارے میرا دم نکلا جا رہا تھا۔ حلق بالکل سوکھ گیا تھا اور اس میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

وہاں کام کرنے والے مزدور بھی وہاں سے رخصت ہو چکے تھے۔ میں پائپ سے باہر نکلا اور کھلی فضا میں دو چار گہرے گہرے سانس لیے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر مجھے مسجد نظر آئی۔ میں مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ پہلے تو میں نے مسجد کے مٹکوں سے پانی کے دو گلاس پیے پھر وہیں بیٹھ کر منہ دھونے لگا۔ منہ ہاتھ دھونے اور پانی پینے سے خاصی تازگی کا احساس ہوا لیکن خالی پیٹ میں اب مروڑ سے اٹھنے لگے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں کیا کروں؟ ایک دفعہ تو میرا دل چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حیدر آباد نکل جاؤں لیکن پھر خیال آیا کہ حیدر آباد جانے کے لیے بھی تو کرایہ چاہیے، پھر بھیا کو ان نامساعد حالات میں چھوڑ کر جانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

میرے فرار کے بعد میڈم کے آدمی ضرور میرے گھر پہنچے ہوں گے۔ دلاور تو یہ سوچ کر وہاں نہیں گیا ہو گا کہ تھانے سے مجھے میڈم لے گئی ہے۔

کراچی میں تو میرا کوئی دوست بھی نہیں تھا جس سے میں کچھ پیسے ادھار ہی لے لیتا۔ لے دے کر اپنے پڑوسی دکان دار مجیب بھائی سے کچھ بے تکلفی تھی لیکن ایک تو مجھے ان کا گھر نہیں معلوم تھا پھر میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے وہ بے چارے کسی مصیبت میں پڑیں۔

میں پیدل ہی ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ اب بنگلوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور کمرشل ایریا شروع ہو گیا تھا۔

وہ خاصی بڑی مارکیٹ تھی۔ سامنے ہی ایک ہوٹل تھا جہاں سے اشتہا انگیز کھانوں کی مہک آرہی تھی۔ تندور سے نکلتی ہوئی تازہ روٹی نے میری بھوک مزید چمکا دی۔

میں بے اختیار ہی اس موٹے آدمی کے پاس پہنچ گیا جو کاؤنٹر پر بیٹھا تھا اور وقفے وقفے سے گھنٹی بجا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر ہوٹل کا بیرا کاؤنٹر کی طرف دیکھتا تھا پھر وہیں سے چیختا تھا... پانچ روپے پچاس پیسے!

جب گاہک ادائیگی کر کے کاؤنٹر سے ہٹا تو میں موٹے شخص کے سامنے پہنچ گیا۔

وہ گھنٹی بجانے ہی والا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں نے کچھ کھایا نہیں ہے... مجھے کوئی کام چاہیے۔“

”ابھی کوئی کام نہیں ہے۔“ اس نے بے اعتنائی سے کہا اور آنے والے ایک گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بھوک کے مارے میرے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ میں مایوس ہو کر پلٹا اور باہر کی طرف جا ہی رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں چونک کر پلٹا تو غلام حسین کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے دل میں پہلا خیال تو یہی آیا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں ورنہ غلام حسین مجھے پکڑ کر دوبارہ تھانے لے جائے گا۔

غلام حسین شاید میرے چہرے سے میری کیفیت بھانپ گیا اور بولا۔ ”ڈریں مت... میں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ویسے بھی اس وقت میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔“

وہ اس وقت سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔ ”غلام حسین! میرے فرار کے بعد میڈم نے تو بہت ہنگامہ کیا ہو گا؟“

”ایسا ویسا ہنگامہ!“ غلام حسین نے کہا۔ ”وہ بپھری ہوئی تھانے پہنچی اور بولی کہ وہ الو کا پٹھا میری گاڑی سے اتر کر بھاگ گیا۔ اسے کسی بھی قیمت پر تلاش کرو۔“

”پھر حشمت خان نے کیا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے صاحب! وہ تو عجیب مصیبت میں پھنس گیا۔ آپ کی نہ کوئی ایف آئی آر درج تھی نہ ہمارے روزنامچے میں کوئی ریکارڈ تھا۔ حشمت خان تو آپ کے بھائی اور وکیل سے جھوٹ بول چکا تھا کہ میں نے جمی کو گرفتار نہیں کیا۔ اب اگر وہ آپ کے گھر جاتا تو کس منہ سے جاتا؟“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”ارے! مجھے باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں رہا کہ آپ نے تو صبح سے کچھ نہیں کھایا ہو گا۔ آپ کے دیے ہوئے سو روپے میرے پاس موجود ہیں۔ میں اس وقت کھانا لینے جا ہی رہا تھا کہ میڈم آپ کو وہاں سے لے گئی۔ پہلے آپ کچھ کھا لیں۔“

”میں یہاں کھانا کھانے ہی آیا تھا لیکن یہاں آکر خیال آیا کہ میری جیب میں تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔“

”ایسا کرتا ہوں، میں آپ کا کھانا پارسل کرا لیتا ہوں۔ یہاں آپ کا بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ آپ میرے گھر چلیں۔ وہاں آرام سے کھانا کھائیے گا۔“

اس نے میرے لیے مغز نہاری اور روٹیاں خریدیں اور مجھے لے کر ایک طرف چل دیا۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کچی آبادی تھی۔ غلام حسین مجھے اسی آبادی کے ایک بوسیدہ سے گھر میں لے گیا۔ وہاں شاید وہ اکیلا ہی رہتا تھا کیونکہ گھر کے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ اس نے تالا کھولا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ اندر چھوٹا سا ایک صحن تھا۔ ایک طرف بیت الخلا، غسل خانہ اور باورچی خانہ تھا اور سامنے کے رخ پر ایک کمرا تھا۔ کمرے میں صرف ایک پلنگ دو پرانی سی کرسیاں اور چھوٹی سی ایک میز تھی۔ دیوار پر ہینگر میں اس کی وردی ٹنگی ہوئی تھی۔

اس نے پلنگ پر بستر بچھایا اور مجھ سے بولا۔ ”آپ بیٹھیں، میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔“

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک پولیس والے کا گھر بھی ایسا ہو سکتا ہے۔

میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس دوران میں غلام حسین چائے بنا لایا۔ چائے پی کر تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔

”غلام حسین! تم یہاں.... اس کچی آبادی میں رہتے ہو؟“

”کیا کروں صاحب! سرکاری کوارٹر کم ہیں اور رہنے والے زیادہ ہیں۔ میری طرح بہت سے لوگ کرائے کے مکانوں میں رہتے ہیں لیکن میں اپنی معمولی تنخواہ میں سے مکان کا کرایہ نہیں نکال سکتا۔“

”لیکن دوسرے لوگ بھی تو آخر...“

”میں رشوت کی ایک پائی کو بھی حرام سمجھتا ہوں۔ اسی وجہ سے میرے افسرانِ بالا اور ساتھی مجھ سے ناخوش ہیں۔“

”ہاں، تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ پھر حشمت خان نے کیا کیا؟“

غلام حسین اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں نے اس وقت جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتایا تھا تاکہ آپ سکون سے کھانا کھا لیں۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

”حشمت خان شیطانی ذہن کا مالک ہے۔ اس نے فوراً دلاور کو بلایا، اسے ساری بات بتائی پھر بولا کہ اب آپ جمی کے خلاف رپورٹ درج کرائیں کہ اس نے آپ کے آدمی کو بے دردی سے مارا ہے اور موقعِ واردات سے فرار ہو گیا ہے۔

”دلاور نے اس وقت رپورٹ لکھوا دی کہ جمی نے میرے آدمی کو اتنی بے دردی سے مارا ہے کہ وہ آئی سی یو میں ہے۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے جمی سے اپنی دی ہوئی رقم کا تقاضا کیا تھا۔

”رپورٹ درج کرنے کے بعد حشمت خان سیدھا آپ کے گھر پہنچا اور آپ کے بھائی سے کہا کہ تم جمی کو تھانے میں تلاش کر رہے تھے نا... اس نے دلاور کے ایک آدمی کو بہت بری طرح مارا ہے اور فرار ہو گیا ہے۔“

”پھر؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”پھر حشمت خان نے آپ کے بھائی کو گرفتار کر لیا اور کہا کہ جب تک جمی ہمیں نہیں مل جاتا، تم ہمارے مہمان رہو گے۔“

میں مضطرب ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ”اس نے... بھیا کو گرفتار کر لیا؟“ میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”مجھے ابھی اور اسی وقت تھانے جانا ہو گا۔ بھیا تو بے چارے سیدھے سادے معصوم سے آدمی ہیں۔ میں ان کی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔“

”پاگل مت بنیں جمی صاحب!“ غلام حسین نے کہا۔ ”آپ اگر ایک بار ان کے شکنجے میں پھنس گئے تو پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں اور میرا بھائی پولیس کے تشدد کا نشانہ بنتا رہے؟“ میں نے کہا۔

”آپ کے پاس گھر کا ٹیلی فون نمبر ہے؟“

”ہمارے گھر میں ٹیلی فون نہیں ہے۔“ میں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔

”مارکیٹ کے کسی اور آدمی کا ٹیلی فون نمبر تو ہو گا؟“ غلام حسین نے پوچھا۔

مجھے یاد آیا کہ مجیب صاحب کے گھر میں ٹیلی فون تھا۔ ان کا نمبر بھی مجھے یاد تھا لیکن وہ بے چارے کیا کر سکتے تھے؟

میں نے غلام حسین سے کہا۔ ”میرے پاس مارکیٹ کے ایک دکان دار کا نمبر تو ہے لیکن اس سے کیا فائدہ ہو گا؟“

”اس سے کم از کم اتنا تو ہو گا کہ آپ کو اپنے بھائی کے بارے میں علم ہو جائے گا کہ وہ اب کہاں ہیں؟“

غلام حسین کی بات سے مجھے اتفاق نہیں تھا۔ مجیب

بھائی سے زیادہ سے زیادہ یہی معلوم ہوسکتا تھا کہ بھیا اس وقت کہاں ہیں اور وہ مجھے معلوم تھا۔
''یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک پی سی او ہے۔ آپ وہاں سے ٹیلی فون تو کریں۔''
غلام حسین کے اصرار پر میں ٹیلی فون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ کراچی میں ان دنوں بھی لوگ راتوں کو دیر تک جاگتے تھے لیکن مجیب بھائی جیسے لوگ جلدی سونے کے عادی تھے۔
پی سی او پر پہنچ کر میں نے مجیب بھائی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ میں ریسیور رکھ کر یڈل پر رکھنے ہی والا تھا کہ مجھے مجیب بھائی کی غنودہ سی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!'' وہ یقیناً سو چکے تھے۔
''مجیب بھائی! میں جمی بول رہا ہوں۔''
''جمی!'' انہوں نے حیرت سے کہا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''
''میں کراچی ہی میں ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بھیا کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے؟''
''ہاں، انہیں پولیس لے گئی تھی لیکن ماجد صاحب اور مارکیٹ کمیٹی کے دوسرے لوگ فوراً تھانے پہنچ گئے۔ مارکیٹ کمیٹی نے کراچی کے ایک بہت معروف وکیل سے رابطہ کیا تھا۔
''وکیل انتہائی بارسوخ ہے۔ اسے دیکھتے ہی حشمت خان کے تیور بدل گئے۔ اس نے حشمت خان سے کہا کہ تم نے مسٹر ذیشان کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟ اب یہ مت کہہ دینا کہ ہم نے انہیں گرفتار نہیں کیا ہے۔
''بہرحال حشمت خان نے یہ کہا کہ وہ ذیشان کو پوچھ گچھ کے لیے تھانے لایا تھا جس پر وکیل نے امن پسند شہری کو حبسِ بے جا میں رکھنے کے جرم کا بتایا اور یہ بھی کہا کہ میں تمہارے خلاف مختلف دفعات استعمال کر سکتا ہوں۔ بہرحال، اس نے ذیشان کو چھوڑ دیا۔''
''اب بھیا کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''وہ اس وقت گھر میں ہوں گے لیکن تم ابھی گھر کا رخ مت کرنا۔ ممکن ہے پولیس یا دلاور کے لوگ تمہارے گھر کے اردگرد منڈلا رہے ہوں۔'' پھر وہ سرد لہجے میں بولے۔ ''تمہاری وجہ سے تمہارے بھائی کا بزنس تو متاثر ہوا ہی ہے مگر پوری مارکیٹ بھی ڈسٹرب ہوگئی ہے۔''
''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے ایسا ہوا۔ میں کوشش کروں گا کہ پہلی فرصت میں حیدرآباد چلا جاؤں۔ آپ بھیا کو بتا دیجیے گا کہ میں خیریت سے ہوں۔''
''ابھی تم حیدرآباد جانے کا خیال دل سے نکال دو۔'' مجیب بھائی نے کہا۔ ''پولیس تمہیں وہاں بھی تلاش کررہی ہے۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ تم کراچی ہی میں رہو لیکن کسی نہ کسی طرح موقع نکال کر ذیشان سے مل ضرور لو۔ ان سے زیادہ تمہاری بھابی اور بھتیجا فرحان پریشان ہیں۔''
''میں کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کو اتنی رات گئے زحمت دی، اس کے لیے معذرت!''
''میری فکر مت کرو، بس تم اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ منقطع کردیا۔
میں بھی غلام حسین کے ساتھ واپس اس کے بوسیدہ سے مکان میں آگیا۔ مجھے آج کی رات یہیں گزارنا ہی تھی۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حالات مجھے کس سمت لے جارہے ہیں۔ میں غیر ذمے دار اور لاابالی ضرور تھا لیکن مجرموں اور جرم سے مجھے شدید نفرت تھی۔ میں متوسط طبقے کا ایک سیدھا سادہ سا نوجوان تھا اور میرے ایمان دار باپ نے مجھے ہمیشہ سچائی، دیانت داری اور فرض شناسی کا درس دیا تھا۔
''اگر نیند نہیں آرہی ہے تو ایک کپ چائے اور بنالوں؟'' غلام حسین کی آواز نے مجھے چونکادیا۔
''نیند تو مجھے نہیں آرہی لیکن اب تم چائے کے لیے کہاں زحمت کروگے؟''
''ارے زحمت کیسی؟'' غلام حسین نے کہا۔ ''مٹی کے تیل کا چولہا جلانا کون سا مشکل ہے۔''
وہ چائے لے کر آیا تو میں نے یونہی گفتگو برائے گفتگو کی۔ ''بھائی غلام حسین! تم اپنے بچوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے؟''
میرا سوال سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور لالٹین کی زرد روشنی میں مجھے اس کا چہرہ مرجھایا ہوا سا لگا۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ''جمی صاحب! میری بیوی بھی تھی اور ایک بیٹی بھی۔ میں ان دنوں اس غلیظ آبادی میں نہیں رہتا تھا بلکہ شہر کی ایک صاف ستھری آبادی میں رہتا تھا۔ ان دنوں میرے نزدیک حرام وحلال میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں رشوت لینے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتا تھا۔ یہ بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے بلکہ تین سال پہلے کی بات ہے۔
''میری بیٹی مریم ان دنوں پانچویں کلاس میں پڑھ رہی تھی، بہت ذہین اور ہونہار بچی تھی۔ اس نے حسن تو اپنی ماں سے لیا تھا لیکن ذہانت اللہ کی طرف سے تھی... کیونکہ نہ

میں اتنا ذہین ہوں، نہ اس کی ماں تھی۔
”ایک دن میں ڈیوٹی کے بعد گھر لوٹا تو مریم بخار میں تپ رہی تھی۔ میں فوراً اسے ایک قریبی کلینک ..... لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا چیک اپ کیا اور کچھ دوائیں لکھ دیں لیکن دوسرے دن تک اس کی حالت مزید غیر ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسے فوری طور پر کسی بڑے اسپتال لے جاؤ۔ شاید اسے وائرل فیور ہوا ہے۔
”ان کی بات سن کر میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میری بیوی ریشماں سیدھی سادی گھریلو عورت تھی۔ وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ مریم کو بیماری کیا ہے۔
”ہم لوگ اسے فوری طور پر جناح اسپتال لے گئے مگر مریم کی حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی تھی۔ مجھے آج بھی اپنی بیٹی کا وہ حسرت زدہ چہرہ یاد ہے۔ تیسرے دن اس نے دم توڑ دیا۔
”اتنا گہرا زخم لگنے کے بعد مجھے سدھر جانا چاہیے تھا لیکن میں نے اپنی روش نہ بدلی اور اسی طرح خلقِ خدا کو تنگ کرتا رہا، لوٹ کھسوٹ کرتا رہا۔
”ایک روز میری بیوی ریشماں کسی کام سے باہر نکلی تو ایک بدمعاش نے اس کا راستہ روک لیا اور اس سے بے ہودہ باتیں کرنے لگا۔ ریشماں شادی کے دس سال بعد بھی اتنی ہی حسین تھی جتنی شادی کے وقت تھی۔ اس کے شور مچانے پر وہاں لوگ اکٹھے ہو گئے۔ یوں ان بدمعاشوں سے اس کی جان چھوٹی۔
”یہ واقعہ اس نے مجھے بتایا تو میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں اسی وقت باہر نکل گیا اور محلے کے ایک دو لڑکوں سے پوچھ گچھ کی۔ ان لوگوں نے بتایا کہ تمہاری بیوی کا راستہ روکنے والے دلاور کے آدمی تھے۔
”میں نے دلاور کا نام سن رکھا تھا۔
ایک دن میں ریشماں کے ساتھ بازار سے واپس آ رہا تھا کہ ریشماں نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ اس لڑکے نے اس دن میرا راستہ روکا تھا۔ وہ لڑکا تو نہیں تھا، اٹھائیس تیس سال کا آدمی تھا۔ چہرے پر خباثت ٹپک رہی تھی۔ میں اس وقت وردی میں تھا۔
”میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے رکشا رکوایا اور ریشماں سے کہا کہ تم گھر جاؤ، میں اس کی خبر لے کر آتا ہوں۔
”وہ مجھے منع ہی کرتی رہی لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی۔
”اسے روانہ کر کے میں اس بدمعاش کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ ‘اوئے، ادھر آؤ!’
‘کیا بات ہے؟’ وہ رعونت سے بولا۔ ‘اور تمیز سے بات کرو۔’
‘تمیز کے بچے!’ میں نے اس کا گریبان پکڑا اور اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ‘بدمعاشی کرتا ہے۔’
‘تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں؟’
‘ہاں، تو لاٹ صاحب کا سالا ہے۔’ میں نے اس کے ایک تھپڑ مزید رسید کیا۔ ‘تھانے چل، تجھے بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں؟’
‘تو اپنی وردی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ تجھے بعد میں بہت پچھتانا پڑے گا۔’
”میں نے اسے گردن سے پکڑا اور اسے دھکا دے کر آگے بڑھایا۔ اسی وقت پولیس کی ایک موبائل وین آ گئی۔
‘کیا بات ہے غلام حسین؟’
‘یہ کھلے عام بدمعاشی کر رہا ہے اور مجھے آنکھیں دکھا رہا ہے۔’ میں نے کہا۔
‘اسے موبائل میں ڈالو۔’
”موبائل وین میں سوار دوسرے پولیس والوں نے اسے دھکیل کر موبائل میں پھینک دیا۔
‘تم سب لوگ شاید اپنی نوکریوں سے بیزار ہو گئے ہو؟’ وہ چیخ کر بولا۔
”اس پر میرے ایک ساتھی نے اس کی کمر پر زوردار ٹھوکر لگائی۔ بھاری بوٹ کی ضرب سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔
”پولیس اسٹیشن پہنچ کر میں اسے سیدھا لاک اپ میں لے گیا اور اس پر لاتوں اور گھونسوں سے پل پڑا۔ ‘تو بہت بڑا بدمعاش ہے؟ تو کھلے عام عورتوں کا راستہ روکے گا؟’ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے اور جسم پر تھپڑوں، لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ چند منٹ میں اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ چہرے کی جلد پھٹ گئی۔ کئی جگہ سے ہونٹ پھٹ گئے اور اس کا چہرہ خون میں تر ہو گیا۔ مجھے اگر سپاہی کرم داد روک نہ لیتا تو شاید وہ اس دن میرے ہاتھوں مارا جاتا۔
”وہاں سے باہر نکل کر میں نے ہیڈ محرر سے کہا۔ ‘اس بدمعاش کے خلاف پرچہ کاٹیں۔’
‘کسی نے اس کے خلاف درخواست دی ہے؟’ ہیڈ محرر نے پوچھا۔

‘اس نے سرِ عام میری بیوی کا راستہ روکا، اس سے بے ہودہ قسم کی باتیں کیں... کیا اس کا یہ قصور کم ہے؟’
”ہیڈ محرر نے کرم داد سے کہا۔ ‘یہاں لے آؤ۔’
”کرم داد اسے لے کر آیا تو ہیڈ محرر اس کی حالت دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا، ایک آنکھ کے نیچے نیل کا گہرا نشان تھا اور چہرے کی جلد کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔
‘نام کیا ہے تیرا؟’ ہیڈ محرر نے پولیس والوں کے روایتی انداز میں پوچھا۔
‘شیر محمد۔’ اس نے جواب دیا۔ ‘عرف شیرو، ولد عبدالغنی!’
‘کام کیا کرتا ہے؟’ اس نے پوچھا۔
‘کچھ بھی نہیں کرتا۔’ شیرو نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔
‘اس کا صرف یہی کام ہے، عورتوں کو چھیڑنا، غنڈا گردی اور اچکا پن۔’ میں نے کہا۔
‘مجھے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟’ شیرو نے کہا۔ ‘میں استاد دلاور کا آدمی ہوں۔’
‘استاد دلاور؟’ ہیڈ محرر چونک اٹھا۔ ‘کیا دلاور کے آدمی کوئی کام نہیں کرتے؟’ ہیڈ محرر نے چیخ کر کہا۔ ‘بند کر دو اسے۔’
”کرم داد اسے لے گیا۔ ہیڈ محرر نے مجھ سے کہا۔ ‘غلام حسین! حوالاتیوں کو دیکھ بھال کر مارا کرو۔ تم نے تو اسے اس بری طرح مارا ہے کہ وہ الٹا پولیس کے خلاف کیس بنا دے گا۔’
”میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جانتا تھا کہ تھانے میں حوالاتیوں کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک ہوتا ہے لیکن وہ پولیس کے خلاف کیس کرنے کی ہمت... نہیں کرتے۔
”اسی وقت ایس ایچ او عارف صاحب آ گئے۔ عارف علی ان دبنگ پولیس آفیسرز میں سے تھے جو اصولوں کی خاطر اپنے سینئرز سے بھی ٹکرا جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک ان کا پروموشن رکا ہوا تھا۔
”انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ شیرو نے میری بیوی کو چھیڑا ہے تو انہوں نے کہا۔ ‘اس بدمعاش کے خلاف ابھی پرچہ کاٹو۔ جب پولیس والوں ہی کی عزت محفوظ نہیں ہو گی تو وہ عوام کی کیا حفاظت کریں گے۔’
”انہوں نے شیرو کو اپنے دفتر میں بلایا اور کہا۔ ‘تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے علاقے میں بدمعاشی کرنے کی؟ کیا تم نے میرا نام نہیں سنا؟ تم نے غلام حسین کی بیوی کے ساتھ بدتمیزی کی تھی... اس کا راستہ روکا تھا؟’
‘مجھے ایک ٹیلی فون کرنے دیں پھر میں آپ کی ہر بات کا جواب دوں گا۔’
”عارف صاحب نے اس کے منہ پر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ وہ چکرا کر گر گیا۔ عارف صاحب دراز قد اور کسرتی جسم کے مالک تھے اور ان کا ہاتھ اتنا بھاری تھا کہ پٹنے والے کہتے تھے کہ آپ ہمیں ڈنڈے سے ماریں، اپنے ہاتھوں کو تکلیف مت دیں۔
‘جو کچھ پوچھا جا رہا ہے، اس کا جواب دے۔’ عارف صاحب گرج کر بولے۔
‘میں نہیں جانتا کہ یہ کس کی بات کر رہا ہے؟’ شیرو نے کہا۔
‘تو نے دو دن پہلے اپنے بدمعاش دوستوں کے ساتھ میری بیوی کا راستہ روکا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی؟’
‘مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔’ شیرو نے کہا۔
”ہیڈ محرر اس کے خلاف بدمعاشی اور غنڈا گردی کے تحت پرچہ کاٹ چکا تھا۔
”اسی وقت ایک کانسٹیبل کمرے میں داخل ہوا اور شیرو کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ کرم داد اسے لے کر دوبارہ حوالات کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اس کانسٹیبل نے کہا۔ ‘سر! یہ شیرو، دلاور کا خاص آدمی ہے۔’
‘دلاور کا آدمی ہے؟’ عارف صاحب نے نفرت سے کہا۔ ‘اسے بلواؤ، اسی بہانے آج اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے بھی اب تک اسے دیکھا نہیں ہے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ یہ دلاور کیا چیز ہے؟’ پھر انہوں نے کرم داد سے کہا۔ ‘دلاور کو یہاں بلاؤ۔’
”تھوڑی دیر بعد دلاور اپنی گاڑی میں وہاں پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے گیٹ کھول دیا اور وہ گاڑی تھانے کے اندر لے آیا۔
”عارف صاحب برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ انہوں نے چیخ کر کہا۔ ‘رحیم بخش! یہ گاڑی اندر کیسے آئی ہے؟’ رحیم بخش وہ سنتری تھا جو گیٹ پر کھڑا تھا۔
”رحیم بخش دوڑا ہوا آیا اور بولا۔ ‘سر! یہ دلاور صاحب ہیں۔ اعظم صاحب نے تو انہیں گاڑی اندر لانے کی اجازت دے رکھی تھی۔’ اعظم اس ایس ایچ او کا نام تھا جو عارف صاحب سے پہلے تھانے کا انچارج تھا۔
‘لیکن میں نے اجازت نہیں دی ہے۔’ عارف صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ ‘اے مسٹر! اپنی گاڑی باہر پارک کرو۔ یہ پولیس اسٹیشن ہے، کوئی پارکنگ لاٹ نہیں ہے... نکلو

باہر۔“
’انسپکٹر صاحب! میں دلاور ہوں اور...‘
’تم دلاور ہو یا زور آور!‘ عارف صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ’گاڑی باہر نکالو۔‘
”دلاور نے ریورس گیئر لگایا اور اتنی تیز رفتاری سے گاڑی ریورس کی کہ اگر رحیم بخش اچھل کر پیچھے نہ ہٹ جاتا تو گاڑی سے ٹکرا جاتا۔
”دلاور گاڑی کھڑی کر کے یوں اندر داخل ہوا جیسے ابھی عارف صاحب کا گریبان پکڑ کر انہیں دو چار تھپڑ لگا دے گا۔
”عارف صاحب برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کے نیچے آ گئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ’ہاں اب بتاؤ، کیسے آئے ہو؟‘
’تم لوگوں نے میرے ایک آدمی کو اٹھا لیا ہے؟‘ دلاور نے یوں کہا جیسے اس کے آدمی کو گرفتار کر کے پولیس نے کوئی سنگین جرم کیا ہے۔
’تم کس آدمی کی بات کر رہے ہو؟‘ عارف صاحب نے غصہ ظاہر کیے بغیر کہا۔ ’ہم نے تو آج چار آدمی گرفتار کیے ہیں۔‘
’شیرو!‘ دلاور نے کہا۔ ’اس کا نام شیرو ہے۔‘
’اچھا، وہ تمہارا آدمی ہے؟‘ عارف صاحب نے تجاہل سے کام لیا۔ ’ہاں، اسے گرفتار تو کیا ہے۔‘
’کس جرم میں؟‘ دلاور نے یوں پوچھا جیسے وہ عارف صاحب کا افسرِ اعلیٰ ہو۔
’اس پر تو کئی مقدمات ہیں۔ تمہیں اگر ایف آئی آر کی کاپی چاہیے تو کل کورٹ سے مل جائے گی۔‘
’ایف آئی آر... کورٹ؟‘ دلاور نے بپھر کر کہا۔ ’تو نے اس کے خلاف پرچہ کاٹ دیا؟‘
عارف صاحب بہت پُرسکون انداز میں آگے بڑھے اور اچانک دلاور کے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ اس کی آواز تھانے کے باہر تک گئی ہوگی۔ دلاور لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس کے گال پر عارف صاحب کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے تھے اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا تھا۔
”انہوں نے آگے بڑھ کر دلاور کا گریبان پکڑا اور ایک اور زوردار تھپڑ رسید کر کے بولے۔ ’آئندہ بات کرتے ہوئے اپنی آواز نیچی رکھنا اور بات بھی تہذیب کے دائرے میں کرنا ورنہ ابھی تجھے بھی اندر کر دوں گا۔ میں ابھی تیرے خلاف بیس پچیس مقدمات بنا سکتا ہوں۔‘
’تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو؟‘ دلاور نے اپنی قمیص کی آستین سے ہونٹوں سے بہنے والا خون صاف کرتے ہوئے کہا۔
’تو پھر اسی لہجے میں بات کر رہا ہے؟ اب تو نے اس قسم کا ایک لفظ بھی کہا تو تجھے بھی بند کر دوں گا۔‘
’میں ابھی آتا ہوں۔‘ دلاور نے بپھر کر کہا اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔
”عارف صاحب اپنے آفس میں جا کر بیٹھ گئے۔ فوراً ہی ڈی آئی جی صاحب کا ٹیلی فون آ گیا کہ شیرو کو چھوڑ دو۔ عارف صاحب نے کہا کہ شیرو کا پرچہ کٹ چکا ہے۔ اب اسے کورٹ ہی چھوڑ سکتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک ڈی آئی جی سے بحث کرتے رہے، پھر بولے کہ اگر آپ اپنی ذمّے داری پر اسے چھوڑ رہے ہیں تو یہاں آ کر تحریری طور پر مجھے حکم دے دیں، میں اسے ابھی چھوڑ دوں گا۔ یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور پٹخ دیا۔
”شیرو کو چھ مہینے کی سزا ہو گئی لیکن دلاور، عارف صاحب کے ساتھ میرا دشمن بھی ہو گیا۔
شیرو جیل سے رہا ہو کر آیا تو اس نے پہلے سے بھی زیادہ بدمعاشی شروع کر دی۔ عارف صاحب کا ٹرانسفر ہو چکا تھا اور حشمت خان ان کی جگہ آ گیا تھا۔
”ایک دن میں گھر پہنچا تو میرے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ مجھے دیکھ کر لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔ محلے کے ایک بزرگ نے بتایا کہ تمہاری بیوی کو کچھ بدمعاش اٹھا کر لے گئے ہیں۔ انہوں نے دستک دے کر دروازہ کھلوایا اور تمہاری بیوی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور فرار ہو گئے۔
”میں رپورٹ لکھوانے تھانے کی طرف دوڑا تو حشمت خان نے کہا کہ تمہاری بیوی خود ہی کہیں چلی گئی ہو گی۔ محلے والوں کا کیا ہے، وہ تو بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔ کچھ دیر انتظار کرو۔ ممکن ہے وہ اس دوران میں واپس آ جائے۔
”میرے دل میں حشمت خان اور دلاور کے خلاف نفرت کی شدید لہر اٹھی۔ مجھے شبہ نہیں بلکہ یقین تھا کہ میری بیوی کے اغوا میں دلاور کا ہاتھ ہے اور حشمت خان، دلاور کا زرخرید تھا۔ عارف صاحب تو اس کے دباؤ میں نہیں آئے تھے لیکن حشمت خان اس کے ہاتھوں بک گیا تھا۔
”شام کو میری بیوی واپس آ گئی لیکن اس حال میں کہ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جسم اور چہرے پر خراشوں کے نشان تھے اور وہ پھٹی پھٹی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔
”میرے لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے تفصیل نہ بتائی۔ بس اس نے اتنا کہا کہ میں اب آپ کے قابل نہیں رہی۔ دلاور نے مجھے بے آبرو کر دیا۔ اس کے ساتھ اس کے تین ساتھی بھی تھے۔ ان میں شیرو بھی تھا۔ ان سب نے مل کر میری عزت کی دھجیاں بکھیر دیں۔
”یہ سب سن کر میرا خون کھولنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ ایسا کرنے والوں کو زندہ دفن کر دوں۔ میں نے اپنی بیوی کو آرام کرنے کا مشورہ دیا اور گھر سے نکل پڑا۔ میرا ارادہ دلاور کے خلاف رپورٹ درج کرانے کا تھا۔
”میں گھر سے نکل کر کچھ فاصلے پر پہنچا ہی تھا کہ مجھے اپنے گھر سے چیخ پکار کی آوازیں سنائی دیں۔ میں دیوانہ وار واپس بھاگا۔ میرے گھر کے کچن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اس کا دروازہ اندر سے بند تھا اور ریشماں کی چیخیں میرا دل چیرے ڈال رہی تھیں۔ میں نے محلے والوں کی مدد سے دروازہ توڑا تو مجھے ریشماں نظر آئی۔ اس کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ آگ بجھانے سے پہلے ہی وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر میں نے بھی وہ علاقہ چھوڑ دیا اور یہاں اس بستی میں آ گیا۔“
اپنی داستان سناتے ہوئے غلام حسین کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔
”میں نے اسی لیے تمہارا ساتھ دیا کہ تم نے دلاور جیسے بدمعاش کو للکارا تھا۔“
اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، میں صبح گھر ضرور جاؤں گا۔
صبح کا اجالا نمودار ہوا تو میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ غلام حسین نے سو کا وہی نوٹ میرے حوالے کر دیا جو میں نے اسے تھانے میں دیا تھا اور بولا۔ ”رکھ لو... تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔“
میں وہاں سے پیدل مین روڈ تک آیا پھر مجھے ایک بس مل گئی جو سبزی منڈی جا رہی تھی۔
میں دو تین بسیں بدل کر گھر پہنچا۔ بھیا علی الصباح اٹھنے کے عادی تھے۔ وہ دکان پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئے اور بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔
میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھیا! مجھے معاف کر دیں۔ یہ سب مصیبتیں میری... وجہ سے نازل ہوئی ہیں۔“
”بے وقوف ہے تُو!“ بھیا نے کہا۔ ”یہ تو حالات کا جبر ہے جمی! پھر انسان کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے، وہ تو ہو کر رہتا ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولے۔ ”لیکن تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ دلاور کے آدمی یہاں آس پاس ہی منڈلاتے رہتے ہیں۔ اب تو تو نے اس میڈم کو بھی اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ تو ایسا کر کہ ابھی حیدر آباد چلا جا۔“
”نہیں بھیا!“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کو اس مصیبت میں چھوڑ کر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“
”پاگل پن کی باتیں مت کرو جمی۔“ بھابی کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گئی تھیں۔ ”وہ لوگ تمہاری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ تمہارے بھیا کے ساتھ تو پوری مارکیٹ کمیٹی ہے۔ تم ابھی حیدر آباد چلے جاؤ۔“
”مارکیٹ کمیٹی بھی دلاور اور اس کے غنڈوں کے سامنے بے بس ہے بھابی!“ میں نے کہا۔ ”بس میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آپ مجھے گھر سے نکال بھی دیں گی تو میں کراچی نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے فیصلہ کن اور اٹل لہجے میں کہا۔ پھر موضوع بدلنے کو کہا۔ ”ارے! اب تک چھوٹو نہیں اٹھا... کیا وہ آج اسکول نہیں جائے گا؟“
”تم کیا زمان و مکان کی قید سے بھی آزاد ہو گئے ہو؟“ بھیا کے چہرے پر پہلی دفعہ مسکراہٹ آئی۔ ”تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ آج اتوار ہے۔“
”غلط بیانی سے کام کیوں لے رہے ہیں؟“ بھابی نے کہا۔ ”آج اتوار ضرور ہے لیکن میں نے فرحان کو اسکول جانے سے روک دیا ہے۔ ان لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“
”تو کیا ان کے خوف سے آپ فرحان کو اسکول نہیں جانے دیں گی؟“
”فرحان خود بھی بہت سہما ہوا ہے۔“ بھابی نے کہا۔ ”میں تو یہ علاقہ ہی چھوڑنے کو کہہ رہی ہوں۔“
”میں بھی دکان بیچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ بھیا نے کہا۔ ”چلتی ہوئی دکان ہے، ایک دو گاہک ملے بھی ہیں۔ ماجد صاحب خود بھی اس دکان میں انٹرسٹڈ ہیں۔ وہ قیمت بھی نسبتاً زیادہ دے رہے ہیں۔ دو چار دن میں سودا ہو جائے گا۔“
”بھیا! آپ اتنی محنت سے جمایا ہوا کاروبار یوں ختم کر دیں گے؟“ میں نے افسردگی سے کہا۔
”آدمی کے پاس صلاحیت ہو، کاروباری سوجھ بوجھ ہو تو ایسے ہزاروں مواقع ملتے ہیں۔ اس کے لیے انسان کا

زندہ رہنا شرط ہے۔"

اسی وقت فرحان اٹھ کر باہر آگیا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ "چاچو! آپ کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں تمہارے دادا کے پاس حیدر آباد گیا تھا۔" میں نے کہا۔ "جاؤ پہلے ہاتھ منہ دھو کر اچھے بچے بن جاؤ پھر ہم سب ناشتا کریں گے۔"

"آپ کو یاد ہے نا چاچو، آج اتوار ہے۔ آج ہم لوگ ناشتے میں حلوا پوری کھاتے ہیں۔"

"ہاں ہاں، حلوا پوری ہی کھائیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

فرحان منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر آیا اور بولا۔ "چاچو! چلیں، حلوا پوری لے کر آئیں۔"

"چاچو کو مت لے جاؤ۔" بھابی نے کہا۔ "تم ابو کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"نہیں۔" فرحان نے کہا۔ "میں تو چاچو کے ساتھ ہی جاؤں گا۔"

"اچھا چلو، میرے ساتھ ہی چلو۔" میں نے ہنس کر کہا اور فرحان کو لے کر باہر نکل گیا۔

گھر سے تھوڑے فاصلے پر چھوٹا سا ایک بازار تھا۔ وہیں ایک دکان پر حلوا پوری، سموسے، کچوریاں اور جلیبیاں ملتی تھیں۔

میں وہاں پہنچا تو وہاں چھ سات گاہک موجود تھے۔ تقریباً دو منٹ بعد میرا نمبر آیا۔ میں نے حلوا پوری لی تو فرحان ضد کرنے لگا کہ میں جلیبی بھی کھاؤں گا۔ میں نے ایک پاؤ جلیبیاں بھی لے لیں۔

میں سامان کا شاپر لے کر مڑا تو میری نظر شہباز خان پر پڑی یہ بھی دلاور کا ساتھی تھا۔ اس نے کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا اور چیخ کر بولا۔ "پکڑو اسے... اس دفعہ بچنے نہ پائے۔"

میں نے فرحان کو اپنے پیچھے کر لیا اور سامان کا شاپر دوبارہ کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"او بھائی!" دکان دار نے کہا۔ "لڑنا ہے تو باہر جا کر لڑو۔"

"خاموش رہو۔" میں نے اسے جھڑک دیا اور فرحان سے کہا۔ "تم کاؤنٹر کے پیچھے چلے جاؤ۔"

خان کے ساتھ اس کے تین ساتھی بھی تھے۔ ان سب کے تیور خطرناک تھے۔ کوئی اور ہوتا تو خان اب تک اسے دبوچ چکا ہوتا لیکن وہ مجھ سے بری طرح پٹ چکا تھا اس لیے نزدیک آتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے چیخ کر بولا۔ "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ پکڑو اسے اور استاد کے پاس لے چلو۔"

اس کے کہنے پر اس کے دو ساتھی آگے بڑھے۔ میں بھی پوری طرح تیار تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ اس وقت خالی ہاتھ تھے۔

ان میں سے ایک نے ہمت کی اور مجھے پکڑنے کی کوشش کی، میں نے وہیں سے لات چلائی جو اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ لات کھا کر دو چار قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور رکوع کی حالت میں جھک گیا۔ میں نے کسی چیز کی تلاش میں اردگرد نظر دوڑائی تو مجھے پوریاں نکالنے کا بڑا چمچہ نظر آیا۔ میں نے اچانک وہی اٹھالیا اور دوسرے آدمی کے سر پر اس چمچے سے وار کیا۔ اس چمچے میں اب بھی گرم تیل کے قطرے تھے۔ اس سے نہ صرف اس کا چہرہ جلا بلکہ سر پر بھی اچھی خاصی چوٹ لگی۔ تیسرا آدمی گھبرا کر مزید پیچھے ہٹ گیا۔

خان نے اچانک جیب سے چاقو نکالا لیکن اس کے کھولنے سے پہلے ہی میں نے اس کے چاقو والے ہاتھ پر وہ چمچہ دے مارا۔ ضرب سے اس کا چاقو ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ میں نے دوسرا وار اس کے سر پر کیا پھر پے در پے میں نے اس کے چہرے، جسم اور ہاتھوں پر کئی زوردار وار کر دیے۔ اس کے ساتھیوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن ایک ایک چمچہ کھا کر وہ پھر پسپا ہو گئے۔

خان نے ہوٹل کے باہر پڑی ہوئی ایک کرسی اٹھالی اور اس کی پشت پکڑ کر اسے زمین پر مار کر توڑ دیا۔ کرسی ٹوٹنے کے بعد ٹوٹا ہوا ایک پایہ اس نے اٹھالیا اور غضب ناک انداز میں میری طرف بڑھا۔ ٹوٹی ہوئی کرسی کے دوسرے پائے اس کے دو ساتھیوں نے اٹھالیے۔

اس کے ساتھیوں میں سے ایک اچانک میری طرف آنے کے بجائے کاؤنٹر کی طرف بڑھا جہاں فرحان سہما ہوا کھڑا تھا۔ وہ زور سے چیخا۔ "چاچو!"

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، خان کا ایک آدمی کرسی کا پایہ فرحان کو مارنے کے لیے بلند کر چکا تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے لپک کر وہ پایہ پکڑ لیا ورنہ فرحان کا سر پاش پاش ہو جاتا۔

اچانک میرے دائیں شانے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میری توجہ فرحان کی طرف ہوئی تو خان کو موقع مل گیا۔ اس نے کرسی کے پائے سے میرے سر پر وار کیا تھا لیکن میں شاید اس کی رینج سے نکل گیا تھا اس لیے اس کا وار میرے کندھے

پر پڑا۔ پوریاں تلنے کا چمچہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا دایاں ہاتھ ناکارہ ہو گیا ہے۔

میں لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میرے پیچھے ہٹنے سے خان مزید شیر ہو گیا۔ اس نے دوبارہ ڈنڈا اچلایا لیکن وہ میرے بجائے میز پر پڑا اور میز کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

میں نے اسے مزید موقع نہیں دیا۔ اس کا ڈنڈے والا ہاتھ پکڑا اور اس کے چہرے پر اچھل کر ایک ٹکر ماری۔ ٹکر کی ضرب سے وہ بری طرح چکرا گیا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا اور وہ آگے پیچھے ڈولنے لگا۔ میں نے اس کی ناک پر ایک ٹکر اور ماری تو وہ لہرایا اور کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

اس کے ساتھیوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ میں نے کاؤنٹر پر رکھا ہوا سامان کا شاپر اٹھایا تو مجھے پیچھے سے فرحان کی آواز آئی۔ "واہ چاچو... واہ! آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔"

میں نے سوچا کہ اب دلاور پھر آجائے گا پھر میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ میں نے سوچا اس سے پہلے دلاور یہاں آئے، مجھے اس کے اڈے پر جا کر اسے مارنا چاہیے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج یا تو دلاور مجھے مار دے گا... یا گھر پہنچ گیا تو بھیا، فرحان یا بھابی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ جب مرنا ہی تھا تو پھر اسے اس کے گھر میں جا کر کیوں نہ للکاروں؟ میں بھی کم سے کم دلاور یا اس کے دو ایک آدمیوں کو مار کے مرنا چاہتا تھا۔

میں نے فرحان سے کہا۔ "تم ناشتے کا سامان لے کر گھر جاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔"

"چاچو! آپ کہاں جا رہے ہیں؟" فرحان نے پوچھا۔

"میں ایک ضروری کام نمٹا کر ابھی آتا ہوں... لیکن خبردار! ابو یا امی کو اس بارے میں کچھ مت بتانا۔"

میں فرحان کو گھر تک چھوڑ کر واپس اسی ہوٹل میں آگیا۔ خان لنگڑاتا ہوا وہاں سے نکل رہا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی فرار ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر خان کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔

میں نے اس سے کہا۔ "گھبراؤ مت... میں اپنے ہاتھ تمہارے خون سے گندے نہیں کروں گا۔ مجھے دلاور تک لے چلو۔"

"دلاور تک؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں... اس سے پہلے کہ وہ یہاں آئے، میں خود ہی اس کے پاس چلا جاؤں۔" میں نے کہا اور ہوٹل میں جا کر اس کا وہ چاقو اٹھالیا جو اس نے مجھے مارنے کے لیے نکالا تھا۔ پھر میں نے خان کی تلاشی لی تو میں نے اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی سائیکل کی چین بھی کھول لی۔ ایسی چین اس سے پہلے میں نے بھورے کے پاس بھی دیکھی تھی۔ خان نے چین کے ایک سرے پر ربر کا پائپ چڑھا کر اس کا نچلا حصہ آپس میں جوڑ دیا تھا۔ ربر کے اس مضبوط پائپ سے ایک ہینڈل سا بن گیا تھا۔ میں نے وہ چین بھی اپنی کمر کے گرد لپیٹ لی۔

اب سے ایک مہینے پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھ جیسا سیدھا سادہ سا... ایک عام سا لڑکا اس قسم کے حالات سے بھی دوچار ہو سکتا ہے۔

اچانک مجھے غلام حسین نظر آیا۔

مجھے دیکھ کر وہ سیدھا میرے پاس آیا اور بولا۔ "جمی صاحب! میں آپ کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔"

میں نے خان کی طرف دیکھا، وہ ہوٹل کے باہر ایک بینچ پر بیٹھا پانی پی رہا تھا۔ اس میں شاید زیادہ دیر تک کھڑے رہنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے اور ناک سے بہنے والا خون جم گیا تھا اور اس کا چہرہ خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اس لحیم شحیم اور ہٹے کٹے بدمعاش کا یہ حشر مجھ جیسے ایک لڑکے نے کیا ہے۔

میں نے مختصراً غلام حسین کو واقعے کی تفصیل بتائی۔ پھر اچانک مجھے فیضو کا خیال آیا۔ میں نے غلام حسین سے کہا۔

"غلام حسین! ہو سکے تو میرا ایک کام کر دو۔"

"کیسا کام جمی صاحب؟"

"لاک اپ میں فیضو نام کا ایک حوالاتی ہے۔ تم اس تک میرا پیغام پہنچا دو کہ میں دلاور کے اڈے پر جا رہا ہوں۔ اگر وہ میری کچھ مدد کر سکتا ہے تو کر دے۔ اس موقع پر مجھے اس کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔"

"آپ... آپ دلاور کے اڈے پر جائیں گے؟" غلام حسین حیرت سے بولا۔ "اپنی جان کو کیوں خطرے میں ڈال رہے ہیں؟"

"اگر دلاور یہاں آگیا تو میرے ساتھ ساتھ میرے بھائی اور ان کی فیملی کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

خان ہم سے کچھ فاصلے پر تھا اور بہت غور سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے ہماری گفتگو کا تو اندازہ نہیں تھا اس کے چہرے پر اذیت کے ساتھ ساتھ کرب کے آثار بھی تھے۔ اس کی ناک بھی اچھی خاصی سوج گئی تھی اور اس سے ابھی تک خون جاری تھا جسے وہ اپنی قمیص کی آستین سے صاف کر رہا

تھا۔

”جی! میری ناک میں شدید تکلیف ہو رہی ہے۔ لگتا ہے میری ناک کی ہڈی تمہاری ٹکر سے ٹوٹ گئی ہے۔“

”تم تو بہت جی دار اور سخت جان ہو۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اب عورتوں کی طرح واویلا کیوں کر رہے ہو؟“

”میرے ساتھی مجھ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے پہنچتے ہی دلاور وہاں سے نکل پڑے گا۔“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ پھر غلام حسین سے کہا۔ ”تم فیضو تک میرا پیغام پہنچا دو۔ مجھے امید تو نہیں ہے کہ فیضو کے آدمی دلاور جیسے بدمعاش کے مقابلے پر آسکیں لیکن ممکن ہے وہ آ ہی جائیں۔“

یہ کہہ کر میں خان کی طرف بڑھ گیا اور بولا۔ ”چلو، تمہاری وہ کھٹارا جیپ کہاں ہے؟“

”وہ جیپ تو بھورے کے پاس ہوتی ہے۔ میں تو موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ میرے آدمی تو پہلے ہی سے اس علاقے میں موجود تھے۔“

وہاں سے کچھ فاصلے پر خان کی کھٹارا سی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

خان نے چلتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے تم اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے ہو جو یوں موت کے منہ میں جا رہے ہو؟“

”ہاں، میں اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس جینے سے بہتر ہے کہ ایک ہی دفعہ مر جاؤں۔ میں کوئی پروفیشنل بدمعاش نہیں ہوں۔ مجھے تم لوگوں نے اس راہ پر ڈالا ہے۔“

”موٹر سائیکل تم ہی چلاؤ۔ مجھ میں تو اسے چلانے کی ہمت نہیں ہے ورنہ اب تک میں یہاں سے نکل گیا ہوتا۔“

”کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ میں موٹر سائیکل کسی بس یا ٹرک سے ٹکرا دوں گا۔ میں تو یوں بھی مرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“

پھر میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور خان کو پیچھے بٹھا کر روانہ ہو گیا۔

اس زمانے میں گلشن اقبال کی آبادی نیپا چورنگی سے آگے نہیں بڑھی تھی بلکہ اس سے پہلے بھی بے شمار خالی پلاٹ تھے جن پر جھاڑ جھنکاڑ اور خودرو پودے اگے ہوئے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب لوگ راتوں کو راشد منہاس روڈ سے گزرنا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہاں آئے دن راہ زنی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ راشد منہاس روڈ پر فلیٹوں کا جنگل بھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔

دلاور کا اڈا اس علاقے میں تھا جو آج کی سندباد کی پشت پر ہے۔ وہاں بدمعاشوں اور لینڈ مافیا نے خالی زمین گھیر رکھی تھی۔ وہاں ابھی تک کچی آبادی تھی اور اس میں بھی ایک دوسرے سے فاصلے فاصلے پر چند ہی مکانات تعمیر ہوئے تھے۔ وہ تعمیر بھی عارضی تھی۔

جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان.... ایک پگڈنڈی تھی۔ خان مجھے اس پگڈنڈی سے دلاور کے اڈے تک لے گیا۔ دلاور نے اچھی خاصی زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔

مکان کے باہر اس کے دو تین آدمی بیٹھے آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔

مجھے خان کے ساتھ دیکھ کر انہوں نے مجھ سے کوئی تعرض تو نہیں کیا لیکن ان کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔

موٹر سائیکل کو سائڈ اسٹینڈ پر کھڑے کرتے ہوئے میں نے خان کو دیکھا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے آدمیوں کو کچھ اشارہ کر رہا تھا۔

میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ میں نے پھرتی سے سائیکل کی چین اپنی کمر سے کھول لی۔

خان لنگڑاتا ہوا مکان کے وسیع و عریض پھاٹک کی طرف بڑھا تو میں نے جھپٹ کر اس کا کالر پشت سے پکڑ لیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟ تم ہی تو مجھے دلاور تک لے جاؤ گے۔“

اس کے ساتھیوں نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا اور مجھے پکڑنا چاہا۔ میں اس کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا۔ میں نے سامنے سے آنے والے آدمی کے پیٹ میں اتنی زوردار لات ماری کہ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ بقیہ دو کو میں نے چین کی ایک ایک ضرب سے ناک آؤٹ کر دیا۔

مجھے خود پر حیرت سے زیادہ افسوس ہو رہا تھا کہ میرا باپ نہایت شریف آدمی ہے، اس جیسے بااصول اور قانون پسند آدمی کا بیٹا بدمعاشی کر رہا تھا۔

”اب چلو۔“ میں نے تلخ لہجے میں خان سے کہا۔ ”آئندہ اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرنے سے پہلے سوچ لینا کہ ان کی نوبت تو بعد میں آئے گی، میں پہلے تمہیں جہنم رسید کر دوں گا۔“

اس مکان کی باؤنڈری وال خاصی بلند تھی اور اندر اتنی زمین خالی پڑی تھی کہ اس میں بہ یک وقت چار پانچ ٹرک اور کم سے کم دس کاریں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اصل عمارت وہاں سے خاصے فاصلے پر تھی۔

اس کے بعد ایک برآمدہ تھا جس پر ٹین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ برآمدے میں چار پانچ آدمی موجود تھے لیکن خان کی وجہ سے وہ بھی کچھ نہیں بولے۔ البتہ ان کے چہرے پر حیرت ضرور تھی۔

میں نے خان کا کالر چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت سست روی سے لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

برآمدے کے آخری سرے پر ایک کمرا تھا۔

خان اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر دلاور اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔

مجھے وہاں دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور چیخ کر بولا۔ ”تم یہاں؟“

”اسے مرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے استاد؟“ خان نے کہا۔ دلاور کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں میں بھورا بھی تھا۔ اس نے جھپٹ کر ہاکی اٹھا لی۔ اس کی دیکھا دیکھی، دلاور کے دوسرے ساتھیوں نے بھی ہاکیاں اور ڈنڈے اٹھا لیے۔

”دلاور صاحب!“ بھورے نے کہا۔ ”آج یہ زندہ بچ کر یہاں سے نہیں جائے گا۔ پہلے تو میں اس کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑوں گا۔“

”واہ!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ایک دفعہ میں تمہیں کتے کی طرح مار چکا ہوں۔ تمہاری عقل اب تک ٹھکانے پر نہیں آئی؟“ پھر میں دلاور سے مخاطب ہوا۔ ”دلاور صاحب! آپ تو بہت بڑے سورما ہیں۔ پورے علاقے میں آپ کی دہشت ہے۔ کیا مجھ جیسے عام سے آدمی کے لیے بھی آپ کو ان بدمعاشوں کی ضرورت پڑے گی؟ مردانگی تو اسی میں ہے کہ آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے ماریں۔“

”تیری یہی خواہش ہے تو اسے میں ضرور پورا کروں گا۔ ویسے تو بھی مرد کا بچہ ہے۔ کس کی جرأت ہے کہ دلاور کے ٹھکانے پر آ کر اسے للکارے؟ تجھے کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ہے۔ تیری ایک ایک ہڈی تو میں اپنے ہاتھ سے توڑوں گا اور تجھے جان سے نہیں ماروں گا بلکہ زندگی بھر کے لیے اپاہج کر کے اسی مارکیٹ میں پھینک دوں گا جہاں تو نے اتفاق سے میرے آدمیوں کی پٹائی کی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے بھورے سے ہاکی لی اور میری طرف اچھال دی۔ میں نے ہاکی پکڑ لی۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھی سے ہاکی لی اور بولا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تو خالی ہاتھ مجھ سے مقابلہ کرے۔“

میں سائیکل کی چین دوبارہ اپنی کمر کے گرد لپیٹ چکا تھا۔ اس کے اوپر میری شرٹ تھی۔ جیب میں چاقو بھی تھا۔

اب دلاور نے جوش میں آ کر مجھے ہاکی بھی دے دی تھی۔

”ایک بات اور سن لے۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں تجھے تو زندگی بھر کے لیے معذور کروں گا ہی... تیرے بھائی کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ ہاں، تیری بھابی بہت خوب صورت ہے۔ کسی بھی عرب ریاست میں مجھے اس کے پچاس ہزار تو مل ہی جائیں گے۔“

اس کی باتیں سن کر میرا دماغ سنسنانے لگا۔ خون میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا اور میں بھول گیا کہ اس وقت میں دلاور کے اڈے پر ہوں۔ غصے کی شدت سے میرا جسم تپ رہا تھا۔

دلاور نے اچانک ہاکی سے میری کمر پر وار کیا جسے میں نے اپنے دائیں ہاتھ پر روکا۔ لمحے بھر کو مجھے ایسا لگا جیسے میرا ہاتھ ناکارہ ہو گیا ہو۔ اس نے فوراً ہی دوسرا وار میرے پیروں پر کیا۔ وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ میں تکلیف کی شدت سے لڑکھڑا کر گر گیا۔ دلاور چاہتا تو میرے سر پر ایک ہی وار کر کے مجھے مار سکتا تھا لیکن واقعی وہ مجھے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا اسی لیے میرے جسم کے دوسرے حصوں پر وار کر رہا تھا۔ اس نے پھر میری ٹانگوں پر وار کیا۔ اس نے میرے گھٹنے کو نشانہ بنایا لیکن میں نے اپنا گھٹنا سمیٹ لیا۔ اس کی ہاکی میری پنڈلی پر لگی۔

وہ پیشہ ور بدمعاش تھا۔ میں تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا اسی لیے بری طرح مار کھا رہا تھا۔

”استاد! اس کی بہن بھی بہت خوب صورت ہے۔“ اس کے کسی ساتھی کی آواز آئی۔ ”میں اس کے بارے میں معلومات لینے حیدر آباد گیا تھا تو میں نے اس کی بہن کو دیکھا تھا۔“

”اگر وہ اتنی ہی خوب صورت ہے تو دو چار مہینے میں اسے اپنے پاس رکھوں گا۔“ دلاور نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

اپنی بہن کا تذکرہ اس انداز میں سن کر مجھ پر ایک مرتبہ پھر جنون سوار ہو گیا۔

دلاور ایک مرتبہ پھر مجھے ضرب لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ میرے ہاتھ میں بھی ہاکی ہے۔

وہ جونہی آگے بڑھا، میں نے جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے لیٹے ہی لیٹے ہاکی سے اس کے گھٹنے پر وار کیا۔

اس کے منہ سے اذیت بھری ایک کراہ نکلی اور وہ بری طرح لنگڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

میں ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں کھڑا تو ہو گیا تھا

لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ میری ٹانگیں زیادہ دیر تک میرا وزن نہیں اٹھا سکیں گی۔ میں نے وہیں سے ہاکی پھینک کر دلاور کے سر کو نشانہ بنایا۔ یہ ضرب بھی خاصی شدید تھی۔ دلاور لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔

اس کے ساتھیوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن دلاور چیخ کر بولا۔ ''کوئی بیچ میں نہیں آئے گا۔'' اس کی آواز میں گھن گرج کے بجائے نقاہت تھی۔

میں اسے مزید موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں وار کرنے جا ہی رہا تھا کہ ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ ''رک جاؤ۔''

میرا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ میں نے گھوم کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس انتہائی شان دار شخصیت کا مالک تھا۔ اپنے حلیے اور چال ڈھال سے وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی یا بینک کا کوئی اعلیٰ عہدے دار لگ رہا تھا۔

اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم پر لعنت ہے دلاور! کل کے اس لڑکے نے پہلے ہمارے اس سورما خان کو مارا پھر بھورے کو ادھ موا کیا... اب تمہیں بھی اس نے زمین چٹادی۔ اگر میں اسے روک نہ دیتا تو ابھی تمہارے بجائے یہاں تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ لگتا ہے تم سب صرف کمزوروں پر ہی رعب جما سکتے ہو۔ کوئی اس جیسا آدمی مقابلے پر آجائے تو کتے کی طرح دُم دبا کر بھاگ نکلتے ہو۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ تمہیں اسی حالت میں یہاں چھوڑ دوں۔''

''ہمیں ایک موقع اور دے دیں سر!'' بھورے نے کہا۔

''میں تمہیں سو موقع بھی دوں گا تو تمہارا یہی حشر ہو گا۔ دلاور کو اسپتال لے جاؤ، تم سب کا حساب تو میں بعد میں کروں گا۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ۔''

میں نے اب خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے شرافت اور دیانت داری سے زندگی گزارنے کی اپنی سی کوشش کر لی تھی لیکن یہاں تو حقائق کچھ اور ہی تھے۔ عملی دنیا میں تو جھوٹ اور بددیانتی کی حکمرانی تھی۔ جو جتنا زیادہ جھوٹا، بے ایمان اور بدکردار تھا... وہ معاشرے میں اتنا ہی معزز تھا۔

میں نے اس سوٹ پوش کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن دو قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کر گر گیا۔ میرے پیروں اور ہاتھ میں شدید تکلیف تھی۔

سوٹ والے نے مڑ کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ارے! تم تو ابھی سے لڑکھڑا گئے؟''

میں واقعی لڑکھڑا گیا تھا۔ زندگی کے اس ڈھنگ سے لڑکھڑا گیا تھا جو اب تک جیتا رہا تھا۔ مجھے ان چند دنوں ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ معاشرے میں مائٹ از رائٹ کا قانون نافذ ہے۔ جانتا تو خیر میں پہلے بھی تھا لیکن جب یہی قانون عملی صورت میں میرے سامنے آیا تو میں اسی انداز میں سوچنے لگا۔ میں نے سوچا، کم از کم میرے خاندان کے دوسرے افراد تو ان آفات سے محفوظ رہیں گے۔ اگر ان کے سکھ کی خاطر مجھے اپنی ذات کو، اپنے ضمیر کو قتل بھی کرنا پڑے تو یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔

میں اپنی بھابی اور بہن کے بارے میں ان کے خیالات بھی سن چکا تھا اور وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔

یہ تمام خیالات مجھے زمین پر پڑے ہی پڑے چند سیکنڈ میں آگئے۔

سوٹ پوش کے اشارے پر بھورا اور ایک دوسرا آدمی مجھے اٹھانے کے لیے آگے بڑھے لیکن میں نے اشارے سے انہیں روک دیا اور اپنی تمام تر قوت اور ہمت مجتمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا... ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ! فرق صرف یہ تھا کہ یہاں جو جمی آیا تھا، میں اسے یہیں چھوڑے جا رہا تھا۔ اب سوٹ پوش کے پیچھے جانے والا ایک نیا جمی تھا۔

میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور قدم جماتا ہوا آہستہ آہستہ سوٹ پوش کے پیچھے چلنے لگا۔ مجھے چلنے میں خاصی تکلیف ہو رہی تھی اور میرا جسم پسینے میں تر ہو گیا تھا لیکن میں کسی کا سہارا نہیں لینا چاہتا تھا۔

میں تکلیف کی شدت سے نڈھال باہر نکلا تو سامنے ہی سوٹ پوش شخص کی نئے ماڈل کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم انتہائی دلیر اور بے جگر آدمی ہو لیکن لڑائی بھڑائی کے فن سے واقف نہیں ہو۔''

''میں کوئی پیشہ ور بدمعاش یا اسٹریٹ فائٹر نہیں ہوں سر!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں تو متوسط طبقے کا ایک عام سا آدمی ہوں۔''

''اب عام نہیں رہو گے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''سر! آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام احتشام ہے۔ میرے بے تکلف دوست مجھے شامی کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے شامی کہہ سکتے ہو۔''

''سر! نہ تو آپ سے میری دوستی ہے، نہ بے تکلفی ہے۔''

"ارے بھئی، دوستی تو اب ہوگئی۔" اس نے کہا۔ "اور بے تکلفی بھی ہوگئی۔"

اس دوران میں گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ وہ کراچی کا انتہائی مہنگا پرائیویٹ اسپتال تھا۔

مجھے فوراً ہی اسپتال میں ایڈمٹ کرلیا گیا۔ فوری طور پر میرے پیروں اور ہاتھ کے ایکسرے لیے گئے۔ میرے جسم میں کوئی فریکچر نہیں تھا۔

شامی نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں کم از کم تین چار دن یہاں رہنا ہوگا، پھر تم چلنے پھرنے کے قابل ہوسکو گے۔ ہاں، میں نے تمہارے گھر اطلاع بھجوادی ہے کہ تم خیریت سے ہو اور ایک ضروری کام میں مصروف ہو۔ کچھ دن بعد گھر پہنچ جاؤ گے۔"

"اس علاقے کے تھانے میں ایک کانسٹیبل غلام حسین ہے۔ اسے بھی اطلاع بھجوادیں کہ میں خیریت سے ہوں ورنہ وہ میرے گھر پہنچ جائے گا اور بھیا کو پوری تفصیل بتادے گا۔" میں نے کہا۔

"یہاں ٹیلی فون موجود ہے۔ تم تھانے کا نمبر ملاؤ۔ غلام حسین اس وقت تھانے ... میں ہوگا۔ تم خود اس سے بات کرلو۔"

پھر اس نے خود ہی تھانے کا نمبر ملایا اور بولا۔ "ہاں حشمت خان! کیسے ہو؟ ذرا اپنے ایک سپاہی غلام حسین کو تو بلاؤ۔ اس سے کچھ بات کرنا ہے۔" پھر اس نے ٹیلی فون سیٹ میرے بیڈ کے نزدیک ٹیبل پر رکھ دیا اور بولا۔ "حشمت خان نے غلام حسین کو بلایا ہے۔"

میں نے ریسیور کان سے لگالیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے غلام حسین کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"ہاں غلام حسین! میں جمی بول رہا ہوں۔"

"آپ کہاں ہیں... خیریت سے تو ہیں؟ میں نے فیضو کو آپ کا پیغام پہنچادیا تھا۔ اس نے مجھے ایک آدمی کا پتا دیا تھا کہ فوراً جاکر اسے اطلاع دے دو لیکن وہ آدمی کراچی میں موجود نہیں ہے۔ میں اس کا پتا تلاش کرکے ابھی ابھی یہاں پہنچا ہوں۔"

"اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میری طرف سے فیضو کا بھی شکریہ ادا کردینا۔ میں دو چار دن میں تم سے ملاقات کروں گا۔"

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ خیریت سے ہیں۔ میں تو آپ کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔"

"اچھا، اب باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

چار دن بعد میں اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہوگیا۔ شامی وہاں سے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کا گھر ڈیفنس میں تھا۔ میرے ذہن میں ایک بات کھٹک رہی تھی کہ آخر شامی کو مجھ سے کیا کام ہے جو وہ میرا اتنا خیال کررہا ہے؟

پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور سوچا کہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

شامی نے مجھے شاپنگ کرائی۔ میرے لیے بہترین قسم کے کپڑے اور جوتے خریدے۔ میں نے اس دوران میں اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔

ایک دن کھانے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "شامی صاحب! یہ میڈم کون ہے؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ انتہائی گھٹیا اور کمینی عورت ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس نے تمہیں پولیس اسٹیشن سے رہائی دلائی تھی۔ وہ تم جیسے وجیہہ اور جی دار نوجوانوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ وہ ان نوجوانوں کے ذریعے معصوم لڑکیوں کو پھانستی ہے اور انہیں خلیج کی کسی ریاست میں بیچ دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ منشیات کا کاروبار بھی کرتی ہے اور جوئے کے اڈے بھی چلاتی ہے۔ اس کی پشت پر ملک سرفراز ہے ورنہ میں اب تک اس کا خاتمہ کرچکا ہوتا۔"

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ تم کون سے پارسا ہو؟ تم اس کا خاتمہ صرف اس لیے کرتے کہ وہ تمہاری کاروباری حریف ہے۔

"کیا سوچنے لگے؟" شامی بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں میڈم کی باتوں پر غور کررہا ہوں۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور لباس سے تو وہ مجھے کسی اچھے گھرانے کی لگی تھی لیکن اس کی باتوں سے فوراً ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا یہ عورت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اب تم نے میرے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یہ بھی بتادوں کہ میں بھی کوئی فرشتہ نہیں ہوں۔ میں بھی منشیات اور غیر قانونی اسلحے کا کاروبار کرتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اپنی قوم کی بہنوں اور بیٹیوں کا سودا نہیں کرتا۔"

"آپ نے اب تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم جیسے جی دار نوجوان مشکل سے دو فیصد ہوتے ہیں۔" شامی نے ہنس کر کہا۔ "ہتھیاروں اور دوسرے ہتھکنڈوں سے دہشت پیدا کرنے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن وہ صرف دوسروں کے بل بوتے پر بدمعاشی کرتے ہیں۔ دلاور کے بارے میں میرا خیال تھا کہ یہ دوسروں سے کچھ مختلف ہے لیکن کسی کی جرأت اور بے جگری تو اسی وقت سامنے آتی ہے جب اسے خود مقابلہ کرنا پڑتا ہے... اور تم تو دلاور کے پیچھے یہاں تک آگئے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ دلاور کو اب ریٹائر کردوں۔ اس کی جگہ اب تم سنبھالو گے۔"

"سوری!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں یہ اُچکوں والا کام نہیں کروں گا۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" شامی جلدی سے بولا۔ "تمہیں کہیں نہیں جانا ہوگا۔ بس تم اپنی ایک ٹیم بناؤ اور اس سے کام لو... اور یہ تو فوری نوعیت کا کام ہے۔ میں تو تم سے بڑے کام لوں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں غنڈا ٹیکس اور بھتے کے معاملے میں سامنے نہیں آؤں گا بلکہ میرا نام بھی استعمال نہیں کیا جائے گا۔ دلاور تو اب کسی کام کا رہا... نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس کے دونوں گھٹنے توڑ دیے ہیں۔ بقیہ زندگی وہ وہیل چیئر پر ہی گزارے گا۔"

"اب مارکیٹ کا علاقہ تمہاری ذمّے داری ہے۔ اپنی ٹیم خود بناؤ۔ چاہو تو نئے لوگوں کو رکھ لو ورنہ جو لوگ ہیں انہی میں سے کچھ لوگ منتخب کرلو۔ تم پسِ پردہ رہ کر کام کرو گے... اور میں پھر کہوں گا کہ یہ بہت چھوٹا سا کام ہے، کم از کم تمہارے لیے۔" شامی نے کہا۔ "یہ بھی میں صرف اس لیے کررہا ہوں کہ اگر میں نے میدان خالی چھوڑ دیا تو میڈم کو اس پورے علاقے میں قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔"

"میڈم... میڈم۔" میں نے کہا۔ "یہ نام سن سن کر تو میرے کان پک گئے ہیں۔ اگر ہم میڈم ہی کو ختم کردیں تو؟"

"یہ ہم ابھی افورڈ نہیں کرسکتے۔" شامی نے یوں کہا جیسے میں نے بزنس کا کوئی بڑا پروجیکٹ شروع کرنے کی بات کی ہو۔ "ملک سرفراز خاصا اثر رسوخ رکھتا ہے۔ مجھے ابھی اپنی قوت مزید بڑھانا پڑے گی۔"

"ایک بات اور!" میں نے کہا۔ "اب تمہارا کوئی آدمی میرے بھیا کو پریشان نہیں کرے گا۔"

"پریشان!" اس نے ہنس کر کہا۔ "ارے! اب تو کوئی تمہارے سوا اس کی دکان کی طرف رخ نہیں کرے گا۔ میں نے ابھی اپنے ان تمام آدمیوں کو بلایا ہے جو مارکیٹ سے "انشورنس ٹیکس" وصول کرتے ہیں۔"

"انشورنس ٹیکس!" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"میرے یار! سیدھی سی بات ہے۔" وہ پھر مسکرایا۔ "جو دکان دار یہ ٹیکس نہیں دے گا پھر اپنی اور دکان کی ٹوٹ پھوٹ کا بھی خود ہی ذمّے دار ہوگا۔ یہ ایک طرح کی انشورنس ہی ہے۔"

اسی وقت ایک ملازم نے آکر اطلاع دی کہ آپ نے جن لوگوں کو بلایا ہے، وہ آگئے ہیں۔

"اچھا، تم چلو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" شامی نے جواب دیا۔

اس کی گفتگو، رکھ رکھاؤ، شخصیت اور خوش لباسی سے اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اتنی پُرکشش اور متاثر کن شخصیت کے پیچھے اتنا مکروہ چہرہ چھپا ہوگا۔

ہم لوگ گیسٹ روم میں پہنچے تو وہاں دلاور کے سولہ آدمی موجود تھے۔ ان سولہ میں سے ایک دلاور بھی تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میری ضرب سے اس کے گھٹنے ٹوٹے نہیں تھے بلکہ دونوں گھٹنوں کے جوڑ نکل گئے تھے۔ وہ دو مہینے میں چلنے پھرنے کے قابل ہوسکتا تھا۔

وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

شامی نے کہا۔ "میں نے تم لوگوں کو یہ بتانے کے لیے بلایا ہے کہ آج سے دلاور کے بجائے جمی تم سب کا لیڈر ہے۔ یہی تم لوگوں کی ڈیوٹیاں لگائے گا۔ یہی تم سے ہر بات کا جواب طلب کرے گا اور تم سب لوگ اس کا ہر حکم مانو گے۔" پھر اس نے ان لوگوں پر ایک نظر ڈالی جو ابھی تک حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ "میرے اس فیصلے پر تم میں سے کسی کو اعتراض ہے؟"

سب خاموشی سے مجھے اور شامی کو دیکھتے رہے۔

"اوکے!" شامی نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ اب تم لوگ جمی ہی سے ڈیلنگ رکھو گے۔ کوئی پرابلم ہو کوئی شکایت ہو تو تم سب جمی ہی سے بات کرو گے۔ اب میں چلتا ہوں۔ جمی تمہیں بتائے گا کہ کیسے کیا کرنا ہے؟" یہ کہہ کر شامی وہاں سے چلا گیا۔

میں نے دلاور سے کہا۔ "دلاور! مجھے افسوس ہے کہ تم میرے ہاتھوں زخمی ہوئے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔" پھر میں ان سب سے مخاطب ہوا۔ "بھورا میرے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرے گا۔ ایک بات اچھی طرح ذہن میں بٹھا لو کہ کسی بھی موقع پر کوئی میرا نام نہیں لے گا۔ میں کسی بھی معاملے میں سامنے نہیں آؤں گا۔

ہاں، بات حد سے گزر جائے تو پھر دیکھا جائے گا۔ اس صورت میں بھی تم لوگ میرا نام ہرگز نہیں لو گے بلکہ صرف مجھے اطلاع دو گے۔ بھورے کے ساتھ شہباز ہوگا۔ باقی لوگوں کو میں نام سے نہیں جانتا ہوں، تم لوگ اپنا تعارف خود ہی کرادو۔"

دلاور، بھورے اور شہباز خان کے علاوہ سب نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میں کسی بھی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔ اب خادم علی مارکیٹ سے رقم وصول کرے گا لیکن ان دکانوں میں میرے بھائی کی دکان اور مجیب بھائی کی دکان شامل نہیں ہے۔ دلاور جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا، یہ آرام کرے گا اور مجھے مشورے دے گا۔" پھر میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "تم لوگ اچھی طرح میری بات سمجھ گئے؟"

"ہاں، استاد!" ان میں سے کئی آدمیوں نے کہا۔

"اور اب یہ استاد وستاد چھوڑو۔ میں تم سب کا باس ہوں۔"

"جی باس!" بھورے نے کہا۔

"باقی کام پہلے کی طرح چلتا رہے گا۔ بس، اب تم لوگ جاؤ۔"

انہیں روانہ کر کے میں دوبارہ ڈرائنگ روم میں آیا تو شامی کسی سے ٹیلی فون پر بات کرنے میں مصروف تھا۔

ٹیلی فون سے فارغ ہو کر وہ بولا۔ "میں تمہاری آواز کی گھن گرج سُن رہا تھا۔ تم نے تو پہلے ہی دن سب لوگوں پر اپنا سکہ جما دیا۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "یہ لوگ اپنا کام کرتے رہیں گے۔ اب تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں دوسرے کاموں کے بارے میں بھی بتا دوں۔ اب تمہیں بھی اکثر ان لوگوں کو ڈیل کرنا پڑے گا۔"

وہ پہلے مجھے اپنے ساتھ شراب کی ایک بھٹی پر لے گیا۔ وہاں کچی شراب تیار ہو رہی تھی اور وہ بھٹی کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع تھی۔ بظاہر وہاں گاڑیوں کے انجن آئل کا ایک پلانٹ تھا لیکن وہاں بڑے پیمانے پر دیسی شراب تیار ہو رہی تھی۔

وہیں انڈسٹریل ایریا کی ایک فیکٹری میں بظاہر بال بیرنگ بنتے تھے لیکن وہ غیر قانونی اسلحے کا گودام تھا۔ اس وقت تک ٹی ٹی، ماؤزر، کلاشنکوف اور دیگر ہتھیاروں کی لعنت سے ہمارا ملک پاک تھا۔ اس لیے وہاں زیادہ تر درے کے بنے ہوئے پستول، ریوالور اور اسمگل شدہ جرمن ہتھیار ہی فروخت ہوتے تھے۔ شامی نے مجھے بتایا کہ ہم آرڈر پر پارٹیز کو اسٹین گن اور بیرن گن بھی فراہم کرتے ہیں لیکن اس بھاری اسلحے کی ابھی یہاں کھپت نہیں ہے۔ اس نے مجھے وہاں کے چیدہ چیدہ لوگوں سے بھی ملوایا۔

"بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" شامی نے کہا۔ "اب میں تمہیں ایک پارٹی میں لے چلتا ہوں۔ وہ پارٹی بھی ملک کے ایک بااثر سیاست داں کی طرف سے ہے۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا جمی! شامی یاروں کا یار ہے لیکن دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اب تم چاہو بھی تو ہمارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ صبح سے لے کر اب تک نہ صرف تمہاری تمام باتیں ریکارڈ ہو چکی ہیں بلکہ تمہاری فلم بھی بن چکی ہے۔ میرے گھر سے لے کر ہر جگہ خفیہ کیمرے نصب ہیں۔ وہاں تمہاری ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت ریکارڈ ہوئی ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا اور چند لمحے تک مجھ سے کچھ بولا بھی نہیں جا سکا۔ پھر میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کی کیا ضرورت تھی؟ کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"بات اعتماد کی نہیں اصول کی ہے۔ جب ہم کسی کو اپنے اہم رازوں سے آگاہ کرتے ہیں تو اپنے بچاؤ کے لیے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"جب میں نے جرم کی دنیا قبول کر ہی لی ہے تو پھر یہ بداعتمادی کیسی؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"ارے یار! یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ تو معمول کا حصہ ہے۔"

"شامی! شاید تم نہیں جانتے کہ میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں آیا تھا۔ مجھے مرنے کا کوئی خوف نہیں ہے اور جب میں نے مرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس فلم بندی اور ریکارڈنگ سے کیا فرق پڑے گا؟ تم لوگ زیادہ سے زیادہ مجھے مار ہی دو گے نا؟"

"تم شاید بھول گئے کہ تمہاری ایک فیملی بھی ہے۔ تمہارے والدین ہیں، ایک بہن ہے، بھائی اور بھابی ہیں... تمہارا چہیتا فرحان ہے۔ تم اپنی نہیں، ان کی فکر کرو۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "یار! تم بھی کیا باتیں لے بیٹھے؟ یہ تو صرف خانہ پری ہے... ابھی پارٹی میں جا کر تمہارا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔"

پارٹی کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی۔

وہ دنیا ہی الگ تھی۔ میں پہلی دفعہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آیا تھا۔ شامی نے مجھے کئی خوب صورت لڑکیوں سے بھی ملوایا۔

پارٹی میں جا کر واقعی میرا موڈ ٹھیک ہو گیا۔

وہیں ایک خوب صورت سی لڑکی کو دیکھ کر میں پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ وہ واقعی اتنی خوب صورت تھی اور مجھے ان سب بنی سنوری اور میک اپ سے لتھڑی ہوئی لڑکیوں سے بالکل الگ لگ رہی تھی۔

میں نے شامی سے پوچھا۔ "وہ لڑکی کون ہے جس نے گلابی سوٹ پہن رکھا ہے اور بالوں کا جوڑا بنا رکھا ہے؟"

"وہ!" اس نے میری نظروں کے تعاقب میں ادھر دیکھا۔ وہ جو اس نیوی بلیو سوٹ والی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہے؟"

"ہاں، میں اسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ ملک کے ایک بہت بڑے بزنس مین کی بیٹی ماریہ ہے لیکن وہ ہما شما کو گھاس نہیں ڈالتی۔ بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ میں نے کئی دفعہ اس سے دوستی کرنے کی کوشش کی لیکن بات ہیلو ہائے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ آؤ، میں تمہیں اس سے ملواؤں۔ دوستی نہ سہی، شناسائی تو ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ماریہ کی طرف بڑھ گیا اور بولا۔ "ہیلو ماریہ! ہاؤ آر یو؟"

"فائن!" اس نے خوب صورت آواز میں جواب دیا۔

"ماریہ! یہ میرے دوست جمی ہیں، ابھی حال ہی میں اسٹیٹس سے یہاں آئے ہیں۔ وہاں ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔"

"ہیلو مسٹر جمی!" ماریہ نے کہا۔ "کیسے ہیں آپ؟ کہیں امریکا جا کر اپنی مادری زبان تو نہیں بھول گئے؟"

"آپ لوگ باتیں کریں، میں ذرا دوسرے لوگوں سے مل لوں۔" شامی نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"کوئی اپنی ماں کو بھی بھول سکتا ہے؟" میں نے کہا۔ "تو پھر اس کی زبان کیسے بھول سکتا ہے۔ میں نے امریکا میں کئی برس گزارے ہیں لیکن وہاں بھی میں پاکستانیوں اور انڈینز سے اردو میں ہی بات کرتا تھا۔ مما اور پاپا بھی گھر میں اردو ہی بولتے ہیں۔"

وہ چونک کر بولی۔ "یہاں ہر آدمی کے ہاتھ میں وھسکی کا گلاس نظر آ رہا ہے لیکن آپ..."

"میں ابھی تک اس "نعمت" سے محروم ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا۔"

"آپ نے کہاں اسٹے کیا ہے؟"

"ابھی تو میں شامی ہی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ میں یہاں بھی ایک فائیو اسٹار ہوٹل بنانا چاہتا ہوں۔" پھر میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "مس ماریہ! آپ مجھے یہاں موجود تمام لڑکیوں سے بالکل الگ تھلگ اور منفرد لگ رہی ہیں۔"

"میرا بھی آپ کے بارے میں یہی خیال ہے۔" ماریہ نے کہا۔ "میں اس قسم کی پارٹیز میں شرکت کرنے کی عادی نہیں ہوں۔ میں اپنی فرینڈ زوبی کے مجبور کرنے پر آ گئی۔"

"پھر تو بہت پرابلم ہو جائے گی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیسی پرابلم؟" اس نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

"آئندہ آپ سے رابطہ کیسے ہوگا؟"

"رابطہ!" وہ کھل کر مسکرائی۔ "آپ تو واقعی بہت اچھی اردو بولتے ہیں۔" پھر اس نے اپنے پرس سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکالا اور بولی۔ "اگر آپ وعدہ کریں کہ میرا یہ ٹیلی فون نمبر آپ ہی تک محدود رہے گا تو میں آپ کو اپنا نمبر دے سکتی ہوں۔"

"میں تو یہاں یوں بھی اجنبی ہوں۔ اس کے باوجود آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ نمبر مجھ ہی تک محدود رہے گا۔"

اس نے مجھے اپنا کارڈ دے دیا اور بولی۔ "ابھی آپ کا کوئی مستقل ٹیلی فون نمبر تو ہوگا نہیں؟"

"میں یہاں مکان خریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دو ہفتے بعد میں بھی آپ کو اپنا وزیٹنگ کارڈ اور ٹیلی فون نمبر دینے کے قابل ہو جاؤں گا۔"

اسی وقت کسی لڑکی نے دور سے اسے آواز دی۔ "اے ماریہ! تم یہاں کھڑی ہو اور میں تمہیں سارے ہال میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔"

وہ مجھ سے معذرت کر کے آگے بڑھ گئی۔

میں نے شامی کی تلاش میں نظریں دوڑائی تو اچانک میری نظر میڈم پر پڑی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور تیر کی طرح میری طرف آئی پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "اوہو... یہ ٹھاٹ ہیں! تم نے آخر دلاور کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے تو تمہارا ہی بھلا چاہا تھا ایک دن تمہیں خود اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ جب بھی تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو، بلاتکلف ہمارے پاس آ جانا۔ ہمارے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔"

اس نے دور سے شامی کو دیکھا تو وہاں سے ہٹ گئی۔

شامی نے وہاں موجود کئی صنعت کاروں اور سیٹھوں سے میرا تعارف کرایا۔ خاص طور پر ملک کے اس معروف

سیاست داں سے میرا تعارف کراتے ہوئے وہ بولا۔ ''سر! یہ جمی ہے۔ میرا بہت پرانا دوست!'' پھر اس نے سیاست داں کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور انہیں تو تم جانتے ہی ہوگے؟''

''میں کیا، چودھری احسان صاحب کو تو پاکستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ یہ تو ایک دفعہ منسٹر بھی رہ چکے ہیں۔''

''چودھری صاحب ہمارے سرپرست ہیں۔'' شامی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اور ہمارے ہی کیا... یہ تو ملک کے ہر محبِ وطن آدمی کے سرپرست ہیں۔''

''جمی!'' چودھری صاحب نے کہا۔ ''میں نے شامی سے تمہارا بہت نام سنا تھا۔''

''آپ نے میرا نام سنا تھا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''مجھے تو شاید میرے محلے والے بھی نہیں جانتے۔''

''بھئی، میں نے شامی سے تمہاری بہت تعریف سنی تھی۔ میں آج اس حکومت میں نہیں ہوں لیکن کل پھر حکومت ہماری ہوگی... اس وقت مجھے تمہاری ضرورت پڑے گی۔''

ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں کہ انہیں بھلا میری کیا ضرورت پڑ سکتی ہے؟

☆☆☆

دوسری صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ شامی کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ آج میں اپنے بھائی اور بھابی سے ملنے جاؤں گا۔

''ان سے کہو گے کیا؟'' شامی نے پوچھا۔ ''کہ اتنے دن کہاں رہے؟''

''کہہ دوں گا کہ میں نے ایک آئل کمپنی میں ملازمت کرلی ہے۔ اس سلسلے میں لاہور گیا تھا۔''

☆☆☆

''ایسی کون سی ملازمت ہے جو تمہیں اتنی تنخواہ مل رہی ہے؟'' بھیا نے کہا۔

میں نے وہ دن بھیا اور بھابی کے ساتھ گزارا تھا۔

''سیلز کا کام ہے بھیا!'' میں نے کہا۔ ''جتنا زیادہ کام کرتا ہوں، اتنا کمیشن ملتا ہے۔ تنخواہ تو کم ہے لیکن کمیشن اس سے دگنا بن جاتا ہے۔'' میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

بھیا مطمئن ہوگئے۔ وہ جانتے تھے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ خاص طور پر بھیا سے جھوٹ بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مجھے لمحے بھر کو ندامت سی ہوئی لیکن میں نے اپنے ضمیر کو تھپک تھپک کر دوبارہ سلا دیا۔

''ایک چکر حیدرآباد کا بھی لگا لو۔'' بھیا نے کہا۔ ''ابو بھی تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولے۔ ''اور تم اس دن اچانک ہی غائب ہوگئے؟ کم سے کم بتا کر تو جاتے۔''

''بھیا! وہ دراصل میرا ایک دوست مل گیا تھا اسی کی وجہ سے مجھے یہ ملازمت ملی ہے۔ وہ کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر ہے۔''

''چاچو! لیکن آپ کا تو...''

''ابے یار! تم بولتے بہت ہو۔'' میں نے ہنس کر اس کی بات کاٹ دی۔ نہ جانے وہ کیا کہنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ''میں آج حیدرآباد جاؤں گا۔ تم چلو گے میرے ساتھ؟''

''ہاں چاچو! میں بھی چلوں گا۔'' فرحان نے کہا۔

''لیکن پھر اسکول کون جائے گا؟'' بھابی نے کہا۔

''ارے بھابی! ایک دن کی تو بات ہے... اور یہ فرحان کون سا یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔ ایک دن کی چھٹی کر لے گا۔''

فرحان خوشی خوشی حیدرآباد جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☆☆☆

حیدرآباد میں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ ہاں، گھر کی حالت خاصی سدھر گئی تھی۔ مجھے ڈرائنگ روم میں فرنیچر بھی نیا نظر آرہا تھا۔ ابو میری وجہ سے بہت پریشان تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوگئے اور مصنوعی خفگی سے بولے۔ ''جمی! تو تو ایک ہفتے کے لیے کراچی گیا تھا اور وہاں جا کر وہیں کا ہوگیا۔ ذیشان بتا رہا تھا کہ تو نے کسی کمپنی میں ملازمت کرلی ہے؟''

''جی ابو!'' میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ مجھے ایک دفعہ پھر ابو کے سامنے جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا۔

''ملازمت تو ملازمت ہی ہوتی ہے بیٹا!'' ابو نے کہا۔ ''میں نے ساری زندگی ملازمت کی تو کیا کر پایا۔ ذیشان کو دیکھو، اس نے اپنا کاروبار کر کے ایک ہی سال میں اتنا کما لیا جتنا میں نے پانچ سال میں بھی نہیں کمایا تھا۔ کالج تو تو نے چھوڑ ہی دیا ہے، اب تو ملازمت کے بجائے اگر ذیشان کے ساتھ کام کرے تو کاروبار میں مزید ترقی ہوگی۔''

''ابو! بھیا کا کام تو ابھی اتنا زیادہ نہیں ہے۔ ہاں، ان کا کام بڑھا تو میں بھی جاب چھوڑ کر ان کے ساتھ لگ جاؤں گا۔''

ثمرہ اس دوران میں کچھ زیادہ ہی نکھر گئی تھی۔ امی کی طرح وہ بھی خوب صورت تھی لیکن اب گھر میں خوش حالی آئی تو اس کے چہرے پر بھی نکھار آگیا... اور جلد کی رنگت سفید تو

پہلے ہی تھی، اب اس میں سرخی بھی جھلکنے لگی تھی۔

''جمی بھائی! آپ اتنے عرصے بعد کراچی سے آئے ہیں۔ یہ بتائیے، آپ میرے لیے وہاں سے کیا لائے؟''

''مجھے ذرا دم تو لینے دے۔ میں سب کے لیے کچھ نہ کچھ لایا ہوں۔''

''پہلے میری چیزیں مجھے دے دیں، دم بعد میں لیجیے گا۔'' اس نے بچوں کی طرح کہا۔

میں اس کے لیے کپڑے، پرس، پرفیوم اور مختلف کریمیں اور لوشن لے گیا تھا۔ ابو کے لیے ایک قیمتی گھڑی تھی، دو تین سوٹ پیس تھے اور پائپ تھا۔ ابو پائپ پیتے تھے۔ وہ قیمتی پائپ دیکھ کر خوش ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی انتہائی قیمتی قسم کی تمبا کو بھی تھا۔ امی کے لیے بھی کپڑے تھے، ایک... کمبل تھا اور اونی شال تھی۔

وہ سب لوگ مجھے یوں گھیرے بیٹھے تھے جیسے میں کراچی سے نہیں بلکہ سعودی عرب سے آیا ہوں۔ اس دور میں سعودی عرب جانے والے کو لوگ رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

امی نے میری پسند کا گاجر کا حلوا بنایا تھا۔ کھانے بھی میری پسند کے تھے۔

میں دوسرے دن کراچی کے لیے روانہ ہونے لگا تو ابو نے کہا۔ ''بیٹا! ایک دو دن اور ٹھہر جاتے۔''

''ابو! مجھے ابھی زیادہ چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں دو تین ہفتے بعد پھر آجاؤں گا۔ کراچی اور حیدرآباد میں فاصلہ ہی کتنا ہے؟ پھر فرحان کے اسکول کا مسئلہ بھی ہے۔ بھیا نے بہت مشکل سے اسے چھٹی کرنے کی اجازت دی ہے۔''

ابو خاموش ہوگئے۔ پڑھائی کے معاملے میں وہ بھی بہت سخت تھے اور اسکول کی چھٹی برداشت نہیں کرتے تھے۔

کراچی پہنچ کر میں شامی کے پاس پہنچ گیا۔

''یار! تم تو ایک دن کا کہہ کر گئے اور تین دن لگا دیے۔ میں تو آج تمہارے گھر کسی کو بھیجنے والا تھا کہ سب خیریت تو ہے...'' پھر وہ بولا۔ ''آج میں تمہیں ایک عجیب کیسینو میں لے جاؤں گا۔ وہاں جوا بہت منفرد انداز میں ہوتا ہے۔''

''مجھے جوئے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہم جوا کھیلیں گے نہیں بلکہ صرف دیکھیں گے۔ تم بھی جوئے کے اس طریقے پر حیران رہ جاؤ گے۔''

تھوڑی دیر بعد بھورا آگیا۔ وہ ہفتے بھر کی وصولی کی رقم لایا تھا۔ اس نے رقم کا بڑا سا خاکی لفافہ میرے ہاتھ میں دیا تو مجھے عجیب سا لگا۔ وہ دکان داروں کی خون پسینے کی کمائی تھی۔ وہ لوگ تو فٹ پاتھ پر کاروبار کرنے والوں اور ٹھیلے والوں تک کو نہیں چھوڑتے تھے۔

''یہ اٹھارہ سو روپے ہیں۔'' بھورے نے کہا۔ ''گن لیں۔''

''تم نے گن لیے، یہی کافی ہے۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟''

''ایسا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوا؟'' بھورے نے کہا۔ ''تھوڑا بہت مسئلہ ہوا بھی تو اسے میں نے اور خان نے سنبھال لیا۔''

وہ لفافہ مجھ دے کر چلا گیا۔ وہ ہلکا پھلکا لفافہ مجھے منوں وزنی لگ رہا تھا۔ میں نے گنے بغیر نوٹ الماری میں رکھ دیے۔

پروگرام کے مطابق شامی رات کو مجھے لے کر کلفٹن کے ایک بنگلے پر پہنچا۔ وہ خاصا وسیع و عریض بنگلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کم سے کم ڈھائی ہزار گز پر تعمیر کیا گیا ہوگا۔ اس کے باہر گاڑیوں کی قطاریں تھیں۔ اندر ایک خاصا بڑا ریسٹورنٹ بھی تھا اور دوسرے کمروں میں جوا ہو رہا تھا۔

ایک کمرے میں فلیش کی بازی جمی ہوئی تھی اور کیسینو کے شار پر، لوگوں کی جیبیں خالی کرنے میں مصروف تھے۔ ایک دوسرے کمرے میں رولٹ ٹیبل تھی۔ ایک جگہ اسنوکر کی بازی لگی ہوئی تھی۔ اس دور میں اسنوکر بڑے لوگوں کا کھیل تھا۔ عام آدمی کو تو شاید اس کا نام بھی نہیں آتا ہوگا۔

''یہاں ایسی کیا عجیب بات ہے؟'' میں نے شامی سے پوچھا۔ ''یہ سب کچھ تو ہر کیسینو میں ہوتا ہے۔''

''ابھی میں نے تمہیں وہ کمرا تو دکھایا ہی نہیں جس کے لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔''

''تو پھر وہ بھی دکھا دو...''

''آؤ میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر شامی ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کے باہر چھوٹا سا ایک کاؤنٹر تھا۔ وہاں ایک شخص بیٹھا لوگوں سے پیسے وصول کر رہا تھا۔ شامی نے بھی اسے دو سو روپے دے کر دو ٹوکن لے لیے۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کمرے میں داخلہ بھی پیسوں سے ہوتا ہے۔'' شامی نے کہا۔ میں تجسس میں مبتلا ہوگیا کہ وہاں ایسا کون سا جوا ہو رہا ہے جہاں داخلے کے لیے بھی ٹوکن ہے؟

اندر کا منظر چونکا دینے والا تھا۔ وہ ہال کمرا تھا۔ اس کے وسط میں ایک بیضوی میز پڑی تھی۔ اس کے گرد لوگ بیٹھے تھے۔ وہ سب ہی اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے بہت دولت مند نظر آرہے تھے۔ ان میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ پچپن سال

کے آدمی سے لے کر بیس سالہ نوجوان تک، ہر عمر کا آدمی وہاں موجود تھا۔

ہم بھی میز کے گرد پڑی ہوئی دو خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے کے دروازے پر ہم سے ٹوکن لے لیے گئے تھے۔ ہمارے بعد تین آدمی مزید آئے، پھر گیٹ پر کھڑے ہوئے آدمی نے بلند آواز میں کہا۔ ''بس شکور! اب کوئی ٹوکن مت دینا۔''

ساری کرسیاں پُر ہو چکی تھیں۔

کمرے کے سامنے بالکل سپاٹ سفید دیوار تھی۔ سب لوگ اسی دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس دیوار میں سے کچھ نمودار ہونے والا ہے۔ پھر دو آدمی آئے اور انہوں نے دیوار پر خوب صورت سی ایک لڑکی کی قدِآدم تصویر لگا دی۔ تصویر والی لڑکی بہت کم سن اور معصوم لگ رہی تھی۔ وہ خوب صورتی میں بھی یکتا تھی۔

تصویر لگانے والا ایک آدمی بلند آواز میں بولا۔ ''چلیے، بولی لگائیے... یہ لڑکی تصویر سے کہیں زیادہ حسین ہے۔''

''دس ہزار!'' ادھیڑ عمر کا ایک شخص بولا۔

''دس ہزار!'' تصویر لگانے والے نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''دس ہزار تو دل والے اس کی ایک مسکراہٹ پر نچھاور کر دیں۔''

''بیس ہزار!'' ایک اور سوٹ پوش بولا۔

''چالیس ہزار!'' درمیان میں بیٹھا ہوا ایک شخص بلند آواز میں بولا۔

''پچاس ہزار!'' ادھیڑ عمر کا ایک اور سیٹھ بولا۔ اس کا سر گنجا تھا اور جسم خمیرے آٹے کی طرح ڈھلکا ہوا تھا۔

''آئیے!'' تصویر والے نے کہا۔

''یہ کہاں لے جا رہا ہے؟''

میں نے شامی سے پوچھا۔

''بس دیکھتے جاؤ، ابھی خود ہی سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔''

وہ گنجا تھلتھلاتا ہوا میز کے دوسرے سرے کی طرف چلا گیا۔

تصویر والے نے ایک ڈبا کھول کر اس میں سے ایسا پانسا نکالا جیسے عموماً لوڈو میں استعمال ہوتا ہے۔ وہ اس پانسے کے مقابلے میں تقریباً چار گنا بڑا تھا۔

تصویر لگانے والے نے کہا۔ ''اس پانسے کے ایک طرف اس لڑکی کی تصویر ہے۔ یہ صاحب پانسا پھینکیں گے۔ اگر تصویر والا حصہ اوپر آ گیا تو لڑکی دو دن کے لیے ان کی ہوگی۔ اگر یہ ناکام رہے تو...''

''ہاں ہاں، سب جانتے ہیں... کھیل شروع کرو۔'' کئی آدمی بے چینی سے بولے۔ اس شخص نے پانسا سامنے رکھ کر لوگوں کو اس لڑکی کی تصویر دکھائی۔ پھر وہ پانسا گنجے کے حوالے کر دیا۔

گنجے نے پانسا لیا، تصویر کو بغور دیکھا پھر دونوں ہاتھوں کا پیالہ سا بنا کر اس میں پانسا بند کیا اور اسے ہلانے لگا۔

لوگ دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت مارے تجسس کے میں بھی سانس لینا بھول گیا تھا۔

گنجے نے تین چار دفعہ اپنے ہاتھوں کے پیالے کو ہلایا اور میز پر پانسا پھینک دیا۔

دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی کیونکہ تصویر کا رخ اوپر کی طرف نہیں تھا بلکہ دائیں جانب تھا۔

''ہارڈ لک سر!'' تصویر والا یوں چلایا جیسے وہ جوئے کے بجائے تمبولا کھلا رہا ہو۔ ''کوئی اور قسمت آزمائے گا۔ قیمت تو اب فکس ہو چکی ہے۔'' تصویر والے نے کہا۔ اس مرتبہ پچیس چھبیس سال کا ایک نوجوان اٹھا اور وہاں موجود لوگوں پر ایک نظر ڈال کر پانسا اٹھا لیا۔ پہلے اس نے دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھا پھر پانسے کا جائزہ لیا اور پانسے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لینے کے بجائے اپنی دائیں مٹھی میں بند کر کے ہلایا اور اچانک میز پر پھینک دیا۔

پانسا میز پر گرتے ہی اس نے فرطِ مسرت سے ''یاہو'' کا نعرہ بلند کیا کیونکہ اس مرتبہ تصویر کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ مجھے بے اختیار اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب ہم اپنا مطلوبہ نمبر آنے پر خوشی سے چیخا کرتے تھے۔

تصویر والا اب دیوار سے وہ قدِآدم تصویر اتار کر کسی دوسری لڑکی کی تصویر لگا رہا تھا۔

میں نے شامی سے کہا۔ ''اب یہاں سے نکلو، اس بند فضا میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' ایک تو لوگ وہاں شراب پی رہے تھے۔ پھر سگریٹ اور شراب کی ملی جلی .... سے مجھے چکر سے آ رہے تھے۔ یوں بھی وہ کمرا ہر طرف سے بند تھا۔

میں اٹھا تو میرے ساتھ شامی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

باہر نکل کر میں نے کھلی فضا میں دو چار گہرے گہرے سانس لیے پھر شامی سے پوچھا۔ ''جن لڑکیوں کی تصویریں دکھائی جا رہی ہیں، کیا وہ اسی بنگلے میں موجود ہیں؟''

''یہ لوگ کوئی کام کچا نہیں کرتے۔'' شامی نے کہا۔

''حالانکہ یہاں جوا کھیلنے والوں میں کئی راشی اور عیاش سرکاری افسر بھی موجود ہیں اس کے باوجود کوئی لڑکی یہاں نہیں ہے۔ لڑکیاں کسی نامعلوم مقام پر ہیں۔ جیتنے والے کو بھی آنکھوں پر پٹی باندھ کر وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ پھر وہ دو دن تک اس لڑکی کے ساتھ رہے گا۔''

''اور یہ لڑکیاں کہاں سے آتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''درختوں سے توڑ لیتے ہیں۔'' شامی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ارے یار! لڑکیاں کہاں سے آئیں گی... یہ لوگ لڑکیوں کو اغوا کرتے ہیں۔ سال، چھ مہینے تک ان پر جوا کھیلتے ہیں پھر انہیں مہنگے داموں خلیج کی کسی ریاست کے شیخ کو بیچ دیتے ہیں۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔''

''ہمارے ملک میں بھی کیسے کیسے بے حس اور بے ضمیر لوگ موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم جانتے ہو، یہ اڈا اور اس جیسے کئی اور اڈے کس کی ملکیت ہیں؟''

''نہیں، میں نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ اڈے اسی ملک سرفراز کی ملکیت ہیں جو اس وقت بظاہر غریبوں کا سب سے بڑا ہمدرد ہے۔''

میں بُری طرح چونک اٹھا۔ ''ملک سرفراز! وہ... وہ میڈم... روبی والا سرفراز؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہی ملک سرفراز!'' شامی نے جواب دیا۔ ''اور ان اڈوں کا پورا انتظام روبی یعنی تمہاری میڈم چلاتی ہے۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں یار!'' شامی نے افسردگی سے کہا۔ ''وہ لوگ صرف اسی ایک جوئے سے مہینے بھر میں کروڑوں روپے کماتے ہیں اور ہمیں اتنا ہی نقصان ہوتا ہے۔'' اس دور میں تو ایک لاکھ کی رقم بھی بہت خطیر ہوتی تھی۔ کروڑ روپے تو صرف بڑے اداروں کے منافع یا بجٹ میں ہوتے تھے۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر کہا۔ ''کیا تم بھی یہی کچھ کرتے ہو؟''

''یہ آئیڈیا تو میرا ہی تھا۔ ہم نے یہ سلسلہ کچھ دن چلایا بھی، پھر یہ ملک سرفراز نہ جانے کہاں سے اور کیسے ٹپک پڑا؟''

''تو کیا ہمارے بھی جوئے کے اڈے ہیں؟'' میں نے شامی سے پوچھا۔

''ہاں، میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔'' شامی نے کہا۔

''تم نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔''

''ارے یار! نہیں بتایا تو اب بتا رہا ہوں۔'' شامی جھنجلا گیا۔

''تم نے تو یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنے ملک کی بہن اور بیٹیوں کا سودا نہیں کرتا۔''

''ارے! یہ تو سب پروفیشنل ہوتی ہیں۔ ان کا سودا ہم نہیں کریں گے تو کوئی دوسرا کر لے گا۔ تو پھر ہم ہی کیوں نہ کریں؟''

ایک لمحے کو مجھے کراہیت سی محسوس ہوئی۔ مجھے اس لمحے شامی کا چہرہ بھی انتہائی مکروہ لگ رہا تھا۔ پھر میں نے سوچا، کسی دوسرے کو لعنت ملامت کرنے سے کیا فائدہ؟ اس راستے کا انتخاب تو میں نے خود ہی کیا تھا۔

اب میں مستقل شامی ہی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں گھر پہنچ کر اس سے کوئی بات کیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اچانک مجھے ماریہ کا خیال آ گیا... نہ جانے کیوں؟ اس کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر وہ مجسم میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ میرے اتنی نزدیک تھی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ میں نے بے اختیار ہاتھ بڑھایا تو وہ اچانک غائب ہو گئی۔

مجھے اپنے خیالات پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ ٹیلی فون کا ایکسٹینشن میرے کمرے میں بھی تھا۔ میں نے اپنے پرس سے ماریہ کا وزیٹنگ کارڈ نکال لیا پھر بے اختیار میں نے اس کا نمبر ملا لیا...... میں نے سوچا کہ اگر ماریہ نے فون اٹھایا تو بات کر لوں گا ورنہ رانگ نمبر کہہ کر رکھ دوں گا۔ پھر دماغ نے مجھے سمجھایا کہ یہ کیا پاگل پن ہے؟ رات کے اس پہر کسی شریف لڑکی کو پریشان کرنا کہاں کی انسانیت ہے؟ دوسری طرف بیل بج رہی تھی۔ میں نے اچانک لائن کاٹ دی۔ ان دنوں ٹیلی فون میں سی ایل آئی کی سہولت موجود نہیں تھی۔

پھر میں بہت دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا اور نہ جانے کب سو گیا؟

صبح میری آنکھ خاصی دیر سے کھلی۔ میں تیار ہو کر نیچے آ رہا تھا تو مجھے شامی کی آواز سنائی دی۔ ''جی سر! میں کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے ابھی اس سے کھل کے بات نہیں کی ہے۔ جبھی ابھی نیا ہے۔ اسے اپنے ٹریک پر لانے کے لیے کچھ عرصہ تو لگے گا۔''

میں دوبارہ اوپر چلا گیا کہ شامی نہ جانے کس سے بات کر رہا تھا اور میرے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔

چند منٹ بعد میں پھر نیچے اُترا تو شامی کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر وہ بولا۔ ''میں ایک ضروری کام سے ائرپورٹ جارہا ہوں۔ آج شام۔ تم کہیں نکل مت جانا، ایک بہت ضروری میٹنگ ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس وقت سوا دس بج رہے تھے۔ ملازم نے مجھ سے ناشتے کا پوچھا۔ میں نے صرف ایک سلائس اور چائے کا ایک کپ لیا۔

اچانک میرے ذہن میں پھر ماریہ کا خیال آگیا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ ماریہ بار بار میرے تصور میں کیوں گھس آتی ہے؟ وہ ایک کروڑپتی بزنس مین کی بیٹی تھی اور میں... میں کیا تھا؟ جرائم کی دنیا کا تیسرے درجے کا آدمی! لیکن دل کوئی بھی دلیل ماننے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور اس کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف بیل بجتی رہی، پھر تیسری یا چوتھی بیل کے بعد کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو، جی کون؟ آپ نے کس سے بات کرنی ہے؟'' دوسری طرف سے شاید ماریہ کی کوئی ملازمہ بول رہی تھی۔

''مجھے ماریہ بی بی سے بات کرنا ہے۔'' میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''میرا نام جمی ہے۔''

''ایک منٹ ہولڈ کریں۔'' ملازمہ نے کہا۔

میں انتظار کرتا رہا، تھوڑی دیر بعد فون پر ماریہ کی مترنم آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''ہیلو ماریہ! میں جمی بول رہا ہوں۔ کیسی ہیں آپ؟''

''آپ کیسے ہیں جمی صاحب؟'' ماریہ نے ہنس کر کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آج کل مکان کی تلاش میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہوں۔'' مجھے اس سے جھوٹ بولتے ہوئے ندامت کا احساس ہوا۔ ''اس وقت کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے؟'' میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ایسی کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔ ہاں، مجھے یاد آیا... ڈیڈی کے ایک دوست اپنا بنگلا بیچنا چاہتے ہیں۔ وہ بنگلا بہت بڑا تو نہیں ہے لیکن فی الحال آپ کی ضرورت کے لیے کافی ہوگا۔ آپ چاہیں تو ابھی وہ بنگلا دیکھ لیں۔''

''مس ماریہ! ابھی میں اس مقام پر نہیں پہنچا ہوں جہاں انسان کو کشف ہونے لگے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں اس بنگلے کی لوکیشن جانتا ہوں، نہ نمبر... میں وہ بنگلا ابھی کیسے دیکھ سکتا ہوں؟''

میری بات پر ماریہ بھی ہنسنے لگی اور بولی۔ ''آپ تو واقعی بہت بہترین اردو بول لیتے ہیں۔ وہ بنگلا تو آپ کو میں بھی دکھا سکتی ہوں۔'' ماریہ نے کہا۔ ''آپ ایسا کریں، میرا ایڈریس نوٹ کرلیں۔ بہت آسان ہے... یا ایسا کریں برج سے اترنے کے بعد جو پہلا پیٹرول پمپ ہے، آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچ جائیں۔ میں آپ کو وہیں مل جاؤں گی۔''

''لیکن فی الحال تو میرے پاس کوئی گاڑی بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسی لیے تو میں نے آدھے گھنٹے کا ٹائم دیا ہے۔ آپ کو آسانی سے ٹیکسی مل جائے گی۔ برج سے اترنے کے بعد لیفٹ پر جو پہلا پیٹرول پمپ ہے، میں آپ کو وہیں مل جاؤں گی۔''

میں نے اپنے کمرے میں جا کر بہت عجلت میں لباس تبدیل کیا اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ بعد مجھے ٹیکسی مل گئی۔

میں مطلوبہ جگہ پر پہنچا تو ماریہ اپنی مارک ٹو میں وہاں پہلے سے موجود تھی۔

وہاں سے ہم کلفٹن کے لیے روانہ ہو گئے کیونکہ ہمارا مطلوبہ بنگلا وہیں تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ ماریہ نے اتنی جلدی مجھ پر اس حد تک کیسے اعتبار کرلیا کہ وہ تنہا میرے ساتھ چلی آئی؟

''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ عجیب لڑکی ہے، پہلی ہی ملاقات میں کمبل ہوگئی۔'' ماریہ نے ہنس کر کہا۔

''میں ایسی کوئی بات نہیں سوچ رہا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن یہ ضرور سوچ رہا ہوں کہ آپ نے اتنی جلدی مجھ پر اس حد تک کیسے اعتبار کرلیا؟''

''جمی صاحب! لڑکیوں میں ایک چھٹی حس ہوتی ہے۔ انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون آدمی کس قماش کا ہے۔''

''اسی طرح کی ایک چھٹی حس لڑکوں میں بھی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بھی اندازہ تھا کہ آپ نے مجھے ناپسند نہیں کیا ہے اور جہاں تک میرا سوال ہے...'' میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''تو میں نے اسی وقت آپ کو پسند کرلیا تھا جب...... پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اس وقت تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آپ اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہیں اور میں معمولی سا ایک بزنس مین!''

''انسان بڑا یا چھوٹا اپنی دولت سے نہیں بلکہ کردار سے ہوتا ہے۔'' ماریہ نے کہا۔ ''پہلی ہی نظر میں آپ بھی مجھے اچھے لگے تھے۔''

''اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں یا آپ مجھ سے مذاق کررہی ہیں؟'' میں نے کہا۔

''پہلے تو یہ ''آپ جناب'' کا چکر چھوڑو۔'' ماریہ نے کہا۔ ''تمہیں اس میں کیا بات مذاق لگ رہی ہے؟''

''تم اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہو، میں تو معمولی سا ایک آدمی ہوں۔ میں...''

''جمی پلیز! اب کوئی لیکچر شروع مت کر دینا۔'' اس نے کہا۔ ''لو... انکل امان کا گھر آگیا۔''

میں نے اس بنگلے کا جائزہ لیا جسے وہ چھوٹا کہہ رہی تھی۔ وہ بنگلا کم سے کم ہزار گز پر بنا ہوا تھا۔ ہاں، کچھ پرانا ضرور تھا لیکن اس سے بنگلے کی خوب صورتی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

ماریہ نے گیٹ کے سامنے پہنچ کر ہارن بجایا تو گیٹ پر موجود چوکیدار نے ذیلی کھڑکی کھول کر باہر دیکھا پھر ماریہ کو پہچان کر اس نے پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔ بنگلے کے اندر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میری گھبراہٹ شاید اس نے بھی محسوس کرلی اور بولی۔ ''گھبراؤ مت... کتنے اس وقت بندھے ہوئے ہوں گے۔'' اس نے پورچ میں گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ وہاں ایک سیڈان اور لینڈ روور جیپ پہلے سے موجود تھی۔ ہم گاڑی سے اتر کر برآمدے میں آئے تو درمیانی عمر کے ایک شخص نے ہمارا استقبال کیا۔

''یہ میرے بہت کیوٹ سے انکل محسن ہیں۔'' وہ مجھ سے بولی پھر اس باوقار شخص سے مخاطب ہوئی۔ ''انکل! یہ میرے دوست جمی ہیں۔ حال ہی میں اسٹیٹس سے آئے ہیں اور یہاں اپنا بزنس کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آپ کا بنگلا خریدنے میں انٹرسٹڈ ہیں۔''

محسن صاحب نے ہاتھ ملایا تو ان کے انداز میں گرم جوشی تھی اور گرفت خاصی سخت تھی۔

''آئیے، اندر آجائیے۔'' محسن صاحب نے کہا۔

ہم لوگ ان کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ایک ملازم سے چائے کے لیے کہہ دیا تھا۔

''امریکا میں کہاں رہتے ہیں آپ؟''

''میں اس وقت نیویارک میں ہوں۔'' مجھے فوری طور پر یہی نام یاد آیا۔ میں وہاں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔

''آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے؟'' میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔

''آپ پہلے بنگلا دیکھ لیں، آپ کو پسند آئے گا تو ڈیمانڈ کی بات بھی کرلیں گے۔''

اسی وقت ملازم چائے کی ٹرالی لے کر آگیا۔

''پہلے چائے پی لیں پھر کاروباری بات بھی ہو جائے گی۔'' محسن صاحب نے مسکرا کر کہا۔

مجھے ہر لمحے یہ احساس ہورہا تھا کہ میں ماریہ سے جھوٹ بول کر اچھا نہیں کررہا۔ وہ بنگلا تو کیا، میں تو اس کا ایک کمرا خریدنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ مجھے یہ احساس بھی ہورہا تھا کہ محسن صاحب میری باتوں پر یقین نہیں کررہے ہیں۔

انہوں نے اچانک پوچھا۔ ''آپ نیویارک میں کہاں رہتے ہیں؟''

''میں نیویارک ساؤتھ میں رہتا ہوں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''بلاک نمبر سیون، ففتھ ایونیو۔'' میں نے کہا۔

''اوکے!'' انہوں نے گردن ہلائی۔

ہم لوگ چائے سے فارغ ہو چکے تھے۔

وہ بولے۔ ''میری فیملی اس وقت کینیڈا میں ہے۔ وہ لوگ وہاں چھٹیاں گزارنے گئے ہیں۔ آئیے، میں آپ کو بنگلا دکھادوں۔''

اس بنگلے میں اوپر نیچے پانچ بیڈ روم تھے۔ خاصا بڑا لان تھا اور بنگلا پرانا ہونے کے باوجود بہترین حالت میں تھا۔

''میں نے یہ بنگلا بہت محنت سے بنایا ہے لیکن اب بچوں کا اصرار ہے کہ یہ بنگلا چھوٹا ہے اس لیے انہیں کوئی بڑا گھر چاہیے۔ آپ چونکہ ماریہ بیٹی کے ساتھ آئے ہیں اس لیے میں آپ سے کوئی بارگیننگ نہیں کروں گا۔ اس کی قیمت صرف آپ کے لیے دس لاکھ روپے ہے۔''

''قیمت تو آپ نے بہت مناسب بتائی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں۔''

''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے... ٹیک یور ٹائم!'' محسن صاحب نے کہا پھر اپنی جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولے۔ ''اس کارڈ پر میرے آفس اور گھر دونوں کے ٹیلی فون نمبرز ہیں۔ اب آپ ڈائریکٹ مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔''

''تھینک یو!'' میں نے کہا اور کارڈ پر ایک نظر ڈالی تو کانپ کر رہ گیا۔ ان کا نام دیکھے بغیر ہی میری نظر کارڈ پر چھپے ہوئے پولیس کے مونوگرام پر پڑی۔ نیچے ان کا نام لکھا تھا۔

محسن جمیل صدیقی، ڈی آئی جی کرائم برانچ!

میں نے اپنے ہاتھ کی لرزش پر بہت مشکل سے قابو پایا اور اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

وہاں سے نکل کر ماریہ سی سائڈ کی طرف نکل گئی اور بولی۔ ''مجھے سمندر سے عشق ہے۔ اس کی بپھری ہوئی لہریں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔''

ہم دیر تک ساحل پر ٹہلتے رہے۔ اس دوران میں ہم دونوں یوں بے تکلف ہو گئے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ وہیں ایک صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں ہم نے لنچ کیا اور واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں ماریہ کو شامی کا گھر نہیں دکھانا چاہتا تھا اس لیے اس سے بہانہ کیا کہ مجھے ایک ضروری کام سے صدر جانا ہے۔ تم مجھے کسی ایسی جگہ ڈراپ کر دو جہاں سے مجھے ٹیکسی مل جائے۔

اس نے ایک جگہ گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔ ''اب کب ملاقات ہوگی؟''

''جلد ہی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''کل مجھے ایک ضروری کام سے اسلام آباد جانا ہے۔ دو دن بعد وہاں سے واپسی ہوگی تو ملاقات بھی ہو جائے گی۔''

''اوکے جمی! سی یو۔'' اس نے ہنس کر کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں نے ٹیکسی پکڑی اور شامی کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ شامی نے شام کو تیار رہنے کو کہا تھا۔ ابھی بہت وقت تھا۔ میں گھر جا کر کچھ دیر آرام بھی کر سکتا تھا۔

میں گھر پہنچا تو ملازم نے بتایا کہ کئی دفعہ آپ کے لیے ٹیلی فون آ چکا ہے۔

''کیا صاحب کا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کوئی ذیشان صاحب تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بہت ایمرجنسی ہے۔ جمی واپس آئے تو اس سے کہنا کہ مجھے کال کرے۔''

میں گھبرا گیا۔ بھیا کو ایسی کیا ایمرجنسی ہو سکتی تھی؟

میں نے اسی وقت مجیب بھائی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف مجیب صاحب ہی تھے۔

میں نے کہا۔ ''مجیب بھائی! میں جمی بول رہا ہوں۔ ذرا بھیا سے بات کرائیں۔''

''ذیشان دکان بند کر کے گھر جا چکے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جمی کا فون آئے تو اس سے کہنا کہ فوراً گھر پہنچے۔ ہمیں ابھی حیدرآباد جانا ہے۔''

میں بری طرح گھبرا گیا۔ بھیا اتنی ایمرجنسی میں حیدرآباد کیوں جا رہے تھے؟ خدا کرے کہ وہاں سب خیریت ہو۔

میں تیزی سے باہر نکلا تو شامی اپنی گاڑی سے اتر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو جمی؟''

''میں گھر جا رہا ہوں۔ بھیا نے بہت ایمرجنسی میں بلایا ہے۔''

''لیکن وہ شام کا پروگرام...''

''اس پر بعد میں بات کریں گے، ابھی تو مجھے گھر جانا ہے۔''

''مجھے ٹیلی فون کر کے بتا دینا کہ ایسی کیا ایمرجنسی ہے۔''

میں تقریباً بھاگتا ہوا گھر سے نکلا۔ چلتے ہوئے شامی نے مجھے دو ہزار روپے دے دیے تھے کہ رکھ لو... کام آئیں گے۔

میں نے باہر آ کر ٹیکسی پکڑی اور گھر پہنچ گیا۔

بھیا مجھے دیکھ کر پھٹ پڑے۔ ''تمہیں تو کسی بات کا احساس ہی نہیں ہے۔ نہ جانے کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو؟''

''بھیا! خیریت تو ہے... آپ اچانک حیدرآباد کیوں جا رہے ہیں؟''

''سنو گے تو تم بھی پریشان ہو جاؤ گے۔'' بھیا نے کہا۔ ''آج اسکول سے واپسی پر کسی نے ثمرہ کو اغوا کر لیا ہے۔''

''ثمرہ کو اغوا کر لیا؟'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''بھیا! آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟'' میری آواز میں وحشت تھی۔

''میں مذاق میں اتنی بھیانک بات کر سکتا ہوں؟'' بھیا نے کہا۔ ''اچھا، اب اپنے آنسو صاف کرو اور میرے ساتھ چلو۔ مجیب نے اپنی گاڑی مجھے دے دی ہے۔''

بھیا کے کہنے پر احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ بھابی بھی رو رہی تھیں اور فرحان بھی۔

میں نے باہر نکل کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھنا چاہا تو بھیا نے منع کر دیا اور بولے۔ ''اس وقت تمہاری ذہنی حالت درست نہیں ہے اس لیے تم ڈرائیونگ مت کرو۔''

پھر بھیا آندھی طوفان کی طرح حیدرآباد روانہ ہو گئے۔

ابو کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ بھیا کو دیکھ کر وہ بری طرح رونے لگے۔

بھیا خود بھی رو رہے تھے۔ انہوں نے بہت مشکل سے ابو کو تسلی دی۔ امی تو اس صدمے سے سکتے میں آ گئی تھیں۔

اسے اسکول سے واپسی پر اغوا کیا گیا تھا۔ میں نے وہ جگہ بھی دیکھی جہاں سے اسے اغوا کیا گیا تھا۔ اتفاق سے مجھے وہاں اس کا پین پڑا نظر آ گیا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر جیومیٹری بکس کی دوسری چیزیں تھیں۔

وہاں کے لوگوں نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ لوگ آج بھی پولیس کو کچھ بتاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ وہ سب انجان بن گئے تھے۔ کسی نے کچھ دیکھا ہی نہیں تھا لیکن وہ لوگ مجھے بچپن سے جانتے تھے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ ثمرہ اسکول سے واپس آ رہی تھی کہ اچانک ایک وین رکی۔ اس کا پچھلا دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے ایک آدمی اترا اور اس نے ثمرہ کو گاڑی میں گھسیٹنا چاہا لیکن وہ مزاحمت کرنے لگی۔ اسی مزاحمت میں اس کی کتابیں گر گئیں۔ پولیس نے اس کی چیزیں بعد میں وہاں سے اٹھا لی تھیں۔ شاید اس پین اور جیومیٹری بکس کی دوسری چیزوں پر ان کی نظر نہیں پڑی تھی۔

ایک دکان دار نے بتایا کہ وین نیوی بلیو تھی اور اس پر کراچی کی نمبر پلیٹ تھی۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ ثمرہ کو کہاں تلاش کروں؟ مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ ثمرہ کو کراچی لے جایا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں شامی سے کچھ مدد مل سکتی ہے۔

میں نے کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ صرف ذیشان بھائی سے یہ کہا کہ میں ثمرہ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔

پھر میں خاموشی سے کراچی آ گیا۔ گھر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ شامی دلاور کے اس اڈے کی طرف گیا ہے جہاں میں دلاور کی تلاش میں پہنچا تھا۔ مجھ سے اس کا انتظار نہ ہو سکا اور ٹیکسی پکڑ کر میں بھی وہیں پہنچ گیا۔

میں وہاں پہنچا تو وہیں ایک طرف اسی طرح کی وین کھڑی تھی۔ میں اسے دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا۔ اس کا رنگ بھی بلیو تھا۔

میں خاموشی سے گھر میں داخل ہوا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے لوگ اب میرے ماتحت تھے۔ انہوں نے خاموشی سے مجھے اندر جانے دیا۔ مکان کے احاطے میں دو گاڑیاں مزید کھڑی تھیں۔ ایک گاڑی تو شامی کی تھی، دوسری گاڑی بھی میں نے اس سے پہلے دیکھی تھی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھی ہے۔

میں مزید آگے بڑھا تو ایک کمرے سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایک آواز سن کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ اس آواز کو تو میں لاکھوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ ثمرہ کی آواز تھی۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ مجھے گھر جانے دو۔

جواب میں مجھے میڈم یعنی روبی کی آواز سنائی دی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ کہنے لگی۔ ''جانے دیں گے ضرور جانے دیں گے۔ تم پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ تمہیں یہاں بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

میں سمجھا کہ روبی کے آدمیوں نے ہمارے اس اڈے پر قبضہ کر لیا ہے لیکن دروازے پر تو ہمارے ہی آدمی تھے۔

اچانک مجھے شامی کی آواز سنائی دی تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

''بہت دنوں بعد اتنی حسین لڑکی ملی ہے۔ اس کے تو ہمیں دگنے پیسے ملیں گے۔''

میرا سر چکرا گیا۔ کیا روبی اور شامی آپس میں ملے ہوئے تھے؟

''میرا بھائی آ کر تم سب کو ختم کر دے گا۔'' ثمرہ نے کہا۔ ''مجھے جانے دو ورنہ وہ تمہیں چھوڑے گا نہیں۔''

شامی ہنس کر بولا۔ ''تیرا بھائی! کون ہے تیرا بھائی؟''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے شامی... اس کے بھائی کو اگر معلوم ہو گیا تو وہ ہمیں چھوڑے گا نہیں۔ جانتے ہو یہ کس کی بہن ہے؟ یہ جمی کی بہن ہے۔''

''کیا؟'' شامی نے حیرت سے کہا۔ ''یہ جمی کی بہن ہے... تم لوگ حیدرآباد سے لائے ہو اسے؟''

میرا خیال تھا کہ اب شامی ان لوگوں کو ڈانٹے گا اور ثمرہ کو تسلی دے گا کہ تم فکر مت کرو۔ میں خود تمہیں حیدرآباد چھوڑ کر آؤں گا لیکن اس کا جواب سن کر میرا خون کھولنے لگا۔

اس نے روبی سے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ جمی کے کانوں میں بھنک بھی پڑے، اسے آج ہی نیو کراچی شفٹ کر دو۔ آج ہی اس کا پوسٹر بنوا لو اور چھوٹی تصویریں بنا کر باس کو پہنچا دو۔''

میں پھر بری طرح اچھلا... میں سمجھ گیا کہ ثمرہ کا پوسٹر کیوں بنایا جا رہا ہے۔ وہ لوگ اسے بھی جوئے کی نذر کرنا چاہتے تھے۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دررے کا بنا ہوا پستول نکال لیا۔ یہ پستول میں نے شامی ہی سے لیا تھا۔ وہ دیکھنے میں بھدا تھا لیکن اپنا کام خوب کرتا تھا۔

میں اچانک اندر چلا گیا۔ وہ سب سکتے میں آ گئے۔ کمرے میں چار افراد تھے۔ شامی، روبی، بھورا اور ثمرہ!
ثمرہ مجھے دیکھ کر بے اختیار چیخی۔ ”جمی بھائی!“
اس کی آواز پر شامی نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے بھی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالنا چاہا لیکن میرے پستول سے گولی نکل چکی تھی۔ وہ گولی شامی کی پیشانی پر لگی۔ دوسری گولی نے روبی کا کام تمام کر دیا۔ بھورا میرے قدموں میں گر گیا اور بولا۔ ”جمی صاحب! میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں تو میڈم کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ آج اسے شامی صاحب کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے معاف کر دیں۔“
میں نے اسے چھوڑ دیا۔ روبی کے نزدیک ہی گاڑی کی چابیاں اور اس کا پرس پڑا تھا۔ میں نے اس کا پرس کھول کر دیکھا۔ اس میں بہت سے کرنسی نوٹ تھے۔ میک اپ کا سامان تھا اور ایک ڈائری تھی۔ میں نے وہ پرس بھی اٹھا لیا اور گاڑی کی چابیاں بھی۔
میں ثمرہ کو لے کر باہر نکلا تو پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے لے کر سیدھا حیدر آباد چلا جاؤں، پھر مجھے خیال آیا کہ ثمرہ کو براہِ راست حیدر آباد لے گیا تو پولیس ابو اور بھیا سے سو قسم کے سوالات کرے گی۔ وہ ثمرہ سے بھی پوچھ گچھ کریں گے اور وہ نادانی میں بتا دے گی کہ جمی بھائی نے دو آدمیوں کو مارا ہے۔
مجھے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ پولیس مجھے گرفتار کرے گی۔ میں ثمرہ کو محفوظ ہاتھوں میں پہنچا دینا چاہتا تھا پھر میں خود ہی گرفتاری کے لیے پیش ہو جاتا۔ مجھے یقین آ گیا کہ رزقِ حلال اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ ابو نے ہمیں رزق حلال کھلایا تھا۔ ہمارے خون میں حرام کی کمائی کا ایک ذرہ بھی شامل نہیں تھا۔ میں جرم کے راستے پر چلتا رہا لیکن رزق حلال مجھے قدم قدم پر ٹوکتا رہا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں اس کا حق ادا کروں۔
مجھے ایک ہی محفوظ جگہ نظر آ رہی تھی۔ میں ثمرہ کو محسن صاحب کے گھر لے گیا۔
وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔
میں نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور ان سے کہا۔ ”آپ میری بہن کو حفاظت سے حیدر آباد بھجوا دیں۔ میں... خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہا ہوں۔“
”کیوں بھئی! تم نے کیا جرم کیا ہے؟ تم نے جو کچھ کیا ہے سیلف ڈیفنس میں کیا ہے ورنہ وہ لوگ تمہیں مار دیتے۔“
محسن صاحب نے ہنس کر کہا۔ ہاں، ناجائز اسلحہ رکھنے اور غصے میں آ کر روبی کو مارنے کے جرم میں تمہیں تھوڑی بہت سزا ہو سکتی ہے۔“
”مجھے اپنی نہیں، ثمرہ کی فکر ہے۔“
”ثمرہ اب میری ذمے داری ہے۔“ محسن صاحب نے کہا۔ ”تم جانتے ہو، مجھے اس دن بھی یقین نہیں آیا تھا کہ تم امریکا سے آئے ہو۔ میں نے بعد میں معلومات کیں تو معلوم ہوا کہ تم شامی کے ساتھ کام کرتے ہو۔ تمہیں حیرت ہوگی کہ یہ شامی، روبی وغیرہ، سب بدمعاش ایک ہیں۔ پہلے تو تم مجھے وہ بنگلا دکھاؤ جہاں وہ جوا ہوتا ہے۔“
پھر وہ مختلف جگہ ٹیلی فون کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ثمرہ کو محسن صاحب نے اندر بھجوا دیا تھا۔ ان کی بیگم اور بچے کینیڈا سے واپس آ گئے تھے۔
پولیس نے جوئے کے اس اڈے کے علاوہ ہر اس ٹھکانے پر چھاپا مارا جو میرے علم میں تھا۔ پھر پولیس نے محسن صاحب کے کہنے پر مجھے بھی گرفتار کر لیا اور جیل بھجوا دیا۔
جیل میں مجھے اطلاع ملی کہ کوئی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں باہر پہنچا تو ماریہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے محسن انکل نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میری نظروں میں تمہاری عزت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ محسن انکل تمہیں سزا نہیں ہونے دیں گے۔“ پھر ایسا ہی ہوا۔ محسن صاحب نے مجھے صاف بچا لیا۔

☆☆☆

میں گھر پہنچا تو میری بیوی نے غصے میں کہا۔ ”آپ نے آج بھی دیر کر دی... آخر آپ کو ملازمت کی ضرورت ہی کیا ہے؟“
”ملازمت میری ضرورت نہیں بلکہ شوق ہے۔“ میں نے کہا۔
میری بیوی نے برا سا منہ بنایا اور بولی۔ ”اور یہ جو لاکھوں روپے کا کاروبار ہے، یہ کون سنبھالے گا؟“
”اسے تم سنبھال رہی ہو، بھیا ہیں... پھر سب سے بڑھ کر بھورا ہے۔“
آپ جانتے ہیں میری بیوی کون ہے؟ جی ہاں، ماریہ اب میری بیوی ہے۔ محسن انکل نے مجھے پولیس میں ملازمت کی آفر کی تھی تو میں انکار نہ کر سکا۔ اب میں سب انسپکٹر ہوں۔ میرے چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں۔ میں بھی اب رزقِ حلال کی افادیت کا قائل ہو گیا ہوں۔